علمائے ہند کا شاندار ماضی

جلد چہارم

۱۸۵۷ء اور جانبازانِ محمدیہ

از

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ

محدث، فقیہ، مؤرخ، مجاہد فی سبیل اللہ، مؤلف کتب کثیرہ

مکتبہ محمودیہ۔ لاہور

58865

مطبوعہ:- استقلال پریس لاہور

Marfat.com

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	انتساب	۶
۲	ضرورت و مقصد	۷
۳	جلد چہارم کے ابواب	۱۰
۴	شکریہ	۱۰
۵	اسباب و وجوہات اور پس منظر	۱۳
۶	اقتصادی وجوہات	۱۳
۷	زمینداری کی نوعیت	۲۱
۸	خاتمہ بحث اور خلاصہ	۲۹
۹	عدل و انصاف پر ٹیکس	۳۱
۱۰	تہذیب برباد اور مذہب کے لئے خطرہ۔	۳۴
۱۱	عزت و شرافت اور خودداری پر کاری ضرب	۴۳
۱۲	الحاق	۴۶
۱۳	یہ طویل خاموشی کیوں؟	۴۹
۱۴	علماء کرام کے نظریات، تجویزیں، لائحہ عمل اور عمل	۵۸
۱۵	مولانا سید نصیر الدین دہلوی	۶۲
۱۶	وطن عزیز کو نجات دلانے کے لئے مشترکہ جد و جہد	۷۲
۱۷	۱۰ مئی ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے	۷۵
۱۸	پیپاتیوں کی تقسیم اور اس کی توجیہات	۷۸
۱۹	پیش گوئیاں	۸۲
۲۰	شاہ ایران اور شاہ روم	۸۳
۲۱	جنوری ۱۸۵۷ء سے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء تک	۸۴
۲۲	منگل پانڈے	۸۵
۲۳	دہلی چلو	۸۹
۲۴	دہلی میں انقلابی فوج کی آمد	۸۹
۲۵	انقلابی سپاہی اور بہادر شاہ	۹۲
۲۶	اعلان آزادی	۹۸
۲۷	انقلابی فوجوں کا دہلی میں استقبال	۱۰۳

Marfat.com

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۲۸	دہلی کی حالت اور اس کا نظم و نسق۔	۱۰۶
۲۹	لوٹ مار کیوں اور کتنی؟	۱۱۵
۳۰	بادشاہ کے تاثرات	۱۲۱
۳۱	بادشاہ کی عظمت	۱۳۱
۳۲	محاذِ جنگ	۱۴۴
۳۳	انقلابی محاذ اور دہلی کا شہری مزاج	۱۴۸
۳۴	فتوے	۱۶۴
۳۵	انقلابی جماعتیں نظم و نسق	۱۸۱
۳۶	مجاہدین کا کردار	۱۹۳
۳۷	جذباتِ ایثار کی سرمستیاں	۲۰۲
۳۸	دہلی کی تباہی	۲۱۳
۳۹	نامور علماء و فضلاء	۲۱۹
۴۰	مفتی صدر الدین	۲۱۹
۴۱	نواب شیفتہ	۲۳۲
۴۲	مولانا صہبائی	۲۳۶
۴۳	مضافاتِ دہلی	۲۴۳
۴۴	ضلع مظفر نگر و سہارنپور	۲۴۵
۴۵	تھانہ بھون و شاملی	۲۵۶
۴۶	ناکامی کے بعد	۲۸۱
۴۷	وارنٹ گرفتاری	۲۸۳
۴۸	حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ	۲۸۹
۴۹	مولانا محمد قاسمؒ	۲۹۴
۵۰	مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ	۲۹۹
۵۱	مولانا محمد مظہر صاحبؒ	۳۰۴
۵۲	مولانا محمد منیر صاحبؒ	۳۰۶
۵۳	مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ	۳۰۷
۵۴	ڈاکٹر وزیر خاں	۳۱۱
۵۵	رڑکی۔ ضلع سہارنپور	۳۱۳
۵۶	مولانا عبد الجلیل شہید	۳۱۶
۵۷	بلند شہر	۳۱۷
۵۸	نواب ولی داد خاں	۳۱۹
۵۹	امین بدھان گوجر	۳۲۳
۶۰	روہیل کھنڈ	۳۲۵
۶۱	ریاست رام پور	۳۳۰
۶۲	انجام	۳۳۵
۶۳	بدایوں	۳۳۷
۶۴	مولانا فیض احمد بدایونی	۳۵۶
۶۵	منشی ذوالفقار الدین	۳۶۲
۶۶	ایمان یا جان	۳۶۳
۶۷	خسر داماد دونوں شہید	۳۶۴

Marfat.com

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۶۸	مراد آباد	۳۶۷	۷۹	علامہ فضل حق خیر آبادی	۴۴۲
۶۹	نواب مجو خاں	۳۷۵	۸۰	جنرل بخت خاں	۴۵۵
۷۰	مولانا کافی	۳۷۶	۸۱	شاہزادہ فیروز شاہ	۴۶۳
۷۱	مولانا وہاج الدین	۳۷۹	۸۲	خاتمۂ کلام اور معذرت	۴۶۶
۷۲	نواب محمود خاں	۳۸۵	۸۳	سرگذشت جیمی گرین	۴۶۸
۷۳	دوسرا رُخ معیار وفاداری	۳۹۷	۸۴	تصویر کا دوسرا رُخ	۴۸۱
۷۴	شاہ غلام بھولن	۴۰۴	۸۵	ابتدائے انتظام	
۷۵	شاہ جہان پور	۴۰۶	۸۶	ضمیمہ ۱ تھانہ بھون	۴۹۱
۷۶	نواب غلام قادر خاں	۴۰۷	۸۷	ضمیمہ ۲ آخری تبرک	۵۰۹
۷۷	مولانا احمد اللہ	۴۱۰	۸۸	خاتمۂ کتاب	۵۱۳
۷۸	مفتی عنایت علی کاکوروی	۴۳۴			

Marfat.com

اِنتساب

نوشہ خاں ایک رضا کار تھا۔ تحریکِ خلافت میں گرفتار ہوا۔ سزا کاٹی۔ ۳۲/۱۹۳۰ء کی تحریکِ آزادی میں پیش پیش رہا۔ سرکار پرستوں کے طعنے سُنے۔ بچّوں کو بھوکا ننگا رکھا۔ مگر حُبِّ وطن کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اُس کا قدم آگے ہی بڑھتا رہا۔

۱۹۳۸ء میں یو۔ پی کونسل کے لئے ضلع مراد آباد کے ایک حلقہ میں ضمنی انتخاب ہوا۔ مولانا بشیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ رکن مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند، کانگریس کی طرف سے اُمیدوار تھے۔ مقابلہ بہت سخت تھا۔ نوشہ خاں بھی شہر مراد آباد کے رضا کاروں کا ایک دستہ لے کر اس الیکشن میں کام کرنے کے لئے "کانٹھ"[1] پہنچے۔ بھوکے پیٹ دن بھر کام کیا۔ رات کو کھانے میں صرف چاول میسّر آسکے۔

جنوری کا مہینہ، کڑاکے کی سردی، کپڑے ناکافی۔ چاول کھا کر فرش زمین پر سونا ہوا۔ صبح آنکھ کھُلی تو نوشہ خاں کو نزلہ و زکام تھا۔ شام تک نمونیہ ہو گیا۔ اپنے وطن مراد آباد واپس ہوئے اور اگلے روز اس وطنِ عارضی سے وطنِ حقیقی کی طرف رخصت ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

یہ کتاب ایسے ہی جاں باز و ایثار شیوہ مجاہدینِ حرّیت کی خدمت میں نذر ہے جن کی قربانیوں نے ایثار و اخلاص کی عظیم الشان مثال قائم کی۔ مگر وہ خود سنگِ بنیاد کی طرح ایسے اوجھل ہوئے کہ نہ کامیاب ہونے والوں کی نظریں اُن پر پڑیں اور نہ تاریخ اُن کے آثار و نشانات کو محفوظ رکھ سکی۔

محمّد میاں

---

[1] کانٹھ۔ ضلع مراد آباد کا ایک قصبہ ہے۔

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

نحمده ونصلی علیٰ رسوله النّبیّ الاُمّی خاتم الانبیاء والمرسلین رحمة للعالمین المبعوث الی کافة النّاس بشیرا ونذیرا - وعلیٰ اٰله وصحبه الطیّبین الطّاهرین ما کانت الایّام متداولة بین النّاس و ما دام فی دفع النّاس بعضهم ببعض حیاة للملل و دفعاً للباس-

---

ضرورت و مقصد

ناکامی ایک قسم کی موت ہے۔ میت کی صورت دیکھنے والے جس آسانی سے مرض اور ناتوانی کا تصوّر کرسکتے ہیں، اس طرح عہدِ شباب کی قوّت و رعنائی کا تصوّر نہیں کرسکتے اور اگر کوئی کہنے لگے کہ ع

انہیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

تو افسردہ طبیعتوں اور پژمردہ دماغوں کو اس کے یقین کرنے میں ذرا تامّل نہ ہوگا۔

سو سال پہلے ۱۸۵۷ء کا وہ عظیم الشان جہاد جس کو نشۂ کامرانی کے بدمستوں نے "غدر" کا نام دیا تھا۔ جس نے ایک برس سے زیادہ عرصہ تک شمالی ہند کے طول و عرض کو قربانیوں اور مظلومانہ جان سپاری کا لالہ زار بنائے رکھا تھا۔ وہ اسی اصول کی ایک تاریخی مثال ہے۔

دورِ غلامی کی افسردہ آب و ہوا میں جن دماغوں نے پرورش پائی تھی اگر وہ انگریز

Marfat.com

ماسٹروں کے پڑھائے ہوئے سبق کو یاد کرلیں اور برطانوی سامراج کے اس پراپیگنڈے کو کہ :

"۱۸۵۷ء کا خلفشار شورہ پشت فوجیوں کی سرکشی اور خود غرض اقتدار پسندوں کی حرکت مذبوحانہ اور گمراہ سازش تھی"۔

حقیقت سمجھنے لگیں گے تو اس سے اصل حقیقت نہیں بدل سکتی۔ اور جو واقعہ ہے اس کے واقعہ ہونے میں فرق نہیں آسکتا۔

حقیقت بہرحال حقیقت ہے خواہ اس پر کتنے ہی پردے ڈال دیئے جائیں، اور اس کو دیکھنے سے خواہ کتنی ہی چشم پوشی کی جائے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

برطانوی جبر و قہر کے بادل جیسے ہی چھٹنے شروع ہوئے، آفتابِ حقیقت کی کرنیں نمودار ہونے لگیں جس کو نصف صدی سے زائد تک غدر کہا گیا تھا، طبیعتیں اس کو غدر کہنے سے شرمانے لگیں اور جن کو غدار کہا جارہا تھا اُن کو "عاشقانِ پاک طینت" سمجھا جانے لگا۔ اُن کے رقم جانبازی کو زندہ کرنے کی اُمنگیں دلوں میں بیدار ہونے لگیں ؎

عجب رسمے بنا کردند بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ونائک[1] دامودر ساورکر، خواجہ حسن نظامی اور پنڈت سندر لال جیسے مصنفین نے انگریزی، اردو اور ہندی میں اپنے اپنے طرز پر حقیقت کی نقاب کشائی شروع کی۔ اسی برطانوی سامراج کے دورِ تشدد میں اسی کتاب یعنی شاندار ماضی جلد چہارم نے اختصار

---

[1] یہ وہی ساورکر ہیں جو آخری دور میں تنگ نظر متعصب ہندو کی حیثیت سے مشہور ہوئے ابتدا میں پُرجوش انقلابی تھے۔ ان کی کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۰۱ء میں لندن میں شائع کی گئی جو ہندوستان میں پہنچتے ہی ضبط کرلی گئی۔

Marfat.com

واجمال کے ساتھ کچھ اشارے کنائے کئے تھے۔ مگر ساورکر کی کتاب نیز "بھارت[1] میں انگریزی راج" کی طرح "علماء ہند کا شاندار ماضی" بھی حبس و بندش کی نذر ہوا۔ کتاب ضبط۔ پریس ضبط مصنف گرفتار، اُس پر مقدمہ، جرمانہ، سزا۔ لیکن یہ جور و ستم کب تک؟ ؎

پنداشت ستم گر کہ جفا بر ما کرد
بر گردن او بماند و بر ما بگذشت

خدا کا شکر ہے، دوسری بار ۵۷ء (۱۹۵۷ء) آیا تو یہ تمام بندشیں داستانِ پارینہ بن چکی تھیں اور اب آفتابِ حقیقت کو حق تھا کہ جتنی تابانی کے ساتھ چاہے وہ درخشاں ہو۔ چنانچہ بے شمار کتابیں اور رسالے اُردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہوئے اور ہر ایک نے اپنے اپنے اسلوب اور انداز میں قربان ہونے والوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا، اور اُن کے ایثار و قربانی کے ترانے گائے۔

تصانیف کا سلسلہ اتنا وسیع ہوا، اور اس موضوع پر کتابوں کا شمار اتنا بڑھ گیا کہ "شاندار ماضی" کی ترتیب جدید میں اس حصّہ کی اشاعت فضول اور عبث معلوم ہونے لگی۔ "کما قیل"

سخن گرچہ دلبند و شیریں بود
سزاوارِ تصدیق و تحسیں بود
چو یک بار گفتی مگو باز پس
کہ حلوا چو یک بار خوردند بس

مگر قابلِ قدر تصانیف کی کثرت کے باوجود چند مسئلے ایسے تھے جن کی جستجو باقی رہی اور اس کے باوجود کہ ہر ایک شائع شدہ کتاب کا مطالعہ پورے ذوق و شوق سے کیا، توسنِ جستجو ناکام ہی واپس ہوتا رہا۔

---

[1] "بھارت میں انگریزی راج" پنڈت سُندر لال جی کی مشہور کتاب ہے جو تقریباً ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی اور فوراً ہی ضبط کر لی گئی۔

Marfat.com

تب ضرورت محسوس ہوئی کہ شاندار ماضی کی ترتیب جدید کو اس دَور کے تذکرہ سے محروم نہ کیا جائے۔ تاکہ وہ پہلو جو مصنّفینِ کرام سے نظر انداز ہو گئے ہیں اُن پر روشنی پڑ جائے، اور اس دَور کے رہنما بالخصوص علماء کرام کی خدمات کسی قدر تفصیل کے ساتھ سامنے آجائیں۔ وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْق۔

جلد چہارم کے ابواب

شاندار ماضی کے اس حصّہ میں باب کا عنوان تو آپ کہیں ملاحظہ نہیں فرمائیں گے البتّہ ذہنی ترتیب کے لحاظ سے یہ کتاب تین ابواب پر منقسم ہے:

۱: تحریک کی حیثیت، اُس کے وجوہ اور اسباب، اور اس کے متعلّق اعتراضات کے جوابات۔

۲: تحریک کے مرکز اور مجاہدینِ حریت کی جِدّ و جہد، پھر انتقامی کارروائیاں

۳: تحریک کے زعماء اور رہنما، اور ان کی خدمات۔

شکریہ

ع۱ اور ع۲ کے متعلّق مطبوعہ اور قلمی کتابوں سے مواد فراہم کیا گیا ہے۔ حاشیہ میں ہر ایک ماخذ کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ لیکن ع۳ یعنی زعماء تحریک کے تذکرہ کے لئے تصنیفات کے علاوہ بیانات سے بھی استفادہ کرنا پڑا ہے۔ یہ ناکارہ خادم اُن تمام احباب اور بزرگوں کا شکر گزار ہے جنہوں نے کسی بھی صورت سے اس مقصد میں مدد فرمائی۔ بہت سے حضرات نے معلومات فراہم کر کے کسی شخصیت کے متعلق مضمون مرتب کیا۔ جو روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے انڈیشن میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں ان مضامین سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ سب حضرات ہمارے شکریہ کے مستحق۔ اُن کے اسماء گرامی ان کے مضامین کے ساتھ

Marfat.com

ذکر کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ احقر خصوصیت سے مولانا عبدالشاہد خاں صاحب شیروانی، مصنف "باغی ہندوستان" کا شکر گزار ہے جنہوں نے احقر کے لئے وہ نایاب کتابیں فراہم کیں، جن کی جستجو سے دستِ طلب ناکام اور ماندہ ہو چکا تھا۔

مولانا عبداللہ خاں صاحب بجنوری بھی احقر کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ آپ نے سرسیدؒ کی مشہور مگر نایاب تصنیف "سرکشی اہلِ بجنور" کا قلمی نسخہ احقر کے لئے فراہم کیا۔

مولانا وحیدالدین صاحب قاسمی انچارج دفتر جمعیۃ علماء ہند کا بھی احقر شکر گزار ہے کہ آپ نے احقر کے لئے قلمی رسالے فراہم کئے۔ اور جہاں جو مضمون مناسب معلوم ہوا، خاص طور سے اس کو مہیّا فرما کر احقر کو ممنون فرمایا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس کتاب کی ترتیب کی سب سے بڑی تحریک آپ کی زیرِ لب فرمائش تھی، جس نے احقر میں آمادگی پیدا کی۔

فشکرھم اللہ ومن لم یشکر النّاس لم یشکر اللہ

Marfat.com

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اسباب[1] و وجوہات اور پس منظر

① اقتصادی وجوہات

پروفیسر باری کی مشہور کتاب "کمپنی کی حکومت" کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"ہندوستان میں مغلوں کی حکومت جاگیری نظام کا عروج تھی۔ جاگیری عہد کی تاریخ میں اتنی بڑی سلطنت کسی دوسری جگہ دکھائی نہیں دیتی۔

سترھویں صدی عیسوی کے آخری سالوں میں مغل حکومت نے دکن کی ریاستوں کو ختم کرنا چاہا۔ چنانچہ لمبی لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان لڑائیوں نے مفتوح کو کمزور اور فاتح کو کمزور تر کر دیا۔ چند سال بعد مغل سلطنت کی مرکزیت ختم ہو گئی[2]۔ دہلی ہی کے مونے پر ہندوستان میں

---

[1] یہ ایک پامال عنوان ہے۔ ہر ایک مصنف نے تفصیل سے اسباب و وجوہات بیان کئے ہیں۔ ہمارا منشا ان کا اعادہ کرنا نہیں ہے بلکہ کچھ اعتراض ہیں ان کے جواب دینے کے لئے یہاں تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔ [2] حقیقت اور واقعہ یہی ہے کہ یہاں عالمگیر کی وفات سے چند سال بعد مرکزیت ختم ہو گئی مگر سلطان عالمگیر کے حامی اس کا الزام عالمگیر کی بجائے اس کے نااہل جانشینوں پر لگاتے ہیں کہ وہ اپنے باپ دادا کی روایات کے خلاف کاہل متلون مزاج ناعاقبت اندیش ہوتے رہے۔ اگر ان میں صلاحیت ہوتی تو اکبر اور ہمایوں کی طرح وہ اس کمزوری کو دور کر سکتے تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ جب خود عالمگیر نے باپ سے بغاوت کر کے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو مغل شاہنشاہیت کمزور نہیں ہوئی تھی۔ مگر عالمگیر کے عزم استقلال نے

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

کئی ایک جاگیری ریاستیں قائم ہوگئیں۔ یہ ریاستیں دہلی سے تو کٹ چکی تھیں، لیکن عام طور پر اُسی نظام کی پیروی کر رہی تھیں جو صدیوں سے دہلی میں رائج ہو چکا تھا۔

ان ریاستوں نے پیدائش کی نئی نئی قوتوں کو دبائے رکھا۔ اس دباؤ سے ان ریاستوں کا جاگیری نظام بھی ٹوٹنے لگا۔

جب یہ جاگیری نظام ٹوٹ رہا تھا، تب انگریزوں نے ہندوستان کی سیاست میں دخل دیا۔

انگلستان میں جاگیری نظام ختم ہو چکا تھا۔ وہاں پیدائش کے نئے عناصر کارفرما تھے۔

انسانی تہذیب کی تاریخ میں ان عناصر نے خواہ کتنے ہی اہم نتائج پیدا کئے ہوں، وہ ہندوستان کی تسخیر میں سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں جن حکمرانوں کو آسانی سے شکستیں دیں وہ پرانے اور مٹتے ہوئے جاگیری نظام کے علم بردار تھے نئی معاشی قوتوں نے نہ صرف یورپ میں بلکہ ہندوستان میں بھی جاگیری نظام کو شکست دی۔

یورپی ملکوں میں اس نظام کو وہاں کے دیسی لوگوں نے ختم کیا۔ لیکن ہندوستان میں یہ نظام اجنبی ہاتھوں سے مٹا۔

اجنبی ہاتھوں نے اس نظام کو جہاں چاہا مٹا دیا اور جہاں چاہا اسے زندہ رکھا۔ اس مٹتی ہوئی جاگیر شاہی نے ۱۸۵۷ء میں انگڑائی لی۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کمزوری کے براعظم ختم کر کے مغل شاہنشاہیت کی رگوں میں ہمت و جرأت کا ایسا جوش کیا کہ منزل کے بجائے حدود مملکت دور دور وسیع ہوگئیں اور ہندوستان جو ایک ہزار سال سے بہت حصوں میں بٹا ہوا تھا، ایک مرکز کے ماتحت متحد ہوگیا

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] کمپنی کی حکومت ص ۳۵۶۔

Marfat.com

اگر آپ پروفیسر صاحب کی اس فاضلانہ تحریر کا خلاصہ معلوم کرنا چاہیں تو اُس کے مختصر الفاظ یہ ہوں گے :

(۱) یہ تحریک صرف ہنگامی شورش نہیں تھی جو چند شورہ پُشت اور سرکش فوجی افسروں کی ناراضگی سے پیدا ہو گئی تھی - بلکہ اس کی تہ میں ایسے اسباب موجود تھے جن کو نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی حالات کا تقاضا کہا جا سکتا ہے جن کا سلسلہ پوری دنیا ورنہ کم از کم ہندوستان اور بیدار مغز یورپ میں عرصہ سے چل رہا تھا۔

(۲) ہندوستان کے نظامِ کہن کو بدلنے میں انگریزوں نے عالمی حالات کی آڑ ضرور لی، مگر صرف معاش کی حد تک - ورنہ ان کا حقیقی نصب العین انگریزی شاہنشاہیت کا بقا اور تحفظ تھا - اسی وجہ سے سب جگہ اُن کا عمل یکساں نہیں رہا -

بلکہ بقول پروفیسر صاحب :

"جہاں چاہا اس نظام کو مٹایا اور جہاں چاہا زندہ رکھا"۔

(۳) اس رد و بدل کا لازمی نتیجہ تھا کہ بحرانی اور اضطرابی کیفیت پیدا ہو - چنانچہ پروفیسر صاحب کی رائے ہے :

"اس مٹتی ہوئی جاگیر شاہی نے ۱۸۵۷ء میں انگڑائی لی"۔

پروفیسر صاحب کا منشا یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کا یہ ہنگامہ محض وقتی نہیں تھا بلکہ ایک عرصہ سے اس کی چنگاریاں ہندوستانی جذبات کے خاکستر میں سُلگ رہی تھیں چنانچہ اسی سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں :

"لارڈ ڈلہوزی کے مستعفی ہونے کے بعد لارڈ کیننگ (۱۸۵۶-۱۸۶۲) کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا کمپنی کی مجلس نظامت نے لندن میں لارڈ کیننگ کو ایک الوداعی پارٹی دی - اس پارٹی میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ کیننگ نے کہا :

"میری خواہش ہے کہ میرا عہد حکومت پُرامن رہے لیکن میں اس

Marfat.com

بات کو نہیں بھول سکتا کہ ہندوستان کی فضا میں بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دکھائی دے گا، اتنا چھوٹا جتنا انسانی ہاتھ۔ لیکن یہ ٹکڑا اتنا بڑا ہوتا جائے گا کہ خود ہمارا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا۔"

پروفیسر صاحب اس پیشین گوئی کی تصدیق ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"اگلے سال بنگال آرمی کے فوجیوں نے بغاوت کر دی۔ انسانی ہاتھ اتنا بڑا بادل میرٹھ سے اُٹھا۔ بادل بڑا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ شمالی ہندوستان پر چھا گیا[1]"

پروفیسر صاحب نے کمیونسٹ نقطۂ نظر سے اس عظیم الشان ہنگامہ کی جو وجہ بیان کی ہے (یعنی مٹتی ہوئی جاگیر شاہی کی آخری انگڑائی) وہ ممکن ہے کسی خاص مفہوم کے ساتھ درست ہو سکے لیکن اس توجیہ کا یہ پہلو نظر انداز نہ ہونا چاہیئے کہ اس صورت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارپرداز جن کے خلاف یہ علمِ بغاوت بلند کیا گیا تھا، ہماری ہمدردیوں کے زیادہ مستحق قرار پاتے ہیں کیونکہ وہ جاگیر شاہی کے خلاف اصلاح پسندوں کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں، جن کا احترام ہر ایک انصاف پسند کو کرنا چاہیئے۔ بہت سے ان پر یہی الزام لگایا جا سکتا ہے کہ وہ نمائشی لیڈر کی طرح اپنے عمل میں اخلاص نہیں رکھتے تھے مگر یہ الزام ایسا ہے جس سے بہت ہی کم رہنما اور زعماء نجات پا سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی کے وہ رہنما جن کو کامیابی کے سہرے پہنائے گئے، اگر ان کی نیتوں اور ارادوں کا ایکسرے کیا جائے تو ایسی تعداد بہت ہی کم ہوگی جن کے جذباتِ حریت میں نمود و نمائش اور گندم نمائی و جَو فروشی کے دھبے نظر نہ آئیں۔

پروفیسر صاحب شاید بہادر شاہ ظفر، جنرل بخت خاں، نواب جھجر، راجہ بلب گڑھ مہارانی لکشمی بائی، کنور جگدیش سنگھ، عظیم اللہ صاحب، تانتیا ٹوپیا، نواب محمد علی اور نواب خان بہادر خاں وغیرہ کو صرف اس بناء پر ہمدردی کا مستحق قرار دیں کہ اُن پر ظلم

---

[1] کمپنی کی حکومت ص ۳۵۷

Marfat.com

بہت کہے گئے، اور تہذیب کی دعویدار قوم نے بربریت اور سفاکی کے وہ مظاہرے کئے کہ ہلاکو اور نادر شاہ کی روحیں بھی کانپ اُٹھیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ

(۱) اوّل تو ہر ایک جاگیردارانہ نظام کو ایک ہی حیثیت دینا، اور روس کی نفرت انگیز و تباہ کن جاگیر شاہی کی عینک سے ہر ایک جاگیردارانہ نظام کو دیکھنا، ایسی انتہا پسندی ہے کہ کوئی بھی منصف مزاج اس کی تائید و حمایت نہیں کر سکتا۔

خدا پنج انگشت یکساں نکرد

چنانچہ روس کے نظام جاگیر شاہی کے مظالم سے عوام یہاں تک آزردہ تھے، کہ کلیسا کو جاگیرداری کا ہم نوا دیکھا تو وہ کمیونزم کی حمایت میں نہ صرف کلیسا بلکہ مذہب سے بھی دست بردار ہو گئے۔

لیکن ہندوستان میں حالت اس کے برعکس تھی۔ ہندوستانی عوام ان اصلاح پسندوں کے مقابلہ میں اپنے پُرانے جاگیرداروں کے حامی تھے۔ انتہا یہ کہ وہ ان کو ختم کرنے کے لئے ہر ایک قربانی دینے کو تیار تھے جو اُن کے جاگیرداروں، مکھیاؤں، مُقدّموں اور گاؤں کے پٹیلوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

اس سلسلہ میں ایسے افسر کی شہادت سب سے زیادہ اہمیّت رکھتی ہے جو ہندوستانی نہیں بلکہ انہیں اصلاح کے دعویداروں کا ہم قوم، ہم وطن اور ہم مذہب ہے اور جو صرف تحریر یا تجویز کا شاہ نہیں بلکہ تجاویز کو عملی جامہ پہنانا اُس کے سُپرد ہے۔ یہ ولیم اڈوارڈس ہیں، جو اس ہنگامہ کے وقت ضلع بدایوں کے مجسٹریٹ تھے۔ ان کی تحریری شہادت ہے:

"ضلع میں ایسے بہت لوگ میرے دوست تھے جو مجھ کو پناہ دے سکتے تھے بلکہ یہ لوگ خود اس کے آرزو مند تھے۔ لیکن میرے ساتھ میرے بہت سے ساتھیوں کو بھی پناہ دے کر اپنے امن کو تذبذب میں ڈال دینا کسی طرح پسند نہیں کرتے تھے، خصوصاً اس سبب سے کہ ان میں بعض لوگوں نے ایسی زمینداریاں مول لی تھیں جو ہماری دیوانی عدالتوں کی ڈگریوں میں سختی کے ساتھ نیلام ہوئی

Marfat.com

تھیں اور اسی لئے ضلع کے لوگ اُن سے عداوت رکھتے تھے۔ پچھلے بارہ پندرہ برسوں میں ایسے نیلام بڑی کثرت سے ہوئے، اور تحصیل مال گذاری کے ایسے طریقے جاری ہوئے کہ مُلک کے رئیس لوگ برباد ہو گئے اور دیہات کے جتھے ٹوٹ گئے ..... اکثر ذی مرتبہ اور مقتدر خاندانوں کے علاقے فریب یا دغا بازی سے چھن گئے اور اجنبی لوگوں مثلاً مہاجنوں یا سرکاری ملازموں نے جن کا پاس و لحاظ یا دباؤ رعایا پر مطلق نہیں تھا، خرید لئے۔ یہ لوگ خود بھی اپنے خریدے ہوئے علاقوں سے علی الاکثر غیر حاضر رہا کرتے ہیں۔ یا تو وہاں رہنے سے ڈرتے ہیں یا وہاں کا رہنا ان کو خوش نہیں آتا۔ کیونکہ ان کو وہاں کے لوگ غاصب اور دخیلِ بے جا کی طرح دیکھتے ہیں۔ پھر ان چھنے ہوئے علاقوں کے مالکانِ قدیم اسی اراضی پر جو پہلے کبھی ان کی اپنی تھی کاشتکارانہ قابض ہیں اور اپنی حالت کا انقلاب ان کو نہایت رنج دہ ہوتا ہے۔ گو قبضہ مالکان اراضی اُن کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن رعایا کی محبّت اور ہمدردی پر ویسا ہی مستقل موروثی قبضہ رکھتے ہیں۔ جیسا ہمیشہ سے چلا آتا ہے، اور رعیت بھی آمادہ و متمنی ہے کہ جب کبھی ان کے مکھیا کھویا ہوا درجہ یا اپنے علاقوں پر قبضہ حاصل کرنے کا ارادہ کریں، ان کا ساتھ دے[1]۔ ایک برس بلکہ اس سے بھی آگے مَیں نے حکّامِ اعلیٰ سے صاف صاف بیان کر دیا تھا کہ دیوانی عدالتیں اپنے اختیارات بہت بُری طرح عمل میں لاتی ہیں اُن کا یہ طریقہ نہایت بے ٹھور ٹھکانے ہے کہ تھوڑے تھوڑے قرضوں کے لئے منافع و مرافق اراضی نیلام کرا ڈالتی ہیں اور اس سبب سے انتظامِ مُدن میں خطرناک ردّ و بدل پیدا ہوتا ہے۔ مَیں نے یہ بھی جتا دیا تھا کہ اگرچہ پُرانے خاندان جلد بے دخل کئے جا سکتے ہیں لیکن ہم پچھلی باتوں کی یاد تو نہیں مٹا سکتے یا اُن میں

---

[1] مصائب غدر صہ ۹ مطبوعہ نول کشور

Marfat.com

اور رعایا میں جو قدیم کا تعلق ہے اس کو تو ناپید نہیں کر سکتے۔ میں نے صاف صاف پوست کندہ کہہ دیا تھا کہ ہم جو ان لوگوں کے آپس کے روابط توڑ دینا چاہتے ہیں، اس کے برخلاف جب کبھی کوئی بلوہ ہو پڑا تو ہم پائیں گے کہ مالکانِ قدیم کا یہ بڑا اور دباؤ والا گروہ کہ اسی کے ذریعہ سے ہم لاکھوں آدمیوں کی دہقانی جماعتوں کو زیر اور مطیع کرنے کی اُمید رکھتے ہیں، ہمارے مقابلہ میں دشمن کی طرف اپنے موروثی ہمراہیوں اور ساتھیوں کو لئے صف باندھے ڈٹا ہوگا۔ میرے جتانے پر کچھ التفات نہ ہوا اور میں ڈرپوک سمجھا گیا کہ تم نے اب تک صرف ملکی صیغے میں نوکری کی ہے، معاملاتِ مالی میں بالکل ناآزمودہ کار ہو، اور اس باب میں رائے صائب نہیں دے سکتے۔"[1]

تشریح کے لئے سرسید مرحوم کی مشہور یادداشت (اسباب بغاوت ہند) کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

"قوانین ضبطی اراضیات لاخراج جس کا آخر قانون ۱۸۱۹ء ہے حکومتِ ہندوستان کو نہایت مضر تھا۔ ضبطی اراضیات نے جس قدر ناراض اور بدخواہ ہماری گورنمنٹ کا کر دیا تھا، اس سے زیادہ اور کسی چیز نے نہیں کیا تھا۔ سچ فرمایا تھا لارڈ منرو اور ڈیوک آف ولنگٹن صاحب بہادر نے کہ ضبط کرنا معافیات کا، ہندوستانیوں سے دشمنی پیدا کرنی اور اُن کو محتاج کر دینا ہے۔ میں نہیں بیان کر سکتا کہ ہندوستانیوں کو کس قدر ناراضگی اور دلی رنج اور ہماری گورنمنٹ کی بدخواہی اور نیز کتنی مصیبت اور تنگی معاش اس سبب سے اُن کو تھی۔ بہت سی معافیات صدہا سال سے چلی آتی تھیں جو ادنےٰ ادنےٰ حیلہ پر ضبط ہو گئیں۔ ہندوستانی صاف

---

[1] مصائب غدر ص ۱

Marfat.com

خیال کرتے تھے کہ سرکار نے خود تو ہماری پرورش نہیں کی بلکہ جو جاگیریں ہم کو اور ہمارے بزرگوں کو اگلے بادشاہوں نے دی تھی وہ بھی گورنمنٹ نے چھین لی۔ پھر ہم کو اور کیا توقع گورنمنٹ سے ہے۔"[1]

ضبطی جائداد کے ساتھ دوسرا قاعدہ نیلام زمینداری کا تھا۔ اس کے نتائج کے متعلق سید صاحب کی شہادت ہے:

"بعوض زر قرضہ نیلام حقیت کے رواج نے بہت سے فساد برپا کئے مہاجنوں اور روپیہ والوں نے دم دے کر زمینداروں کو روپے دیئے اور قصداً ان کی زمینداری چھین لینے کو بہت فریب برپا کئے اور دیوانی میں ہر قسم کے جھوٹے سچے مقدمات لگائے۔ اور قدیم زمینداروں کو بے دخل کیا اور خود مالک بن گئے۔ ان آفات نے تمام ملک کے زمینداروں کو ہلا ڈالا۔"[2]

"ابتدائے عملداری سے آج تک شاید کوئی گاؤں ایسا ہوگا جس میں تھوڑا بہت انتقال (ردّ و بدل) نہ ہوا ہو۔ ابتدا ابتدا میں ان نیلاموں نے ایسی بے ترتیبی سے کثرت پکڑی کہ تمام ملک اُلٹ پلٹ ہوگیا۔"[3]

مہاجنوں کا ذکر آیا ہے تو واقعہ کی صحیح تصویر نظر میں لانے کے لئے مسئلہ سود کا بھی صحیح خاکہ سامنے رکھئے۔

بے شک ہندوستان میں سود کا رواج ہمیشہ رہا۔ مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی وحشیانہ بھوک معمولی سود سے نہیں مر سکتی تھی۔ اُس نے سود در سود کا قانون بنایا جس کی "ٹھنڈی مار" نے تھوڑے ہی دنوں میں ہندوستان کا اقتصادی ڈھانچہ درہم برہم

---

[1] اسباب بغاوت ہند ص۲۵-۲۶۔ [2] ایضاً ص۲۸۔ [3] کیئے (KAY) نے بنگال کے ایک مقدمہ کا حوالہ دیا ہے جس میں چار روپیہ کی ڈگری کے عوض ایک جاگیر کے نیلام کا حکم دیا گیا تھا۔ (حاشیہ ص۱۷۸ بحوالہ ۱۸۵۷ء۔ از مولانا مہر)۔

Marfat.com

کر دیا۔ بڑے بڑے گھرانے ختم ہو گئے۔ ان کے سایہ میں پرورش پانے والے ہزاروں لاکھوں نفوس اناج کے ایک ایک دانہ کو محتاج ہو گئے، اور دولت کے یہ انبار یورپ کے ساہوکاروں یا اُن ہندوستانی مہاجنوں کی تجوریوں میں بند ہو گئے جن کے باورچی خانہ کا دُھواں بھی کسی کو نظر نہیں آسکتا تھا۔

زمینداری کی نوعیّت آج سوشلزم اور کمیونزم کے دَور میں زمینداری کا لفظ ایسا ناگوار ہو گیا ہے کہ کان اُس کے سُننے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں مگر واقعات کی کھود کرید کے وقت یہ نازک مزاجی کسی طرح بھی جائز نہیں۔

مظلوم کی داستان تو سُننی ہی پڑتی ہے خواہ آپ کو کتنی ہی ناگوار ہو۔ سر سیّد زمینداروں کے حامی نہیں ہیں۔ مگر جو بات حق ہے، اس کا اظہار وہ بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہے:

"اگر خیال کیا جائے تو ہندوستان میں ہر ایک محال زمینداری کا "ایک چھوٹی سی سلطنت" دکھائی دیتی ہے۔ قدیم سے (دستور ہے) کہ سب کی رضامندی سے ایک شخص سردار ہوتا ہے۔ وہ ایک بات تجویز کرتا تھا اور ہر ایک حقّیت دار کو بقدر اپنے حصّہ زمینداری کے بولنے کا اور دخل دینے کا اختیار ہوتا تھا۔ رعیّت باشندۂ دیہ (گاؤں میں رہنے والوں کے) چودھری بھی حاضر ہو کر کچھ کچھ گفتگو کرتے تھے۔ اگر کسی مقدمہ نے زیادہ طُول پکڑا، تو کسی بڑے گاؤں کے مُقدّم اور سردار کے حکم سے فیصلہ ہو گیا۔"

ہندوستان کے ہر ایک گاؤں میں بہت خاصی صورت ایک چھوٹی سلطنت اور پارلیمنٹ کی موجود تھی[1]۔"

زمینداری اور جاگیرداری کے دَور میں عدل و انصاف اور شہری حقوق کی ادائیگی

---

[1] اسباب بغاوت ہند ص۲۷

کی یہ ایک صورت تھی۔ دوسرا مسئلہ کہ خود اُن زمینداروں اور جاگیرداروں کا سُلوک اُن کے ساتھ جن کو رعایا کہا جاتا تھا، کیسا ہوتا تھا۔ تو سینکڑوں تاریخی مثالوں کی شہادت یہ ہے کہ زمیندار و رعایا، راجہ اور پرجا کا باہمی تعلق، محبّت و خیر خواہی پرورش اور وفاداری کا ہر دلعزیز رشتہ مانا جاتا تھا۔

بے شک یورپین نفع اندوزوں کی آمد کے بعد جب استحصال بالجبر، نفس پرستی، بے دردانہ قتل و غارت اور انسانی حقوق سے بے پروائی کے ناپاک تحفے جگہ جگہ تقسیم ہونے لگے، اور بے مروّتی، خود غرضی، محنت کشی نے سکّہ رائج الوقت کی حیثیت اختیار کر لی، تو کچھ زمینداروں اور جاگیرداروں نے بھی وہ ظلم و تعدّی اختیار کی جنکی مثالیں پیش کر کے موجودہ نسلوں کو اپنے پیش رو بزرگوں سے نفرت دلائی جاتی ہے۔ مگر اسی گئے گذرے دَور میں (جبکہ یورپین نفع اندوزوں کو قدم جمائے ہوئے ڈیڑھ سو برس گذر چکے تھے) وہ مثالیں بھی سامنے آتی ہیں جن کی شہادت یہ ہے کہ بادِ سموم کی تمام آتش انگیزیوں اور شعلہ افشانیوں کے باوجود رعایا پروری اور غربا نوازی کے چمن اب بھی بالکل خشک نہیں ہوئے تھے۔ محنت کش طبقہ کسی بھی عنوان سے جب اپنے زمینداروں اور جاگیرداروں کی پناہ ڈھونڈتا تھا تو یہ خزاں رسیدہ چمن اور گلشن تازگی اور آسودگی کی بخشش میں فراخ حوصلگی کی مردہ روایتیں زندہ کرنے میں کوتاہی نہیں کیا کرتے تھے۔ اس وقت "مُشتے نمونہ از خروارے" ہندوستان کے سب سے بڑے نامور جاگیردار بہادر شاہ کی سیر چشمی اور فراخ حوصلگی کی صرف ایک روایت جو دہلی کے دیہات میں مشہور ہے، پیش کی جا رہی ہے۔ ایک دہقان کی زبان سے سُنیئے۔

"غدر سے پہلے پُرانے قلعہ کی دھرتی میں باجرا بہت اچھا پیدا ہوتا تھا۔ یہ دھرتی ہمارے پاس تھی۔ ہم پر سرکاری لگان صرف یہ تھا کہ بادشاہ سلامت کے کبوتروں کے واسطے ہل پیچھے سوا سیر باجرا دینا پڑتا تھا۔

بوڑھے دہقان نے کہا۔ گوجروں کی قوم بہت شریر ہوتی ہے۔ ایک دفعہ

58865

Marfat.com

ہم لوگوں کے دل میں شرارت آئی۔ ہم نے سوچا کہ اس مرتبہ باجرے کو بھی گول کر جاؤ، اور بادشاہ سلامت کو کسی طرح پھسلا دو۔ بات یہ تھی کہ اس سال برکھا کچھ کم ہوئی تھی۔ اگر ہم ایسے ہی سیدھی طرح بادشاہ سلامت سے معافی مانگ لیتے تو لگان معاف ہو جاتا۔ مگر ہمیں چال سوجھی کہ ہم نے باجرے کی بالیں صفائی سے کاٹ لیں اور خالی پودے کھیتوں میں کھڑے رہنے دیئے۔ پھر سارے کسان لال قلعہ کے جھروکوں کے سامنے جمنا کی ریتی پر جا پڑے۔ اور بادشاہ سلامت کی دُہائی کا شور مچانے لگے۔ شور وغل کی آواز بادشاہ تک پہنچی تو جہاں پناہ نے خود جھروکوں میں آکر ہمیں درشن دیئے۔ "کیا بات ہے کیسا شور ہے"۔ جہاں پناہ کے ایک نقیب نے دریافت کیا۔

"سرکار ہم لُٹ گئے۔ کھاری باؤلی کے بنیوں نے باجرے کا بیج جانے کیسا دیا کہ پیڑ تو خُوب اُگ آئے۔ ہرے بھرے بھی خُوب ہیں لیکن بال ایک بھی نہیں آئی۔ اب ہم جہاں پناہ کے کبوتروں کا باجرا کیسے ادا کریں گے۔ اس سال لگان معاف کر دیا جائے"۔ کسانوں نے کہا۔

"اچھا کل کو ہم خود موقع پر پہنچ کر ملاحظہ کریں گے۔ پھر حکم دیں گے"۔ بادشاہ نے جواب دیا۔

"چنانچہ دوسرے دن شام کے وقت بادشاہ سلامت ہوادار پر سوار ہو کر پُرانے قلعے آئے۔ کھیتوں کو ملاحظہ فرمایا۔ وہاں کوئی بال چھوڑی ہوتی تو نظر بھی آتی۔ بادشاہ سلامت نے دُور ہی سے کھیتوں پر نظر ڈال کر فرمایا۔ اماں[1]! گوجروں کی فریاد ٹھیک ہے۔ کھاری باؤلی کے بنیوں نے بڑا دھوکا کیا۔ کل کو انہیں بُلواؤ۔ اچھا جاؤ، اس سال لگان معاف"۔

دہقان کا کہنا ہے کہ گاؤں کے سمجھدار مکھیا وغیرہ اس کھیل میں شریک نہیں تھے۔ وہ بخار کا

---

[1] بادشاہ کا تکیہ کلام تھا۔ ارے میاں کے بجائے اماں کہا کرتے تھے۔

Marfat.com

بہانہ بنا کر گھروں میں لیٹ گئے تھے۔ انہیں خیال تھا کہ بادشاہ سلامت ایسے بے وقوف نہیں ہیں۔ وہ جب پیڑ دیکھیں گے اصل بات سمجھ جائیں گے۔ پھر اُن کی خفگی جانے کیا رنگ لائے۔

بات بھی یہی تھی۔ بادشاہ سلامت ایسے بے وقوف نہیں تھے مگر یہ رعایا کا ناز تھا اور وہ ناز برداری اور رعایا پروری۔ سچ ہے، آدمی آدمی انتر ہے کوئی ہیرا ہے کوئی کنکر ہے۔

اسی دہقان کی ایک روایت اور بھی ہے کہ ایک سال بارش نہیں برسی کھیت سُوکھ گئے۔ غلّہ مہنگا ہو گیا۔ بادشاہ سلامت کے پاس لوگ فریاد لے کر گئے۔ پہلی مرتبہ بنیوں کو بُلا کر غلّہ کا ایک نرخ (ایک من فی روپیہ) مقرّر کر دیا۔ مگر کچھ دنوں بعد بنیوں نے اپنی مجبوری اور پریشانی کا اظہار کیا تو اب بادشاہ سلامت نے نماز استسقاء کا فیصلہ کیا۔ عام اعلان ہو گیا کہ کل کو صبح کے وقت عیدگاہ پر نماز استسقاء ہو گی۔ شہر کے تمام چھوٹے بڑے امیر غریب، ہندو مسلمان عیدگاہ پہنچے۔ بادشاہ اور بیگم بھی معمولی لباس میں عیدگاہ پہنچے۔ نماز پڑھی گئی۔ بادشاہ سلامت نے رونا شروع کیا تو ساری مخلوق کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔

دل کا فغاں اور آنکھوں کے آنسو ابھی ختم نہیں ہوئے تھے کہ بقول دہقان:

"پھر جو کالی کالی، بھوری بھوری گھٹا اُٹھ کر برسنی شروع ہوئی تو لوگوں کو گھر پہنچنا مشکل ہو گیا۔"[1]

بادشاہ سلامت اچھے تھے یا بُرے، بادشاہ بیگم کا کردار کیا تھا۔ ان سب سے قطعِ نظر یہ ہمدردی اور وطن کے دُکھی انسانوں سے یہ میل جول وُہ جوہر ہے جو اس جاگیرداری میں کمیاب نہیں تھا جس کا شکوہ کیا جا رہا ہے۔

○ علاوہ ازیں تاریخِ انسانیت کے اس یادگار حادثہ کو صرف جاگیرداروں کا رقصِ بسمل قرار دینا، اگر قصد و ارادہ سے ہے تو تاریخ کے حق میں بہت بڑی خیانت ہے۔ اور ایک ایسی چشم پوشی ہے جو مورّخ کے لئے کبھی بھی جائز قرار نہیں دی جا سکتی۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے دَورِ تسلط میں جاگیرداری سے

---

[1] افسانۂ غم۔

Marfat.com

کہیں زیادہ صنعت و تجارت کو برباد کر دیا تھا، اور وہ ہندوستان جو علوم و فنون میں تمام دنیا سے فائق، فراوانیِ دولت میں سونے کی چڑیا، خوش حالی میں رشکِ ارم، راحت و آرام میں جنت نشان مانا جاتا تھا، اس کو انتہائی بے دردی اور خود غرضی سے تباہ کاری اور غارت گری کا تختۂ مشق بنا کر اتنا برباد کر دیا تھا کہ اب وہ علم و ہنر سے تہی دامن، قحط زدہ، فاقہ مست، کاشتکاروں اور بے ہنر مزدوروں کا ویران خانہ بن کر رہ گیا تھا۔ کہیں کہیں کوئی شمع باقی رہ گئی تھی تو ہسٹنگز اور ڈلہوزی جیسے ستم ایجاد گورنروں کی پھونکیں ان کو بھی بجھا چکی تھیں یا بجھا رہی تھیں۔ تاریخِ ہندوستان کی یہ الم ناک حقیقتیں اتنی واضح ہو چکی ہیں کہ تحریر کی ضرورت نہیں۔ عیاں راچہ بیاں۔

تفصیلات اگر مطلوب ہوں تو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ نے نقشِ حیات جلد اوّل میں اور مولوی سید طفیل احمد صاحب مرحوم علیگ نے حکومتِ خود اختیاری اور روشن مستقبل میں اردو خواں حضرات کے لئے کافی ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔

ہم سر سید مرحوم کے ایک دلچسپ فقرہ پر اس باب کو ختم کرتے ہیں:

"اہلِ حرفہ کا روزگار بسبب جاری اور رائج ہونے اشیاء تجارتِ ولایت کے بالکل جاتا رہا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی سوئی بنانے والے اور دیا سلائی بنانے والے کو بھی نہیں پوچھتا تھا۔ پارچہ بافوں کا تار تو بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ اسی وجہ سے سب سے زیادہ اس ہنگامہ میں یہی لوگ گرم جوش تھے[1]۔"

(۳) مزید برآں جاگیر شاہی کا جو کچھ بھی خاتمہ ہوا تھا وہ اس لئے نہیں کہ اس نو وارد اُمّت کو جاگیرداری سے نفرت تھی۔ شاہنشاہیت نواز اور سامراج پرست قوم جاگیرداری سے کس طرح نفرت کر سکتی ہے۔ بلکہ صرف اس لئے تھا کہ:

---

[1] اسباب بغاوت ہند ص۳۶

Marfat.com

الف : ہر ایک جاگیر اور ریاست کے ختم کرتے وقت ان سفید درندوں کے ہاتھ جس طرح لُوٹ مچاتے تھے، اس میں لاکھوں کروڑوں روپیہ کا فائدہ شخصی طور پر خود ان مہذّب غارت گروں کا ہوا کرتا تھا۔

ب : پُرانی جاگیر شاہی ختم کر کے نئی جاگیر شاہی اور اجارہ داری قائم کی جائے جس میں زیادہ سے زیادہ نفع ان سامراج پرستوں اور اُن کے ہم وطنوں کا ہو جس کے عشرت کدوں میں دولت و ثروت کے انبار لگانے کے لئے یہ تمام کھیل کھیلا جا رہا تھا اور غارت گری کی یہ مشق کی جا رہی تھی۔

انگریزوں کی تنخواہوں اور بھتوں کا جائزہ لیجئے اور یہ بھی یاد رکھئے کہ تحصیل داری یا ڈپٹی مجسٹریٹی سے آگے کسی ہندوستانی کو کوئی عہدہ نصیب نہیں ہو سکتا تھا اور جو عہدہ بھی ہندوستانیوں کو عطا کیا جا سکتا تھا، اُس میں انگریزوں کی تنخواہ دس گُنے تک زیادہ ہوتی تھی۔ یعنی ہندوستانی کو اگر سَو روپے دیئے جاتے تھے تو اسی پوسٹ پر انگریز کی تنخواہ پانچ سو، سات سو اور کبھی ایک ہزار تک ہوتی تھی۔ اس جائزے کے بعد سر سیّد مرحوم کی یہ شہادت بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ ضبطی معافیات وغیرہ سب اس لئے تھا کہ حکومت کا یہ غیر معمولی خرچ چلایا جا سکے، جو انگریز کے لئے "گنج بخش" تھا ــــ اور ہندوستانی کے لئے محض "فاقہ شکن"۔

> پس یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کا یہ خونین حادثہ ــــــ مٹی ہوئی جاگیر شاہی کی انگڑائی نہیں بلکہ ایک قوم کی بڑھتی ہوئی جاگیر شاہی کے مقابلہ میں دوسری قوم کی حرکتِ مذبوحانہ تھی۔

> ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
> وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یہ بحث طویل ہے۔ اس کا ہر ایک گوشہ ایک داستان رکھتا ہے۔ تنخواہوں کا تفاوت، مال گذاری کا اضافہ، وصولی مال گذاری کے لئے جائدادوں کا نیلام نیلام کے

Marfat.com

دل آزار اور توہین آمیز طریقے، سود اور سود در سود کا رواج وغیرہ۔ غرض ہر ایک باب داستانِ الم ہے۔ اسی سلسلہ کا ایک مستقل باب، دوامی اور عارضی بندوبست بھی ہے۔

ایک مؤرخ کی حیثیت سے اگر تفصیلات تلاش کرنا چاہیں تو وہ شیخ الاسلام قدس سرہٗ کا "نقشِ حیات" جلد اوّل، مولوی سیّد طفیل احمد صاحب (علیگ) کی "حکومتِ خود اختیاری اور روشن مستقبل" وغیرہ ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں بندوبست کے سلسلہ میں سرسیّدؒ کا ایک تاریخی نوٹ قابلِ مطالعہ ہے۔ وہ اگرچہ کسی قدر طویل ہے مگر اس کو پیش نہ کرنا بھی ایک قسم کا بخل ہے جو حقیقت کے متلاشی کے لئے درست نہیں۔

سرسیّد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"بندوبست مال گذاری جو ہماری گورنمنٹ نے کیا، نہایت قابل تعریف ہے۔ مگر اگلے بندوبستوں کی نسبت سنگین ہے۔

اگلی عملداریوں میں بطور خام تحصیل مال گذاری لی جاتی تھی شیر شاہ[1] نے پیداوار کا ایک تہائی حصّہ گورنمنٹ کے لئے مقرر کیا تھا۔ کچھ شک نہیں کہ اس طریقہ میں بہت مشکلیں[2] تھیں اور گورنمنٹ کو نقصان متصوّر تھا

---

[1] اسلام کی فیاضی اور غریب نوازی ملاحظہ فرمائیے کہ اس نے عشر اور نصف عشر کی تعلیم دی ہے یعنی بارش کی زمینوں پر پیداوار کا دسواں حصّہ، اور جو زمینیں کنویں اور تالاب وغیرہ سے سیراب کی جائیں جن کی آبپاشی پر رقم خرچ کرنی پڑے، اُن کی پیداوار پر بیسواں حصّہ یعنی اگر سو من پیداوار ہے تو پہلی صورت میں دس من اور دوسری صورت میں صرف پانچ من غلّہ واجب ہوگا۔ البتہ جو اراضی خراجی ہیں اُن کا محصول آپس کے مشورہ سے طے ہوگا۔ جس میں کاشتکاروں اور مزارعین کی رائے کو پورا دخل ہوگا۔ ہندوستان کی زمین خراجی مانی گئی ہے۔ اس لئے شیر شاہ کا یہ فعل جائز قرار دیا جائے گا کہ عشر کی بجائے ثلث مقرر کیا۔ محمّد میاں۔ [2] دنیاوی حکومتوں کے نزاکت مآب حکام ان مشکلات کو اپنے بجائے کاشتکاروں اور زمینداروں پر ڈال دیتے ہیں مگر اسلامی تعلیم یہ ہے کہ اس قسم کی مشکلات برداشت کرنا حکومت کے کارپردازوں کا فرض ہے۔ البتہ اسلامی تعلیم یہ بھی ہے کہ اگر یہ فرض دیانت داری اور خوش اسلوبی سے انجام دیا جاتا رہا تو دیانت دار کارپرداز کو اللہ کے یہاں "مجاہد" کا درجہ ملتا ہے۔ محمّد میاں

Marfat.com

مگر کاشتکار سب آباد رہتے تھے۔ کسی کو ٹوٹا دینا نہ پڑتا تھا"۔ اکبر اوّل" نے اسی بندوبست کو (یعنی پیداوار کا تہائی حصّہ لینا) پسند کیا اور اسی کو جاری کیا۔ مگر بندوبست پختہ کر دیا۔ جس کا ذکر لارڈ انفسٹن صاحب کی عمدہ تاریخ میں مندرج ہے، اور آئینِ اکبری میں بھی اس کا بیان ہے۔ اکبر نے اقسام زمین کے مقرّر کئے۔ اوّل قسم کی زمین کا نام "پولج" تھا اور ہر سال بوئی جاتی تھی۔ برابر مال گذاری کا حصّہ لیا جاتا تھا۔ دوم قسم کی زمین جس کا نام "پڑوتی" تھا۔ اس زمین سے انہیں سالوں کے بابت مال گذاری لی جاتی تھی جس میں وہ کاشت ہوئی تھی۔ سوم قسم کی زمین جس کا نام "چچر" تھا اور تین چار برس سے بے تردّد ہوتی تھی، اور اس کی درستی کے لئے خرچ بھی درکار ہوتا تھا۔ اوّل سال زراعت میں پچدو لیا جاتا تھا اور پھر بڑھتا جاتا تھا۔ یہانتک کہ پانچویں میں پورا ہوتا تھا۔ چہارم قسم کی زمین جس کا نام "بنجر" تھا، اور پانچ برس سے زیادہ سے بے تردّد پڑی تھی اور ملائم شرطیں تھیں۔ اس خام بندوبست کا نقدی سے بدلنا اس طرح پر تھا کہ پیداوار ہر بیگھہ کی اور ہر قسم کی زمین کی اوسط کے حساب سے غلّہ کے وزن پر نکالی جاتی تھی۔ مثلاً بیگھہ پیچھے نو من غلّہ کی پیداوار نکالی۔ تین من غلّہ اس بیگھہ کا کاشتکار سے لینا حصّہ گورنمنٹ ٹھیر گیا۔ پھر اوسط نرخ ناموں سے غلّہ کی قیمت قرار دی گئی۔ وہ نقدی اس بیگھہ کی ٹھیر گئی۔ پھر اس میں بڑی رفاہ یہ تھی کہ اگر کاشتکار بعوض نقدی گرانی سمجھ کر تین من غلّہ دے دے تو اُس کو اختیار تھا۔ سرکاری بندوبست میں اُن میں سے بہت سی باتوں کا خیال نہیں رہا۔ اُفتادہ زمین پر برابر محصول لگ گیا۔ جن زمینوں کا زور بڑھانے کو کچھ دنوں اُفتادہ رکھنا تھا، اُن میں منہائی نہیں ہوئی۔ ہر سال برابر جوتے جانے سے زور کم ہو گیا، پیداوار کم ہونے لگی۔ جو حساب بندوبست کے وقت لگایا تھا، وہ نہ رہا۔ اکثر اضلاع میں ہر ایک

Marfat.com

بندوست سخت ہوتا گیا۔ زمینداروں کاشتکاروں کو نقصان عائد ہوئے رفتہ رفتہ بے سامان ہوگئے۔ زراعت کا سامان بہت کم ہوگیا، اور اس سبب سے جو زمین کاشت کرتے تھے، وہ جیسا کہ چاہیئے کمائی نہ گئی۔ اس سبب سے بھی کمی پیداوار کی ہوئی۔ ادائے مال گذاری کے لئے وہ قرض دار ہوئے۔ سود قرضہ زیادہ ہونے لگا۔ بہت سے زمین دار مال گذار جو بہت اچھا اور معقول سامان رکھتے تھے مفلس ہوگئے۔ جن دیہات میں افتادہ زمین سوا تھی، وہ اور زیادہ خراب ہوگئی۔ آنریبل ٹامسن صاحب بہادر اپنے ہدایت نامہ کی دفعہ ۶۴ میں لکھتے ہیں کہ آئین نہم ۱۸۳۳ء کے بندوبست میں علی العموم یہ بات نظر آتی ہے کہ اچھی دیہات کی جمع کچھ نرم تجویز ہوئی، اور خراب دیہات کی جمع سنگین ہوگئی۔ زمینداروں کی ناجائز منفعتیں جاتی رہیں۔ اگرچہ یہ بات بہت اچھی تھی مگر بندوبست کے وقت اس کی رعایت چاہیئے تھی۔ غرض کہ ان اسباب سے زمینداروں اور کاشت کاروں کو مفلسی نے گھیر لیا تھا۔ جس کے سبب باوجود اس امن و آسائش کے جو زمینداروں کو تھی، اُن کے دل سے پچھلی عملداریوں کی یاد بھولتی نہ تھی۔"

(اسباب بغاوت ہند ص۲۸ تا ص۳۰)

خاتمہ بحث اور خلاصہ اقتصادیات کے سلسلہ میں بحث بہت طویل ہوگئی ہے۔ اب ہم اس کو ختم کرتے ہیں، اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کے الفاظ میں اس بحث کا خلاصہ بھی پیش کر دیں۔ تاکہ اندازہ ہوسکے کہ وہ ہندوستانی جو نہ جاگیردار تھے، نہ معافی دار یا سرمایہ دار، اُن کے تاثرات کیا تھے اور وہ کس درجہ اس آنے والی بدنشی حکومت سے نالاں ہوچکے تھے۔

"ہندوستان کی رعایا روز بروز مفلس ہوتی جاتی تھی۔ ٹیکس کی زیادتی نے زمینداروں اور کاشت کاروں کو تباہ کر دیا تھا۔ بقایا وصول کرنے کے لئے

Marfat.com

زمینداریاں نیلام کرائی جاتی تھیں۔ جو ہندوستان میں بالکل نیا دستور تھا۔ ولایتی مال کی آمد نے اہلِ حرفہ کو برباد کر دیا تھا۔ بایں ہمہ حکومت نے پرامیسری نوٹ جاری کر دیئے جس پر ملک سے سود وصول کیا جاتا تھا اگلی عملداریوں میں شاہی انعام و اکرام آسودگیِ رعایا کا ایک مستقل ذریعہ تھا جب شاہجہاں تخت پر بیٹھا تو صرف تخت نشینی کے دن چار لاکھ بیگہ زمین اور ایک سو بیس گاؤں اور لاکھوں روپے انعام دیتے تھے۔ یہ بات ہماری گورنمنٹ میں یک قلم مسدود تھی۔ بلکہ پہلی جاگیریں بھی ضبط ہو گئی تھیں۔ اس عام افلاس کا نتیجہ تھا کہ جب باغیوں نے لوگوں کو نوکر رکھنا چاہا تو جیسے بھوکا آدمی قحط کے دنوں میں اناج پر گرتا ہے اسی طرح یہ لوگ نوکریوں پر جا گرے۔ بہت سے آدمی صرف آنہ یومیہ پر نوکر ہوتے تھے۔ اور بہت سے آدمی سیر ڈیڑھ سیر یومیہ اناج پاتے تھے۔[1]

آخر میں سر سید مرحوم نہایت جوش سے لکھتے ہیں:

"غرض کہ ملک ہر طرح سے مفلس ہو گیا تھا۔ اگلے خاندان جن کو ہزاروں کا مقدور تھا، معاش سے بھی تنگ آ گئے تھے، اور یہ اصلی سبب ناراضگیِ رعایا کا گورنمنٹ سے تھا۔

لوگوں کے دل جو تبدیلیِ عملداری کو چاہتے تھے اور نئی عملداری کیلئے راغب اور دل سے اُس سے خوش تھے، مَیں سچ کہتا ہوں کہ اسی سبب سے تھے۔ ہم سچ کہتے ہیں اور پھر ہم سچ کہتے ہیں کہ ہم بہت سچ کہتے ہیں، کہ جب افغانستان، سرکار نے فتح کیا تو لوگوں کو بڑا غم ہوا۔ کیا سبب تھا؟

صرف یہ سبب تھا کہ اب مذہب پر اعلانیہ دست اندازی ہوگی جب گوالیار فتح ہوا، پنجاب فتح ہوا۔ اودھ لیا گیا تو لوگوں کو کمال رنج

---

[1] اسباب بغاوت ہند ص ۳۶-۳۲

ہوا۔ کیوں ہوا ؟

اس لئے ہوا کہ ان پاس کی ہندوستانی عملداریوں سے ہندوستانیوں کو بہت آسودگی تھی۔ نوکریاں اکثر ہاتھ آتی تھیں۔ ہر قسم کی ہندوستانی اشیاء کی تجارت بکثرت تھی۔ ان عملداریوں کے خراب ہونے سے زیادہ سے زیادہ افلاس اور محتاجی ہوتی جاتی تھی"[1]

عدل و انصاف پر ٹیکس چند قوانین برخلافِ رواج اور مخالف طبیعت ہندوستانیوں کے صادر ہوئے جس کی وجہ سے رعایا ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر یا شہد کی چھری یا ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی اور سمجھتی تھی کہ ہم آج گورنمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں، اور کل ہیں تو پرسوں نہیں۔ اور پھر اس پر اضافہ یہ ہوا کہ باوجود ہندوستانیوں کی مفلسی کے عدالت کی چارہ جوئی پر اسٹامپ لگا دیا گیا جو ناقابلِ برداشت تھا۔[2]

(۴) درست ہے، بہادر شاہ کی خاندانی سلطنت ختم ہو رہی تھی۔ واجد علی شاہ کی ریاست چھین لی گئی تھی۔ اسی طرح تانتیا ٹوپی، کنور سنگھ، مہارانی لکشمی بائی وغیرہ بھی زخم خوردہ تھے۔ مگر کیا اُن کے دلوں کا اپریشن کر کے دیکھ لیا گیا ہے کہ اس وقت کی تمام جدّ و جہد صرف اپنی ریاستوں اور جاگیروں کے لئے تھی، اور اس میں کوئی بھی جزو اس ہمدردی اور غمخواری کا نہیں تھا جس میں پورا ہندوستان مبتلا تھا۔

بہادر شاہ کے متعلق تو یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ وہ نہ اس تحریک کے بانی تھے، نہ اُن کو پہلے سے اس کی خبر تھی۔ وہ صرف نام کی بادشاہی کو غنیمت سمجھ کر کمپنی کی پنشن پر قناعت کئے ہوئے تھے، اور اپنی اولاد کے لئے اس سے بھی صبر کر چکے تھے۔ اُن کا مشہور شعر اس کی شہادت ہے ؎

اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظامِ سلطنت
بعد تیرے نے ولیعہدی نے نظامِ سلطنت

---

[1] اسباب بغاوت ہند ص ۳۶-۳۷۔ [2] اسبابِ بغاوتِ ہند بحوالہ روشن مستقبل ص ۲۶۲

Marfat.com

ستم رسیدہ فوجی جب بہادر شاہ کی دُہائی دیتے ہوئے اُس کے دیوانِ خاص میں گھُس آئے، تو باوجودیکہ بوڑھے بادشاہ کے اس یقین میں کوئی فرق نہیں آیا تھا کہ نتیجہ ناکامی اور خاندانِ تیمور کی آخری تباہی ہے[1]۔ مگر رعایا سے محبت جو اس خاندان کے خمیر میں گُندھی ہوئی تھی، یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ رعایا تباہ و برباد ہو اور بادشاہ آنکھ بند کئے رکھے[2]۔ محبتِ خلق اور ہمدردیِ اہلِ وطن کے اسی جذبہ نے تیموری خون میں حرارت پیدا کی۔ رگِ حمیّت پھڑکنے لگی اور چار و ناچار بہادر شاہ نے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

پس اگر اس ہمدردی اور فریاد رسی کا نام "جاگیر شاہی کی انگڑائی" ہے، تو یہ انگڑائی بہت مبارک۔ اور کمیونزم کا فیصلہ کچھ بھی ہو مگر ایشیائی فطرت تو یہ ہے کہ ایسی انگڑائیوں میں جو بربادی آئے وہ آبادی ہے اور جو موت آئے وہ سراسر زندگی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شُد بعشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

رہے واجد علی شاہ، تو اگرچہ وہ ایک سال پہلے ہی معزول کر دیئے گئے تھے،

---

[1] ہمارے محترم شمس العلماء ذکاء اللہ خاں تحریر فرماتے ہیں۔ بادشاہ کا دم تو پہلی ہی جون کو نکلنے لگا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو بُلا کر کہا "میرا کہنا یاد رکھو، انگریز ایک دن آکر تم کو پھانسی دیں گے اور میرا حال یہ ہوگا کفن پہن کر زندگی کے ایام کسی باغ میں گذران دوں گا۔ (تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۹۷)

[2] یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ مظلوم فوجیوں نے بادشاہ کی طرف رجوع کیا، بلکہ انگریزی حکومت دہلی کے ذمہ دار رکن "تھیونلسن مٹکاف" جوائنٹ مجسٹریٹ دہلی کا بیان ہے کہ "جب خوف ناک بلوے ظہور میں آجاتے تھے، جیسا کہ وہ واقع ہوتے رہتے تھے تو اس وقت عوام بادشاہ کی طرف رجوع ہوتے تھے۔ تاکہ انگریزی حکّام سے انہیں پناہ مل جائے۔ ایک دفعہ بلوے کے موقع پر اسسٹنٹ ریزیڈنٹ نے لکھا تھا کہ مجھے یقین ہے کہ یہ بلوہ کبھی وقوع پذیر نہ ہوتا، اگر لوگوں کو توقع نہ ہوتی کہ بادشاہ انہیں بچالے گا جیسا کہ انہوں نے بالآخر بچالیا۔ (غدر کی صبح شام ص۲۵)۔

Marfat.com

اور اس موقع پر واجد علی شاہ نے نہیں بلکہ اُن کی بیگم "حضرت محل" اور اُن کے سب سے چھوٹے لڑکے "برجیس قدر" نے تحریک میں حصّہ لیا تھا (جس کا تذکرہ دوسرے موقع پر آئے گا) لیکن واجد علی شاہ کی سیاسی زندگی سے اُن کی بیگم اور لختِ جگر کے ارادوں کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے۔ واجد علی شاہ کے متعلق خود پروفیسر باری صاحب کی شہادت یہ ہے:

"واجد علی نے ولی عہدی کا زمانہ عیش و عشرت میں صرف کیا لیکن تخت پر بیٹھتے ہی وہ ملکی انتظامات میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ واجد علی اپنی فوج کی تربیت پر اپنا بہت سا وقت صرف کرتا تھا ایسٹ انڈیا کمپنی اسے برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

۳۲ سال کی عمر میں اُسے کلکتہ میں جلاوطن ہونا پڑا۔ جہاں اُس نے ۱۸۸۷ء میں وفات پائی۔[1]

اودھ کا آخری تاجدار واجد علی شاہ، عربی، فارسی اور اُردو کا فاضل تھا[2]۔ اُس نے اُردو میں کئی کتابیں لکھیں۔ اُسے تاریخ سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ اودھ کی فوجی طاقت کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے اختری پلٹن اور نادری پلٹن بنائی۔ واجد علی شاہ نے لکھنؤ میں "سُلطانی پریس" قائم کیا۔ دیوانی اور فوجداری مقدموں کی مزید سماعت کے لئے ہائی کورٹ قائم کیا۔ حفظانِ صحت کا الگ محکمہ قائم کیا تھا۔

---

[1] کمپنی کی حکومت ص۲۱۷۔ [2] اسی طرح بھاکا اور سنسکرت میں بھی شعر کہتا تھا اور ان زبانوں کی مناسبت سے اپنے تخلّص میں یہ تبدیلی کی تھی کہ اختر کے بجائے اکھتر لکھتا تھا۔ خود بادشاہ کا بیان ہے تخلص خود اختر میدارم۔ در تصانیف اردو و فارسی احتیاج تبدیل نمودنش نبود مگر در تصنیف ہذا کہ مملو از زبانِ ہندی و بھاکا و سنسکرت است بناچاری بجائے خاء معجمہ کاف عربی را معین نمودم تا در لہجہ و زبان ہندوی و بھاکا و سنسکرت بے ربط نہ شود پس ہر جا کہ لفظ اکھتر با کاف عربی در اواخر انترا یعنی مصرع دوم یافتہ شود تخلص راقم ست۔ ("ناجو" بحوالہ تاریخ اودھ جلد ۵ ص۱۱۱)

Marfat.com

دستوراتِ واجدی کے نام سے ایک عدالتی رسالہ شائع ہوتا تھا۔ واجد علی شاہ کے عہدِ حکومت میں لکھنؤ ہندوستان کے تمام شہروں میں ترقی یافتہ اور مرفّہ الحال تھا۔ شہر کے وسطی حصّہ میں گھنی آبادی تھی۔ خاص سڑکوں کے مناظر بہت دلکش تھے۔ لوگ شاہانہ لباس پہن کر گھر سے نکلتے تھے۔ سارا شہر ایک تصویر نظر آتا تھا[1]۔"

مرزا معین الدین حسن خاں اپنے روزنامچے میں تحریر فرماتے ہیں:

"جب ۱۸۴۷ء میں شاہ لکھنؤ امجد علی شاہ بادشاہ کا انتقال ہوا، تو شاہ واجد علی اُن کے جانشین مقرر ہوئے۔ انہوں نے فوج کو از سرِ نو مرتب کرنا شروع کیا۔ احکام نافذ کئے گئے کہ لکھنؤ کی تمام پلٹنیں روزانہ صبح کے پانچ بجے پریڈ کیا کریں گی۔ بادشاہ خود پریڈ کے موقع پر کمان کرتے تھے اور جنرل کی وردی زیب تن فرماتے تھے۔ وہ روزانہ چار پانچ گھنٹے تک فوج سے ڈرل کرایا کرتے تھے۔ مزید برآں انہوں نے حکم نافذ کرا رکھا تھا کہ اُمورِ سلطنت کی ضروریات کے سوائے اگر کبھی وہ خود غیر حاضر ہو جایا کریں گے تو وہ دو ہزار روپے جرمانہ ادا کیا کریں گے۔ جسے لکھنؤ کی فوج میں تقسیم کرایا جایا کرے گا۔ اتنا ہی جُرمانہ اس پلٹن سے وصول کیا جاتا تھا جو پریڈ میں دیر سے آتی تھی۔ (ص۲۵ غدر کے صبح و شام)۔

(۲) تہذیب برباد اور مذہب کے لئے خطرہ

"فلسفۂ کارل مارکس" ہر ایک انقلاب کا محرک اقتصادی مسائل قرار دیتا ہے۔ اُسے مذہب کے چلمن میں بھی اقتصادی تقاضے ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور تہذیب خود ایک محرک ہے اور ایسا طاقت ور جذبہ ہے جو انسان کو ہر ایک قربانی پر آمادہ

---

[1] کمپنی کی حکومت ص۲۱۸

Marfat.com

کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ موت کو حیات اور فنا کو بقا سمجھنے لگتا ہے۔

مذہب بسا اوقات ذاتی رجحانات کا نتیجہ ہوتا ہے، اور تہذیب کو انسان اپنا خاندانی اور آبائی ترکہ تصور کرتا ہے۔ جس طرح موروثی جائداد کی حفاظت کے لئے جان ہتھیلی پر لئے رہتا ہے، اسی طرح حفاظتِ تہذیب کے لئے بھی وہ ہمیشہ کفن بردوش رہتا ہے۔

اس ہنگامہ کے پس پردہ مذہبی اور تہذیبی تقاضے بھی اتنے شدید تھے کہ ہندوستانی اگر ۱۸۵۷ء کی یہ قیامت برپا نہ کرتے، تو فطرتِ انسانی کا فیصلہ ان کے خلاف نہایت سخت ہوتا۔

بے شک وہ ناکام ہوتے، مگر اُن کو معذرت کا موقع مل گیا کہ:

مقابلہ تو دل ناتواں نے خُوب کیا

سرسید مرحوم کو مذہبی اعتبار سے وسیع المشرب کہا جاتا ہے اور تہذیب کے لحاظ سے ان کی آزادی یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ آخر عمر میں تو ایشیائی تہذیب کے بجائے یورپین تہذیب کے داعی اور مناد بن گئے تھے۔ یہی سرسید اس بغاوت کے اسباب میں جو مذہبی اور تہذیبی خطرات بیان کرتے ہیں وہ یقیناً قابلِ مطالعہ ہیں، اور ظاہر ہے اس بارہ میں سرسید کی شہادت قطعاً غیر جانبدارانہ ہوگی —— اور اُن کی شہادت سے زیادہ مستند کسی کی شہادت نہیں ہوسکتی۔

مداخلتِ مذہبی اور رسم و رواج (تہذیب) کے لئے خطرات

کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل و قابل، اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے تھے، کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو، کیا ہندو کیا مسلمان، عیسائی مذہب اور اپنے ملک کے رسم و رواج پر لا ڈالے۔ اور سب سے بڑا سبب اس سرکشی میں یہی ہے۔

ہر شخص دل سے جانتا تھا کہ ہماری گورنمنٹ کے احکام بہت آہستہ آہستہ ظہور میں

Marfat.com

آتے ہیں، اور جو کام کرنا ہوتا ہے، رفتہ رفتہ کیا کرتے ہیں، اس واسطے دفعۃً اور جبراً دین بدلنے کو نہیں کہتے۔ مگر جتنا جتنا قابو پاتے جائیں گے، اتنی اتنی مداخلت کرتے جائیں گے، اور جو باتیں رفتہ رفتہ ظہور میں آتی گئیں جن کا بیان آگے آئے گا اُن کے اس غلط شبہ کو زیادہ تر مستحکم اور مضبوط کرتی گئیں۔ سب کو یقین تھا، کہ ہماری گورنمنٹ علانیہ جبر، مذہب بدلنے پر نہیں کرے گی بلکہ خفیہ تدبیریں کر کر مثل نابود کر دینے علم عربی و سنسکرت کے، اور مفلس اور محتاج کر دینے ملک کے، اور لوگوں کو جو اُن کا مذہب ہے اس کے مسائل سے ناواقف کر کر اور اپنے دین و مذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ کو پھیلا کر نوکریوں کا لالچ دے کر لوگوں کو بے دین کر دیں گے۔ ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کئے گئے، تمام اضلاع مغربی و شمالی میں ارادۂ گورنمنٹ کے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اس طرح پر مفلس اور محتاج کر کر اپنے مذہب میں لے آئیں گے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جب سرکار آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کوئی ملک فتح کرتی تھی، ہندوستان کی رعایا کو کمال رنج ہوتا تھا۔ اور یہ بھی میں سچ کہتا ہوں کہ منشا اس رنج کا اور کچھ نہیں ہوتا تھا، بجز اس کے کہ لوگ جانتے تھے کہ جوں جوں اختیار ہماری گورنمنٹ کا زیادہ ہوتا جائے گا اور کسی دشمن اور ہمسایہ حاکم کے مقابلہ اور فساد کا اندیشہ نہ رہے گا، دوں دوں ہمارے مذہب اور رسم و رواج میں زیادہ تر مداخلت کریں گے۔

مذہبی گفتگو بہت ہوتی ہماری گورنمنٹ کی ابتدائی حکومت میں ہندوستان میں گفتگو مذہب کی بہت کم تھی، روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور اس زمانہ میں بدرجۂ کمال پہنچ گئی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہماری گورنمنٹ کو ان اُمور میں کچھ مداخلت نہیں تھی۔ مگر ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب معاملے بموجب حکم اور بموجب اشارے اور مرضی گورنمنٹ ہوتے ہیں۔ سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے۔ گورنمنٹ سے پادری صاحب تنخواہ پاتے ہیں۔

Marfat.com

حکّام معتمد کا مشنری طریقہ برتنا گورنمنٹ اور حکام انگریزی جو ولایت زا اس اس مُلک میں نوکر ہیں وہ پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کو دیتے ہیں اور ہر طرح اُن کے مددگار اور معاون ہیں۔ اکثر حکام معتمد اور افسرانِ فوج نے اپنے تابعین سے مذہب کی گفتگو شروع کی تھی۔ بعضے صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی پر آکر پادری صاحب کا وعظ سُنو اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ غرضکہ اس بات نے ایسی ترقی پکڑی تھی کہ کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا۔

پادری صاحبوں کا وعظ پادری صاحبوں کے وعظ نے نئی صورت نکالی تھی۔ تکرار مذہب کی کتابیں بطور سوال و جواب چھپنی اور تقسیم ہونی شروع ہوئیں۔ ان کتابوں میں دوسرے مذہب کے مقدّس لوگوں کی نسبت الفاظ اور مضامین رنج دہ مندرج ہوتے۔ ہندوستان میں وعظ اور کتھا کا دستور یہ ہے کہ اپنے اپنے معبد یا مکان پر بیٹھ کر کہتے ہیں۔ جس کا دل چاہے اور جس کو رغبت ہو، وہاں جا کر سُنے۔ پادری صاحبوں کا طریقہ اس کے برخلاف تھا۔ وہ خود غیر مذہب کے مجمع یا تیرتھ اور میلہ میں جا کر وعظ کہتے تھے اور کوئی شخص حکّام وغیرہ کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا۔ بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا، کہ پادری صاحب کے ساتھ تھانہ کا چپراسی جانے لگا۔ پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذہب کے مقدّس لوگوں کو اور مقدّس مقاموں کو بہت بُرائی اور ہتک سے یاد کرتے تھے۔ جس سے سُننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی۔ اور ہماری گورنمنٹ سے ناراضی کا بیج لوگوں کے دِلوں میں بویا جاتا تھا۔

مشنری سکول مشنری اسکول بہت جاری ہوئے اور اُن میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہیں۔ بعض اضلاع میں بہت بڑے بڑے عالی قدر حکّام معتمد ان سکول میں جاتے تھے اور لوگوں کو اس میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب

Marfat.com

دیتے تھے۔ امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا تھا اور طالب علموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے، پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون؟ تمہارا نجات دینے والا کون؟ اور وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے۔ اس پر اُن کو انعام ملتا تھا۔ ان سب باتوں سے رعایا کا دل ہماری گورنمنٹ سے پھرتا جاتا تھا۔

یہاں ایک بڑا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر لوگ اس تعلیم سے ناراض تھے تو اپنے لڑکوں کو کیوں داخل کرتے تھے۔ اس بات کو عدمِ ناراضی پر خیال نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ یہ ایک بڑی دلیل ہے ہندوستان کے کمال خراب حال اور مفلس اور نہایت تنگ اور تباہ حال ہو جانے پر۔ یہ صرف ہندوستان کی محتاجی اور مفلسی کا باعث تھا کہ لوگ اس خیال سے کہ ان سکولوں میں داخل ہو کہ ہماری اولاد کو کچھ وجہ معیشت اور روزگار حاصل ہوگا، ایسی سخت بات کو جس سے بلاشبہ اُن کو دلی رنج اور رُوحانی غم تھا گوارا کرتے تھے نہ رضامندی سے۔

دیہاتی مکاتیب دیہاتی مکتبوں کے مقرر ہونے سے سب یقین سمجھتے تھے کہ صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب جاری ہوئے ہیں۔ پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر جو ہر ہر گاؤں اور قصبہ میں لوگوں کو نصیحت کرتے پھرتے تھے کہ اپنے لڑکوں کو مکتبوں میں داخل کرو۔ ہر ہر گاؤں میں اُن کا نام کالا پادری تھا۔ جس گاؤں میں پرگنہ وزیٹر یا ڈپٹی انسپکٹر پہنچا، اور گنواروں میں چرچا ہوا کہ "کالا پادری" آیا۔ عوام الناس یوں خیال کرتے تھے کہ یہ عیسائی مکتب ہیں اور کرشٹان بنانے کو بٹھاتے ہیں۔ اور فہمیدہ آدمی اگرچہ یہ نہیں سمجھتے تھے، مگر یوں جانتے تھے کہ ان مکاتب میں صرف اُردو تعلیم ہوتی ہے۔ ہمارے لڑکے ان میں پڑھ کر اپنے مذہب کے احکام اور مسائل اور اعتقادات اور رسمیات سے بالکل ناواقف ہو جائیں گے، اور عیسائی بن جائیں گے۔ اور یوں سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کا ارادہ یہی ہے کہ ہندوستان کے مذہبی عُلوم کو معدوم کر دے۔ تاکہ آئندہ کو عیسائی مذہب پھیل جائے۔ اکثر اضلاع مشرقی ہندوستان میں ان مکتبوں کا جاری ہونا اور لڑکوں کا داخل ہونا

Marfat.com

صاف تحکماً ہوا، اور کہہ دیا کہ گورنمنٹ کا حکم ہے کہ لڑکوں کو داخل کیا جائے۔

لڑکیوں کے سکول کا اجراء لڑکیوں کی تعلیم کا بہت چرچا ہندوستان میں تھا اور سب یقین جانتے تھے کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں سکول میں آئیں اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہو جائیں کہ یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی بعض اضلاع میں اس کا نمونہ قائم ہو گیا تھا۔ پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم سعی کر کر لڑکیوں کے مکتب قائم کر دیں گے تو ہماری بڑی نیک نامی گورنمنٹ میں ہوگی۔ اس سبب سے وہ ہر طرح پر بطریق جائز و ناجائز لوگوں کو واسطے قائم کرنے لڑکیوں کے مکتبوں کی فہمائش کرتے تھے، اور اس سبب سے زیادہ تر لوگوں کے دلوں کو ناراضی اور اپنے غلط خیالات کا اُن کو یقین ہوتا جاتا۔

بڑے کالجوں میں طریقۂ تعلیم کا تبدّل بڑے بڑے کالج جو شہروں میں مقرر تھے۔ اوّل اوّل گو اُن سے بھی کچھ کچھ وحشت لوگوں کو ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں شاہ عبدالعزیزؒ جو تمام ہندوستان میں نہایت نامی مولوی تھے، زندہ تھے۔ مسلمانوں نے اُن سے فتویٰ پوچھا۔ اُنہوں نے صاف جواب دیا کہ کالج انگریزی میں جانا اور پڑھنا انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب کے سب درست ہے۔ اس پر سینکڑوں مسلمان کالجوں میں داخل ہو گئے۔ مگر اس زمانہ میں کالجوں کا حال ایسا نہ تھا بلکہ ان میں تعلیم کا سررشتہ بہت اچھا تھا۔ ہر قسم کے علوم فارسی اور عربی اور سنسکرت اور انگریزی پڑھائے جاتے تھے۔ فقہ اور حدیث اور علم ادب پڑھانے کی اجازت تھی۔ فقہ میں امتحان ہوتا تھا سندیں ملتی تھیں کسی طرح کی ترغیب مذہبی نہ تھی۔ مدرس بہت ذی عزت اور معتبر اور مشہور اور ذی علم اور پرہیزگار مقرر ہوتے تھے مگر آخر کو یہ بات نہ رہی۔ قدر عربی کی بہت کم ہو گئی اور فقہ اور حدیث کی تعلیم یکسر جاتی رہی۔ فارسی بھی چنداں قابل لحاظ نہ رہی تعلیم کی صورت اور کتابوں کے رواج نے بالکلیہ تغیر پکڑا۔ اُردو اور انگریزی کا رواج بہت ہوا۔ جس کے سبب وہی شبہ کہ گورنمنٹ کو ہندوستان کے مذہبی علوم کا معدوم کرنا منظور

Marfat.com

ہے، قائم ہوگیا۔ مدرس لوگ معتبر اور ذی علم نہ رہے۔ وہی مدرسہ کے طالب علم جنہوں نے ابھی تک لوگوں کی آنکھوں میں اعتبار پیدا نہ کیا تھا، مدرس ہونے لگے اس لئے ان مدرسوں کا بھی وہی حال ہوگیا۔

گورنمنٹ کا اشتہار درباب استحقاق نوکری ادھر تو دیہاتی مکاتب اور کالجوں کا یہ حال تھا کہ ان پر سب کو شبہ رواج دینے مذہب عیسائی کا ہو رہا تھا کہ دفعۃً پیش گاہ گورنمنٹ سے اشتہار جاری ہوا کہ جو شخص مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہوگا اور فلاں فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دے کر سند یافتہ ہوگا، وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا۔ چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی ڈپٹی انسپکٹروں کے سرٹیفکیٹ پر جن کو ابھی تک سب لوگ "کالا پادری" سمجھتے تھے منحصر ہوگئیں اور ان غلط خیالات کے سبب لوگوں کے دل پر ایک غم کا بوجھ پڑ گیا اور سب کے دل میں ہماری گورنمنٹ سے ناراضی پیدا ہوگئی۔

لوگ یہ سمجھے کہ ہندوستان کو ہر طرح بے معاش اور محتاج کیا جاتا ہے تاکہ مجبور ہو کر رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مذہبی باتوں میں تغیر و تبدل ہو جائے[1]

جیل خانوں میں اختلاطِ اکل و شرب اسی زمانہ میں بعض اضلاع میں تجویز ہوئی کہ قیدی جیل خانوں میں ایک شخص کے ہاتھ کا پکا ہوا کھائیں۔ جس سے ہندوؤں کا مذہب بالکل جاتا رہتا تھا۔ مسلمانوں کے مذہب میں اگرچہ کچھ نقصان نہیں آتا تھا مگر اس کا رنج سب کے دل پر تھا کہ سرکار ہر ایک کا مذہب لینے پر آمادہ اور ہر طرح پر اسکی تدبیر میں ہے۔

پادری اے ایڈمنڈ کی چٹھیات کا اجراء یہ سب خرابیاں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو رہی تھیں کہ دفعۃً ۱۸۵۵ء میں پادری اے ایڈمنڈ نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیاں بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ:

---

[1] لفٹننٹ کرنل ویلر جو ایک رجمنٹ کا کمانیر تھا، اس نے ۱۸۵۷ء میں بڑے فخر سے کہا تھا کہ بیس برس سے کچھ زیادہ دنوں سے میری یہ عادت رہی ہے کہ سب قسم کے آدمیوں کو بغیر کسی تمیز کے وعظ سناتا ہوں یسوع کا سپاہی بن کر خدا کے احکام اور سرکار کمپنی کا سپاہی بن کر اس کے احکام سناتا ہوں (تاریخ عروج عہد انگلشیہ ص ۳۰۱)

Marfat.com

"اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی۔ مذہب بھی ایک چاہیئے۔ اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔"

میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا۔ پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی۔ سب کو یقین ہوگیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آگیا۔ اب جتنے سرکاری نوکر ہیں، اوّل اُن کو کرشٹان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو۔ سب لوگ بے شک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں۔ آپس میں ہندوستانی لوگ اہل کاران سرکاری سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس بھی چٹھی آئی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم بھی بسبب لالچ نوکری کے کرشٹان ہو گئے۔ ان چٹھیوں نے یہاں تک ہندوستانی اہل کاروں کو الزام لگایا کہ جن کے پاس چٹھیاں آئی تھیں، وُہ مارے شرمندگی اور بدنامی کے چھپاتے تھے اور انکار کرتے تھے کہ ہمارے پاس تو نہیں آئی۔ لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آجائے گی۔ کیا تم سرکاری نوکر نہیں ہو؟ اگر سچ پوچھو تو یہ چٹھیاں تمام ہندوستانیوں کے غلط شبہات کو پکا اور مستحکم کرنے والی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے کر دیا اور اس کے مٹانے کو کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ کچھ عجب نہ تھا کہ اسی زمانہ میں کچھ برہمی اور تھوڑا بہت فسادُ ملک میں شروع ہو جاتا۔ چنانچہ اُس وقت کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر جناب معلیٰ القاب نواب لفٹننٹ گورنر بہادر بنگال نے بہت جلد خبر لی۔ اور ایک اشتہار جاری کیا۔ جس سے فی الجملہ لوگوں کے دلوں میں تسلی ہوئی اور وہ اضطرار جو ہوگیا تھا، وہ دھیما ہوا۔ مگر جیسا کہ چاہیئے ویسا قلع اور قمع اس کا نہ ہوا۔ لوگ سمجھے کہ بالفعل یہ بات موقوف ہوگئی۔ پھر کبھی قابو پاکے وقت پر جاری ہوگی۔

مسلمانوں کو مداخلتِ امورِ مذہبی سے زیادہ رنج ہونا اور اس کا سبب | ان سب باتوں سے

Marfat.com

مسلمان بہ نسبت ہنود کے زیادہ ناراض تھے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندو اپنے مذہب کے احکام بطور رسم و رواج کے ادا کرتے ہیں، نہ بطور احکام مذہب کے۔ ان کو اپنے مذہب کے احکام اور عقائد اور وہ دلی اور اعتقادی باتیں جن پر نجات عاقبت کی موافق اُن کے مذہب کے منحصر ہے مطلق معلوم نہیں ہیں۔ اور نہ اُن کے برتاؤ میں ہیں۔ اس سبب سے وہ اپنے مذہب میں نہایت سُست اور بجز اُن رسمی باتوں کے اور کھانے پینے کے پرہیز کے اور کسی مذہبی عقیدے میں پختہ اور متعصّب نہیں ہیں۔ اُن کے سامنے اُن کے اس عقیدے کے جس کا دل میں اعتقاد چاہیئے، برخلاف باتیں ہوا کریں اُن کو کچھ غصہ یا رنج نہیں آتا۔ برخلاف مسلمانوں کے وہ اپنے مذہب کے عقائد بموجب جو باتیں کہ اُن کے مذہب میں نجات دینے والی اور عذاب میں ڈالنے والی ہیں، بخوبی جانتے ہیں۔ اور ان احکام کو مذہبی احکام اور خدا کی طرف کے احکام سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس سبب سے اپنے مذہب میں پختہ اور متعصّب ہیں۔ ان وجوہات سے مسلمان زیادہ تر ناراض تھے اور ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ تر فساد میں اُن کا شریک ہونا قرین قیاس تھا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ بلاشبہ جتنی گورنمنٹ کی مداخلت مذہب میں خلافِ قواعدِ ملک داری ہے، ایسا ہی کسی مذہب کی تعلیم کو روکنا علی الخصوص اس مذہب کی جس کو وہ حق سمجھتی ہے، برخلاف اور بے جا ہے۔ مگر ہمارا مطلب صرف اتنا ہے کہ باوجودیکہ ہماری گورنمنٹ ایسی ہی ہے مگر کام اس طرح پر ہوئے کہ رعایا کا یہ غلط شبہ رفع نہ ہوا۔[1]

پنڈتوں کی مخالفت شمس العلماء ذکاء اللہ خاں مشنریوں اور انگریزی حکام کی اُن کوششوں کو جو ہندوؤں کے مذہب اور اُن کے رسم و رواج کے خلاف تھیں تفصیل سے بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"پنڈتوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں دنیاوی عُلوم کی ہر شاخ کو باقاعدہ

---

[1] اسباب بغاوت ہند ص۱۷ تا ص۲۳۔

Marfat.com

نظام کے ساتھ داخل کر رکھا ہے۔ غرض اس دنیا میں اور اس سے باہر ہندوؤں پر اقتدار پنڈتوں کو وہ حاصل ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں۔ اب انگریزی عملداری میں ان کے سارے اقتداروں اور اختیاروں میں خلل پڑا۔ مقدمات میں رجوع انگریزی عدالتوں میں کی جاتی اور اُن کے اپیل بھی اعلےٰ عدالتوں میں ہوتے۔ پنڈتوں کی پوچھ کچھ اُن میں کمتر ہوگئی۔ اس لئے یہ سارا فرقہ انگریزی عملداری کا بدخواہ ہوگیا[1]۔

(۳) عزّت، شرافت اور خودداری پر کاری ضرب

ہندوستان کی عزّت و عظمت پر کاری ضرب تو سو سال پہلے مئی ۱۷۵۷ء میں لگ چکی تھی۔ جب عیّاری اور مکّاری سے سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کیا گیا تھا اور بقول ایک کمیونسٹ مصنّف کے ۱۸۵۷ء میں جس کی صد سالہ یادگار منائی جارہی تھی لیکن اس وقت ہندوستان کی مختلف طاقتیں اس طرح آپس میں دست و گریباں تھیں کہ سراج الدولہ کا قتل بھی ایک معمولی واقعہ تصوّر کیا گیا۔

ظاہر ہے کہ جب ایک طرف احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کی عظیم الشّان طاقت کو تہ و بالا کر رہا ہو، پھر شمالی ہند میں شجاع الدّولہ اور حافظ رحمت خاں، اور جنوبی ہند میں نظام الملک اور سلطان ٹیپو۔ ایک دوسرے کی شکست پر چراغاں کر رہے ہوں احمد شاہ ابدالی کے قتلِ عام کے بعد بھی مرہٹوں کے آپس کے جھگڑے ختم نہ ہوئے ہوں اور نہ صرف جنوبی مغربی سرحد کے علاقوں میں بلکہ وسطِ ہند تک اُن کے اکھاڑے جمے ہوئے ہوں تو انگریزوں کے ڈپلومیٹک اور پُرفن ہاتھ جو گُل کھلا رہے تھے اُن کا احساس عوام تو عوام خواص کو بھی مشکل ہی سے ہو سکتا تھا۔ اور چونکہ انگریز خود بھی اپنے مستقبل سے مطمئن نہیں تھے ایک طرف یورپ میں نپولین بونا پارٹ اُن کے پیٹ پر سوار تھا، دوسری جانب

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۱۹۷

Marfat.com

ہندوستان میں فرانسیسی فوجیں نبرد آزما تھیں۔ ہندوستان کا نپولین اعظم جس کو انگریزوں نے نہیں بلکہ خود اُس کے غدّار ساتھیوں نے ناکام نپولین بنا دیا۔ یعنی سلطان ٹیپو، اُس کا کرّہ فر انگریزوں کی نیند حرام کئے ہوئے تھا۔ اُس سے فراغت ہوئی تو جسونت راؤ ہلکر، نواب امیر علی خاں اور وسط ہند میں پنڈاری عرصہ تک اور اس کے بعد سیّد احمد شہیدؒ کی غیر معمولی تنظیم ۱۸۳۱ء تک انگریزی قوّت کے لئے تپ دلرزہ بنی رہی تھی۔ لہٰذا انگریز کا ٹھنڈا دماغ بھی اُس کو چاپلوسی اور خوشامدانہ سیاست پر آمادہ کئے ہوئے تھا۔ وہ نہ صرف بادشاہوں اور نوابوں کے دربار میں دست بستہ مؤدبانہ حاضری دیتا تھا بلکہ علماء، فقراء اور جوگیوں کی خدمت میں بھی ہاتھ باندھ کر حاضر ہوتا تھا۔ انتہا یہ کہ سیّد احمد صاحب شہیدؒ کا قافلہ سفر کرتا ہے تو ہندو مسلمانوں کی طرح نیل کی کمپنیوں کے انگریز مالک بھی جگہ جگہ دعوت کرتے ہیں۔

مگر یہی انگریز جب ۱۸۳۰ء میں سیّد صاحب شہیدؒ اور اُن کی جماعت کو سکھوں اور سامراج پرست مسلمانوں کے ہاتھ، پھر سکھوں کو خود آپس کی خانہ جنگی کے ذریعہ قلع قمع کر دیتا ہے تو ایک طرف اپنی شہنشاہیت کا اعلان کرتے ہوئے مغل بادشاہ اور اودھ کے بادشاہ کے بجائے کمپنی بہادر کا سکّہ رائج کرتا ہے عدالتوں میں شاہی دستاویزوں کے بجائے کمپنی کے اسٹامپ جاری کرتا ہے اور دوسری طرف غرور اور تکبّر کا پارہ یہاں تک چڑھتا ہے کہ سر سیّد جیسے وفادار کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ سر سیّد مرحوم کا شکوہ ملاحظہ فرمائیے۔ اس مؤدب شکوے میں سر سیّد نے دونوں رُخ پیش کر دیئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"شمال کے حکّام مُتعہّد (اُس وقت کے افسران متعلّقہ کے مقابلہ میں) وہ پہلے لوگ (سابق زمانہ کے یورپین افسر) بہت عزّت کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کی ہر طرح سے خاطر داری کرتے تھے۔ اُن کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ دوستانہ، اُن کے رنج و راحت کے شریک

Marfat.com

ہوتے تھے۔ باوجودیکہ وہ بہت بڑی سرداری اور حکومت ہندوستان میں رکھتے تھے اور حشم اور رعب اور دبدبہ جو شایانِ حکومت ہے وہ بھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ پھر ایسی محبت اور عزت ہندوستانیوں کی کرتے تھے کہ ہر ایک شخص مل کر اُن کے اخلاق کا اور اُن کی محبت کا فریفتہ ہو جاتا تھا اور تعجب سے کہتا تھا کہ یہ کیسے اچھے لوگ ہیں، کہ باوجود اس حشمت و شوکت اور حکومت کے بے غرور ہیں اور کس طرح اخلاق سے ملتے ہیں۔ ہندوستان میں جو لوگ بزرگ گنے جاتے تھے، اُن سے اسی طرح پیش آتے تھے۔ بیشک ان لوگوں نے پطرس مقدس کی پیروی کی تھی اور برادرانہ محبت پر اُلفت بڑھائی تھی۔ حال میں جو حکام متعہد ہیں، اُن میں سے اکثروں کی طبیعتیں اس کے برعکس ہیں۔ کیا اُن کے غرور اور تکبر نے تمام ہندوستانیوں کو اُن کی آنکھوں میں ناچیز نہیں کر دیا ہے؟ کیا اُن کی بدمزاجی اور بے پروائی نے ہندوستانیوں کے دل میں بے جا وحشت نہیں ڈالی ہے؟ کیا ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم ہے کہ بڑے سے بڑا ذی عزت ہندوستانی حکام سے لرزاں اور بے عزتی کے خوف سے ترساں نہ تھا، اور کیا یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ایک اشراف اہل کار، صاحب کے سامنے مثل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہا ہے، اور صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی۔ اس نوکری سے تو گھانس کھودنی بہتر ہے[1]۔

بلاشبہ تمام رعایا ہندوستان کی اس بات کی شاکی ہے، کہ ہماری گورنمنٹ نے ان کو نہایت بے قدر اور بے وقر کر دیا ہے۔

[1] اسباب بغاوت ہند ص۴۲ و ص۴۳۔

Marfat.com

ہندوستان کے اشراف آدمی کی ایک چھوٹے سے یورپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں ہے جیسی ایک چھوٹے یورپین کی ایک بہت ڈیوک کے سامنے۔ یوں تصوّر کیا جاتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی جنٹل مین نہیں ہے[1]۔

④ الحاق

ہم اس کے قائل نہیں ہیں کہ "۱۸۵۷ء کا ہنگامہ صرف مٹتی ہوئی جاگیر شاہی کی انگڑائی تھی"۔ یہ ہنگامہ تقاضا تھا انسانی شرافت کا، عزّتِ نفس اور ہندوستانیوں کی خودداری کا، اُن کی حمیّت و غیرت کا، احساس صحیح اور جذبہ تعاون کا۔ یہ ہنگامہ اضطراب تھا دین و ایمان کے ماننے والوں، دھرم اور مذہب کے پابند پاک نفوس اور پاک باطن خدا پرستوں کے پاک جذبات و احساسات کا۔ یہ ہنگامہ شور و فغاں تھا تباہ شدہ دست کاروں کی فاقہ مستیوں کا، زیادہ ستانی کی مصیبت کے مارے ہوئے کسانوں اور کاشت کاروں کے رنج و غم کا۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہنا بھی حقیقت کے خلاف ہوگا کہ جاگیرداروں کے اضطراب اور اُن کی بے چینی کو اس کے اُبھارنے میں کوئی دخل نہیں تھا۔ بلاشبہ اُن کو بھی دخل تھا اور اس بے سرو سامان ہندوستان میں اس کا بھی پورا پورا سامان موجود تھا۔ اس کی مختصر سی سرگذشت ملاحظہ فرمائیے:

"لارڈ ڈلہوزی نے جنگ اور فتوحات کے ذریعہ پنجاب اور برما کو کمپنی کی مملکت میں شامل کر لیا۔ پنجاب کی دوسری جنگ کے بعد کمپنی پنجاب پر بھی قابض ہوگئی۔ تین سال تک پنجاب کی عنانِ حکومت ایک کونسل کے ہاتھ میں رہی۔ ۱۸۵۳ء میں کونسل توڑ کر پنجاب کو ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا گیا۔ اس صوبہ کا پہلا چیف کمشنر سر جان لارنس تھا۔

---

[1] اسباب بغاوت ہند ص۴۲

Marfat.com

برما کی دوسری جنگ کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے برطانوی مؤرخوں نے بہت تعصب سے کام لیا ہے۔ رنگون کے برمی حاکم کو برطانوی تجارت کا دشمن ظاہر کرنے میں انہوں نے واقعات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا کمپنی کو حق بجانب قرار دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

فتوحات کے ذریعہ لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب اور برما کو کمپنی کی مملکت میں شامل کیا۔ لیکن ڈپلومیسی کو کام میں لاکر اُس نے ستارا، ناگپور، جھانسی، برار، سنبھل پور، اودے پور اور اودھ پر قبضہ کیا۔

جن شہزادوں کی مدد سے کمپنی ہندوستان میں ایک وسیع سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی، اُن کے لاولد مرنے پر اُن کی ریاستوں پر قبضہ جمانے کا نام مسئلہ الحاق ہے۔

کمپنی پرتاپ سنگھ کو ستارا کا حکمران تسلیم کر چکی تھی۔ اس کے سن بلوغت تک کپتان گراپ ڈف ریاست کا ناظم مقرر ہوا۔ شہزادہ جوان ہوا۔ بلوغت کے ساتھ ذہانت بھی آئی۔ کپتان دیسی رئیسوں کی ذہانت کو کمپنی کے لئے آفت خیال کرتا تھا پرتاپ سنگھ کو جلا وطن کرکے بنارس بھیج دیا گیا۔ ستارا کا جدید حکمران اُس کا بھائی مقرر ہوا۔ دونوں بھائی ۱۸۴۸ء میں لاولد مر گئے۔ اُن کے متبنوں کو وراثت کا جائز حق دار تسلیم کرتے ہوئے ڈلہوزی ستارا پر قابض ہو گیا۔[1]

(داستان ستارا، از میجر باسو)۔

ناگپور کے راجہ رگھوجی بھونسلہ ثالث نے ۱۱ دسمبر ۱۸۵۳ء کو وفات پائی۔ چونکہ وہ لاولد تھا، اس لئے اس کی دادی نے اُس کے بھائی کے بیٹے کو ریاست کا وارث تسلیم کر لیا۔ مرحوم کی رانیوں نے بھی اُسے راجہ تسلیم کر لیا۔ لیکن ڈلہوزی نے یشونت راؤ کو ناگپور کا راجہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لاولدیت کا بہانہ کرتے ہوئے ڈلہوزی ناگپور پر قابض

---

[1] مزید معلومات کیلئے باسو کی "داستانِ ستارا" نیز میجر ایوانز بیل کی "ہندوستان میں سلطنت" ملاحظہ ہو۔

Marfat.com

قابض ہوگیا۔ ناگپور کے الحاق کے ساتھ متوفّی راجہ کی رانیوں کے ساتھ بُرا سُلوک کیا گیا۔ اُن کے جواہرات اور سامان آرائش نیلام کیا گیا۔ (ہندوستان میں سلطنت از میجر ایوانز بل)۔ ناگپور کے الحاق کا سبب کمپنی کا اپنا پیدا کردہ تھا۔

جھانسی کے آخری راجہ نے ۲۱ر نومبر ۱۸۵۳ء کو وفات پائی۔ ڈلہوزی نے متوفّی راجہ کے متبنّٰی کو وارث تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ رانی کو پنشن دے کر جھانسی کا الحاق کردیا گیا۔ جھانسی کے الحاق نے ۱۸۵۷ء میں رانی کو انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونے پر مجبور کردیا۔

لارڈ ڈلہوزی کے عہدِ حکومت میں ہندوستانی راجوں کی لاولد موت، بہت بڑا معمّہ ہے۔

ڈلہوزی نے اپنی نگاہِ حرص مملکتِ آصفیہ پر جمائی۔ ڈلہوزی نے نظام کو توہین آمیز خط لکھا۔ ڈلہوزی نے امدادی فوج کے اخراجات کے لئے نظام سے برار کا علاقہ چھین لیا۔ وہ مملکتِ آصفیہ پر قابض ہوجاتا، اگر سالارِ جنگ اس کے عزائم کو شکست نہ دیتا۔ پچاس سال بعد لارڈ کرزن نے برار پر مکمّل قبضہ کرلیا۔

اودھ کا الحاق سیاسی اور اخلاقی طور پر ایک بہت بڑا گناہ تھا۔ مؤرخوں نے اس الحاق کو ۱۸۵۷ء کے حادثہ کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے۔ اودھ کا آزادانہ وجود مغلیہ سلطنت کے دَورِ انحطاط سے شروع ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ آزاد تھے لیکن انہیں مغل شہنشاہ کا وزیر خیال کیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ نواب وزیر، مغلیہ دربار کے تاثرات سے آزاد ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ کمپنی نے انہیں دہلی کے حلقہ اثر سے آزاد ہونے میں مدد دی۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے اودھ کے نواب وزیر کو "شاہ" کا خطاب دیا۔ وزارت سے شاہیت زیادہ غلامانہ ثابت ہوئی۔ شاہانِ اودھ کمپنی کے زیر اثر آگئے۔ کمپنی نے حسبِ منشا شاہانِ اودھ کی طاقت کم کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کی۔ ۱۸۰۱ء کے معاہدہ نے کمپنی کو مملکت اودھ کا محافظ بنادیا۔ اودھ کی تمام مصیبتوں کا سرچشمہ یہی معاہدہ تھا۔ کمپنی کی پنجاہ سالہ سرپرستی حالاتِ اودھ کو بہتر نہ بنا سکی۔ لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں اودھ کے حالات بہت نازک ہوچکے تھے۔

Marfat.com

ڈلہوزی معاملاتِ اودھ میں مداخلت چاہتا تھا۔ ڈلہوزی کی مداخلت کا مقصد اودھ کا خاتمہ کرنا تھا۔ مدتوں سے انگریز اودھ پر آنکھ لگائے ہوئے تھے۔

اودھ کی برطانوی آبادی ڈلہوزی کو الحاق کا مشورہ دے رہی تھی۔ دربار ناصر الدین کے ایک برطانوی مصور نے شاہانِ اودھ کو بدنام کرنے کے لئے "مشرقی بادشاہ کی خانگی زندگی" لکھی۔ اسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے "کلکتہ ریویو" کے ایک مدیر نے ایک مقالہ بعنوان "کیا فتوحات کا زمانہ ختم ہو چکا ہے" لکھا۔ اس مقالہ میں الحاق اودھ کا مشورہ دے دیا گیا۔

الحاق اودھ کے بعد ڈلہوزی ۱۸۵۶ء میں انگلستان چلا گیا۔

(کمپنی کی حکومت از پروفیسر باری ص۳۳۴ تا ص۳۳۶)

یہ طویل خاموشی کیوں؟

پہلے باب میں جن اسباب اور وجوہات کی طرف مختصر اشارے کئے گئے ہیں، اگرچہ اُن کے سنہ اور تاریخیں نہیں بیان کی گئیں۔ مگر اتنی بات ظاہر ہے کہ آج (۱۸۵۷ء) سے نہیں بلکہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے کمپنی کی لوٹ مار جاری تھی۔ اس لوٹ کھسوٹ سے ہندوستان کی صنعت و تجارت برباد ہو چکی تھی، اور سو سال پیشتر یعنی جنگِ پلاسی ۱۷۵۷ء کے بعد تو اس نے حکومت کا روپ بھی دھارن کر لیا تھا۔ پہلے اگر "گربۂ مسکین" بن کر خون چوستی اور گوشت نوچتی تھی تو اب "گرگِ مردم خور" بن کر نہ صرف دستکاری کے کارخانوں اور تجارت کی منڈیوں کو تباہ کر رہی تھی بلکہ بڑی بڑی حکومتوں کے پرخچے اُڑا رہی تھی۔ پس سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستانیوں کے دلوں کی سرزمین میں قومی احساس کے ذرّے چمک رہے تھے۔ اگر اُن کے سینوں میں وطنی جذبات زندہ تھے، اگر خودداری اور خود اعتمادی کی حرارت سرد نہیں پڑی تھی، اگر دُور اندیشی اور انجام بینی کے چراغ گُل نہیں ہوئے تھے تو وہ اتنے طویل عرصہ تک کیوں خاموش رہے، اور اُن کے تن بدن میں حرکت کیوں نہیں پیدا نہیں ہوئی؟ یہ ایک نہایت معقول سوال ہے۔ اس کا جواب ہندوستان کے

Marfat.com

ایک مشہور صاحبِ قلم نے یہ دیا ہے :

"انگریز جب یہاں پہنچے تھے تو تاجروں کی حیثیت میں پہنچے تھے۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں صرف بیوپار سے دلچسپی ہے، ملک داری سے کوئی واسطہ نہیں اور انہوں نے جو لڑائیاں کیں، وہ ملک گیری کے لئے نہ تھیں بلکہ ملکی حکمرانوں میں سے کسی ایک کی امداد کے لئے تھیں۔ یا اُن کا مقصد یہ تھا کہ دوسری یورپی تاجروں کا مقابلہ کر سکیں۔ پھر جب باقی یورپی قومیں مقابلہ کے میدان سے ہٹ گئیں تو انگریزوں نے یا تو ملکی حکمرانوں کی حمایت کو پردہ بنائے رکھا یا ایسی چالیں چلتے رہے کہ اُن کے حقیقی مقاصد سب پر آشکارا نہ ہو سکے۔

چند مثالیں مثلاً

(۱) وہ بنگال، بہار، اُڑیسہ میں جعفر کے پس پردہ پہنچے۔ پھر اُنہوں نے شاہ عالم ثانی سے تینوں صوبوں کے لئے دیوانی کی سند حاصل کی (۱۷۶۵ء)

(۲) اودھ میں عمل دخل حاصل کیا تو شجاع الدولہ یا آصف الدولہ یا یا سعادت علی خاں یا غازی الدین حیدر وغیرہ کے حامیوں اور مددگاروں کی حیثیت میں حاصل کیا اور اسی حیثیت میں روہیلوں کو تباہ کیا۔

(۳) حیدر علی، ٹیپو سلطان سے مرہٹوں اور نظام کے شریکِ کار، رفیق اور بہی خواہ کی حیثیت میں لڑائیاں کیں۔ جب ٹیپو سلطان نے شہادت پائی تو مرہٹوں کو بالکل مٹا دیا، اور نظام کو بے دست و پا بنا کر آخری دم تک مرقعِ عبرت کے طور پر قائم رکھا۔

(۴) دہلی پہنچے تو "شاہ عالم" کے ہمدرد اور بہی خواہ بنے۔ عجب بات یہ ہے کہ شاہ عالم کے نزدیک بھی انگریزوں کی حیثیت یہی تھی۔ اکبر شاہ ثانی کے وقت تک یہی حالت تھی کہ انگریز جو رقم بادشاہ کو دیتے تھے، اُسے وظیفہ نہیں خراج کہا جاتا تھا۔ اکبر شاہ کا ایک خط موجود ہے جس میں خراج

Marfat.com

بڑھانے کی طرف توجہ دلائی گئی تھی - جب پردے چاک ہو گئے اور انگریزوں کا اقتدار برہنہ ہو کر سامنے آگیا تو لوگوں پر حقیقتِ حال آشکارا ہوئی - اُس وقت قومی غیرت کا جذبہ بیدار ہوا - پھر دوسرے اسباب اس جذبے پر پر برابر تازیانوں کا کام دیتے رہے"

یہ فاضل مقالہ نگار جو ہند و پاکستان کے جلیل القدر مصنف ہیں، جن کی تعظیم و تکریم کے لئے ہماری گردن خم ہے اور اُن کی فاضلانہ تنقید و تحقیق کے سامنے پیشانیٔ خامہ سرنگوں - آپ کی تمام عظمتوں کے اعتراف کے باوجود ہمیں اس جواب کی اصابت و صداقت میں تامل ہے - ممکن ہے خامۂ نوک دریدہ کی یہ جولانی جسارتِ بے جا اور حدِ ادب سے تجاوز قرار دی جائے لیکن تحقیق و تفتیش اور نظر و فکر کی سیاحت گاہوں میں ایسی منزلیں بھی آتی ہیں جہاں مؤدبانہ نقد و تبصرہ کے لئے اجازت لینی پڑتی ہے -

فاضل مقالہ نگار کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ انگریز تاجروں کی حیثیت میں ہندوستان پہنچے اور کم از کم ابتدائی دور کے لئے یہ بھی تسلیم ہے کہ عام لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں صرف بیوپار سے دلچسپی ہے ملک داری سے کوئی تعلق نہیں" - اور ہم یہ بھی تسلیم کر سکتے ہیں کہ سراج الدولہ کو ختم کرنے کے لئے میر جعفر نے جو سازش کی، اُس کی بنیاد بھی یہی تصور تھا کہ روپیہ ان بیوپاریوں کا ہوگا اور سلطنت میری -

لیکن غور و فکر کا مقام یہ ہے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد جب جعفر کی گدی میر قاسم کو بخش کر کمپنی بہادر سودا فروش کی حیثیت میں نہیں بلکہ "نواب گر" کی شان میں جلوہ افروز ہوئی، تو کیا اب بھی اس تصور کے لئے کوئی گنجائش باقی رہ گئی تھی کہ "انگریز کو صرف بیوپار سے دلچسپی ہے" -

حافظ رحمت خاں (شہید) اور روہیلوں کی طاقت کو ختم کرنا بیشک شجاع الدولہ کا سیاسی منصوبہ تھا جس کی تکمیل کے لئے اُس نے انگریزوں سے مدد لی - مگر کیا بہار میں شکست پر شکست اُٹھانے اور کوڑہ جہاں آباد کے معاہدہ کی رو سے محصور اور پابند ہو جانے کے بعد بھی

Marfat.com

شجاع الدولہ یہی تصور کرتا رہا تھا کہ انگریز کو صرف بیوپار سے دلچسپی ہے۔

صرف یہ تین واقعات[1] جو صرف سترہ سال (۱۷۵۷ء تا ۱۷۷۴ء) کی قلیل مدت میں پیش آگئے، سونے والوں کو بیدار کرنے اور دیدہائے بستہ کو وا کرنے کے لئے کافی تھے۔ جو قوم ان تین قیامت خیز حادثوں کے بعد بھی انگریز کو نہیں پہچان سکی تھی، اُس کے لئے ناممکن تھا کہ وہ کسی بھی وقت انگریز کو پہچان سکتی۔ کیونکہ بجلیوں کے کڑاکوں کو نہ سُننا اور برق خرمن سوز کی چمک اور تڑپ کو نہ دیکھنا، غفلت کی دلیل نہیں، بلکہ فقدانِ صلاحیت کی علامت ہے کہ یہاں سمع و بصر کی طاقت ہی موجود نہیں کہ گرج اور چمک کا احساس ہو۔

اسی صدی کے آخر میں سلطان ٹیپو شہید کو ختم کرکے اس کے مُلک کو حصّے بخرے کرنا اور صرف سات سال بعد دہلی فتح کرکے شاہ عالم کو نظر بند کر دینا، انگریزی مقاصد کی سراسر عریانی تھی۔ اب کونسا پردہ تھا جو اس نیم برہنہ قوم کی کامل برہنگی میں حائل رہ گیا تھا۔

اتنی بات قابلِ تسلیم ہے کہ یورپ کے سفید فام، جو دِلوں کی سیاہی اور اپنی جلّاد طبیعت کو چٹی چمڑی اور بھولی بھالی صورتوں میں پنہاں کئے ہوئے تھے، اپنے کردار کی وحشت و بربریت پر بھی رنگ برنگ نقاب ڈالتے رہے۔ مگر کیا ہندوستانی مدبّر ایسے کوتاہ اندیش تھے کہ اُن کی نگاہیں سیاسی چال بازیوں کے پس منظر تک نہ پہنچ سکیں جن کے دعوے یہ تھے کہ ؎

من اندازِ قدت را مے شناسم
بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش

اور وہ رنگ برنگ نقابوں کے نظر فریب نظاروں میں ایسے محو ہوگئے تھے کہ اندازہ

---

[1] ۱: میر جعفر اور میر قاسم میں گدی کا تبادلہ۔ ۲: کوڑہ جہاں آباد کا معاہدہ۔ ۳: روہیلہ طاقت کی شکست و تخریب۔

Marfat.com

قد و قامت کے بعد بھی پری اور دیو میں فرق نہ کر سکے۔ تعجب ہے یہ فاضل مقالہ نگار ایک طرف اپنی محققانہ تصانیف میں جماعت مجاہدین اور اُن کے قائد حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی اُن بے مثال قربانیوں اور عظیم الشان مجاہدانہ خدمات کا تعارف کرا رہے ہیں جن کی نظیر کم از کم تاریخ ہندوستان میں ناپید ہے اور دوسری جانب ہندوستانیوں کی نہ صرف کوتاہ اندیشی بلکہ کور باطنی اور کور چشمی کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔

ممکن ہے یہ توجیہ کی جائے کہ "مقالہ نگار" کا جواب عام ہندوستانیوں کے لحاظ سے ہے۔ سید صاحب کی مخصوص جماعت اس سے مستثنیٰ ہے لیکن تاریخ کی ناقابل انکار حقیقتیں اس توجیہ کو بھی جائز نہیں قرار دے سکتیں۔ کیونکہ اگر تحقیق و تفتیش کے دائرے کو صرف انگریزی کتابوں تک محدود نہ رکھا جائے اور اپنے کسی مخصوص تصوّر کو نبھانے کی خاطر واقعات کے تسلسل کو توڑنے کی کوشش نہ کی جائے، تو جو حقیقت روزِ روشن کی طرح نکھر کر سامنے آئے گی، وہ یہ ہوگی کہ ہندوستان کے ارباب حل و عقد، فرمانروا اور علماء انگریز کو اُسی وقت پہچان چکے تھے جب اُنہوں نے اور اُن کے پیش رو پرتگیزیوں نے ہندوستان کے ساحلوں پر قزاقی شروع کی تھی اور حاجیوں کے جہازوں کو لوٹ کر اپنی بربریت اور وحشت کو تاریخِ ہند کا ایک دل خراش باب بنا دیا تھا۔

خطرات کا احساس اور اُن کا علاج ظاہر ہے "واسکوڈی گاما" مغل سلطنت کی بنیاد پڑنے سے بھی تقریباً ربع صدی پہلے کالی کٹ پہنچ چکا تھا۔ اسی وقت سے سوداگروں کے لباس میں ان قزاقوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی اور اکبر کے زمانہ تک وہ متعدد بندرگاہوں پر قابض ہو چکے تھے۔

مغلِ اعظم اکبرؒ نے ایک مرتبہ اپنے دربار میں پرتگیزی وفد کا اعزاز و اکرام کر کے بلاشبہ اپنی بلند حوصلگی، سیر چشمی اور اعلیٰ کردار کا ثبوت دیا۔ لیکن ساتھ ہی جب پرتگیزی قزاقوں کے متعلق شکائتیں پہنچیں تو گجرات و مالوہ کے گورنروں کے ذریعہ اُن کی گوشمالی بھی کرا دی۔

جہانگیر کے دورِ حکومت میں انگلستان کے نمائندے ہندوستان پہنچے۔ "سر طامس رو" کی سفارت باریاب ہوئی۔ شاہی اعزاز و اکرام نے ان کا استقبال کیا۔ مگر شاہزادہ خرم

Marfat.com

(بعد کا شاہجہاں بادشاہ) اُن کے چہرے بشرے سے اُن کی نیتیں تاڑ رہا تھا۔ اس کی کوشش بھی یہی رہی کہ یہ سفارت ناکام ہو۔ پھر جب شاہزادہ خرم شاہجہاں ہو گیا تو اُس نے اور اُس کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے جس طرح اُن کو بار بار ہندوستان کی سرحدوں سے ہٹکایا۔ پیش قدمی کرنے والوں کو گرفتار کر کے سزائیں دیں، وہ اس کا بیّن ثبوت ہیں کہ یہ بیدار مغز فرمانروا اُن کے سبز قدموں کی نحوست سے غافل نہ تھے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ شاندار ماضی جلد اوّل۔ شاہانِ مغلیہ کا نظامِ حکومت)۔

جہاں تک طبقۂ علماء کا تعلق ہے تو عہد اکبر و جہانگیر کے سب سے بڑے عالم جن کو دنیائے معرفت نے "مجدد الف ثانی" کا خطاب دیا، اُن کا ایک عارفانہ جملہ مشہور ہے جس میں آپ نے کفر و عصیاں کے بدترین نمونہ کے طور پر "کافر فرنگ" کا نام لیا ہے۔

"معرفت سرآں کس حرام است کہ خود را از کافر فرنگ بہتر داند"۔[1]

دورِ خود فراموشی پس ان اربابِ بصیرت علماء اور فرمانرواؤں کے متعلق یہ ارشاد کہاں تک اور کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ یہ انگریز کو نہیں پہچان سکتے تھے۔ البتہ سلطان عالمگیر کی وفات کے بعد وہ دَور آیا جو سلطنت مغلیہ کی جان کنی کا دور تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس ملک (ہندوستان) کی عزت و عظمت بھی حالتِ نزع میں گرفتار ہونے لگی۔ جس نے دو سو برس سے اپنی قسمت کے تار و پود مغل بادشاہت کے دامنوں سے باندھ دیئے تھے، یہ دَور تھا جب مرکزیت فنا کے گھاٹ اُتاری جا رہی تھی اور طوائف الملوکی کے عفریت ہندوستان کے چپہ چپہ پر رینگ رہے تھے۔ اس دَور کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا، کہ لوگوں نے انگریزوں کو پہچاننا چھوڑ دیا تھا، البتہ یہ درست ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے غافل ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے مستقبل کو پہچاننا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انگریز کو پہچان لینے کے باوجود وہ نہیں کیا یا نہیں کر سکے جو کرنا چاہیئے تھا۔ خود پرستی نے خود غرضی اور ذاتی مفاد کی ہوسناکی جو قومی عظمت و وقار اور حیاتِ اجتماعی کے لئے سرطان اور پلیگ

---

[1] بحوالہ مکتوباتِ شیخ الاسلام و حیاتِ شیخ الاسلام ص۲۷

Marfat.com

سے بھی زیادہ مُہلک امراض ہیں اور جن کی بناء پر طوائف الملوکی عروج پاتی ہے انہیں امراض نے ارباب اقتدار کی چشم کو نابینا اور گوش سخن نیوش کو اصم و مدہوش بنا دیا تھا۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ۔

یہ عجیب فلسفہ ہے کہ انسان جتنا زیادہ اپنی پرستش میں مشغول ہوتا ہے اُتنا ہی زیادہ خود فراموش ہو جاتا ہے۔ ذاتی مفاد اور خود پرستی کے شوالے جو دکن، بنگال اور اودھ میں تعمیر کئے گئے تھے، اُن کی خصوصیت یہ تھی کہ اُن کے پجاری انگریزوں کو پہچاننے، سمجھنے اور بُوجھنے کے باوجود اس پر مجبور تھے کہ سُنی کو اَن سُنی اور دیدہ کو نادیدہ بنا دیں۔ کیونکہ وہ اغراض جن کے آب و گِل سے یہ شوالے تعمیر ہوئے تھے، اُن کا تقاضا ہی یہ تھا۔ ورنہ یہ شوالے مسمار ہو رہے تھے ؎

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

گذشتہ واقعات اگر اس لئے یاد دلائے جاتے ہیں کہ مستقبل کے لئے اُن سے سبق لیا جائے تو یاد دلانے والوں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی، الگ الگ کر کے دکھائیں۔ کوئی ضرورت نہیں کہ یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ جیسا فعل کر کے تاریخ کی افادیت میں ہم خلل انداز ہوں، جب آئین قدر و قضا لے لاگ ہے ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو از مکافاتِ عمل غافل مشو

تو مؤرخ کے قلم حقیقت رقم کو بھی بے لوث اور بے باک ہونا چاہئے۔ کیوں نہیں کہہ دیا جاتا کہ میر جعفر نے وہی سبق دُہرایا جو سراج الدولہ کے مکتبِ سیاست میں پڑھا تھا اور سراج الدولہ کے اسکول کا کورس وہی تھا جس کو علی وردی خاں کی عملی سیاست نے مرتب کیا تھا۔ پھر جب کمپنی کا دَور آیا تو کمپنی بہادر کے ارباب حل و عقد نے وہی کیا جو میر جعفر اور سراج الدولہ نے سکھایا تھا۔ وقس علیٰ ھٰذا۔ پس ہندوستان میں انگریزی عروج کا سبب انگریز ناشناسی نہیں بلکہ اس کا سبب وہ خود پرستی، خود فراموشی اور

Marfat.com

خود ناشناسی سے جو بنیاد تھی طوائف الملوکی کی ؎

نشانِ برگِ گُل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گُل چیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں (اقبال)

مختصر یہ کہ نو وارد فرنگیوں کے پہچاننے میں اگر ابتداءً غلطی ہوئی بھی تھی تو وہ بہت جلد ختم ہو گئی۔ البتہ جن اغراض مشئومہ نے جانے پہچانے پڑوسیوں سے انجان بنایا تھا وہی اغراض اب انگریزوں کے شناخت کرنے میں چشمِ بصیرت کے لئے باعثِ خیرگی بنی ہوئی تھیں۔ غور فرمائیے۔ نظام حیدر آباد نے جب اٹھارھویں صدی کے وسط میں مرہٹوں کو پایۂ تخت "دہلی" کا راستہ بتا کر اُن کی حوصلہ افزائی کی تھی تو کیا وہ اپنے پڑوسی مرہٹوں سے واقف نہیں تھا؟ لیکن جن اغراض کی خاطر نظام نے مرہٹوں کے ہاتھوں مرکز کو کمزور کر کے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی، وہی اغراض آج ٹیپو سلطان کو دشمن، اور انگریزوں اور مرہٹوں کو دوست بنا کر پیش کر رہی تھیں۔ ان اغراض کا نتیجہ یہ الم ناک عذاب تھا، کہ بادشاہانِ ذی جاہ اور نوابان ذی اقتدار اپنی موت کی دستاویزوں پر خود اپنے ہاتھ سے دستخط کرتے رہے، اور اس اجنبی قوم سے واقفیت حاصل کرنے کے باوجود جتنی بھی گلو خلاصی کی کوشش کرتے تھے، طوقِ غلامی کی گرفت سخت اور مضبوط ہو جاتی تھی۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

پس انگریز کی اجنبی طاقت سے ایک لمحہ نفرت اور دوسرے لمحہ میں اس کی امداد و اعانت اور اُس سے تعلق بڑھانے کی ضرورت۔ اگر یہ عملی تضاد نتیجہ تھا طوائف الملوکی کا، تو اس طویل خاموشی کا سبب یہ طوائف الملوکی قرار پائے گی جس نے ایک کو دوسرے سے اس طرح الجھائے رکھا کہ وہ خود ختم ہو گیا مگر یہ الجھاؤ ختم نہیں ہوا۔

علماء کرام کا احساس صحیح اور جہاد پیہم البتہ اسی اغراض پرستی اور طوائف الملوکی کے دَور میں تحقیق و تفتیش کی نُدرت آفرینی اور تلاش و جستجو کی عجائب نوازی ہمیں ایک جماعت سے روشناس کراتی ہے جس کے جذبات مقدّس، مقاصد بلند اور

Marfat.com

جس کی جدّ و جہد ہر قسم کے شُبہ سے پاک ہے۔ بادشاہوں، شاہزادوں، نوابوں اور راجاؤں کے متعلق بجا طور پر جاگیر شاہی کی زرّیں تمناؤں کا شُبہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اس جماعت کا دامن ایسے تمام داغوں سے پاک ہے۔ یہ جماعت نہ اقتدار کی خواہاں، نہ حکومت و سلطنت کی آرزو مند، نہ اعزاز و اکرام اور اعلیٰ خطابات کی ہوس اس کے دامنوں سے اُلجھی ہوئی۔ اس کے سامنے صرف وطن ہے۔ باشندگانِ وطن ہیں، وطن عزیز کی حفاظت، اہلِ وطن کی ہمدردی اور اپنے ملک کی تعمیر و ترقی ہے۔ یہی اُن کا نصب العین ہے۔ ہاں اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اس دین و مذہب کی حفاظت بھی ضروری سمجھتے ہیں جس نے اُن کے پاک نفوس میں یہ پاکیزہ جذبات پیدا کئے۔ یہ "علماء ہند کی جماعت ہے"۔ وہ جماعت کہ اگر اس کے فکرِ سلیم اور جذبۂ صادق کا اعتراف نہ کیا جائے، اور اگر تاریخی واقعات کی ترتیب اور اُن کے سلسلہ میں سے اس جماعت کی سنہری زنجیر کو نکال دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ باخلاص اور ایثار شیوہ جماعت کے حق میں ناانصافی ہوگی، بلکہ حق یہ ہے کہ وطنِ عزیز کے حق میں خیانت اور ایثار و قربانی کی پوری تاریخ پر ایک بہت بڑا ظلم ہوگا۔ بیشک اس کم شعار دنیا میں قوموں کی تاریخ پر ایسے ظلم بارہا ہوئے ہیں کہ صفحاتِ تاریخ سے اُن کے نام تک کھرچ دیئے گئے ہیں۔ لیکن یہاں ایک بہت بڑی قباحت یہ پیدا ہوتی ہے کہ اگر اس کڑی کو بیچ سے نکال دیا جائے تو اس دَور کے بہت سے واقعات معمّہ بن جاتے ہیں یعنی نتیجہ تو ناقابلِ انکار مگر اس کے اسباب مفقود اور ناپید۔ اور جب فلسفۂ تاریخ سبب کے بغیر نتیجہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تو کبھی کسی واقعہ کو تاریخ کا معجزہ ماننا پڑتا ہے، کبھی ۱۸۵۷ء کی عظیم الشان اور حیرت انگیز جنگِ آزادی کو "مٹتی ہوئی جاگیر شاہی کی انگڑائی" کہنا پڑتا ہے اور کبھی اس محاربۂ عظیم کو "سرکش فوجیوں کی ہنگامی بغاوت" کہہ کر قصہ مختصر کرنا پڑتا ہے۔ یہ تمام اعجوبہ کاریاں اسی وقت ہوتی ہیں جب اس جماعت (جماعت علماء) کی مدبرانہ اور پیہم کوششوں کو نظر انداز

Marfat.com

کر دیا جاتا ہے۔

جماعت علماء کی کارگذاری اس جماعت نے اٹھارھویں صدی کے وسط سے رفتار زمانہ کو بھانپ کر جو نظریئے مرتب کئے، وطن عزیز کی ترقی اور کامیابی کیلئے جو تدبیریں سوچیں اور جس طرح اُن پر عمل کیا، اس کی تفصیل اسی سلسلہ کی دوسری جلد میں گذر چکی ہے، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ موقع کی مناسبت سے کچھ اشارے ضروری ہیں جو آئندہ صفحات میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

علماء کرام کے نظریات، تجویزیں، لائحہ عمل اور عمل

(۱) اٹھارھویں صدی کا تقریباً وسط تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کی کشتی ڈانواں ڈول اور انگریزی اقتدار کی گھٹائیں دن بدن گاڑھی ہو رہی تھیں۔ وطنی سیاست کے چاند تارے ان گھٹاؤں میں چھپ چکے تھے یا چھپتے جا رہے تھے۔ تب حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی نے (قدس اللہ سرہ العزیز) خوش حال، ترقی پذیر متمدّن اور فوجی لحاظ سے نہایت مضبوط وطن کے نقشہ کو نصب العین بنا کر کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں اقتصادی اور سیاسی نظریات مرتب کئے اور ان نظریات پر دماغوں کی تربیت کے لئے وطن عزیز میں چند مراکز قائم کر دیئے (دیکھو شاندار ماضی جلد دوم اور حضرت شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک)۔

(۲) سب سے بڑا مرکز دہلی کا مدرسہ تھا (مدرسہ شاہ عبدالعزیز)۔ جس نے استاذ العلماء حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی کی زیر تربیت ہندوستان کے علمی حلقوں میں نئی زندگی پیدا کی اور حضرت سید احمد شہیدؒ، مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ، شیخ الاسلام مولانا عبدالحیؒ، مولانا محمد یوسف پھلتی جیسے جرنیل، حضرت مولانا شاہ اسحاق[1] صاحب حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب[2]، حضرت مفتی صدرالدین صاحب، حضرت

---

[1] المتوفی رجب ۱۲۶۳ھ مطابق جون ۱۸۴۷ء۔ [2] المتوفی ذیقعدہ ۱۲۸۳ھ مطابق مارچ ۱۸۶۷ء

Marfat.com

مولانا رشید الدین صاحب دہلوی، مولانا مرزا حسن علی محدث لکھنوی، مولانا سید اولاد حسین صاحب قنوجی، مولانا الٰہی بخش صاحب کاندھلوی، مولانا قطب الدین صاحب دہلوی، مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی جیسے مفکر و مدبر پیدا کئے۔ اسی مرکز کے مربی اور سرپرست (حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب) نے ۱۸۰۶ء میں دہلی پر انگریزی اقتدار کے بعد وہ مشہور فتوےٰ صادر کیا جو بعد کے علماء اور تمام مذہب پرست طبقہ کے لئے نشانِ راہ بنا۔ اور ابھی آپ دنیا سے رخصت نہیں ہوئے تھے کہ سینکڑوں تربیت یافتہ انقلابی نوجوانوں کی فوج حضرت سید احمد صاحب شہید کی زیر کمان انقلاب کے لئے قدم بڑھا چکی تھی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، شاندار ماضی جلد دوم)۔

(۳) منهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر۔

ترجمہ: کچھ وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں اور کچھ انتظار کر رہے ہیں۔

بے شک حضرت سید صاحب شہید جنہوں نے ہندوستان کے بہت بڑے حصہ کا دورہ کر کے عوام کے اندر روحِ انقلاب پیدا کی، مئی ۱۸۳۱ء میں جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔ مگر وہ مرکز جو اُن کے لئے مجاہد اور مالی امداد فراہم کر رہا تھا جس کی صدارت و قیادت حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے بعد اُن کے صحیح جانشین حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے سپرد تھی، وہ زندہ تھا، محفوظ تھا، متحرک تھا۔ چنانچہ اسی محاذ کو سرگرم عمل کرنے کے لئے حضرت شاہ اسحاق صاحب نے اپنے داماد عزیز مولانا سید نصیر الدین دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز کو اپریل ۱۹۳۵ء میں دہلی سے روانہ کر دیا، اور جب یہ نخل آرزو بار آور ہونے سے پہلے ۱۸۴۰ء میں طبعی وفات سے پژمردہ ہو گیا تو حضرت شاہ اسحاق صاحب اور اُن کے برادر عزیز مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب رحمہما اللہ نے وطن عزیز سے رخت سفر باندھا اور مکہ معظمہ میں جا کر ڈیرے ڈال دیئے۔

حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب اور مولانا یعقوب صاحب کا یہ

Marfat.com

سفر مایوسی کا نتیجہ تھا یا انقلاب کے لئے نئے راستہ کی تلاش؟

اس کا جواب مشہور انقلابی عالم حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کے ایک فقرہ سے معلوم کیجئے:

"مولانا محمد اسحاق نے اوّلاً مکہ معظمہ پہنچ کر پوری آزادی سے اپنی ہندوستانی تحریک کی رہنمائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس پر دولت عثمانیہ کی وزارتِ خارجہ کو اُن کے اخراج پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی۔"[1]

شاہ صاحب موصوف نے وہاں کا معاملہ تو شیخ الحرم کو بیچ میں ڈال کر ٹھیک کر لیا۔ چنانچہ بطور پناہ گزیں وہاں رہنے کی اجازت مل گئی[2]۔ مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل و عقد کے غیض و غضب کو فرو کرنا نہ اُن کے امکان میں تھا اور نہ وہ عرب اُن کو اس کی اجازت دے سکتے جن کو وہ سینہ میں لے کر مکہ معظمہ گئے تھے۔ چنانچہ یہاں ان کی تمام املاک ضبط کر لی گئیں جس کا مقابلہ انہوں نے اُس خندہ پیشانی سے کیا، جو ایسے جلیل القدر اور اولوالعزم رہنماؤں کی شان کے مناسب تھا۔ چنانچہ جب ضبطی جائداد کی خبر ان بزرگوں کو پہنچی تو اُن پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔ آپس میں مبارک باد دے رہے تھے اور بڑی خوشی سے یہ خبر دوستوں کو سُناتے تھے[3]۔

سیدنا حضرت شاہ اسحاق صاحب کو مکہ معظمہ رخصت کرنے[4] کے بعد آپ ایک ایسے موڑ پر کھڑے ہیں جہاں سے ۱۸۵۷ء میں صرف تیرہ منزل کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء احساسِ حریت کا وہ روشن مینارہ ہے جس کی ضیا پاشیاں سو سال

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص۱۸۴۔ [2] ایضاً ص۱۸۵۔ [3] یہ جہاد حریت ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ہوا۔ کیونکہ ۱۸۴۷ء میں حضرت شاہ اسحاق صاحب وفات پا چکے تھے۔ [4] امیر الروایات [5] امیر شہید اور مولانا شہید کی شہادت سے تقریباً گیارہ سال بعد ۱۲۶۰ھ، ۱۸۴۴ء میں مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب نے اپنے خاص خاص متوسلین سمیت ہندوستان سے ہجرت کر کے حرم محترم کو اپنا نشیمن بنا لیا۔ (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک حاشیہ ص۱۷۷)۔

Marfat.com

گذر جانے کے بعد (۱۹۵۷ء میں) بھی نظروں کو چکا چوند کر رہی ہیں۔

میرٹھ کی باغی فوج کے سامنے ۔ ب ریزیڈنٹ بہادر دہلی کی اُس تقریر کے بعد جس کے ایک ایک فقرہ میں اُمیدوں کے سرسبز و شاداب باغ دکھائے گئے تھے، میرٹھ سے آئے ہوئے انقلابی فوجیوں کی یہ صدا آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔

"اب سرکار جو چاہے کرے، ہم سب مرنے پر تیار ہیں اور ہم اپنے آپ کو اُسی وقت مُردہ تصوّر کر چکے ہیں جس وقت جیل خانہ توڑ کر افسروں کو برآمد کیا تھا"۔ (داستانِ غدر از حضرت راقم الدولہ ظہیر دہلوی) ص ۵۲

کہہ سکتے ہو، فوجوں میں یہ جوش و خروش حال کی پیداوار ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ شمالی ہند کا تقریباً دو ہزار میل لانبا وہ علاقہ جو حضرت سیّد صاحب اور اُن کے رفقاء اور خلفاء کا آماج گاہ رہا تھا، اسی جوش و خروش کے انگاروں میں دہک رہا ہے۔ کیا اِس پورے علاقہ میں عوام کا جوش و خروش انہیں چند ماہ کی پیداوار ہے جب سے کارتوسوں کا معاملہ پیش آیا تھا اور خفیہ طور پر چپاتیاں تقسیم ہونی شروع ہوئی تھیں۔

عوامی تحریکوں کا جن کو تجربہ ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ عوام میں بیداری پیدا کرنا کتنا صبر آزما اور کتنا مُدّت طلب کام ہے۔ بالخصوص ایسی بیداری جو اُن کو اس پر آمادہ کر دے کہ ع

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

اگر اپنے سامنے کے تجربات اور ذاتی مشاہدات پر تاریخی واقعات کو قیاس کرنا صحیح اور درست ہے، اور اگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ اُس بیداری کے پیدا ہونے کے بعد ۱۸۵۷ء کے ہیبت ناک دھماکے سے ہوئی تھی۔ بیدار ہندوستان کو پُورے نوّے سال جدّ و جہد کرنی پڑی ہے، اور اگر انڈین نیشنل کانگریس کے آغاز سے شعور و احساس کی ابتداء مانی جائے تو ابتداء شعور سے کامیابی کی منزل تک پہنچنے میں پُورے ترسیٹھ سال صَرف ہوئے ہیں۔ حالانکہ نشر و اشاعت اور پراپیگنڈے کی سہولتیں اس وقت

Marfat.com

۱۸۵۷ء سے پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ میسّر تھیں، اور جیسا کہ کہا جاتا ہے فہم و فراست، سیاسی شعور اور تعلیم میں بھی پہلے سے زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ تو اگر اس نوّے سالہ یا باسٹھ سالہ دَور کو انگریزوں سے ناواقف نہیں قرار دیا جا سکتا تو یقیناً ۱۷۶۵ء (انگریزوں کو دیوانی دیئے جانے اور کوڑہ جہاں آباد کے معاہدہ کے وقت) سے لے کر ۱۸۵۷ء تک بہتر سالہ دَور کے ہندوستانیوں کے متعلق بھی یہ فتویٰ صادر کرنا غلط ہو گا کہ وہ انگریزوں اور اُن کی ڈپلومیسیوں سے ناواقف جھوٹے وعدوں کے سبز باغوں میں سیر کر رہے تھے۔

(۶) مولانا سیّد نصیر الدّین دہلوی

یہ مولانا سیّد نصیر الدّین[1] دہلوی جن کا ذکرِ خیر فقرہ نمبر ۳ میں گذرا، کون تھے؟ اُن کی سیرت نگاری اگرچہ ایک مقدّس خدمت ہے مگر اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے کیونکہ اُن کا دَور ۱۸۵۷ء سے سولہ سترہ سال پہلے ختم ہو چکا تھا۔ لیکن اس دَور کے وہ اثرات جو قدرتاً اور طبعاً ۱۸۵۷ء تک زندہ رہ سکتے تھے، چنانچہ زندہ رہے۔ اُن کا اجمالی تذکرہ اس موقع پر ازبس ضروری ہے اور اس مناسبت سے حضرت مولانا سیّد نصیر الدّین صاحب کا کچھ ذکرِ خیر بھی ضروری ہے۔

مولانا سیّد نصیر الدّین صاحب، حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رح (بانی نظریات انقلاب) سے نانہالی رشتہ رکھتے تھے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے بھائی حضرت مولانا شاہ رفیع الدّین صاحب سے شاندار ماضی جلد دوم کے مطالعہ کرنے والے حضرات واقف ہیں۔ مولانا

---

[1] مولانا سیّد نصیر الدین صاحب کا دادھیالی تعلق حضرت سیّد ناصر الدّین صاحب تھانیسری سے اور نانہالی رشتہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے ہے (جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے) آپ نے دہلی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ پھر بسلسلہ تدریس کلکتہ تشریف لے گئے۔ حضرت سیّد صاحب جب قافلے کر حج کے لئے تشریف لے گئے، آپ کا قیام کلکتہ ہی میں تھا۔

Marfat.com

سیّد نصیر الدّین صاحب اِنہیں حضرت شاہ رفیع الدّین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے ہیں۔ جدید رشتہ یہ ہے کہ حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کی صاحبزادی آپ سے منسوب ہیں۔

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے نواسے اور مسند درس کے جانشین جو حضرت سیّد احمد صاحب شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید (رحمہما اللہ) کی تحریکِ جہاد کے لئے مرکز دہلی سے مجاہد اور مالی امداد فراہم کرتے رہے تھے، اُن کی اور اُن کے داماد مولانا سیّد نصیر الدّین صاحب کی دلچسپیاں اس تحریک کے ساتھ ذمہ دارانہ تھیں۔ چنانچہ:

"۱۲۴۰ھ، ۱۸۲۵ء (جب سیّد صاحب کا قافلہ سفر جہاد کی تیاری کر رہا تھا تو) حضرت شاہ اسحاق صاحب وعظ فرماتے تھے، اور مولانا نصیر الدّین صاحب مدرسے کے دروازے پر فراہمیِ زرِ اعانت میں مصروف رہتے تھے"۔[1]

بہرحال ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۱ء) میں جب یہ دونوں بزرگ (سیّد صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب) بالاکوٹ میں شہید ہو چکے تو اگرچہ جاں نثارانِ حق کے چھوٹے چھوٹے گروہ وقتاً فوقتاً سرحد پہنچتے رہتے تھے (اور جیسا کہ شاندار ماضی جلد دوم اور جلد سوم میں واضح کیا گیا ہے، جاں نثارانِ حق نے ان بزرگوں کی شہادت کے بعد بھی اُن کے بلند کئے ہوئے علمِ جہاد کو سربلند رکھا) تاہم عام مسلمانوں کے جوشِ جہاد میں افسردگی پیدا ہو رہی تھی۔ اس لئے کہ سرحد میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام پانے کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔ لہٰذا سیّد صاحب کی تحریکِ جہاد کے کارفرماؤں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ دوبارہ ایک بڑی جماعت تیار کر کے آزاد علاقے میں بھیج دی جائے جس سے سیّد صاحب کے شروع کئے ہوئے کام میں جوش و خروش کی نئی رُوح پیدا ہو جائے۔

---

[1] سرگذشت مجاہدین ص ۱۳۶۔

Marfat.com

اس اہم فرض کی بجا آوری کا شرف روزِ ازل سے مولانا سیّد نصیر الدّین دہلوی کے لئے مقدر ہو چکا تھا جنہوں نے سیّد صاحب کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ملک کے مختلف حصّوں کا دورہ کیا۔ دعوتِ جہاد سے ایک جماعت تیار کی اور سیّد صاحب کی طرح وطن مالوف سے ہجرت کر کے کاروبار جہاد کی تجدید کا انتظام فرمایا۔[1]

اس کے بعد آپ نے ٹونک، اجمیر، میرٹھ، امروہہ، رام پور وغیرہ کا دورہ کیا۔ حاجی سیّد عبدالرحیم سورتی، مولوی بہاؤالدّین چنیاپٹنی[2]، احمد سادہ کار، امام الدّین سوزن ساز وغیرہ آپ کے رفیقِ خاص تھے۔[3]

آپ کی خواہش یہ بھی تھی کہ ہجرت سے پیشتر ملک کے اور حصّوں کا بھی دورہ کریں حضرت سیّد احمد صاحب شہیدؒ کے مقرر فرمائے ہوئے نقیب جا بجا دعوت و تبلیغ میں مصروف تھے۔ مثلاً مولانا ولایت علی عظیم آبادی (جو سیّد صاحب کی شہادت کے بعد وطن واپس آگئے تھے اور نظام از سرِ نو قائم فرما رہے تھے) اُن کے بھائی مولانا عنایت علی مشرقی بنگال میں سرگرمِ عمل تھے۔ مولانا سیّد محمد علی مدراس میں وعظ و نصیحت کے مرکز قائم کرنے کے بعد مُلک کے دوسرے حصّوں میں مشغول تھے۔ مولانا سیّد اولاد حسن قنوجی[4] بھی اپنے گرد و پیش کام انجام دے رہے تھے۔

مولانا سیّد نصیر الدّین صاحب چاہتے تھے کہ دعوت و تبلیغ کی ان مساعی میں تنظیم پیدا کر کے اندازہ فرمالیں کہ کُل کتنی جمعیت کا انتظام ہو سکے گا اور آئندہ کے لئے مجاہدین کی آمد کا سلسلہ کس پیمانے پر جاری رہ سکے گا۔ مگر جب سوچا کہ اس طرح آغازِ کار میں بہت تاخیر ہو جائے گی تو یہی فیصلہ کیا کہ زیادہ تاخیر روا نہ رکھی جائے اور ظاہر ہے جواں مردانہ میدانِ جہاد میں اُتر آنا بجائے خود دعوت و تبلیغ کا ایک مؤثر پیغام تھا۔[5]

---

[1] سرگذشت مجاہدین ص۱۳۵۔ [2] چنیاپٹن، مدراس کا پُرانا نام ہے۔ [3] سرگذشت مجاہدین ص۱۳۶۔
[4] والد ماجد نواب صدیق حسن صاحب والی بھوپال۔ [5] سرگذشت مجاہدین ص۱۳۸۔

Marfat.com

مولانا نصیرالدین صاحب کی والدہ محترمہ حیات تھیں۔ اُن سے اجازت[1] حاصل کی۔

---

[1] والدہ ماجدہ سے اجازت حاصل کرنے کا قصّہ بہت ہی دلدوز اور بہت ہی دلچسپ ہے آپ بھی مطالعہ فرمالیجئے اور یاد رکھئے (انّ فی ذٰلک لعبرہ لاولی الابصار)۔ دہلی کی پردہ نشین خواتین، ہمارے زمانہ میں تو جس وقت جہاں چاہتی ہیں سیر و تفریح یا ادائے نماز اور شرکتِ مجالس وعظ کے لئے چلی جاتی ہیں۔ صرف برقع کی ضرورت ہوتی ہے جس کا نقاب عموماً نیم باز ہوتا ہے۔ مگر اُس زمانہ میں یہ آزادی نہیں تھی۔ قد و قامت اور وضع قطع تو درکنار، شرم و حیا کے نازک احساسات یہ بھی گوارا نہ کرتے تھے کہ کوئی اجنبی شخص آنچل بھی دیکھ سکے۔ حضرت مولانا نصیرالدین صاحب کی والدہ ماجدہ انہیں غیور پاکباز خواتین میں سے تھیں۔ مگر اس کے باوجود اُن کی ایک تمنا یہ تھی کہ رمضان شریف کے مہینہ میں جامع جہاں نما (جامع مسجد دہلی) میں نماز ادا کریں۔ ۱۲۵۰ھ (جنوری ۱۸۳۵ء) کا رمضان شریف آیا مولانا نصیرالدّین صاحب کے قدم راہِ جہاد میں خارِ مغیلاں کو بوس و کنار کے لئے مضطرب ہونے شروع ہوئے اور جذباتِ فدائیت اپنی حسرتیں پوری کرنے کے لئے مچلنے لگے۔ اُس وقت آپ کو خیال آیا، کہ اپنی تمنا پوری کرنے سے پہلے والدہ محترمہ کی دیرینہ تمنا بھی پُوری کرادیں۔ چنانچہ ایک شب والدہ صاحبہ کو جامع مسجد میں لے گئے کہ اپنی آرزو پُوری کرلیں۔ والدہ محترمہ جامع مسجد میں پہنچیں۔ خدا کا شُکر ادا کیا پھر نماز میں مصروف ہوگئیں۔ اطمینان سے نماز پڑھی۔ اس کے بعد اپنے گوشۂ جگر کو جس نے یہ پُرانی آرزو پوری کرائی تھی، بہت بہت دعائیں دیں۔ حضرت مولانا نصیرالدّین صاحب نے والدہ محترمہ کو بے حد مسرور پایا تو سمجھے کہ حصولِ اجازت کا یہی موقع سب سے بہتر ہے۔ والدہ صاحبہ سے عرض کیا۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۵ (تم ہرگز "برّ" نہیں حاصل کرسکتے (اور کلمہ توحید ادا کرکے ایثار و للّٰہیت کا جو عہد کیا ہے اُس کو اس وقت تک پورا نہیں کرسکتے) جب تک تم ان چیزوں میں سے خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہیں) مولانا نصیرالدین صاحب نے یہ آیت پڑھ کر اپنی والدہ صاحبہ سے عرض کیا۔ "آپ کو مجھ سے محبّت ہے میں راہِ خدا میں جہاد کا آرزومند ہوں۔ آپ اس کارِ خیر کیلئے مجھے اجازت دیں اور جُدائی پر صبر و سکون اور تسلیم و رضا سے کام لیں"۔ اس فرشتہ خصلت خاتون کے جذبات بھی بیٹے سے کم نہیں تھے۔ بیٹے کی درخواست کرنے کی دیر تھی،

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

سفر کا نہایت مختصر سامان ساتھ لیا[1]۔ ۳ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ (۲ اپریل ۱۸۳۵ء) کو گھر بار اہل و عیال اور اعزا و احباب سے مفارقت اختیار کر کے عرب سرائے میں جا ٹھہرے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جیسے ہی یہ درخواست سامنے آئی۔ حرفِ اجازت والدہ محترمہ کی زبان پر تھا اور دل صبر و سکون کی دعاؤں میں مصروف۔ (رحمہا اللہ)

تصور کیجئے اکلوتے فرزند کی محبت کا۔ کیا حالت[ع] ہوگی، جب خیال آتا ہوگا کہ شاید اس کے بعد زندگی میں دوبارہ ملنا نصیب نہ ہوگا (جیسا کہ ہوا) مگر حضرت شاہ اسحاق صاحب کی صاحبزادی کو ایسے تمام وسوسوں سے بالاتر ہونا چاہیئے تھا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] سامان کیا تھا؟ جس کی تفصیل معلوم ہوسکی، وہ چند کتابیں تھیں یعنی قرآن مجید، تفسیر جلالین، مشکوٰۃ شریف، سنن ابوداؤد شریف، الحبل المتین، حجۃ اللہ البالغہ کے چند جزو جس میں احسان سے متعلق ابواب ہیں۔ کچھ ساتھیوں نے کہا۔ تفسیر بیضاوی بھی ساتھ لے لیجئے۔ فرمایا۔ ہم جس مقصد سے یہ سفر اختیار کر رہے ہیں، اس میں کتابوں کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئے گی۔ جو کتابیں ساتھ لی گئیں وہ صرف اس لئے کہ کتاب اللہ اور سُنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں عمل کے لئے ہدایات حاصل کر سکیں۔ بیضاوی شریف میں عملی ہدایات کی تشریحات برائے نام ہیں، زیادہ تر منطقی قسم کے مباحث ہیں۔ اس سلسلہ میں دوسری بات جو معلوم ہوسکی وہ یہ کہ مولانا کی اہلیہ محترمہ نے بستر اور فرش فراہم کیا۔ کچھ برتن ساتھ کئے اور اپنے کڑوں کی ایک جوڑی پیش کر دی۔

ع الحمد للہ یہ سعادت ایک نہایت معمولی درجہ میں احقر کو بھی نصیب ہوئی۔ تحریکِ آزادی کے زمانہ میں (از ۱۹۲۹ء تا ۱۹۴۵ء) والدہ صاحبہ حیات تھیں جو اس ناکارہ کو تحریک میں شرکت کی عام اجازت دیئے ہوئے تھیں۔ اگرچہ زمین اور آسمان کا فرق یہ تھا کہ مولانا نصیر الدین صاحب ایسی تحریک کے لئے اجازت مانگ رہے تھے جس میں جانبازی اور سرفروشی سب سے مقدم تھی اور احقر نے ایسی تحریک کی اجازت چاہی تھی جس کی بُنیاد عدمِ تشدّد پر تھی۔ مگر "بُلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس ست"

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۔ محمد میاں

Marfat.com

۶ ذی الحجہ کو عرب سرائے سے روانہ ہوئے، اور قطب صاحب میں حوض شمسی کے کنارے مسجد اولیاء کے متصل قیام کیا۔ ۷ ذی الحجہ تو چلے کو ریواڑی پہنچے۔ عید الاضحیٰ کی نماز یہیں ادا کی۔

ریواڑی سے روانہ ہو کر جے پور قیام کیا۔ پھر ٹونک پہنچے۔ جہاں نواب وزیر الدولہ کا دورِ حکومت تھا۔ نواب وزیر الدولہ (سید احمد صاحب شہید کے پروردۂ خاص) مولانا سید نصیر الدین صاحب کی تشریف آوری کے لئے چشم براہ تھے۔ بڑے حوصلے سے خاطر مدارات کی۔ مجمع کثیر کے ساتھ حلقہ بگوش ارادت[1] ہوئے اور رخصت کے وقت بہت کافی سامان نذر کیا۔

مولانا سید نصیر الدین صاحب کا قافلہ ٹونک سے روانہ ہو کر اجمیر پہنچا۔ پھر جودھپور میں قیام کیا۔ جودھپور سے جیسلمیر ہوتے ہوئے سندھ میں داخل ہوا۔ جہاں مختلف مقامات پر قیام ہوا۔ سندھ کے علماء، زعماء اور مشائخ سے تبادلہ خیالات کیا گیا۔ جہاد کی ترغیب دی گئی۔ جس قدر میسر ہو سکا، سامانِ جہاد فراہم کیا گیا۔ ان مرحلوں سے گذرنے کے بعد یہ قافلہ مزاری[2] بلوچوں کے علاقہ میں[3] پہنچا۔ اور اسی علاقہ کو قیام کے لئے منتخب کر لیا جہاں کچھ معرکے ہوئے۔ پھر آپ ستھانہ تشریف لے گئے اور اسی کو جہاد حریت کا مرکز بنا لیا مگر ابھی پوری طرح جمنے نہ پائے تھے کہ پیغامِ اجل آ پہنچا۔ جس کو لبیک کہنا ناگزیر تھا۔ رحمہ اللہ و قدس سرہٗ۔ یہ چند سطریں جو اوپر گذریں سیرت سید نصیر الدین کا نقشِ ناتمام ہیں۔

وہ خاص بات جس کے لئے مولانا نصیر الدین صاحب کا تذکرہ یہاں پر کیا گیا ہے۔ یہ ہے کہ آپ کی جد و جہد چند نفوس کی جاں بازی اور سرفروشی تک محدود نہیں تھی بلکہ جذبات

---

[1] مولانا سید نصیر الدین صاحب کے متعلق آپ کا اعتقاد یہ تھا کہ آپ حضرت سید احمد شہیدؒ کے پرتو ہیں۔

[2] مزاری بلوچوں کی بہت بڑی برادری ہے۔ وجہ تسمیہ کے متعلق دو رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ مزار اُن کے کسی مورثِ اعلیٰ کا نام تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یہ قبیلہ ابتداء میں ایک ندی پر آباد تھا جس کا نام مزار تھا۔ اس لئے اس برادری کا نام مزاری ہو گیا۔ [3] یہ علاقہ خیر پور کی حدود سے متصل موجودہ ڈیرہ غازی خاں کے جنوبی حصہ پر مشتمل ہے۔

Marfat.com

حریت کے جو شعلے آپ کے دل و دماغ میں مشتعل تھے، آپ نے اُن کی چنگاریاں پورے شمالی ہند میں پھیلا دی تھیں۔ وہ سینکڑوں عمائد اور اپنے اپنے علاقہ کے سربرآوردہ علماء اور زعماء جن کے پاس مولانا نصیر الدین صاحب نے اعلام نامے بھیجے اور جن سے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا۔ اُن میں سے محترم غلام رسول صاحب مہر نے ایک سو چھ ۱۰۶ حضرات کے نام دریافت کر لئے ہیں[1]۔

دہلی و نواحِ دہلی : مولانا شاہ اسحاق صاحب۔ مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب۔ مولوی محبوب علی صاحب۔ مولوی نصیر الدین صاحب۔ مولوی مظفر حسین صاحب۔ مولوی شیخ محمد صاحب۔ حاجی محمد۔ حاجی مزمل۔ مولوی حافظ محمد حسین۔ مولوی کرم اللہ۔ مولوی الٰہی بخش۔ مولوی جمال الدین۔ حافظ عبدالرحمٰن۔ مولوی محمد وزیر علی۔ منشی ایزد بخش۔ امیر الدین۔ امین الدین۔ حافظ عبدالرزاق۔ مولوی عبداللہ۔ مولوی علی محمد۔ مولوی بہاء الدین۔ مولوی عبدالخالق۔ مولوی امام علی۔ حافظ اکرام الدین۔ مولوی شاہ علی۔ مولوی عبداللہ خاں علوی۔ بشارت خاں۔ مولوی عبدالمجید۔ قاری احمد زمان۔ حافظ جھجو بیگ۔ حافظ احمد خاں۔ عظیم اللہ خاں۔ مرزا ایوب بیگ۔ میاں احمد۔ میاں نجابت علی۔ قاضی عبدالرحمٰن عرب سرائے والے۔ میاں غلام محی الدین۔ حافظ ولی محمد۔ میاں رکن الدین۔ میاں الٰہی بخش آئینہ ساز۔ مولوی امداد علی۔ مولوی نذیر حسین۔

میرٹھ : مولوی بزرگ علی۔ مولوی عنایت احمد۔ مولوی محمد متقی وغیرہ۔

پھلت و نگینہ : مولوی وحید الدین۔ مولوی خدا بخش۔ مولوی تہور علی۔ مولوی خیر الدین۔ مولوی منیر الدین۔

امروہہ : مولوی رمضان علی۔ مولوی امانت علی۔ مولوی کریم اللہ۔ شیخ رحمٰن بخش صوفی صاحب۔ شاہ غلام علی۔ میر ہدی۔

مراد آباد : حافظ عبدالرحیم۔ میاں عثمان۔ میانجی خلیفہ۔

گڑھ مکتیسر : حاجی صبغۃ اللہ۔ شیخ محمد حسین۔

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

یہ بزرگ اور رہنما، دہلی، میرٹھ، پھلت، نگینہ، گڑھ مکتیسر، امروہہ، مراد آباد، رام پور، بریلی، کانپور، لکھنؤ، فرخ آباد، باندہ، قنوج، جون پور، غازی پور، بنارس، آرہ، سہسرام، پٹنہ، مظفر پور، چھپرہ، مونگیر، کلکتہ اور نواح کلکتہ کے رہنے والے ہیں۔

ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا تعارف حضرت سید احمد شہید قدس سرہٗ کی تحریک کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ بہت سے وہ ہیں، جن کا تعارف خاص اسی موقع پر ہو رہا ہے۔

جہاں تک ۱۸۵۷ء کی تحریک میں ان حضرات کی شرکت کا تعلق ہے تو یہ درست

رام پور: مولوی حیدر علی۔ مولوی نور الاسلام۔ اخوند زعفران۔ اکبر علی خاں۔ شاہ دل خاں۔ حافظ احمد علی۔ مرتضٰے خاں۔ اخوند امام الدین وغیرہ۔

لکھنؤ: مرزا حسن علی۔ مولوی خرم علی۔ **قنوج:** سید اولاد حسین۔

جون پور: مولوی سخاوت علی۔ مولوی کرامت علی۔ مولوی محمود علی۔ مولوی الٰہی بخش و مولوی مکارم خاں وغیرہ ساکنان فرخ آباد، باندہ، بریلی۔

بنارس: مولوی احمد اللہ۔ مولوی رحمت اللہ۔ حافظ صدیق۔

غازی پور: شیخ فرزند علی۔ مولوی محمد فصیح صاحب۔

عظیم آباد: شاہ محمد حسین صاحب۔ مولوی ولایت علی صاحب۔ مولوی الٰہی بخش صاحب۔

کلکتہ و نواح کلکتہ: مولوی محمد علی صاحب۔ مولوی امام الدین صاحب۔ مولوی مراد صاحب۔ قاضی عبد الباری صاحب۔ صوفی نور محمد صاحب۔ منشی غلام رحمٰن صاحب۔ مولوی حراست اللہ صاحب۔ مولوی عبد اللہ صاحب۔ مستری رجب علی صاحب۔

اجمیر شریف: مولوی محمد سراج الدین صاحب۔

ٹونک: مولوی خلیق الرحمٰن صاحب۔ مولوی بہادر علی صاحب۔ سید حمید الدین صاحب (خواہر زادہ سید صاحب)۔ سید زین العابدین صاحب۔ سید ابو القاسم صاحب (ابنا سید احمد علی خواہر زادہ سید صاحب)۔ سید محمد یعقوب صاحب برادر زادہ سید صاحب۔

Marfat.com

ہے کہ ان میں سے بہت سے وہ ہوں گے جو ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی زندگی کے تمام مرحلے طے کر کے دارِ بقا کے منزل گزیں ہو چکے ہوں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سوں کے جذبات افسردہ ہو چکے ہوں اور اس دارِ فنا میں زندہ رہتے ہوئے اُن کے جذبات حریت فنا ہو چکے ہوں لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہی مقام ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں قربان گاہِ ایثار و فدائیت بنے اور یہی آتش دان تھے جن کے شراروں نے شمالی ہند کے بڑے حصہ کو آتش کدۂ حرب و ضرب بنا دیا، تو کیا ہمیں یہ فرض کرنا ضروری ہوگا کہ جو تپش مولانا سید نصیر الدین صاحبؒ نے پیدا کی تھی، وہ سرد ہو چکی تھی، اُس کا نام و نشان باقی نہیں رہا تھا۔ یا قرین قیاس یہ ہے کہ وہی چنگاریاں جن کو مولانا نصیر الدین صاحب نے اپنی پھونکوں سے جگہ جگہ سُلگایا تھا، ۱۸۵۷ء کے بادِ صرصر نے دفعۃً ان کو آتش افروزاں بنا دیا تحریکات کی تدریجی رفتار اور ان کے مدّ و جزر سے جو واقف ہیں، اُن کا فیصلہ وہی ہوگا جن کو قرین قیاس بتایا گیا ہے۔

۱۹۱۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کا تیس ۳۰ سالہ دَور ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ خلافتِ آلِ عثمان کے سقوط پر تحریکِ خلافت کی جو آندھی اُٹھی تھی، وہ پانچ سال بعد مدہم پڑ گئی۔ ہندو مسلم اتحاد کے بجائے منافرت و عداوت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ یہاں تک کہ جب ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے دوبارہ میثاقِ آزادی مرتب کیا تو ایک نئی نسل سامنے تھی۔ لیکن کیا کوئی بھی انصاف پسند اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اس نئی نسل کے تازہ خون میں حرارت پیدا کرنے والے وہی انجکشن تھے جو شہیدانِ جلیانوالہ باغ ۱۹۱۹ء کے خونِ شہادت سے تیار کئے گئے تھے۔ بیشک ۱۹۱۷ء کے بہت سے تیز رو تھک کر بیٹھ گئے تھے۔ بہت سے ساتھی بچھڑ گئے تھے، بایں ہمہ جنہوں نے ۱۹۲۹ء میں زمامِ قیادت سنبھالی تھی وہ وہی تھے جن کو ۱۹۱۷ء کی تحریک نے پیدا کیا تھا۔[1]

---

[1] مثلاً شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ۔ حضرت علامہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مفتیٔ اعظم ہندؒ۔ ابوالمحاسن مولانا سجاد صاحب (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

پس اگر ۱۹۱۷ء کی تحریک ۱۹۲۹ء کا پہلا زینہ قرار دی جاسکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حضرت سید احمد صاحب شہید اور مولانا نصیر الدین (رحمہما اللہ) کی تحریک کو ۱۸۵۷ء کی تحریک کا زینہ نہ قرار دیا جائے اور اس طوفانِ بے پناہ کے سرچشمے کہیں اور تلاش کئے جائیں۔

البتہ ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت سید احمد صاحب اور حضرت مولانا نصیر الدین صاحب دہلی کی تحریکیں خالص اسلامی بنیادوں پر تھیں۔ مسلمان ہی اُن کے جاں باز تھے اور مسلمان ہی علمبردار، اور کہیں استثنا تھا تو برائے نام[1] تھا۔ اس کے برخلاف ۱۸۵۷ء کی تحریک میں تفرد کے بجائے اشتراک، اور علیحدگی کے بجائے اختلاط تھا۔ تو سوال یہ ہو سکتا ہے کہ تفرد اور علیحدگی کے بجائے یہ اختلاط کیسے پیدا ہوا۔ مگر اس سوال کو وہی شخص حجت بنا سکتا ہے جو سیاسی تحریکات کے مدّ و جزر سے قطعاً ناآشنا ہو۔ لیکن جس نے بارہا دیکھا ہو کہ سیلاب کے وقت دریاؤں کی دھاریں کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں گھاس کے سوکھے ہونٹ نمی کو ترس رہے تھے، وہاں آبِ رواں کی لہریں اُچھلنے لگتی ہیں۔ اُس کی نظر میں یہ حجت سوت کا کچا دھاگا ہے جس میں مضبوطی کا نام و نشان نہیں۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہے گا کہ جس وادی کو سیلاب بداماں بتایا جا رہا ہے کیا وہاں پہلے سے نشیب تھا جو سیلاب کا خیر مقدم کر سکے یا اس میں ایسی نرمی تھی کہ سیلاب کے لئے اپنا سینہ کھول سکے؟

آیئے اس زاویہ سے بھی سید صاحب کی تحریک پر ایک نظر ڈال لیں کہ کیا اس میں اشتراک و اختلاط کی گنجائش تھی یا نہیں؟ آئندہ صفحات کے ملاحظہ سے اندازہ ہوگا کہ سید صاحب کی تحریک کا تفرد اس بنا پر نہیں تھا کہ گل چیں کا دامن تنگ تھا بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ ابتک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری۔ رفیع احمد صاحب قدوائی۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب۔ حافظ محمد ابراہیم صاحب۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ خان عبدالغفار خاں وغیرہ وغیرہ۔ ہندو حلقہ میں مہاتما گاندھی۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد وغیرہ وغیرہ۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] مثلاً حضرت سید احمد صاحب شہید کے توپ خانہ کا افسر راجہ رام تھا۔

Marfat.com

گلوں کو اپنی پژمردگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

وطن عزیز کو نجات دلانے کیلئے مشترک جدّوجہد

انگریزی دَور کے تاریخ نویس، نہ مہاراجہ اندور جسونت راؤ ہلکر کے مدّاح ہیں اور نہ نواب امیر علی خاں (بانی ریاست ٹونک) کی عزّت و عظمت کے قائل ہیں لیکن ہر ایک حقیقت پسند اس اعتراف پر مجبور ہے کہ اس مرہٹی راجہ اور روہیلہ پٹھان نے مِل کر جو محاذ قائم کیا تھا، اُس کا اہم ترین مقصد یہی تھا کہ وطنِ عزیز کو انگریزوں روز افزوں چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھا جائے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اپنے خلیفۂ خاص حضرت سیّد احمد صاحب شہید کو ۱۸۱۰ء میں اس محاذ پر کام کرنے کے لئے بھیجا تو مشترک جدّ وجہد پر شرعی تصدیق کی مُہر بھی ثبت ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ سیّد صاحب نواب امیر علی خان کی فوج میں ایک سوار کی حیثیت سے ملازم تھے لیکن اگر آپ کی حیثیت صرف ملازم کی تھی تو نواب امیر علی خاں آپ کو اپنے مشوروں میں شریک اور آپ کا غیر معمولی اعزاز کیوں کرتا تھا؟ اس پر بھی شُبہ کیا جاتا ہے کہ اس وقت آپ کا تشریف لے جانا اپنے شیخ اور مرشد حضرت شاہ عبدالعزیز کے ایما پر تھا، بلکہ کسبِ معاش کے لئے آپ تشریف لے گئے تھے۔ حالانکہ یہی شُبہ کرنے والے یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ سیّد صاحب جب تقریباً سترہ سال کی عمر میں اپنے وطن سے چند دوستوں کے ساتھ طلبِ روزگار کے لئے نکلے، تو رفتہ رفتہ تمام ساتھیوں کو کسی نہ کسی ملازمت میں لگا دیا اور خود ملازمت کا خیال چھوڑ کر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگئے تھے کہ کاروبار دنیا کی بجائے دین کا کاروبار کریں۔ یہاں پہنچ کر کسبِ فیض کیا۔ ولایتِ انبیاء کے شرف سے بہرہ اندوز ہوئے۔ خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

تعجّب ہے جو شخص ابتدائے شعور میں ملازمت اور زر اندوزی کی طرف مائل نہیں ہوا۔ کیا زہد و تقوےٰ کی منزلیں طے کرنے اور حضرت شیخ سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد

Marfat.com

وہ طلبِ روزگار کے لئے سفر کرے گا اور سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک نواب کی فوج میں بھرتی ہو کر چند ٹکوں کی خاطر اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ فروخت کر ڈالے گا اور بایں ہمہ ایک مقدس پیشوا اور دینی رہنما کی حیثیت سے اس کی سوانح حیات مرتب کرنا قابلِ فخر دینی خدمت سمجھا جائے گا۔

بہرحال اس سفر کے متعلق حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی تحقیق ہی درست معلوم ہوتی ہے۔ عقلی اور قیاسی قرائن اسی کی تائید کرتے ہیں کہ:

ارسله الامام عبد العزیز الی (النواب امیر علی خاں) لتحصیل المهارة فی العلوم العسکریة۔

"امام عبدالعزیز ہی نے سید صاحب کو امیر علی خاں نواب ٹونک کے لشکر میں بھیجا تاکہ فنونِ جنگ میں عملی تجربہ اور مہارت حاصل کر لیں"[1]۔

جب نواب امیر خاں نے انگریزوں سے معاہدہ کر لیا تو سید صاحب خاطر برداشتہ ہو کر اپنے شیخ محترم حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس تشریف لے آئے لیکن نواب امیر خاں اور اس کی اولاد آخر تک حضرت سید صاحب کا احترام پیر و مرشد کی طرح کرتی رہی۔ اس کے بعد مرہٹی اقتدار اور اولوالعزمیوں کا آخری نشان "دولت راؤ سندھیا" کی راجدھانی (گوالیار) شاہد ہے کہ حضرت سید صاحب نے جب فوجی قافلہ کو لے کر سرحد کی طرف کوچ کیا تو سب سے پہلی قابلِ ذکر منزل جہاں چند روز قیام فرمایا، اسی سرزمین کے شاداب خطہ میں ہوئی تھی جس کو "باغ فتح علی خاں" کہا جاتا تھا۔ یہاں حضرت سید صاحب اور اُن کے ساتھیوں کا شاہانہ احترام کیا گیا۔ امیرانہ حوصلوں کے ساتھ دعوتیں ہوئیں اور نتہائی میں مہاراجہ سے بات چیت ہوئی۔

اس وقت مہاراجہ مرض استسقاء میں مبتلا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد انتقال کر گیا۔ اس زمانہ کی برطانوی پالیسی کے مطابق جانشینی کا قضیہ چلا۔ اس دور میں دولت راؤ

---

[1] تمہید۔ بحوالہ سیاسی تحریک ص۱۴۷۔ [2] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص۱۱۵

Marfat.com

سندھیا کا نسبتی بھائی "راجہ ہندو راؤ" ریاست کا مختار اور مدار المہام تھا۔ آپ نے اُس کو اور اُس کے معتمدِ خاص غلام حیدر کو علاقہ سرحد کے "مرکز جہاد" سے خط لکھا۔ امداد کی درخواست کی۔ اس کا یقین دلایا کہ کامیابی کے بعد مہاراجہ کی حکومت بدستور رہے گی بلکہ مضبوط ہو جائے گی۔ یہ پورا خط نقشِ حیات جلد دوم اور شاندار ماضی جلد دوم وغیرہ میں ملاحظہ فرمایا جائے۔ یہاں اس کا پہلا فقرہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے اور جذبات کا اندازہ کیجئے۔

بیگانگاں بعید الوطن ملوکِ زمین و زماں گردیدہ و تاجرانِ متاع فروش بپایہ سلطنت رسیدہ۔	سمندر پار کے رہنے والے پردیسی دُنیا جہاں کے تاج دار اور سودا بیچنے والے دوکاندار سلطنت کے مالک بن گئے ہیں۔
(نقشِ حیات جلد ۲ ص۱۳)	

اس سے بڑھ کر جذبۂ حریّت اور حبّ وطن کیا ہو سکتا ہے کہ اپنے یا اپنے ساتھیوں کے لئے نہ حکومت اور سلطنت کی تلاش ہے، نہ کسی منصب اور عہدے کی خواہش۔ نہ اس پر بحث ہے کہ مسلمانوں کا حصّہ کیا ہوگا۔ بلکہ اور وضاحت کر دی گئی کہ ہمیں کچھ درکار نہیں۔

"وقتے کہ میدان ہندوستان از بیگانگاں دشمنان خالی گردیدہ و تیر سعی ایشاں بر ہدف مراد رسیدہ۔ آئندہ مناصب ریاست و سیاست بطالبین آں مسلم باد۔ و بیخ شوکت و سطوت ایشاں محکم شود"۔

(نقشِ حیات جلد دوم)

جب ہندوستان ان بیگانے دشمنوں سے خالی ہو جائے گا تو سیاست و ریاست اربابِ حکومت کو مبارک ہو، اور ان کی شوکت و حشمت کی جڑ مضبوط ہو"۔

آگے اور وضاحت کر دی ہے کہ ہم تو صرف اتنا چاہیں گے کہ اسلام کی خدمت آزادی سے کرتے رہیں اور آپ ہماری دل و جان سے مدد کرتے رہیں۔

Marfat.com

بہرحال جس طرح اس مقدّس جماعت نے جہادِ حریّت کے لئے قدم بڑھایا تھا، مشترک جدّ و جہد کا تصوّر بھی اسی نے پیدا کیا۔ جو اس وقت اگرچہ کامیاب نہیں ہو سکا لیکن چند دنوں بعد یہی تخم بار آور ہوا۔[1]

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے

الحاق - لاخراجی زمینوں کی ضبطی - جیل خانوں میں ایک کھانا - فوجی بھرتی میں سمندر پار جانے کی شرط - نکاح بیوگان - گھی میں چربی اور آٹے میں ہڈیوں کی راکھ کا پراپیگنڈہ - چپاتیوں کی تقسیم اور چربی لگے ہوئے کارتوسوں کے افسانے اور اُن کے اثرات - پیشینگوئیاں - شاہِ ایران اور شاہِ روم سے غلط توقعات وغیرہ وغیرہ -

(شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب کے الفاظ میں)

(۱)

برٹش گورنمنٹ کے کاموں کی شرحیں عجیب عجیب رنگ سے ہوتی تھیں - بڑی ذہانت سے قصّے اور افسانے بنائے جاتے - جن کا مطلب یہ ہوتا کہ سپاہی کے دل میں بے چینی پیدا ہو اور وہ گورنمنٹ کی وفاداری اور جاں نثاری سے دستبردار ہو

---

[1] ایک عجیب بات ہے کہ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک جو آزادی کی تحریک چلتی رہی اس میں جمعیۃ علماء کا نظریہ یہی رہا کہ جدّ و جہد آزادی ایسا فرض ہے کہ ہندو مسلم حقوق کے تصفیہ پر اس کو موقوف نہیں رکھا جا سکتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہی سبق تھا جس کی تعلیم حضرت سیّد احمد صاحب کے کردار سے حاصل کی تھی۔ مسلمانوں کی بعض دوسری جماعتیں تصفیہ حقوق کو مقدم قرار دیتی رہیں اور اس بہانہ انگریزی سامراج کے ہاتھوں میں کھیلتی رہیں۔ محمد میاں۔ [2] بہت پہلے کے واقعات کا اجمالی ذکر وجوہات و اسباب کے سلسلہ میں گذر چکا ہے۔

Marfat.com

گو یہ سب باتیں مختلف راگوں میں گائی جاتیں مگر سب کا سم اس پر ٹوٹتا کہ سپاہی کو یہ سمجھایا جائے کہ انگریزوں کی کل تدابیر کا مآل یہ ہے کہ جات کو بالکل غارت کر دیں اور کُل مُلک میں عیسائی مذہب کو داخل کر دیں۔

الحاق | جب کوئی صوبہ الحاق کیا جاتا تو یہ کہا جاتا کہ اسے عیسائی بنانے کے لئے آسانی ہوئی کہ بہت سے آدمی عیسائی ہو جائیں گے۔

معافیات کی ضبطی | لاخراجی زمینوں کی ضبطی کا مطلب یہ بیان کیا جاتا تھا کہ ملک میں تمام مذہبی اوقاف کا نام نہ رہے۔

سرکاری قانون | سرکاری قانون جو جاری ہوتے، اُن کا مطلب یہ ہی بیان کیا جاتا کہ ہندو مسلمانوں کے مذہب تہ و بالا ہو جائیں۔

تعلیم | تعلیم کی تمام تدابیر کو کہتے تھے کہ یہ تو براہِ راست ملک کے مذہب پر حملہ ہے۔

جیل خانوں میں ایک کھانا | تعزیرات کے نظام کو بتاتے تھے کہ وہ جات کے برباد کرنے کے لئے ہے۔ جیل خانوں میں دیکھ لو، سب کا کھانا پینا ایک کر دیا۔

چھاؤنی کی ہر لین میں اس قسم کے آدمی تھے جو سپاہیوں کو ان جھوٹی باتوں کی تعلیم کرتے تھے اور اس کے ساتھ یہ یقین دلاتے تھے کہ عنقریب وقت آنے والا ہے کہ ایک فرنگی زندہ باقی نہیں رہے گا۔ نئی سلطنت قائم ہو گی۔ سپاہ کا نیا انتظام ہو گا۔ جس میں سارے اعلیٰ عہدے، جن کا فرنگیوں نے اجارہ لے رکھا ہے وہ سب ہندوستانیوں کو ملیں گے[1]

(۲)

سمندر پار جانے کی شرط اور نکاحِ ثانی | اس زمانہ میں سپاہ کی بھرتی ہونے سمندر پار جانے کی شرط کا داخل ہونا اور بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی کا قانون اس بات کے سمجھانے کے لئے کافی تھا کہ یہ باتیں اس تدبیر کا جزو ہیں جو ہندوستانیوں

---

[1] تاریخ عروج انگلیشیہ ص۱۵۲ و ص۱۵۳۔

Marfat.com

کو عیسائی بنانے کے لئے گورنمنٹ کر رہی ہے[1]۔

خوراک میں آمیزش کا پراپیگنڈہ لارڈ کیننگ پر خوب ظاہر ہوگیا کہ ہندوستانی سپاہ کے دلوں میں نہایت بُرے شبہات نے خوب جڑ پکڑ لی ہے۔ پھر اُنہوں نے سپاہ کی ناراضی کے آثاروں بڑی توجہ کی، تو یہ معلوم ہوا کہ شُبہات فقط سپاہی کے دلوں میں نہیں تھے بلکہ عموماً آدمیوں کے دل بے چین ہو رہے تھے۔ صرف میرٹھ ہی میں نہیں بلکہ مُلک کے اور اطراف میں بھی یہ یقین تھا کہ دونوں ہندو مسلمانوں کے دین کو انگریزوں نے بگاڑنے کی تجویز کی ہے کہ اُن کی روزانہ خوراک کو ممنوع و حرام چیزوں سے ناپاک کر دیں۔ اب اس خوراک کے ناپاک کرنے کی بہت سی صورتیں بیان کی جاتی تھیں کہ برٹش گورنمنٹ نے سرکار کمپنی اور ملکہ معظمہ کے حکم سے پسی ہوئی ہڈیاں، آٹے اور نمک میں ملا دی ہیں کہ وہ بازاروں میں فروخت ہوں۔ اور گھی میں جانوروں کی چربی ملا دی ہے۔ اور شکر کو جلی ہوئی ہڈیوں سے صاف کیا ہے۔ اور کنوؤں میں سؤر اور گائے کا گوشت ڈلوا دیا ہے تاکہ پانی پینے کا نجاست آلود ہو جائے۔ یہ چکنے کارتوس تو فقط مذہب خراب کرنے کی تدبیر کا ایک جزو تھا جو سپاہ کے ساتھ مخصوص تھا۔ یہاں تو گورنمنٹ سب ہندو مسلمانوں کے مذہب بگاڑنے کی تجویز کر رہی ہے اور یہ کہانی بھی گھڑی گئی کہ بڑے بڑے صاحبوں نے حکم دیا ہے کہ تمام سلاطین و امراء و تعلقہ دار و زمیندار و روساء اہلِ تجارت، و اہلِ زراعت سب انگریزی روٹی کھائیں اور ان جھوٹ موٹ کہانیوں

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ صفحہ ۳۰۰۔ [2] لارڈ ڈلہوزی جسے اپنے کارناموں کی بنا پر خود یقین تھا کہ ہندوستان میں یورپین آتش فشاں پہاڑ پر بیٹھے ہیں۔ مارچ ۱۸۵۶ء میں یہاں سے واپس ہوا۔ اس کی جگہ لارڈ کیننگ وائسرائے ہو کر آیا۔ جس نے یورپ سے روانگی سے کچھ پہلے ایک وداعی پارٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ میری خواہش ہے کہ میرا عہدِ حکومت پُر امن رہے لیکن میں اس بات کو نہیں بھول سکتا کہ ہندوستان کی فضا میں بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دکھائی دے گا، اتنا چھوٹا جتنا کہ انسانی ہاتھ۔ لیکن یہ ٹکڑا اتنا بڑا ہوتا جائے گا کہ خود ہمارا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔
(تاریخ عروج عہد انگلیشیہ صفحہ ۲۶۷۔ کمپنی کی حکومت صفحہ ۳۵۰)

Marfat.com

میں آرد استخوان آمیز کی کہانی ہندوستانیوں کے دلوں میں بڑی مؤثر تھی وہ اپریل کے شروع میں بارک پور میں مشتہر ہوئی تھی۔ اس مہینے میں یہ وبا بالا ہند میں پھیلی۔ کانپور میں آٹا مہنگا ہوگیا تھا۔ میرٹھ کے بنیوں نے گورنمنٹ سے چند کشتیاں کرایہ پر لے کر اس میں آٹا لاد کر کان پور بھیجا۔ پہلی دفعہ جب یہ آٹا کان پور میں آیا تو سستا ہونے کے سبب سے فوراً بک گیا۔ لیکن جب اور آیا تو یہ گھڑت ہوئی کہ نہر کی پن چکیوں میں یورپین کے اہتمام سے گیہوں پیسے گئے ہیں اور اس میں گائے کی ہڈیوں کی خاکستر ملا دی گئی ہے تاکہ ہندوؤں کی جات آٹے کھانے سے جاتی رہے۔ اس بات کی شہرت کانپور کی بستیوں اور بازاروں میں ایسی ہوئی کہ میرٹھ کے آٹے کا بکنا موقوف ہوگیا۔ کوئی ایک سپاہی اُس کو ہاتھ نہ لگاتا تھا اور نہ کوئی آدمی اس کو خریدتا تھا اگرچہ وہ کانپور کے بازار کے آٹے سے سستا بکتا تھا۔ یہ خبر ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی میں پہنچی۔ آٹے کا وہم یہانتک لوگوں دلوں پر چھایا کہ انہوں نے آٹا کھانا چھوڑ دیا۔ جو روٹیاں پکی ہوئی تھیں، اُن کو پھینک دیا۔ غرض لوگوں کے دِلوں میں یہ نقش کالحجر ہوگیا کہ گورنمنٹ اُن کی جات اور مذہب خراب کرنے کی تدبیر کر رہی ہے۔

(۴)

چپاتیوں کی تقسیم اور اُس کی توجیہات لارڈ کیننگ کو یہ یقین ہوگیا کہ رعایا کو بڑا خوف لگ رہا ہے کہ گورنمنٹ اُن کے مذہب بگاڑنے کے درپے ہے۔ اس لئے وہ اس سے بڑی نفرت و عداوت رکھتے ہیں۔ یہ خیال کرکے اُنہوں نے ایک دوسری کہانی پر جو چپاتیوں کی تقسیم سے متعلق تھی، توجہ کی۔ ممالکِ مغربی سے ان چپاتیوں کی تقسیم کی خبر پہنچی۔ جن کی وجہ اُن کے بڑے بڑے تجربہ کار مشیر بھی نہیں بتا سکے۔ یہ چپاتیاں دہ بدہ (گاؤں گاؤں) اس طرح بٹیں کہ ایک شخص اُن کو ایک گاؤں میں زمیندار کو دے جاتا، اور اُس سے فرمائش کر جاتا کہ تم دوسرے گاؤں میں ان کو بھیج دینا۔ بس اس طرح یہ چپاتیاں دہ بدہ گشت کرتی پھرتیں۔ ان کے باب میں نہ کوئی

Marfat.com

سوال کرتا، نہ کوئی سمجھتا کہ وہ کہاں سے آئی ہیں اور کیوں آئی ہیں۔ بے سمجھے دوسرے گاؤں میں بھیجنے کے حکم کی اطاعت کی جاتی۔ ایک مدّت کے بعد گورنمنٹ کے عہدہ داروں کو خبر ہوئی۔ بعض نے اس پر بہت بعض نے تھوڑا خیال کیا۔ ہر ایک نے اپنی طبیعت اور ذہانت کے موافق اس کے مختلف سبب بیان کئے۔

اوّل مسٹر فورڈ کلکٹر گوڑگانوہ نے ممالک مغربی و شمالی کے لفٹننٹ گورنر مسٹر کالون کو ان چپاتیوں کا حال لکھا۔ اُنہوں نے حکّام اضلاع کے نام سرکلر جاری کئے۔

دہلی کے بادشاہ کی تحقیقات جُرم میں یورپین اور ہندوستانی گواہوں کے اظہارات میں تفتیش کی گئی کہ چپاتیوں کی تقسیم کا راز کھلے مگر وہ نہ کھلا۔ بہت سے افسروں نے بیان کیا کہ وہ صرف اس بات کی نشانی ہے کہ آئندہ جو کوئی حادثہ عظیم واقعہ ہونے والا ہے اس کے لئے عین وقت پر سب تیار رہیں۔ ایک بڑے مستند حاکم نے گورنر جنرل کو لکھا کہ مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ چپاتی آدمیوں کی خوراک کی ایک علامت ہے۔ اس کے گشت لگانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمیوں کو چونکا دے اور اُن کے دلوں پر اثر کرے کہ اُن کی خوراک حاصل کرنے کے وسائل چھن جائیں گے۔ اس لئے ان کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ سب آپس میں متّفق رہیں۔ دوسرے افسروں نے اس خیال کی بڑی ہنسی اُڑائی اور بیان کیا کہ وہ کل مُلک کے اوہام میں سے ہے۔

یہ بھی کہا گیا کہ یہ ہندوؤں کی عادت کے موافق ہے۔ جب کسی ہندو کے خاندان میں بیماری ہوتی ہے تو وہ چپاتیاں اس لئے تقسیم کرتا ہے کہ اس کے گھر سے بیماری کو چپاتیاں اپنے ساتھ باہر لے جائیں۔ یا جب کسی گروہ میں ہیضہ پھیلتا ہے یا وبائیں آتی ہیں۔ تو وہ بھی اس طرح کا ٹوٹکا کرتے ہیں۔ اور آدمی یہ یقین کرتے تھے کہ برٹش گورنمنٹ کے دشمنوں نے اس مطلب کے لئے تقسیم کیا ہے کہ جھوٹی باتوں کو جو انہوں نے پھیلا رکھا ہے، ان کے ساتھ یہ خوفناک دروغ بھی منسلک ہو جائے۔ جس کا اثر یہ ہو کہ اُن میں گائے کی پسی ہوئی ہڈیاں ہیں اور انگریزوں نے ان لوگوں کے مذہب بگاڑنے کی ترکیب کا تتمّہ ان کو

Marfat.com

بنایا ہے۔

بعض لوگوں نے اٹکل سے یہ کہا کہ جیل خانوں میں بعض دفعہ مراسلت اس طرح کی جاتی ہے کہ جس کو "پنج کوڑی خاں" نے ظاہر کیا تھا کہ جب کوئی قیدی سپاہیوں کی سنگینوں تلے مقید ہوتا ہے تو اس کو روٹی کھانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ روٹی پکانے والے کو رشوت دی جاتی ہے اور ایک چھوٹا سا رقعہ چپاتی میں رکھ دیتا ہے یا رکابی پر کوئی فقرہ لکھ دیا جاتا ہے۔ پس جب قیدی روٹی کھاتا ہے تو اُس کو پڑھ لیتا ہے۔ پس اس طرح ان چپاتیوں کے اندر بغاوت آمیز، فتنہ انگیز خطوط ہیں جو دہ بدہ (گاؤں گاؤں) اس طرح پہنچائے جاتے ہیں اور اُن کو گاؤں کا ایک سردار پڑھ کر اُن پر آٹا لپیٹ کر اور چپاتی بنا کر دوسرے کے پاس بھیج دیتا ہے جو اس کو کھول کر پڑھ لیتا ہے۔

کپتان کیٹنج لکھتے ہیں کہ چپاتیوں کا گشت ۱۸۵۷ء کے شروع سے شروع ہوا۔ بنارس سے اس کا آغاز ہوا ہے کہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں وہ بھیجی جاتی ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شمالی ہند میں بھی یہی حال ہوا ہے اور وہ ایک بلوہ کی علامت بتائی گئی ہے جو اس سال میں پیچھے واقع ہوگا۔ جب وہ بنارس میں نمایاں ہوئی ہیں تو وہ سب جگہ اندور کی طرف سے آتی تھیں۔ اندور میں اس وقت ہیضے کی وبا سخت پھیل رہی تھی اور ہر روز شہر میں بہت سے آدمی مرتے تھے۔ بیمار کے آدمی یقین کرتے تھے اور اب بھی یقین کرتے ہیں کہ گیہوں کی چپاتیاں ایسے منتروں کے پڑھنے کے بعد جن سے یہ یقین ہو کہ وہ وبا کو ساتھ لے جائیں گی، باہر تقسیم ہوتی ہیں۔

چپاتیاں شمال سے جنوب کو براہِ راست نہیں آتی تھیں وہ باجانگر میں بھی ۹ فروری کو آئیں جو گوالیار اور اندور کے عین وسط میں واقع ہے اور مندسور میں وہ ۱۲ جنوری ۱۸۵۷ء کو تقسیم ہوئیں۔ جب گاؤں میں سیتلا بچوں کو نکلتی ہے تو ایک مینڈھا لیتے ہیں اور اس کے گلے میں ناریل ڈالتے ہیں اور چوکیدار اس کو "من داتا" کی سڑک پر جو گاؤں اوّل آتا ہے لے جاتا ہے، اور اس کو بستی کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ پھر اسی طرح ایک گاؤں سے

Marfat.com

دوسرے گاؤں میں مینڈھا پھرتا رہتا ہے، اس کو قرار نہیں ہوتا۔ یہ ترکیب دھرم شاستر میں لکھی ہے۔ میجر آرمسکن، کمشنر ساگر و نربدا، رپورٹ بھیجتے ہیں کہ کہ جنوری ۱۸۵۶ء کے پیچھے تک چپاتیاں ایک راز کے طور پر اکثر اضلاع میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں گشت کرتی رہیں۔ اگرچہ اس کو کسی آنے والی بات کی نشانی جانتے ہیں لیکن کُل قسمت میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا کارسازی کرتی ہیں یا کہاں سے وہ آتی ہیں اور اُن کی نسبت بہت ہی کم خیال کیا جاتا ہے۔ الاساگر کے مہاجنوں کے بازار میں کچھ تھوڑا سا اثر ہنڈویوں کے معاملہ میں کرتی ہیں۔ میں اس معاملہ کی رپورٹ گورنمنٹ کو کر رہا ہوں لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ کوئی شخص ان چپاتیوں کے اسرار سے واقف کار ہو، یا ان کو وہ آئندہ سرکشی کی طرف راجع جانتا ہو۔ اگرچہ اب ہماری رائے اس کی نسبت یہی ہو۔

غرض بعض ان چپاتیوں کے گشت کرنے کو بے معنی جانتے تھے۔ بعض اس کے معنی عظیم جانتے تھے۔ آئندہ زمانہ نے بھی کوئی معنی اُن کے روشن نہیں کئے۔ ابتک اس کے معانی میں اختلافات چلے آرہے ہیں۔ بعض مؤرخین یہ لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں ایک مولوی نے ان چپاتیوں کو تقسیم کیا تھا اور اس کا مطلب جہاد تھا۔ "مارا گھونٹا پھوٹی آنکھ"۔

غرض ان چپاتیوں کی بابت قیاسات تو بہت گھڑے گئے۔ مگر کوئی رازداں ایسا نہیں ملا کہ وہ تاریخ میں لکھنے کے قابل افشاءِ راز کرتا۔ اب تاریخ صرف اس یقینی امر کو بیان کرتی ہے کہ یہ عجیب چپاتیاں جہاں ایک مقام سے دوسرے مقام کو جاتیں تو وہاں نئی برانگیختیاں اور فضول توقعیں (توقعات اور اُمیدیں) پیدا ہوتیں[1]۔

ان بہت سے خیالات میں غالباً سب سے صحیح وہ ہے جو مولوی کی طرف منسوب کیا گیا۔

چپاتیاں بٹنے کا واقعہ ہندوستان میں نیا نہیں تھا۔ سنتھالیوں کی بغاوت سے پہلے سال کے درخت کی ٹہنیاں گاؤں گاؤں بھیجی گئی تھیں۔ مرہٹوں نے جب شمالی

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۳۴۲ تا ص۳۴۵۔

Marfat.com

علاقے پر حملے کئے تو اس سے پہلے روٹی پر جوار کی ٹہنی رکھ کر بانٹی گئی تھی۔

بعض جگہ ان پر بکری کے گوشت کی بوٹیاں بھی رکھ دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے محاورات میں چپاتیاں بٹنا اور کچے گوشت کا اس پر رکھا ہونا، قلع قمع کر دینے، کچا چبا ڈالنے اور کلی طور پر استیصال کی علامت مانی جاتی ہے۔

ساورکر کا خیال یہی ہے کہ مختلف طبقات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی تھی۔ بنگال میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ایک خاص قاصد ہر ایک چھاؤنی میں جاتا، سب سے بڑے ہندوستانی افسر سے ملتا اور اُسے سُرخ کنول کا پھُول دکھاتا۔ افسر وہ پھُول پاس کے سپاہی کو دے دیتا۔ اور اسی طرح پھُول ایک ایک سپاہی کے ہاتھ میں پہنچتا۔ یہ پھُول نشان تھا صفائی، پاکیزگی، فتح اور شادابی کا۔

(۵)

پیشین گوئیاں اخباروں میں ولیوں کی پیشین گوئیاں بھی برٹش گورنمنٹ کے ختم ہونے کی چھاپی جاتی تھیں۔

اخباروں میں سیّد نعمت اللہ شاہ متخلّص ولی ہانسوی کے قصیدہ کے اشعار لکھے جاتے تھے۔

یہ قصیدہ بھی عجیب ہے، جو واقعات واقع ہوتے جاتے ہیں منظوم ہو کر اس قصیدے کے دُم چھلّا بنتے جاتے ہیں، اور وہ ولی کی پیشین گوئیاں یقین کی جاتی ہیں۔ جن اشعار میں اس زمانہ کے لئے پیشین گوئیاں کی گئیں، وہ یہ ہیں:

قوم سکھاں چیرہ دستیہا کند بر مسلماں
تا چہل ایں جور و بدعت اندراں پیدا شود
بعد ازاں گیرد نصاریٰ مُلک ہندوستان تمام
تا صدی حکمش میاں ہندوستان پیدا شود

Marfat.com

چوں شود عہدِ آں با جور و بدعت را رواج
شاہِ عربی بحرِ قتلش خوش عنان پیدا شود
درمیانِ ایں و آں گردد بسے جنگِ عظیم
قتلِ عالم بے گماں درعہدِ شان پیدا شود
فتح یابد شاہ درویشاں بزورِ تیغ جہد
قوم عیسیٰ را کش او بے گماں پیدا شود
پانصد و ہفتاد و ہجری بود تا ایں گفتہ شد
در ہزار و درصد و ہفتاد آں پیدا شود[1]

(۶)

شاہِ ایران اور شاہِ روم سے غلط توقعات انگریزی کتابوں میں لکھا جاتا ہے

"جب شاہِ ایران سے ۱۸۵۶ء میں انگریزوں کی لڑائی ہوئی تو اُس نے اپنے ہی جاسوس شاہِ دہلی کے پاس بھیجے کہ وہ انگریزوں کے ساتھ لڑائی کرے اور ہم دونوں آپس میں متحد ہو جائیں۔ جس سے اُمید ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی سلطنت قائم ہو جائے گی اس لئے ایک اشتہار تیار ہوا۔ اور وہ دہلی اور جامع مسجد کی دیواروں پر چسپاں ہوا اور یہ شہرت بھی ہوئی کہ خلیج فارس میں انگریزوں کو بڑی شکست فاش ہوئی ہے۔ اور یہ بات مشہور ہوئی کہ انگلش یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم نے امیر دوست محمد خاں کو دوست بنا لیا۔ مگر اصل میں وہ ایران کا زیر فرمان ہے۔ انگریزوں کے ساتھ دوستی اس لئے اختیار کی ہے کہ افغانوں کو انگریز پشاور دے دیں[2]۔

صادق الاخبار وغیرہ میں جو خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں جن کی حقیقت افواہ سے زیادہ کچھ نہ تھی، اُن کا خلاصہ یہ تھا کہ:

"شاہ ایران درہ بولان سے بے مزاحمت اُتر آیا ہے اور اٹک تک

---

[1] تاریخ عروج انگلیشیہ ص۲۸۵ و ص۲۸۶ - [2] ایضاً ص۳۰۱

Marfat.com

آگیا ہے"۔

اصل لڑائی کا حال یہ ہے کہ شاہِ ایران پانچ پیڑھیوں سے خزانے پر خزانے، سپاہ پر سپاہ اور اسباب پر اسبابِ حرب و ضرب اس لئے جمع کر رہا تھا، کہ ہندوستان کو فتح کرے۔ اب لڑائی کا وقت آگیا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ روسیوں نے بہت سا سامانِ جنگ شاہِ ایران کے حوالہ کیا ہے اور پانچ لاکھ سپاہیوں کا لشکرِ جرّار جس کے ساتھ بہت کچھ اسبابِ حرب و ضرب ہے، ایران کی کمک کے لئے بھیج دیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ اس کی یہ سپاہ قواعد داں کافی نہ ہوگی تو بہت سی پولیس کی سپاہ کمک کے لئے اور بھیج دی جائے گی۔ شاہ ایران کے ممد و معاون شاہِ فرانس و سلطانِ روم ہیں۔ اصل جنگ کا سرِ منشاء روس ہے جو ایران کی آڑ میں ہندوستان فتح کرنے کے لئے کارستانیاں کر رہا ہے۔ امیر دوست محمد خاں والئے کابل نے انگریزوں کے ساتھ ظاہری مصالحت اس لئے کر لی ہے کہ اُن سے ہتھیار اور روپیہ لے لے اور ایران کی حمایت میں کام میں لائے۔[1]

جنوری ۱۸۵۷ء سے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء تک

۱۸۵۷ء کا آغاز، کارتوسوں کا قصّہ دل آزار، تکلیف دہ اور ہندوستانیوں کے لئے توہین آمیز واقعات کا سلسلہ جو عرصہ سے چل رہا تھا، وہ دن بدن زیادہ ہوتا رہا۔ حکومت کو بار بار آگاہ کیا لیکن اس کے سول اور ملٹری حکّام نے پتّوں کی کھڑکھڑاہٹ پر کان دھرنے سے انکار کر دیا۔ انہیں اسی وقت ہوش آیا جب طوفان نے درختوں کو اُکھاڑنا شروع کر دیا۔

اس بے چینی نے سب سے پہلے ۲۲ جنوری ۱۸۵۷ء کو ڈم ڈم[2] میں عملی شکل اختیار

---

[1] تاریخ عروج انگلیشیہ ص ۳۰۱۔ [2] ڈم ڈم، کلکتہ سے تقریباً ۱۳ میل۔ آج کل کلکتہ کا ہوائی اڈہ ڈم ڈم میں ہی ہے۔

Marfat.com

کی۔ ڈم ڈم میں مقیم دیسی سپاہیوں نے اپنے انگریز افسر سے شکایت کی کہ ان فیلڈر انفلوں کے لئے جو کارتوس بنائے جاتے ہیں، ان میں گائے اور سؤر کی چربی ہے۔ اس افسر نے حکومت ہند کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔ حکومت نے بعض چھاؤنیوں میں دیسی سپاہیوں کو یقین دلا دیا کہ کارتوسوں میں ممنوعات استعمال نہیں کی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ افواہ بارود کے ڈھیر میں چنگاری کا کام کر چکی تھی۔ بارک پور[1] کے فوجیوں نے بہرام پور[2] کی انیسویں رجمنٹ میں بے چینی کا بیج بو دیا۔ ۱۹ فروری کی رات کو اس رجمنٹ نے مظاہرہ شروع کر دیا۔ کرنل مچل نے فوجیوں سے اس مظاہرہ کا سبب دریافت کیا۔

فوجیوں کا جواب یہ تھا:

"سرکار ہمارا دین بگاڑ رہی ہے"۔

کرنل نے فوجیوں کے سامنے ایک تقریر کی اور یقین کر لیا کہ فوج مطمئن ہو گئی۔ اطمینان کہاں؟ جب لارڈ کیننگ کو بہرام پور کے واقعہ کا پتہ چلا تو اس نے ایک دوسری رجمنٹ کو بارک پور پہنچنے کا حکم دیا۔ نیز بہرام پور کی انیسویں رجمنٹ کو بھی حکم ملا کہ وہ بارک پور پہنچ جائے۔

یہ سلسلہ چل رہا تھا کہ بارک پور کی چونتیسویں رجمنٹ کے ایک فوجی نے پریڈ کے وقت "دین دین" کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو فرنگیوں کے خلاف لڑنے کیلئے اکسایا۔ سارجنٹ میجر موقع پر پہنچ گیا۔ اس فوجی نے اس پر گولی چلا دی۔ وہ بال بال بچ گیا۔ بغاوت کے آثار پا کر جنرل ہرسی موقع پر پہنچ گیا۔ حالات پر قابو پا لیا گیا۔

منگل پانڈے یہ "دین دین" کا نعرہ لگانے والا ایک برہمن تھا۔ "منگل پانڈے" نام اس کا واقعہ یہ تھا کہ فوج کے ایک خلاصی نے جو نیچ ذات کا تھا، اس سے کہا، کہ اپنے لوٹے سے مجھے پانی پلا دے۔ منگل پانڈے نے جواب دیا۔ تو کس ذات کا ہے۔ خلاصی نے طنزاً

---

[1] بارک پور، کلکتہ سے ۱۶ میل۔ [2] بہرام پور، بارک پور سے ۱۰۰ میل۔ نواب بنگال کے قدیم دارالخلافہ مرشد آباد سے چند میل۔

Marfat.com

کہا۔ ذات کیا پوچھتے ہو۔ اب سب ذات پات رکھی رہ جائے گی۔ وہ کارتوس آگئے ہیں جن میں سور اور گائے کی چربی لگی ہے، اُن کو دانت سے کاٹنا پڑے گا۔

بہرحال اس سے اگلے روز اُنیسویں رجمنٹ بھی بارک پور پہنچ گئی تھی۔ اسی شام کو انگریزی سپاہی بھی بارک پور آگئے تھے۔ اگلے دن جرنیل نے گورنر جنرل کا ایک فرمان سُنایا جس میں اُنیسویں رجمنٹ کو توڑ دینے کا حکم تھا۔ ۶ر اپریل کو منگل پانڈے کا مقدمہ شروع ہوا۔ ۷ر کو پھانسی کی سزا تجویز کی گئی اور ۸ر کو اُسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ۲۱ر اپریل کو اُس کے ایک ساتھی ایشوری پانڈے کو پھانسی دے دی گئی۔ اُس کا جرم یہ تھا کہ منگل پانڈے جب فائر کی تیاری کر رہا تھا اور ایشوری سے کہا گیا تھا کہ منگل پانڈے کو گرفتار کرلے تو ایشوری نے تعمیل میں لاپرواہی برتی تھی۔ جب دوبارہ اُس کو حکم دیا گیا تو کہہ دیا۔ منگل پانڈے تو پاگل ہو گیا ہے۔

ایشوری کا جواب یہ تھا کہ میں نے سب سے کہا تھا۔ منگل پانڈے سے بچو اور درخت کی اوٹ میں کھڑے ہو جاؤ۔ منگل پانڈے پاگل ہو رہا ہے۔

چند روز بعد چوبیسویں رجمنٹ کی سات کمپنیوں سے ہتھیار چھین کر انہیں الگ کر دیا گیا۔ حکومت مطمئن تھی کہ بغاوت ختم ہو چکی ہے۔ بغاوت تو ابھی ہونے والی ہے۔

بارک پور کی خبریں کسی قدر مبالغہ کے ساتھ شمالی ہند تک جا پہنچیں۔ اپریل ۱۸۵۷ء کے آخری ہفتہ میں میرٹھ میں ہندوستانی سپاہیوں نے مختلف صورتوں میں بے چینی کا اظہار کیا تھا۔ چونکہ میرٹھ میں انگریزی سپاہیوں کی ایک پوری رجمنٹ موجود تھی اور یہاں کا توپ خانہ پورے ملک میں سب سے بہتر توپ خانہ تھا۔ اس لئے یہاں کے فوجی حکام مطمئن تھے۔ غالباً اسی زعم میں یہاں پر ۲۳ر اپریل کو پریڈ کا حکم نافذ کیا گیا۔ ۲۴ر کو دیسی فوج نے پریڈ کی۔ پریڈ کے بعد حوالدار میجر اور اُس کے اردلی نے اُن کارتوسوں کو چلایا جن کے متعلق خیال تھا کہ اُن کے چلاتے وقت دانتوں سے کاٹنا پڑتا ہے۔ پریڈ ختم ہوئی۔ دیسی سپاہی اپنی بارکوں میں چلے گئے۔ اُسی رات

Marfat.com

اردلی کے خیمہ کو آگ لگا دی گئی۔ اگلے دن دیسی سپاہیوں نے کارتوس لینے سے انکار کر دیا۔ ۲۵ اپریل کو ڈپٹی جج کے سامنے اس معاملہ کی پڑتال کی گئی۔ سپاہیوں نے کارتوسوں کو ناپاک بتایا۔ انہیں سمجھایا گیا کہ کارتوسوں میں ممنوعات استعمال نہیں کی گئیں۔ سپاہیوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ ان کارتوسوں کو استعمال کریں گے۔

سپاہیوں کے سامنے بڑی پریشانی یہ تھی کہ کارتوسوں کے خلاف پروپیگنڈہ اتنا زیادہ کر دیا گیا تھا کہ اگر فوج کے سپاہی مطمئن ہو کر کارتوسوں کو لے بھی لیتے تو فوج سے باہر اُن کی بات ماننے والا کوئی نہیں تھا۔ اُن کی ذات، برادری کے آدمی بھی اُن سے نفرت کرنے لگتے۔

فوجی اس تصور سے لرز جاتے تھے۔ وُہ زار زار روتے تھے کہ اگر ہم کارتوس لے لیتے ہیں تو ذات برادری سے خارج ہوتے ہیں۔ اپنے عزیزوں سے چھوٹتے ہیں۔ جینا برباد اور موت کے ایمان اور دھرم کا خطرہ۔ اور اگر نہیں لیتے تو سرکار کے باغی ٹھہرتے ہیں۔

ادھر ہر سفید چمڑی والا اقتدار کے نشہ میں ایسا مدہوش تھا کہ غیر مشروط وفاداری کے سوا کسی بات کے ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دلوں کی بے چینی زبانوں تک، اور زبانوں سے بڑھ کر ہاتھ پاؤں تک پہنچ چکی ہے۔ چھاؤنیوں کی بیرکوں میں آگ لگنے کا سلسلہ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ آگ لگانے والوں کا پتہ کیسے چلتا۔ جب پتہ چلانے والے خود مجرم تھے اور کوئی گواہی دینے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود فتوحات کے غرور نے گردنوں کو اتنا سخت کر دیا تھا کہ وہ کسی طرح خم ہونے کو تیار نہ تھیں۔

مختصر یہ کہ ۶ مئی کو میرٹھ چھاؤنی میں پریڈ کرائی گئی۔ ہر ایک فوج سے پندرہ پندرہ آدمی منتخب کئے گئے۔ کُل نوّے آدمی پریڈ میں موجود تھے۔ کارتوسوں کی تقسیم کا حکم دیا گیا۔ پانچ کے سوا سب نے انکار کر دیا۔ جن میں اونچاس ۴۹ مسلمان[1] تھے، ۳۶ غیر مسلم۔

۹ مئی فیصلہ سُنانے کا دن تھا۔ پُوری فوج پریڈ پر حاضر تھی۔ سب کے سامنے بہت بلند

---

[1] غلام رسول مہر صاحب نے اپنی تصنیف ۱۸۵۷ء میں ان کے نام بھی نقل کر دیئے ہیں۔ ۱۲

Marfat.com

آواز سے سزا کا حکم سُنایا گیا۔ دس دس سال قید بامشقت۔ پھر فوراً ہی فوجی نشان چھین لئے گئے۔ اُن کی وردیاں پُشت کی طرف سے پھاڑ دی گئیں۔ پھر لوہار آگے بڑھے۔ چند لمحوں میں یہ بے داغ، وفادار سپاہی بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

یہ نظارہ بہت ہی حسرت ناک اور اشتعال انگیز تھا۔ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے سپاہیوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، وہ ساتھی جو اُن کو عزّت کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ یہ اپنی اپنی لین میں باعزّت تھے، فوج میں نام آور رہے تھے۔ پاس انگیز نگاہوں نے اشاروں ہی اشاروں میں بغاوت کا سبق پڑھا دیا۔ مگر گرداگرد تیار توپ خانہ کی موجودگی میں سرکشی کا تصوّر بھی خودکُشی تھا۔

اس کے بعد ان پچاسی ۸۵ جوانوں کو پا پیادہ شہر کے جیل خانہ میں پہنچا دیا گیا۔ جدھر سے یہ سپاہی گذرتے تھے، اُن کے مایوس دلوں کی سوزش ہندوستانی غیرت و حمیّت کی ٹوٹی جھونپڑیوں میں چنگاریاں چھوڑتی جاتی تھی۔ عورتیں بھی بے تاب ہو کر چیختی تھیں۔ اگر مردوں میں اُن کے چھڑانے کی ہمّت نہیں ہے تو چوڑیوں اور مہندیوں کا تبادلہ کر لیں۔ چوڑیاں وہ پہن لیں اور تلوار ہمارے ہاتھ میں دیں۔ ہم دکھا دیں گے غیرت کس چیز کا نام ہے اور حمایت کس طرح کی جاتی ہے۔

کیا آج کے آفتاب کے بعد بھی آفتاب طلوع ہوگا۔ آفتاب ضرور طلوع ہوگا، مگر اب اس کی چلکتی ہوئی دھوپ اور نوکیلی کرنیں انگریزی اقتدار کی جڑیں اُکھاڑنے کے لئے کام میں لائی جائیں گی۔ یہ تجویز دُکھی دلوں کی پوری تائید کے ساتھ بلا کسی کانفرنس کے پاس ہو گئی۔

۱۰ مئی اتوار کا دن۔ صبح کا سہانا وقت ختم ہوا۔ جیسے جیسے درجۂ حرارت بڑھنے لگا، جذبات کے تنور دہکنے لگے۔ کہا جاتا ہے ۳۱ مئی بغاوت کے لئے متعیّن تھی۔ مگر جس کو شام کرنی مشکل تھی وہ ۳۱ مئی کا انتظار کہاں تک کرتا۔

آفتاب دن بھر کی بکھرتی ہوئی کرنوں کو ابھی سمیٹنے نہیں پایا تھا۔ گرجا میں شام کا

Marfat.com

گھنٹہ بجنا شروع ہی ہوا تھا کہ بغاوت کا آتش فشاں انگارے اُگلنے لگا۔

ایک دستہ نے بیرکوں کو آگ لگائی، دوسرا جیل خانہ کی طرف دوڑا۔ کل جن کی مدد نہ کر سکے تھے، آج اُن کی بیڑیاں کاٹ ڈالیں۔ جیل خانے کے جنگلے توڑ کر آٹھ سو اخلاقی قیدیوں کو بھی رہائی کا فیصلہ عملاً سُنایا گیا۔

دہلی چلو بغاوت کر دی۔ بارکیں پھونک دیں۔ قیدی چھڑا لئے۔ جو انگریز سامنے آیا، اُسے گولی کا نشانہ بنایا۔ اب کیا کرنا ہے؟ یہاں انگریزی فوج موجود ہے۔ اُس کے پاس بہترین توپ خانہ ہے وہ آناً فاناً سب کو توپ دم کر سکتے ہیں۔ اب کیا کیا جائے اور کس طرح کیا جائے؟ جوش اور وحشت سے لبریز دماغوں کا یہ سوال تھا۔

جواب ایک تھا: دہلی چلو۔ اور اتنا تیز چلو کہ انگریزوں کی تیاری سے پہلے ایک منزل طے کر لو، اور صبح کو جمنا کے پانی سے وضو کرو اور اشنان کر لو۔ چلتے چلتے یہ باتیں طے ہو گئیں۔

دہلی میں اِنقلابی فوج کی آمد

باغی سپاہی جو دن چھپنے کے بعد میرٹھ سے چلے تھے، صبح سویرے دہلی پہنچ گئے۔ کہیں آرام کرنا اور سانس لینا تو درکنار، کھانے پینے سے بھی بے نیاز۔

مئی کا مہینہ، چاند کی سولھویں رات، دن گرم، رات خوشگوار، جوشِ جنوں نے قدموں کی رفتار بڑھا دی یا زمین کی طنابیں کھینچ دیں کہ نو گھنٹے میں پا پیادہ چوالیس میل طے کر لئے۔

غلطی اور غفلت مثل مشہور ہے "چوں قضا آید طبیب ابلہ شود"۔ قضا اور تقدیر کو کوئی مانے یا نہ مانے، لیکن تاریخ کا یہ کس قدر عجیب و غریب سانحہ ہے کہ میرٹھ میں انگریزی سپاہیوں کی پوری رجمنٹ اور پورے ہندوستان کا سب سے بہتر توپ خانہ موجود تھا جو دنیا کے بہترین توپ خانوں میں شمار ہوتا تھا۔ ادھر دہلی میں

Marfat.com

فوج کی ایسی بڑی جمعیۃ جو باغیوں پر دہلی کے دروازے بند کر سکتی تھی، حاضر تھی لیکن میرٹھ چھاؤنی کے افسران کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ وہ حیران اور ایسے بدحواس ہو گئے کہ یہ بھی نہ معلوم کر سکے کہ انقلابی فوج کس طرف گئی[1]

اور جب حواس ٹھکانے ہوئے تو بر سبیل احتیاط یا کسی یقین کی بنا پر دہلی تار دیا تار[2] فوراً پہنچ گیا مگر سائمن فریزر (ریزیڈنٹ کمشنر دہلی) جن کے نام تار تھا، نیند یا نشہ میں ایسے بے خود تھے کہ تار کو بغیر پڑھے جیب میں رکھ لیا اور سو گئے۔

انقلابی فوج دہلی میں ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء، ۱۶ رمضان ۱۲۷۴ھ دوشنبہ کے دن صبح کے سہانے وقت جمنا کے ایک کنارے لال قلعہ کی سُرخ و سپید بُرجیاں، اور اُن کے سنہرے کلس آفتاب کی کرنوں سے شوخیاں کر رہے تھے اور دوسرے کنارہ پر جوش و خروش سے وارفتہ انقلابی فوج بے چینی سے گذرگاہ تلاش کر رہی تھی۔

---

[1] روایت ہے کہ ہندوستانی رسالہ کا انگریز کمانڈر کرنل اسمتھ بغاوت کی خبر سُنتے ہی جان بچانے کے لئے کہیں چھپ گیا اور جب توپ خانہ کے کمانڈر نے توپیں تیار کرائیں، ہندوستانی فوج دلی کے راستہ پر بہت دُور نکل چکی تھی۔ انگریزی فوج کو بہانہ ہاتھ آگیا۔ وہ بجائے تعاقب کے چھاؤنی میں پڑ کر سو گئی۔ [2] ایک روایت یہ بھی ہے کہ کسی ہندوستانی کو کافی رقم دے کر بھیجا گیا تھا اور صبح کے وقت محکمہ تار کا انگریز افسر ٹاڈ جو جمنا کے کنارے پر مارا گیا تھا۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وُہ یہاں اس لئے آیا تھا کہ تار کی لین خراب ہو گئی تھی، اُس کو درست کرنا تھا۔ یہ اس امر کا قرینہ ہے کہ تار باغی فوج نے کاٹ ڈالے تھے لہٰذا میرٹھ سے تار نہ ہو سکا تو کسی آدمی کو بھیجا گیا۔ مگر یہ روایت اس لئے صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ سائمن فریزر کے پاس اطلاع رات ہی کو پہنچ گئی تھی۔ پس تار کاٹنا اگرچہ قرین قیاس ہے مگر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ ایک دو بجے رات تک کوئی آدمی میرٹھ سے دہلی گیا ہو۔ نیز اگر تار رات ہی کو کٹ گئے تھے تو انگریز افسر کو اسی وقت دیکھنا تھا صبح کا انتظار کرنا غلط تھا۔ اس بنا پر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ تار صبح کے وقت یا آخر شب میں کاٹے گئے اور اس سے پہلے میرٹھ سے تار دینا اور دہلی تار پہنچ جانا دونوں قرین قیاس ہیں حقیقت رہے کہ اپنی کوتاہیوں کو چھپانے کیلئے طرح طرح کی باتیں بنائی گئیں۔ محمد میاں۔

Marfat.com

اسی کنارہ پر پرمٹ کی چوکی تھی۔ باغی فوج نے اس میں آگ لگائی۔ کلکٹر کو مارا۔ پھر کشتیوں کے پُل پر پہنچے۔ محکمہ تار کا انگریز افسر، جس کا نام ٹاڈ تھا، سامنے آیا۔ اُس کو قتل کیا۔ کلکتہ دروازہ جو کشتیوں کے پُل کے قریب تھا (موجودہ ریلوے لائن سے شمال کی طرف) اُس نے ان سرفروش انقلابیوں کے استقبال میں تامّل کیا تو سامنے راج گھاٹ کے کھلے دروازے[1] نے اپنی طرف اشارہ کرکے داخلہ کی اجازت دے دی۔ پیادہ اور سواروں کی بھیڑ قلعہ معلّٰی کے جھروکوں کے نیچے سے گذرتی ہوئی آگے بڑھی اور راج گھاٹ کے دروازہ سے شہر میں داخل ہوگئی۔ اب داخل ہونے والی فوج کے داہنے جانب قلعہ تھا اور بائیں جانب کسی قدر فاصلہ سے دریا گنج۔ جہاں کچھ انگریزوں کے بنگلے تھے۔ فوج قلعہ کی طرف بڑھی۔ پھاٹک پر سنتری موجود تھے۔ مگر اشاروں ہی اشاروں میں ایسی باتیں ہوئیں کہ انقلابی فوج بلا مزاحمت قلعہ میں داخل ہوکر بادشاہ کے حضور میں پہنچ گئی۔ اب بادشاہ سے جو گفتگو ہوئی، پہلے اس کو سُن لیجئے۔ راقم الدولہ ظہیر دہلوی جن کا دربار سے تعلق تھا۔ بادشاہ کے حضور میں روزانہ حاضری دیا کرتے تھے اور اس روز اگرچہ باغیوں کے پہنچنے کے وقت وہ دربار میں نہیں تھے۔ مگر تھوڑی دیر بعد ہی پہنچ گئے تھے۔ اُن کے طویل بیان کے کچھ حصّے یہاں نقل کئے جارہے ہیں۔

---

[1] یہ دروازہ موجودہ سنہری مسجد کی سیدھ میں تھا۔ جامع مسجد کے مشرقی صدر دروازہ کے سامنے سے اگر سیدھی سڑک جمنا تک نکالی جائے تو راج گھاٹ کے دروازہ سے گذرے گی۔ اس دروازہ کے کھلنے کے متعلق مختلف روایتیں ہیں کہ کچھ سپاہیوں نے جو پہلے سے سازش میں شریک تھے اُنہوں نے کھول دیا۔ بظاہر صحیح یہ ہے کہ اشنان کے واسطے جانے والوں کے لئے یہ کھلا ہوا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اشنان کے لئے جانے والوں نے زبردستی کھلوایا تھا۔

Marfat.com

انقلابی سپاہی اور بادشاہ بہادر شاہ

دربار میں حاضری، سرپرستی کی درخواست، بادشاہ کا فقرانہ جواب

راقم الدولہ ظہیر صاحب دہلوی کی روایت ہے کہ فوج کے نمائندوں نے بادشاہ سے عرض کیا:

"حضور جہاں پناہ سلامت! آپ دین و دنیا کے بادشاہ ہیں۔ تمام ہندوستان آپ کا محکوم و فرماں بردار ہے۔ آج تک منادی میں پکارا جاتا ہے "خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا حکم کمپنی کا"۔ انگریز لوگ آپ کی طرف سے مالک و مختار ہیں۔ ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں امیدوارِ انصاف ہیں۔ ہم لوگ ملازم انگریزی ہیں۔ ہمیں لوگوں نے اپنی جانیں بیچ کر اور اپنے سر کٹوا کر کلکتہ سے کابل تک چودہ سو کوس میں انگریزی عملداری قائم کرادی۔ اور ہمیں لوگوں کی استعانت و امداد سے تمام ہندوستان پر تسلط ہو گیا۔ یہ ولایت سے کوئی فوج ہمراہ لے کر نہیں آئے تھے۔ سب ہندوستانی فوج کی کارگذاری ہے۔ شہادت کے واسطے ہمارے پاس تمغے موجود ہیں۔ اب چونکہ تمام ہندوستان پر قبضہ اور تسلط انگریزوں کا ہو گیا اور کوئی سرکش باقی نہ رہا۔ اب سرکار کی نیت میں فتور واقع ہوا، اور ہمارے دین و مذہب کے درپے تخریب ہوئی اور چاہا کہ تمام ہندوستان کو عیسائی کرلیں اور ابتداء اس کی فرقہ فوج سے ہونی چاہیئے۔ چنانچہ باہم صلاح کر کے یہ تجویز قرار پائی کہ ایک قسم کی بندوق ایسی ایجاد کی گئی کہ جس میں ٹوٹا یعنی کارتوس دانتوں سے کاٹ کر بندوق کے منہ میں دینا پڑے اور اس ٹوٹے کو جانوروں کی چربی سے

Marfat.com

منڈھوایا گیا۔ اب نہ معلوم وہ جھلّی کس جانور کی ہے۔ وہ بندوقیں ہم لوگوں کو دی گئیں کہ تم کارتوسوں کو دانت سے کاٹ کر بندوقوں میں ڈالو۔ ہم لوگوں نے بالاتفاق ہندو اور فرقہ مسلمان نے تعمیلِ حکم سے انکار کیا کہ ہم ہرگز ہرگز ایسا نہ کریں گے، خواہ سرکار نوکر رکھے یا نہ رکھے۔ فرقہ ہندو کو تو گائے کی جھلّی کا اشتباہ ہوا، اور اہلِ اسلام کو سور کی جھلّی کا۔"

اس کے بعد ظہیر صاحب کی روایت کا خلاصہ یہ ہے:

"اب سرکار کو اپنی بات کی آن تھی، اور ہمیں دھرم اور ایمان کی۔ چار ماہ سے زیادہ ہو گئے یہ نزاع درپیش ہے۔ حکّام کی کمیٹیاں ہو رہی ہیں، اور ہم لوگوں میں بھی سواروں اور پیادوں کی چھاؤنیوں میں جگہ جگہ چٹھیاں دوڑ گئی ہیں کہ یک قلم کُل فوج انکار کر دے اور زیادہ سختی برتی جائے تو ایک معیّن تاریخ پر تمام ہندوستان میں غدر مچا دیا جائے، پھر دیکھو انگریز کیا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مفسدہ کا ظہور اب آکر ہوا، اور اس وقت اس کی بنا اس طرح ہوئی کہ انگریز افسران کو خیال ہوا کہ میرٹھ میں انگریزی فوج بھی کافی ہے اور ہندوستانی فوج بھی وہ ہے جو پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ بھروسے کی اور بہت پُرانی فوج مانی جاتی ہے۔ لہٰذا کارتوس کی مہم اگر یہاں کامیاب ہو جاتی ہے تو پھر پورے ہندوستان میں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ چنانچہ پریڈ کرائی گئی۔"

اس کے بعد ظہیر صاحب نے پریڈ پر کارتوسوں کے پیش کئے جانے، ان فوجیوں کے انکار، پھر انکار کرنے والوں کی سزا وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد تحریر ہے:

باقی ماندہ تقریر سوارانِ باغیہ

بیک گردشِ چرخِ نیلوفری نہ نادر بجا ماند نے نادری

Marfat.com

"جب ہم داخل جیل خانہ ہوئے تو کیمپ میرٹھ میں تہلکہ عظیم برپا ہوگیا، اور گھر گھر کھچڑی پکنے لگی اور باہم صلاح و مشورے ہونے لگے، خصوصاً فرقہ مستورات میں کہ ہمیشہ سے ناقص العقل اور کوتہ اندیش ہوتی آئی ہیں، اُن کو ہرگز اپنے انجام پر نظر نہیں ہوتی۔ اُن میں اکثر عورتیں تھیں، جن کے ورثا محبوس ہوئے تھے، انہوں نے زبانِ طعن و تشنیع سے پنکھا جھل جھل کر نائرۂ فتنہ و فساد کو بھڑکانا شروع کیا اور اُن کی چرب زبانی آتش فساد پر روغن کا کام کر گئی۔ اس موقع پر "دیوانہ را ہوئے بس است" کا مضمون صادق آیا۔ ان عورتوں نے مردوں کو طعنے دینے شروع کئے کہ تم لوگ مرد ہو اور سپاہ گری کا دعوی کرتے ہو، مگر نہایت بزدلے اور بے غیرت اور بے شرم ہو۔ تم سے تو ہم عورتیں اچھی۔ تم کو شرم نہیں آتی کہ تمہارے سامنے تمہارے افسروں کے ہتھکڑیاں پڑ گئیں اور تم کھڑے کھڑے دیکھا کئے اور تم سے کچھ نہ ہو سکا۔ لو یہ چوڑیاں تو تم پہن لو، اور ہتھیار ہم کو دو ہم افسروں کو چھڑا کر لاتی ہیں۔ ان کلماتِ فتنہ انگیز نے اور اشتعالِ طبع پیدا کیا، اور تمام فوج کے دلوں میں جوش و خروشِ مردمی اور مردانگی کی آگ بھڑک اُٹھی اور مرنے مارنے پر تیار ہو گئے اور باہم یہ صلاح قرار پائی کہ شب کو چل کر جیل خانہ توڑ کر افسرانِ فوج کو چھوڑا لاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اس کے بعد انقلابی فوج کے افسروں نے کہا تیس ۳۰ کوس کی مسافت طے کر کے اس وقت ہم یہاں پہنچے ہیں۔ بادشاہ سلامت ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں اور ہمارا انصاف فرمادیں۔ ہم دین پر بگڑ کر آئے ہیں۔

جواب باصواب از جانب بادشاہ عالی جاہ

سُنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے، مَیں تو فقیر ہوں۔ ایک تکیہ

Marfat.com

بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لئے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضہ میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے آباو اجداد کے نوکر چاکر اپنے خداوندانِ نعمت کی اطاعت سے جداگانہ رئیس بن بیٹھے۔ میرے باپ دادا کے قبضہ سے ملک نکل گیا۔ قوتِ لایموت کو محتاج ہو گئے۔"

اس کے بعد بادشاہ نے شاہ عالم کا ذکر کیا کہ کس طرح انگریزوں سے وظیفہ لینا قبول کیا۔ پھر فرمایا:

"لڑائی جھگڑے سے کچھ کام نہیں۔ اس کا انسداد اور انتظام انگریز لوگ خود کریں گے۔ میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں۔ مجھے ستانے کیوں آئے۔ میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا۔ میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمہاری امداد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمہیں نوکر رکھوں گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھ سے کسی طرح کی توقع استعانت کی نہ رکھو۔ تم جانو یہ لوگ جانیں۔ ہاں ایک امر میرے اختیار میں ہے، البتہ وہ ممکن ہے کہ میں تمہارے درمیان میں ہو کر انگریزوں سے تمہاری صفائی کرا سکتا ہوں۔ تم ابھی یہیں ٹھہرے رہو، میں نے صاحب ریزیڈنٹ کو بلوایا ہے۔ وہ میرے پاس آنے والے ہیں۔ پہلے میں ان سے دریافت کر لوں۔ ان کی زبانی مجھے حال فتنہ و فساد کا معلوم ہو جائے گا اور خدا چاہے تو میں اس فساد کو رفع دفع کرا دوں گا۔ غرض یہ گفتگو ہنوز ناتمام تھی کہ سائمن فریزر صاحب ریزیڈنٹ ہمراہی قلعدار صاحب داخل دیوان خاص ہو گئے۔ خواجہ سرا نے جا کر آداب کورنش ادا کیا۔ اندر سے حکم آیا کہ دونوں صاحب محل میں

Marfat.com

حاضر ہوں۔ اس وقت صاحب ریزیڈنٹ بہادر قلعدار صاحب اور احسن اللہ خاں اور محبوب علی خاں ہر چہار اشخاص محل شاہی میں داخل ہوئے۔

حضور پُر نور:

"کیوں[1] بھئی یہ کیا فتنہ و فساد برپا ہو گیا۔ یہ مذہب کا جھگڑا کیسا اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ مقدمہ دین آئین کا ہے تعصب مذہب بہت بُری شے ہے۔ اس میں اکثر سلطنتیں معرضِ زوال میں آگئی ہیں لاکھوں آدمیوں کا کشت و خون ہو گیا ہے۔ اس فتنہ کا جلد انسداد ہونا واجب ہے۔

سر چشمہ شاید گرفتن بہ میل
چو پُر شد نشاید گذشتن بہ پیل

مبادا فتنہ و فساد ہندوستان میں عالمگیر ہو جائے اور لاکھوں آدمیوں کا کشت و خون ظہور میں آئے اور انتظام مالی و ملکی میں فرق واقع ہو۔ جہاں تک ممکن ہو، نرمی اور آشتی سے کام لینا چاہیئے۔ یہ لوگ لوگ جاہل ہیں، فرقہ سپاہ جاہل ہوتا ہے۔ ان سے تھپک کر کام نکالنا چاہیئے۔ اور ان کو ہدایت کرو کہ یہ لوگ اس فتنہ و فساد سے باز آجائیں جائے تعجب ہے کہ تم کو اس معاملہ کی اب تک خبر نہیں۔

صاحب ریزیڈنٹ بہادر: حضور غلام کے پاس شب کے گیارہ بجے سوار نے چٹھی لا کر دی۔ مجھ کو چونکہ اس وقت نیند کا غلبہ تھا، میں سمجھا کوئی معمولی چٹھی ہے۔ اس وقت کچھ خیال نہ کیا، پاکٹ میں ڈال کر سو رہا۔

---

[1] فرقہ وارانہ مسائل اور مذہبی معاملات میں بہادر شاہ کے خیالات اس زمانہ میں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ محمد میاں

Marfat.com

صبح کو جب حضوری سوار میرے پاس پہنچے، اُس وقت مَیں نے چِٹھی پڑھی، تو حال معلوم ہوا۔ حضور کچھ اندیشہ نہ فرمائیں، خاطر جمع رکھیں بلوائی لوگ کیا کر سکتا ہے۔ حضور کے اقبال سے سب رفع دفع ہو جائیں گے۔ غلام ابھی جا کر اُن کو فہمائش کرتا ہے، خدا چاہے تو فساد بڑھنے نہ پائے گا۔"

اس کے بعد ظہیر صاحب نے صاحب ریزیڈنٹ کی تقریر نقل کی ہے۔ تقریر میں خُوب سبز باغ دکھائے اور اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ فوج کے نمائندوں کا جواب یہ تھا:

"آپ نے جن احسانات کا ذکر کیا ہے درست ہے۔ مگر ہماری قربانیوں کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ہم نے ہر موقع پر ہر حکم کی تعمیل کی۔ یہانتک کہ برما سے افغانستان تک پُورا ملک فتح کر کے آپ کے حوالہ کر دیا۔ مگر ہماری ان تمام قربانیوں کا بدلہ ہمیں یہ ملا کہ سرکار ہمارے دین کے درپے ہے۔ چربی لگے کارتوس دانتوں سے کٹوانے کا اصرار ہے تو

ہم لوگ اپنے دین آبائی کو چھوڑ کر کس طرح بے دین ہو جائیں
ہم کو مرجانا قبول ہے مگر دین سے بے دین نہ ہوں گے۔ اب
سرکار جو چاہے ہمارا کرے۔ ہم سب مرنے کو تیار ہیں، اور
ہم اپنے کو اُسی وقت مُردہ تصوّر کر چکے ہیں، جب ہم نے
جیل خانہ توڑ کر افسروں کو برآمد کیا تھا۔"

ریزیڈنٹ نے اس تقریر کا بھی جواب دیا، اور یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک گولی فریزر صاحب کے پاس سے سنسناتی ہوئی گذری۔ حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے جب دیکھا کہ معاملہ قابو سے باہر ہے تو فریزر کو پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے آئے۔ فریزر یہاں سے روانہ ہوا کہ فوج کو آمادہ کر کے باغیوں کا مقابلہ کرے۔ بادشاہ نے جاتے ہوئے کہا کہ شاہی باڈی گارڈ کے کچھ سپاہیوں کو ساتھ لے لیجئے تو فریزر نے بے پروائی سے مُسکرا کر جواب دیا کہ:

"دربار کی سوبھا کے آدمی ہیں۔ ڈیوڑھی کی حفاظت کو رہنے دیجئے۔ حضور کا

Marfat.com

اقبال کافی ہے۔ حضور خاطر جمع رکھیں[1]۔

مگر فریزر کا یہ استغنا کام نہ آیا۔ وہ باہر نکلا تو قتل کر دیا گیا اور پھر ڈگلس قلعدار (قلعہ سے متعلق پولیس کا افسر) بھی قتل کر دیا گیا۔ ہچنسن کلکٹر بھی یہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ بھی ختم کر دیا گیا کپتان ڈگلس کے یہاں ایک پادری مہمان تھا، اس کی لڑکی بھی ساتھ تھی، اس افراتفری میں یہ بھی قتل کر دیئے گئے۔

اعلانِ آزادی ہم کنارِ نشاناتِ ناکامی

قلعہ میں جواب و سوال ہو چکے تو فوج نے شہر کا رُخ کیا۔ ایک طرف دریا گنج میں (جہاں انگریزوں کے بنگلے تھے) انگریزوں کا قتلِ عام کر کے کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ دوسری جانب قلعہ سے مغربی سمت میں چاندنی چوک کے قریب سرکاری بینک تھا، اس پر یورش کر کے روپیہ لُوٹا۔ کاغذ پھاڑے۔ رجسٹر پھینکے۔ عمارت کو آگ لگا دی۔ منیجر بینک بیرس فورڈ بیوی بچوں کو لے کر چھت پر چڑھ گیا۔ مگر بے سود۔ باغیوں کے ہاتھوں جب بینک کی عمارت ڈھیر ہوئی تو یہ خاندان بھی ختم ہو گیا۔

دہلی گزٹ۔ پریس اور گرجا مظلوم فوج کو انگریزی نسل ہی سے نہیں بلکہ انگریز کی کی ہر چیز سے نفرت تھی۔ جوشِ غضب انگریز کے ایک ایک نشان کو ختم کر دینا چاہ رہا تھا۔ چنانچہ کشمیری گیٹ کے قریب دہلی گزٹ کا پریس تھا، اس پر حملہ کر کے پریس کو تباہ کیا گیا۔ عیسائی کمپوزیٹر جو وہاں کام کر رہے تھے، اُن کو ختم کیا۔ پھر گرجا گھر کا رُخ کیا۔ اُوپر کی صلیب کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ گھنٹے کی رسیاں کاٹ دیں۔ دیواروں پر جو صلیبیں لگی ہوئی تھیں، اُن سب کو اُکھاڑ پھینکا۔

میگزین قلعہ کی شمالی دیوار سے تقریباً تین فرلانگ کے فاصلہ پر کشمیری گیٹ کی جانب جہاں آج کل شہر دہلی کا بڑا ڈاک خانہ[2] ہے۔ بہت بڑا میگزین تھا جسمیں

---

[1] داستانِ غدر ص۵۴۔ [2] بڑے ڈاک خانہ کے سامنے سڑک کی دوسری جانب (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

ہر قسم کا سامانِ جنگ بافراط[1] موجود تھا۔ انقلابی فوج کے ہوشمند افسروں نے بادشاہ کو راضی کرنے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کرنا چاہا کہ بادشاہ کے ذریعہ میگزین حاصل کرلیں۔ چنانچہ شاہی شقہ میگزین کے افسر کے نام بھجوا دیا گیا کہ میگزین حوالہ کر دیا جائے۔ فوج کا ایک دستہ بھی بھیج دیا گیا کہ میگزین کو اپنی تحویل میں لے لے۔

اُدھر انگریزی افسروں کی قومی غیرت پوری طرح بیدار تھی ـــــ لفٹننٹ ولوبی (WILLOUGHBY) میگزین کا افسر اعلیٰ اور اُس کے ساتھی انگریز افسروں[2] نے طے کرلیا کہ اپنی جانیں قربان کر دیں گے مگر میگزین پر قبضہ نہیں ہونے دیں گے۔

چنانچہ میگزین کے دروازے بند کرکے اندر کی طرف ریت کے بورے چُن دیئے گئے۔ زمین پر گوکھرو اور بارود کی سرنگیں بچھا دی گئیں۔ دیواروں پر توپیں نصب کر دی گئیں۔ اس طرح حفاظت اور بچاؤ کا انتظام مکمّل کر لیا گیا۔ انگریزوں کو یقین تھا کہ باغی فوج کے پیچھے پیچھے میرٹھ سے انگریزی فوج بھی آ رہی ہوگی۔ اُس وقت تک حفاظت کیلئے یہ انتظام کافی تھا۔

لیکن میرٹھ کی فوج کا پہنچنا تو درکنار، کئی ہفتہ بعد تک اُس کو دہلی کا رُخ کرنے کی بھی ہمّت نہیں ہوئی۔ ادھر خود میگزین کے ہندوستانی ساتھیوں سے برگشتگی کے آثار محسوس ہونے لگے۔ اب صرف انگریز افسر ہم خیال تھے جن کی تعداد بشمول "ولوبی" نو[9] تھی۔ نہایت نازک صورت جس نے انگریز افسران کو فوری کارروائی پر مجبور کر دیا، یہ پیش آگئی کہ انقلابی فوج کے افسروں نے بادشاہ سے درخواست کرکے وہ بڑی سیڑھیاں حاصل کرلیں جن سے اُونچی دیوار پر چڑھا جا سکتا تھا۔ اب انگریز افسروں کے لئے آخری اقدام کے بغیر چارہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ایک پھاٹک اب تک قائم ہے جو محکمہ آثارِ قدیمہ کی زیرِ نگرانی ہے۔ اس پر ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس میں میگزین کے اُڑنے اور اُس کے افسروں کا تذکرہ ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو اس میگزین میں نو لاکھ کارتوس دس ہزار رائفلیں موجود تھیں۔ بہت سی توپیں تھیں۔ توپ گاڑیاں تھیں اور سینکڑوں من بارود تھی۔ [2] اُن کی تعداد آٹھ تھی اور بشمول ولوبی نو۔

Marfat.com

نہیں تھا یعنی میگزین کو تباہ کر دینا، جس کے ساتھ خود اُن کی ہلاکت بھی یقینی تھی۔ چنانچہ فتیلہ روشن کر دیا گیا۔ فوراً ہی شرارے بلند ہوئے۔ ایسا دھماکہ ہوا گویا سینکڑوں توپیں ایک ساتھ چلی ہیں۔ پورا شہر دہل گیا۔ میگزین کی دیواروں کے ٹکڑے اور پتھر کئی کئی فرلانگ تک دُور تک جا کر پڑے۔ حملہ آور سپاہی اور پبلک جو آس پاس تھی، وہ سب ختم ہو گئی۔ مرنے والوں کی تعداد سات سو تک بیان کی جاتی ہے۔ تو انگریز جنہوں نے جان پر کھیل کر یہ اقدام کیا تھا، اُن میں سے پانچ ختم ہو گئے اور چار بچ کر نکل گئے۔ ولوبی بھی بھی انہیں بچنے والوں میں سے تھا جس کا صرف چہرہ جُھلس کر سیاہ ہو گیا تھا۔ مگر غازی آباد کے دیہات میں یہ پہچان لیا گیا اور وہیں ختم کر دیا گیا۔

اگرچہ میگزین کے اُڑنے سے اتنا نقصان نہیں پہنچا، جتنا پہنچانا مقصود تھا کیونکہ ہزاروں کی تعداد میں بندوقیں اور رائفلیں، اسی طرح اور سامان بہت کافی باقی رہ گیا جو انقلابی فوجیوں کے کام آیا۔ تاہم انگریزوں کی قومی غیرت، ایثار اور فدائیت کی ایک مثال سامنے آگئی جس سے انگریز کی کامیابی کے آثار نمایاں تھے۔

اور ظاہر ہے ہزاروں من بارود کا ذخیرہ جو بھک سے اُڑ گیا وہ انقلابی فوجوں کیلئے نشانِ ناکامی تھا۔

لفٹننٹ ولوبی افسر اسلحہ خانہ کی طرح ٹیلیگرام[1] آفس کے دو نوجوان سگنیلروں کا کارنامہ

---

[1] کلکتہ دروازہ سے نصف میل کے فاصلہ پر جو دلّی کا قدیم ڈاک بنگلہ تھا، وہیں صدر تار گھر تھا۔ اس کے سامنے ایک ستون ان عہدہ دارانِ محکمہ تار کی یادگار میں کھڑا کیا گیا ہے جو اس ہنگامہ میں کام آئے۔ اور جس سے اُن کی، نیز ان کم عمر سگنیلروں کی یاد تازہ کرنی مقصود ہے جو اس معرکۂ عظیم میں جبکہ موت سامنے کھڑی تھی، ذرا بھی ہراساں نہیں ہوئے اور انبالہ کو وہ مشہور تار برقی دوڑایا جس کی بدولت مُلک پنجاب بال بال بچ گیا۔ تختی کے سامنے جو عبارت درج ہے، اُس کا ترجمہ یہ ہے:

"۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کے ہولناک دن دو نوجوان سگنیلر ولیم برنڈس اور جے۔ ڈبلیو۔ ملنگٹن جبتک اُن کو چلے جانے کا حکم نہیں دیا گیا، اس وقت تک اپنی ڈیوٹی پر مستعد رہے۔ دہلی میں (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

بھی وہ کارنامہ ہے جس نے انگریزوں کی شکست کو فتح سے بدلا۔ یہ دو نوجوان ولیم برنڈس[1] اور جے۔ ڈبلیو پلنگٹن تھے۔ جنہوں نے حاضر حواسی سے کام لے کر ٹھیک وقت پر پنجاب گورنمنٹ کو بیدار کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں نہ صرف پنجاب (انگریزوں کے حق میں) محفوظ رہا۔ بلکہ دہلی کا فیصلہ بھی انگریزوں کے حق میں ہوا۔

تار کا ترجمہ یہ ہے:

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء۔ ہمیں دفتر سے چلا جانا چاہیئے۔ میرٹھ کے سپاہی سارے بنگلے جلا رہے ہیں۔ یہ لوگ آج صبح یہاں پہنچے۔ ہم جا رہے ہیں آج گھنٹی نہ بجانا۔ ہمارا خیال ہے مسٹر سی ٹاڈ مر گئے۔ کیونکہ آج صبح باہر گئے تھے اور اب تک واپس نہیں آئے۔ ہم نے سنا ہے نو یورپین قتل کر دیئے گئے۔ اچھا رخصت۔

دہلی چھاؤنی دہلی چھاؤنی میں کوئی انگریزی رجمنٹ نہیں تھی۔ ہندوستانی فوجیں تھیں جن کے افسر انگریز تھے۔

ان فوجوں کی تیوریاں صبح ہی سے بدلی ہوئی تھیں۔ چنانچہ جب اُن کو انقلابی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جو کچھ گذر رہا تھا، اس کی اطلاع انبالہ کو دینے سے انہوں نے پنجاب گورنمنٹ کی انمول خدمت گذاری کی۔ مسٹر رابرٹ منٹگمری کے الفاظ میں: اس تار برقی نے ہندوستان کو بچا لیا۔ یہ تار دلی سے انبالہ پہنچا۔ اسی دن دوپہر کے بعد اس کی نقل میجر جنرل سر آئی برنارڈ۔ سی۔ بی کمانڈنگ افسر ضلع سرہند کو بھیج دی۔ پھر وہاں سے متعلقہ افسران کو اطلاع دی گئی جس کے نتیجہ میں فوراً تیاری کر لی گئی جس کا تذکرہ پنجاب کے سلسلہ میں آئے گا۔ انشاء اللہ۔ (بہادر شاہ ظفر صفحہ ۷۴)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] یہ اور اُن کے ساتھی جنہوں نے غیر معمولی جرأت اور دلیری سے کام لیا پورے ہنگامہ میں محفوظ رہے۔ اور پھر ڈبلیو برانڈس یکم ستمبر ۱۸۹۶ء کو پنشن لے کر سبک دوش ہوا۔ اور جے۔ ڈبلیو پلنگٹن کو اگرچہ باغیوں نے قید کر لیا تھا، مگر وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور رڑکی میں ۲۴ مارچ ۱۸۶۷ء کو انتقال کر گیا۔

Marfat.com

فوجوں پر حملہ کرنے کے لئے کہا گیا تو اُس کی تعمیل نہیں کی گئی۔ تاہم اُنہوں نے بغاوت کا اعلان نہیں کیا تھا۔ لیکن میگزین کے دھماکہ سے ہندوستانی فوجوں کو یقین ہو گیا کہ یہ انگریزوں نے انقلابی فوجوں کو توپ دم کیا ہے۔ اس یقین کے ساتھ انہوں نے کُھلے طور پر بغاوت کا اعلان کر دیا۔ انگریز افسران کو قتل کرنے لگے۔ کچھ مارے گئے کچھ نے بھاگ کر جان بچائی۔ کسی نے انبالہ کرنال کا راستہ لیا۔ کوئی میرٹھ پہنچا اور کوئی راستہ ہی میں ختم کر دیا گیا۔

انگریزوں کا قتل مذکورہ بالا اہم واقعات کے علاوہ آج کے دن انقلابی فوجیوں کا تمام دن انگریزوں کو تلاش کر کر کے قتل کرنے میں صرف ہوا۔ کچھ انگریز اور اُن کے اہل و عیال گرفتار کر کے پہلے حرمِ شاہی کے ایک حصّہ میں قید کئے گئے اور چند روز بعد سر پھرے فوجیوں نے ان کو بھی گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔

علماء کے فتوے بھی سُنائے گئے۔ سنجیدہ رہنماؤں نے بھی سمجھایا کہ عورتوں اور بچوں کا قتل جائز نہیں۔ مگر جنونِ انتقام کچھ اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ نہ فتوے کارگر ہوئے نہ نصیحتیں۔

یہ وارفتگی ناکامی کا نامبارک نشان تھی جو پہلے ہی قدم پر ظاہر ہوئی۔

لوہاروں کا کارخانہ اور جیل خانہ جب میگزین پر یورش ہو رہی تھی تو اُس کے قریب لوہار خانہ پر بھی حملہ کیا گیا۔ یہاں ہلکے اوزار بنتے تھے۔ اس کو لُوٹا گیا۔ جیل خانہ غالباً اسی جگہ تھا، جہاں اب ہے یعنی دہلی دروازہ سے باہر۔ اس پر حملہ کر کے قیدیوں کو رہا کرا دیا گیا اور جو خزانہ یہاں تھا وہ بادشاہ کے پاس پہنچا دیا گیا۔

اعلانِ آزادی شمس العلماء ذکاء اللہ خاں کے الفاظ میں قصّہ مختصر جب ایوان خاص میں تلنگوں[1] کا ہجوم ہوا، تو بادشاہ دیوانِ خاص میں کرسی پر آ کر بیٹھا اور اُن

---

[1] یہ لفظ پہلی مرتبہ فرخ سیر کے زمانہ میں دہلی کی زبان میں داخل ہوا۔ اس سے تلنگی زبان بولنے والے مرہٹے مراد ہوتے تھے۔ پھر اس زمانہ میں مشرقی یوپی اور بہار کے رہنے والے فوجیوں کو بھی تلنگا ہی کہا گیا بس ۱۸۵۷ء کے واقعات میں تلنگوں سے بہار اور مشرقی یوپی کے سپاہی مراد ہوتے تھے۔

Marfat.com

سے پوچھا، کیا مانگتے ہو؟

تلنگوں نے عرض کی۔ ہماری زندگی کا مدار حضور کی پرورش پر ہے۔ ہماری پرورش کیجئے، نہیں تو ہم آپ اپنے لئے انتظام کرلیں گے۔ پھر اُنہوں نے بادشاہ کے قدموں پر سر جُھکا کر نذریں دیں اور عرض کیا۔ جہاں پناہ ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں۔ بادشاہ نے اُن کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اُنہوں نے بادشاہ کو دُعائیں دیں۔

سلامی جب رات کو سب باغی سپاہ قلعہ میں جمع ہوگئی تو اُنہوں نے اپنے توپ خانہ سے اکیس توپیں سَر کیں[1]۔

زِندہ دلانِ دہلی نے انقلابی فوجوں کا استقبال کس طرح کیا۔

۱۱ مئی کو دہلی میں پہنچنے کے بعد:

"جب سوار جاتے تھے تو وہ دین دین پُکارتے جاتے تھے۔ اس لئے اُن کے ساتھ مسلمانوں کی بھیڑ ہوجاتی تھی۔ دھرماتما ہنود بھی اُن کو اولوں اور بتاسوں کا شربت لیٹوں میں پلاتے جاتے تھے۔

سارے شہر میں ہڑتال تھی۔ ایک سناٹے کا عالم تھا۔ اس سے ڈرتے تھے کہ دیکھئے، شہر سے انگریز کیا معاوضہ لیں گے۔

باغی سپاہی شہر کے مالک ہوگئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ چھاؤنی میں جتنی پلٹنیں ہیں۔ اُن میں سے ایک سپاہی بھی ایسا نہیں ہے، کہ انگریزوں کی حمایت کے لئے اپنی بندوق کا گھوڑا چڑھائے گا یا تلوار چلائے یا توپ کو پلیتہ لگائے[2]

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۶۱ [2] ماخوذ از تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۴۱۱

Marfat.com

دہلی میں قتل و غارت اس تاریخ کی صبح ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ تینوں ہندوستانی رجمنٹیں اور توپ خانہ جو دہلی کی چھاؤنی میں تھا وہ میرٹھ کے سواروں سے اُن کے پہنچنے سے پہلے مل گیا تھا میگزین جس میں اسبابِ جنگ بہت موجود تھے، وہ بادشاہ کے اختیار میں آگیا تھا، اور شہر کے ڈیڑھ لاکھ باشندے فرنگیوں کے مرد و عورت اور بچّوں کے قتلِ عام کرنے کے لئے اور اُن کے مال و اسباب کو لُوٹنے کے واسطے مدد کرنے کو تیار تھے۔[1]

حضرت راقم الدولہ ظہیر دہلوی اپنا مشاہدہ بیان فرماتے ہیں:

"جس وقت چھوٹے دریبے کے پھاٹک سے باہر انقلابیوں کو دیکھا، کہ تین چار سوار کرتے پہنے دھوتیاں باندھے ہوئے سر سے ایک چھوٹا سا انگوچھا لپٹا ہوا، فقط ایک کرچ داب میں اور وہ پیپل کے درخت کے سائے میں نہر کی دیوار سے لگے کھڑے ہیں اور ہندو لوگ اس کی سربراہی کر رہے ہیں۔ کوئی پوریاں لے آیا ہے، کوئی مٹھائی کا دونا لئے آتا ہے، کوئی لوٹا پیتل کا پانی سے بھر کر لا دیتا ہے[2] الخ

اس کے بعد مسلمانوں میں جہاد کے ولولے تھے۔ علماء کرام مسجدوں میں جہاد کے وعظ کہتے تھے۔ لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ:

"ہندوؤں کے پنڈت مسلمانوں کے مولویوں کی نسبت انگریزوں سے عداوت کرنے میں کچھ کم نہ تھے۔ کئی دفعہ انہوں نے پتروں کو دیکھ بھال کر لڑنے کی شبھ مہورت نکال کے تلنگوں کو بتلائے اور ان کو یقین دلایا کہ اُن میں اگر لڑنے جاؤ گے تو فتح پاؤ گے۔ چنانچہ وہ ان مہورتوں میں جا کر خُوب لڑے۔

---

[1] تاریخِ عروج عہد انگلیشیہ ص۴۰۵۔ [2] داستانِ غدر ص۶۵۔

Marfat.com

پنڈتوں نے تلنگوں کو یقین دلایا تھا کہ انگریزی راج پھر نہیں ہوگا ان ہی کا راج ہوگا۔

ایک عجیب تماشا چاندنی چوک اور بازاروں میں یہ دیکھنے میں آتا تھا کہ پنڈتوں کے ہاتھ میں پوتھیاں ہیں اور وہ ہندوؤں کو دھرم شاستروں کے حکم سنا رہے ہیں کہ انگریز ملکشوں سے لڑنا چاہیئے۔

جب لڑائیوں میں سے تلنگوں کی لاشیں چارپائیوں پر اُن کے سامنے آئیں تو وہ ہندوؤں کو اُپدیش دیتے کہ ان سرگ باشیوں کی طرح سرگ میں چلے جاؤ، جن کے لئے نہ ارتھی کی ضرورت ہے، نہ کریا کرم کی مگر ہندوؤں پر ان اُپدیشوں کا ایسا اثر نہیں ہوتا تھا، جیسا کہ مسلمانوں پر جہاد کے وعظ کا ہوتا تھا۔[1]

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشہ ص ۶۷۶

Marfat.com

دہلی شہر کی حالت اور اس کا نظم و نسق

زمانۂ جنگ میں

بادشاہ کی طرف سے شاہی اختیارات منتقل کرنے کا اعلان

چند سال پہلے تک ہندوستان پر برطانیہ کا "یونین جیک" لہرا رہا تھا، جس کی تہذیب اور تنظیم کے نام پر نہ صرف بہادر شاہ اور اُس کے دَور کو بلکہ تمام ہندوستانی حکومتوں، اُن کے نظم و نسق اور آئین و دستور کو دوسروں نے تو بدنام کیا ہی تھا اپنوں نے بھی بدنام کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔

خاص اسی مہذّب اور متمدّن برطانیہ کے دَور کی بات ہے کہ امن و امان کے زمانہ میں جب فوجوں کے تبادلہ کا وقت آتا تھا اور کوئی فوج ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی کو کوچ (مارچ) کرتی تھی تو شاہراہ کے قریب جو قصبے اور گاؤں آباد ہوتے تھے، فوجی مارچ کی خبر اُن کے باشندوں کے لئے ایک مصیبت اور پریشانی کا اعلامیہ ہوا کرتی تھی۔ اگر مصیبت کی انتہا یہ ہوتی کہ بیل گاڑیاں اور چھکڑے بیگار میں لئے جائیں گے تب بھی پریشانی خاص خاص افراد تک محدود رہتی۔ لیکن اصل مصیبت تو یہ ہوتی تھی کہ اس علاقے کے باشندوں کی کوئی چیز یہاں تک کہ عورتوں کی عصمت بھی محفوظ نہیں رہتی تھی۔

دیہات کی عورتیں گھروں کے دروازے بند رکھتی تھیں کیونکہ آگ لینے کے بہانہ سے فوجی گھروں کے اندر چولھوں تک پہنچ جاتے تھے۔ پھر اُن سے مقابلہ وہی کر سکتا تھا جس میں پوری فوج سے مقابلہ کی طاقت ہو۔[1]

---

[1] قصبہ دیوبند جو راقم الحروف کا وطن مالوف ہے۔ شاہراہِ اعظم کے کنارے پر واقع ہے۔ قصبے کے باشندے اس آزمائش میں بارہا مبتلا ہوئے ہیں۔ ہمارا محلہ پیرزادگان فرودگاہ (دیبی کنڈ اور جنگل شاہ عباس) سے تقریباً چار فرلانگ ہے۔ احقر نے مصیبت کی یہ داستانیں اپنے بزرگوں سے سُنی ہیں۔

Marfat.com

پھر جب فوجوں کی نقل و حرکت ٹرینوں کے ذریعہ ہونے لگی، تو زمانۂ جنگ میں ہم نے خود دیکھا ہے کہ فوجی اسپیشل کی آمد کی خبر خوانچوں اور اسٹال والوں پر کس طرح ہیبت طاری کر دیا کرتی تھی۔ اسٹالیں بند کر دی جاتی تھیں اور خوانچے والے اپنے خوانچے لے کر اسٹیشن سے باہر چلے جاتے تھے۔ اور بدقسمتی سے کوئی خوانچہ یا اسٹال پلیٹ فارم پر فوج والوں کی نظر پڑ جاتا، تو وہ پورا کا پورا اُن کی بے تکلفی کی نظر ہو جاتا تھا۔

اس تمہید کا دوسرا حصّہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جن فوجوں نے عَلَمِ بغاوت بلند کیا تھا، اُن کی تربیت انگریزی سامراج کے اسی ماحول میں ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ یورپ کی وہ بڑی لڑائیاں جو اسی نصف صدی میں یعنی ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۷ء و ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء میں ہو چکی ہیں، ان لڑائیوں نے یہ مشاہدے بھی پیش کئے کہ جنگ کے وقت شریف اور امن پسند باشندے تو دہشت زدہ ہو کر اپنی جانوں کی فکر میں ہوتے تھے اور آوارہ گرد اوباش لوگوں کی بہار آجاتی تھی۔ وُہ لُوٹ مار سے لے کر عصمت دری تک من مانی کارروائیاں کرتے تھے۔ اس بِنا پر رضا کار (والنٹیر) بھرتی کر کے اُن کو ٹریننگ دی جاتی تھی اور اسپیشل اختیارات دے دیئے جاتے تھے کہ ایسے موقع پر وہ شہریوں کی حفاظت کر سکیں۔

اس ضروری تمہید کے بعد زمانۂ جنگ میں شہر دہلی کے حالات کا جائزہ لیجئے۔

"۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جب میرٹھ کی فوجیں عوام کے ہجوم کے ساتھ بھوکی پیاسی تھکی ماندی شہر میں داخل ہوئیں اور انگریزوں کو قتل کرنا، انگریزی سامانوں کو تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا تو کسی قدر افراتفری لازم تھی۔ اس پریشان حالی میں نزاکت اس لئے بھی پیدا ہو گئی کہ سامانِ رسد کہیں بھی فراہم نہیں تھا۔ اس نازک صورتِ حال کے باوجود جو کچھ ہوا، اس کے متعلق راقم الدولہ ظہیر دہلوی کی چشم دید شہادت ملاحظہ فرمائیے

Marfat.com

راقم الدولہ کا انقلابی فوج سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اس کے سخت مخالف تھے۔ اسی بنا پر اُن کے بیانات نہ صرف طنز آمیز بلکہ انقلابیوں کے حق میں سخت توہین آمیز ہیں۔ مگر ایک حقیقت نگار واقعہ کو طنز اور توہین کا جامہ تو پہنا سکتا ہے، اصل واقعہ کی واقعیت کا انکار نہیں کر سکتا۔

ظہیر صاحب فرماتے ہیں:

"۱۱ مئی کو جب میرٹھ کے فوجی آئے تو دو چار دستوں کو تو بادشاہی گھوڑوں کے دانہ کے چنے دے دیئے گئے۔ ان کے بعد جب مزید فوجی آئے جن کی تعداد کئی ہزار تھی، تو بادشاہ کی طرف سے امن کا اعلان ہوا، اور ہر جگہ چوکی پہرے بٹھا دیئے گئے کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ حلوائیوں اور بقالوں کو بلوا کر دوکانیں کھلوائی گئیں۔ پھر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے خود (راقم الدولہ ظہیر دہلوی صاحب) اور اُن کے ساتھ صوفی اشرف بیگ صاحب رسالدار کو بھیجا کہ جا کر دیکھیں کہ اعلانِ امن پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے۔ یہ لال قلعہ سے مسجد فتحپوری تک گئے۔ ہر جگہ امن پایا۔ خال خال دکانیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ ہر دکان پر پہرہ تھا کہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔"[1]

انقلاب کے ساتھ ساتھ اس طرح امن ایسے دَور میں کہ نہ تیز رفتار پولیس ویگنیں ہیں نہ ریڈیو اور لاسلکی، انقلاب پسندوں کے لئے درسِ عبرت ہے۔

یہ گیارہ مئی کی فوری کارروائی تھی۔ اگلے روز متعلق ظہیر دہلوی صاحب کے ہمنوا جن کو برطانوی سامراج نے شمس العلماء کے خطاب سے بھی نوازا ہے اُن کی شہادت ملاحظہ فرمائیے:

---

[1] داستان غدر ص ۷۱

Marfat.com

"تلنگے[1] (انقلابی فوجی) ابھی شہر و گلی کوچوں سے نابلد تھے۔ چوڑے چوڑے بڑے بڑے بازاروں کو جانتے تھے، ان میں اُن کو اپنی ضرورت کی چیزیں ملتی نہ تھیں۔ انہوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ حضور سوار ہو کر بازار کی دوکانیں کھلوا دیں۔ بادشاہ نے اُن کی درخواست کے موافق سواری کا حکم دیا۔[2]

بادشاہ عماری میں ہاتھی پر سوار تھا، اُس کے نقیب احکام سُناتے جاتے تھے۔

غدر سے پہلے ڈھنڈورا اس طرح پیٹا جاتا تھا کہ نقارہ پر چوٹ لگا کے ڈھنڈورچی اوّل یہ کہتا کہ:

"خلقت خدا کی، مُلک بادشاہ کا، حکم سرکار کمپنی بہادر کا۔" پھر آگے وہ بات کہتا تھا جس کا مشتہر کرنا منظور ہوتا تھا۔ ۱۲ مئی کو ڈھنڈورے پر سے "حکم سرکار کمپنی بہادر کا" اُڑ گیا۔ اُس کی جگہ بادشاہ کا حکم ہو گیا۔

اس اعلان کے بعد اس روز تو یہی ہوا کہ "اِدھر کوئی دکان کھلی اور اُدھر بند ہوئی۔"[3]

لیکن ۱۲ کے بعد کاروبار بدستور جاری ہو گیا۔ بلکہ کچھ اضافہ کے ساتھ۔ چنانچہ خود شمس العلماء کی شہادت ہے:

"جس تاریخ سپاہ آئی، دوسرے روز قلعہ میں اکابر شہر کی ایک مجلس مقرر ہوئی کہ شہر کا اور سپاہ کی رسد رسانی کا انتظام کیا جائے۔ اگر رسد کا بندوبست نہیں ہوگا تو وہ سارے شہر کو لُوٹ کر کھا جائیں گے۔

---

[1] شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب نے شاہی جلوس کا نقشہ بھی بتایا ہے جو سراسر مضحکہ خیز اور توہین آمیز ہے۔ ہم اس کو نقل کرنا بیکار سمجھتے ہیں۔ جو صاحب ضرورت سمجھیں ص۶۶۲ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ملاحظہ فرمائیں۔ [2] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۶۲۔ [3] ایضاً۔

Marfat.com

اس کام کا اہتمام محبوب علی خاں اور میر نواب پسر سید تفضل حسین وکیل کو سپرد ہوا۔"

شہر میں انگریزوں کی طرف سے رسد آنے کا انسداد تو کسی جانب سے نہیں ہوا تھا۔ چاروں طرف سے صبح سے شام تک سب طرح کی اجناس ضرورت کے موافق آتی تھیں۔ بیلوں، گدھوں، ٹٹوؤں، خچروں، گاڑیوں، چھکڑوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ شہر میں جابجا یہ اجناس بکتی تھیں، کسی کا مقدور نہیں تھا کہ اُن پر ہاتھ ڈال سکے۔ تلنگے رسد کے قواعد سے خُوب واقف تھے۔ جنس کی قیمت نرخ کے موافق خُوب دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ہم قیمت کم دیں گے تو رسد بند ہو جائے گی پھر ہم بھُوکے مریں گے۔ غرض تلنگوں نے خود اپنی رسد کا انتظام ایسا رکھا کہ اُن کو بادشاہی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی کوئی جنس کم ہو جاتی تھی تو وہ بادشاہ سے اس کو بہم پہنچانے کی درخواست کرتے وہ ان کو منگا دیتا۔ ایک دفعہ افیون کا توڑا ہو گیا تھا تو بادشاہ نے راؤ تلارام کو لکھا کہ دو من افیون بھیج دے۔ قیمت دے دی جائے گی جب وہ میدانِ جنگ میں جاتے تو بادشاہی اہل کار حلوائیوں سے مٹھائی وغیرہ بنوا کر چھکڑوں میں اُن کے پاس بھیجتے۔

کہیں ایسا اتفاق دو تین ہی دفعہ ہوا ہوگا کہ شہر میں سپاہ کو یا اہلِ شہر کو ضروری چیزوں کے میسّر ہونے میں تکلیف ہوئی ہو۔[1]

سونے چاندی کی خرید و فروخت | عام اجناس کے علاوہ سونے چاندی

---

[1] تاریخ عروج عہدِ انگلیشیہ ص۶۷۹۔ اس موقع پر ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۵ء کا زمانہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ جب گیہوں کا آٹا تولوں کے حساب سے ملتا تھا۔ عجیب و غریب بات یہ تھی کہ تانبہ کے پیسے اور ایک دو آنے کے سکّے ناپید ہو گئے تھے۔ کہیں ڈاک خانہ کے ٹکٹ اور کہیں اور طرح کی پرچیوں سے لوگ اپنا کام نکالتے تھے۔ محمد میاں۔

Marfat.com

اور زیورات کی خرید و فروخت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

بعض تلنگوں[1] کے پاس روپیہ اتنا تھا کہ وہ اُس کو اُٹھا نہیں سکتے تھے۔ وہ شہر میں سونا خریدتے پھرتے تھے۔ اُن کی خریداری کے سبب سے سونے کا بھاؤ سولہ سترہ روپے سے ستائیس اٹھائیس روپے تولہ ہو گیا۔ دلال بازاروں اور گلی کوچوں میں اُن کو لئے پھرتے تھے اور اُن کو ہندوستانیوں کے گھروں سے سونے کے زیور مول لے دیتے تھے۔ مسلمانوں نے اکثر اپنی ضرورتوں کے سبب سے اور ہندوؤں نے اپنی طمع[2] کے سبب سے سونے کے زیور اُن کے ہاتھ بہت بیچ ڈالے۔

سُناروں کی دکانوں پر تلنگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ وُہ اُن سے کڑے ہاتھوں کے اور رانوں کے بنواتے تھے۔ بعض تلنگوں کی رانوں پر پانچ پانچ ایسے کڑے چڑھے ہوئے تھے۔[3]

نظم و نسق بہرحال ۱۲ مئی کو شاہی جلوس اور اعلان کے بعد بعد رفتہ رفتہ کاروباری

---

[1] شمس العلماء تحریر فرماتے ہیں۔ دہلی میں جو سپاہ داخل ہوتی تھی وہ روپیہ کے حال سے بڑی مختلف الحال تھی۔ اُن میں بعض پلٹنیں تھیں کہ خزانہ اُن کو جو ہاتھ لگا تھا، اُس میں سے اوّل تو انہوں نے اپنا دامن خاطر خواہ پُر کیا۔ جو بچا وہ بادشاہ کے حوالہ کیا۔ جیسا کہ علی گڈھ، بلند شہر کی رجمنٹوں نے کیا۔ بعض نے خزانہ اپنے قبضہ میں رکھا جیسا کہ بریلی بریگیڈ نے۔ بعض کو خزانہ ہاتھ ہی نہیں لگا تھا جیسا کہ میرٹھ کی سپاہ کو۔ پس بعض تلنگوں کے پاس روپیہ اتنا تھا کہ وہ اس کو اُٹھا نہیں سکتے تھے مگر مفلس بہت تھے الخ۔ (ص ۶۶۷ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ)۔ [2] مثل مشہور ہے۔ اپنی عقل، دوسرے کا مال زیادہ معلوم ہوا کرتا ہے بظاہر یہی مثل یہاں بھی صادق ہے۔ ورنہ کم از کم اس زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی حالت میں فرق نہیں تھا۔ ہاں اس کے بعد جب انگریزی تسلط دوبارہ بحال ہوا، تو ہندو چونکہ اصل مجرم نہیں قرار دیئے گئے، اُن کے ساتھ رعایتیں ہوئیں۔ اس وقت بیشک ہندوؤں کو نیلام وغیرہ خریدنے کے مواقع میسر آئے۔ جس سے اُنکی مالی حیثیت بلند ہو گئی۔ [3] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ۔

Marfat.com

حالت معمول پر آگئی۔ بلکہ نفع اندوزوں کے لئے اچھے مواقع مہیّا ہوگئے۔ یہاں تک کہ سونے کی قیمت دوگُنی سے بھی زیادہ کر دی گئی۔

غذائی نظم و نسق کے لئے ۱۲ مئی ہی کو قلعہ میں اکابرِ شہر کی ایک مجلس مقرر ہوگئی[1] تھی۔ میر محبوب علی خاں اور میر نواب پسر سیّد تفضّل حسین وکیل کو فراہمی رسد کی خدمت سپُرد ہوئی یعنی فوڈ منسٹر بنائے گئے۔ ان کی کارگذاری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس غیر معمولی ہنگامی دَور میں دہلی کی پوری آبادی جو پہلے سے تقریباً دوگنی ہوگئی تھی[2]، غذائی بحران سے محفوظ رہی اور کبھی بھی کسی کو خوراک کے سلسلہ میں پریشانی نہیں ہوئی[3]۔

عدلیہ | قانونی کاموں کے لئے:

"بہادر شاہ نے یہ حکم جاری کیا کہ سلطنت اور عدالت کے کاموں میں شاہزادے اور سپاہ مداخلت نہ کرے۔ عدالت کے سارے کام صرف مفتی اور صدر الصدور کیا کریں۔ نہ سپاہ، نہ مال کے حکام اس عدالت میں دخل دیں[4]۔

مولوی فیض احمد (مولانا فیض احمد صاحب) آگرہ میں صدر بورڈ کا سررشتہ دار تھا۔ اور باغی ہو کر دہلی میں آیا تھا۔ اس کو اور مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کو عدالت کا کام سپُرد ہوا۔"[5]

پولیس | شہر میں پہلا کوتوال معین الدّین حسن خاں مقرّر ہوا جو نواب قدرت اللہ

---

[1] تاریخ عروجِ عہد انگلیشیہ ص۶۷۹ ۔ [2] ایضاً ص۶۸۷ ۔ [3] ایضاً ص۶۸۹ ۔ [4] ایضاً ص۶۸۷ شمس العلماء نے اس کے بعد یہ بھی فرمایا ہے کہ مگر بادشاہ کے اس حکم کی تعمیل کبھی نہیں ہوئی۔ شاہزادے سپاہ کے زور سے ہمیشہ ان کاموں میں دخل دیتے تھے۔ مگر اگلے اقتباس سے اس کی تردید ہو جاتی ہے کیونکہ مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کی مداخلت سپاہ کے زور سے نہیں ہوئی تھی بلکہ اس لئے کہ عدلیہ ان کے سپرد تھا۔ دیکھو ص۶۸۸ کا اقتباس۔ [5] ایضاً ص۶۸۸۔

Marfat.com

خاں کا بیٹا تھا۔[1]

یعنی پہلے یہ تھانہ پہاڑ گنج میں انچارج تھانیدار تھے۔ ۱۱ مئی کے انقلاب کے بعد جیسے ہی بادشاہ کی طرف سے تقررات شروع ہوئے، یہ جست لگا کر آگے آگے بڑھے اور شہر کے کوتوال (یعنی سپرنٹنڈنٹ پولیس) ہو گئے۔

یہ دل سے انگریز کے حامی تھے۔ ۱۱ مئی کے قیامت خیز ہنگامہ میں سر تھیوفلس مٹکاف

---

[1] ایضاً ص ۶۸۸۔ گلی قاسم جان، جہاں آج کل جمعیۃ علماء ہند کا دفتر ہے اور اس کی مسجد آپ کے والد نواب قاسم جان کے نام سے منسوب ہے۔ اس مسجد کے متولی آج کل محترم خسرو مرزا صاحب ہیں۔ اس خاندان کی آمد اور سلسلۂ نسب کے متعلق نواب خسرو مرزا صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ سہراب جنگ نواب قاسم جان مع اپنے دو برادرانِ حقیقی عارف خاں و عالم بیگ خاں بخارا سے ۱۷۷۰ء میں ہندوستان آئے۔ بخارا میں محلہ پستہ شکن میں ان کا مکان تھا اور وزیر بخارا کے عہدہ پر متمکن تھے۔ خواجہ عبدالرحمٰن یسوی کی اولاد میں تھے اور خواجہ عبدالرحمٰن یسوی، خواجہ احمد یسوی کے سلسلہ میں تھے، یعنی اُن کی اولاد میں تھے۔ یہ خواجہ احمد یسوی، خواجہ یوسف ہمدانی کے خلیفہ تھے۔ اُن کا وصال ۵۶۲ھ میں ہوا۔ نواب قاسم خاں کے نام پر گلی قاسم جان آباد ہے اور مسجد موجودہ ۱۱۹۳ھ میں تعمیر کرائی۔ عارف خاں کی اولاد میں نواب احمد بخش خاں پہلے فرمانروا ریاست فیروز پور جھرکہ اور لوہارو ہوئے۔

نواب قاسم خاں

- نواب محمد بخش خاں
- نواب فیض محمد خاں
- نواب قدرت اللہ بیگ خاں
  - معین الدین حسن خاں عرف بڑے مرزا۔ لاولد
  - محمد حسن خاں
    - مرزا محمد حسین خاں عرف منصور شاہ لاولد
  - امتیاز زمانی بیگم عرف حاجی بیگم صاحبہ پرنانی راقم خسرو اہلیہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں

Marfat.com

مجسٹریٹ دہلی کو تھانہ میں چھپا کر انقلابی گروہ سے بچانا، پھر رقم خرچ کر کے معتبر آدمی کے ذریعہ اُن کو جھجر پہنچانا انہیں کا کام تھا۔[1] اس وقت کوتوال کا عہدہ سنبھالنے کا مقصد بھی یہ تھا کہ :

"انگریزوں کی خیر خواہی اس بدخواہی کے لباس میں کروں"۔[2]

اُن کی اس دورویہ پالیسی کے ساتھ امن کا قائم رہنا ناممکن تھا۔ چنانچہ چند روز بعد اُن کو الگ کر دیا گیا۔[3]

"اس کے بعد خواجہ وحید الدین کی سفارش سے قاضی فیض اللہ، کوتوالِ شہر اور قاضی عبدالرحیم نائب کوتوال مقرر ہوئے۔ قاضی نے استعفیٰ دے دیا۔[4] اس کے بعد سید مبارک شاہ رام پور کا باشندہ کوتوال مقرر ہوا، اور آخر غدر تک وہی کوتوال رہا۔ نجف گڈھ، مہرولی، شاہدرہ پہاڑ گنج، بدرپور اور شہر میں جہاں جہاں پہلے تھانے تھے، تھانہ دار مقرر ہوئے۔ ان کاموں میں سوائے شہزادوں کے بخت خاں بھی دخیل تھا۔ بادشاہ نے تھانہ داروں اور کوتوال کے نام حکم جاری کر دیا تھا کہ وہ بخت خاں کے حکم کی تعمیل کیا کریں۔[5]

سکّہ قدرت اللہ خاں سو[100] سواروں کو لے کر اودھ کی کل سپاہ کی عرضی لایا۔ بخت خاں نے بادشاہ سے ملاقات کرائی۔ قدرت اللہ نے بادشاہ کی خدمت میں مندرجہ ذیل چیزیں نذر کیں۔

۱ : نئے سکّے کی اشرفیاں جن پر نقش تھا :

بزر زد سکّہ نصرت طراز سراج الدین بہادر شاہ غازی

۲ : دو گھوڑے۔ ۳ : دو کتی۔ ۴ : کلاہ جس میں بیش بہا موتی

---

[1] ۱۸۵۷ء ص ۱۶۲ و ص ۱۷۱۔ [2] و [3] تاریخ عروجِ عہد انگلیشیہ ص ۶۸۸۔ [4] لیکن استعفا دینے پر بھی پھانسی سے نہیں بچے۔ [5] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۸۸۔

Marfat.com

ٹکے ہوئے تھے۔ ۵ : ایک جوڑی بازو بند الماس پیوند[1]

بادشاہ کی طرف سے شاہی اختیارات منتقل کرنے کا اعلان۔ پارلیمنٹری حکومت اور کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی

منشی جیون لال جی، بادشاہ سے زیادہ انگریزوں کے وفادار ہیں۔ مگر اس کارروائی کی شہادت دینے پر مجبور ہیں کہ ۴ ستمبر ۱۸۵۸ء جے پور، جودھ پور، بیکانیر اور الور کے راجگان کے نام بادشاہ کی دستخطی چٹھیاں بھیجی گئیں۔ جس میں لکھا تھا کہ مجھے فوج کی ضرورت ہے اور یہ کہ میں انگریزوں کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن چونکہ اس وقت میرے اُمورِ سلطنت کا انتظام کرنے کے لئے قابلِ اعتماد آدمی موجود نہیں ہیں، اس لئے میں ریاستوں کی ایک مجلس بنا دینی چاہتا ہوں اور اگر وہ ریاستیں جن کے نام خط بھیجے جا رہے ہیں، اس غرض کے لئے مجلس بنا لیں گی تو میں نہایت خوشی سے اپنے شاہی اختیارات اُن کے ہاتھ میں دے دوں گا۔[2]

لُوٹ مار کیوں ہُوئی اور کتنی ہُوئی

قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی نازیبا حرکتیں اور بادشاہ کے تاثرات

شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ خاں جو ایک طرف شکایت کرتے ہیں :

"جس وقت سے کہ انگریزی عملداری شہر سے کافور ہوئی تو چوبیس گھنٹہ کے اندر شہر میں کوئی گناہ اور پاپ ایسا نہ تھا، جو انسان کر سکتا تھا، وہ نہ ہوا ہو۔"[3]

لُوٹ مار کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

"غرض کوئی مہینہ خالی نہیں گیا کہ دو چار آدمیوں کی کم بختی اس طرح تلنگوں

---

[1] تاریخ عروجِ عہد انگلشیہ۔ [2] غدر کی صبح و شام ص۲۴۲ و ص۲۴۳۔ [3] تاریخ عروجِ عہد انگلشیہ ص۶۶۱۔

Marfat.com

کے ہاتھ نہ آئی ہو"[1]

لیکن یہی شمس العلماء یہ بھی اعتراف کرتے ہیں :

"لوٹ اور شبہ میں قتل کے واقعات دس بارہ سے زیادہ نہیں[2] ہوئے۔

غرض جیسی اس لوٹ مار کی شہر میں شہرت ہوتی تھی، اس کا سواں حصہ بھی صحیح نہیں ہوتا تھا۔ صدہا محلے تھے، جن میں ایک کوڑی کا مال بھی نہیں لٹا[3]"

"۱۱ مئی کو کھاری باؤلی، چاندنی چوک، دریبہ اور چاوڑی میں دکانیں بند ہوگئیں۔ اگرچہ اُن میں سے بہت تھوڑی لٹیں تھیں[4]"۔

تھوڑی مقدار بھی ملاحظہ فرمایئے :

"دریبہ میں صراف کی ایک دکان لٹی تھی، اور صرافوں نے اپنا زر و زیور اور روپیہ گھر چلتا کر دیا تھا، اور اپنی دکانوں کے آگے واویلا مچانے کھڑے ہوگئے تھے، ہائے ہم لٹ گئے۔ اگرچہ اور گلی کوچوں میں اس لوٹ کا کچھ بھی اثر نہیں تھا۔ سب سوداسلف بدستور بک رہا تھا۔ اگر کوئی بدمعاش گلی کوچے کے دوکان دار سے ٹرپیش کرتا، تو اہلِ محلہ اس کو درست کر دیتے۔ اپنے پرانے دوکانداروں پر ذرا ظلم و ستم نہ ہونے دیتے[5]"

مختصر یہ کہ چار ماہ کی غیر مطمئن سلطنت میں جس کو ایک لمحہ کا اطمینان بھی نصیب نہ ہوا۔ جو بیرونی دشمنوں اور اندرونی جاسوسوں سے گھری ہوئی تھی، لوٹ مار اور قتل کے واقعات دو چار ماہانہ کے اوسط سے کل دس بارہ ہوئے۔ افسوس شمس العلماء کو یہ خبر نہیں تھی کہ جس حکومت کی عظمت سے اُن کا قلم سرنگوں ہے، اُسی کے دورِ سطوت جبروت میں ایسا زمانہ بھی آنے والا ہے کہ امن و امان کے زمانہ میں بھی قتل و خون اور لوٹ مار کا تناسب

---

[1] تاریخ عروج عہدِ انگلیشیہ ص۶۶۵ ۔ [2] ایضاً ص۶۶۵ ۔ اوسط وہی ہے یعنی دو چار آدمی ایک ماہ میں۔

[3] ایضاً ص۶۶۶ ۔ [4] ایضاً ۔ [5] ایضاً ص۶۶۱ ۔

Marfat.com

اس سے کہیں زیادہ ہوگا۔ بہرحال ان واقعات کی کُل تعداد دس بارہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ واقعات کیوں ہوتے تھے۔ اس سوال کا جواب شمس العلماء کی زبان سے ہی اچھا معلوم ہوگا۔

آپ صرف یہ غور فرمائیے کہ جن وجوہات کی بنا پر تلنگے آپے سے باہر ہو کر یہ اقدام کرتے تھے، آیا وہ ایسے ہی اشتعال انگیز تھیں کہ ایک غیور باحمیت جماعت کو اُن پر مشتعل ہونا چاہیئے تھا یا کسی ذاتی غرض اور مالی منفعت کے سبب سے وہ یہ حرکتیں کرتے تھے۔

اگر یہ وجوہات فی الحقیقت اشتعال انگیز ہوں، تو پھر جُرم اور الزام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ قانونی اور آئینی کارروائی کے بجائے قانون اپنے ہاتھ میں لے کر بے آئین حرکت کی۔

شمس العلماء فرماتے ہیں تلنگے کئی سبب سے لوگوں کو قتل کرتے تھے۔ مثلاً

(۱) جن کو کرشٹان جانتے تھے۔ اس سلسلہ میں دو واقعے پیش آئے۔ ایک سیٹھ بدی چند ڈپٹی انسپکٹر مدراس دہلی جو بڑا کٹر سرادگی ہندو تھا۔ مگر وہ انگریزی کپڑے پہنتا تھا۔ اس لئے لوگ اس کو کرشٹان جانتے تھے، اس کو ایسا زخمی کیا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔

دوسرے کشمیری پنڈت مدن موہن لال۔ جس نے مسلمان ہو کر اپنا نام آغا حسن جان رکھا تھا۔ وہ کوٹ پتلون پہنتا تھا۔ اس کو بھی کرشٹان سمجھ کر قتل کرنا چاہا مگر میاں نظام الدین آڑے آگئے۔ انہوں نے صفائی دی۔ جس سے اس کی جان بچ گئی۔ پھر اس کو ولی داد خاں اپنے ساتھ مالاگڈھ لے گئے۔ وہاں سے وہ میرٹھ چلا گیا۔

(۲) جس کے متعلق یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے یہاں کوئی انگریز عورت یا بچہ پوشیدہ ہے۔ اس الزام میں ۱۱ مئی کو قاضی پنو کو قتل کر دیا گیا، اور لطف یہ ہے کہ خود قاضی صاحب کے بھانجوں نے کسی عداوت کی بنا پر قاضی کے خلاف تلنگوں کو مشتعل کیا تھا۔

شمس العلماء یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس الزام میں قاضی صاحب کے علاوہ اور کوئی قتل نہیں ہوا۔

Marfat.com

۱۲ مئی کو نواب حامد علی خاں کو اسی الزام میں گرفتار کر کے قلعہ میں لائے۔ وہاں محبوب علی خاں وزیر نے سفارش کر کے ان کو رہا کرایا۔ نواب صاحب کا مکان لُٹنے کی بہت شہرت ہوئی۔ مگر اس شہرت کی حقیقت یہ تھی کہ بہت معمولی سا سامان خرد برد ہوا تھا۔

۱۳ مئی کو نرائن داس نہر والے کے متعلق بھی شبہ ہوا۔ یہ شبہ صحیح ثابت ہوا۔ دو انگریز اس کے مکان سے گرفتار کئے گئے۔ جو قتل کر دیئے گئے اور لالہ کا مکان لُوٹ لیا۔

اس طرح شہر میں اور دو چار غریب آدمیوں کے گھروں کی کم بختی آئی۔ ایک درزی کے گھر سے تین فرنگی نکالے۔

(۳) جن کے متعلق شبہ ہوتا تھا کہ وہ انگریزوں سے سازش رکھتے ہیں۔ اُن سے خط و کتابت ہے یا اُن کے لئے سامانِ رسد فراہم کرتے ہیں۔

بدنصیبی ملاحظہ کیجئے۔ جن پر جاسوسی کا شبہ سب سے زیادہ تھا۔ وہی سب سے زیادہ بادشاہ کے مقرب تھے یعنی حکیم احسن اللہ خاں صاحب۔ زینت محل (بادشاہ بیگم) اور بہادر شاہ کا وزیر محبوب علی خاں۔ چنانچہ بار بار اس کے چرچے ہوئے حکیم احسن اللہ خاں صاحب کو دو تین مرتبہ گھیر بھی لیا۔ مگر ان سب کو وہ تقرب حاصل تھا کہ اُن کے حیلے بہانے بھی حقیقت سمجھے جاتے، اور اُن کا جھوٹ بھی سچ مان لیا جاتا تھا۔ ان میں صرف حکیم احسن اللہ خاں صاحب کو کچھ مالی نقصان اُٹھانا پڑا کہ وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر تھے اور پیچھے مکان لُٹ گیا۔ ان کے علاوہ اور کسی کو نقصان نہیں اُٹھانا پڑا۔ حالانکہ انقلابی فوج کا اس عرصہ میں بہت نقصان ہوا۔ یعنی چوڑی[۲] دالان میں جو اسلحہ کا کارخانہ اور میگزین تھا، وہ اُڑا دیا گیا۔ تلنگوں کو یقین تھا کہ حکیم احسن اللہ خاں نے آگ لگوائی ہے[۳]۔ اسی اشتعال میں وہ حملہ آور ہوتے تھے۔

مان سنگھ اور تراب علی کے متعلق شبہ بالکل صحیح تھا۔ اُن ایک مرتبہ گرفتار کر کے قلعہ میں پہنچا دیا گیا۔ مگر قلعہ کے قریب خود شاہزادے اِن دشمنوں کے دوست تھے۔

---

[۱] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۶۴۔ [۲] شمرو کی بیگم کے مکان میں۔ [۳] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۶۴۔

Marfat.com

اُنہوں نے بلا تکلف اُن کی دوستی نمایاں کر کے اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود لی اور اُن کو رِہا کرا دیا۔

مہاراجہ پٹیالہ انگریزوں کا سب سے بڑا دوست، اور اگر انگریزوں میں جذبۂ احسان مندی ہوتا، تو اس وقت سب سے بڑا مُحسن تھا۔ اس کا چچا راجہ اجیت سنگھ دہلی میں رہتا تھا۔ ایسے شخص کو نظر بند کر دینا اور حراست میں رکھنا حزم و احتیاط اور دستور و آئین کا تقاضا ہے۔ تلنگوں نے اُن کو گرفتار کیا تو بالکل بجا اور درست تھا۔ مگر وہ مغل بادشاہ جن کا عقیدہ یہ تھا:

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

اس گرفتاری کو کب گوارا کر سکتا تھا۔ اس کو رِہا کرا دیا کہ یہ تو مہاراجہ پٹیالہ سے ناراض ہیں اور عرصہ سے یہاں رہتے ہیں۔

اسی طرح رائے رام سرن داس ڈپٹی کلکٹر کے رشتہ دار دہلی میں رہتے تھے۔ اُن پر بھی جاسوسی کا الزام تھا۔ اُن پر بھی فوجیوں نے یورش کی اور سامان و اسباب لُوٹ لیا۔ غالباً جنرل بخت خاں کے بعد اس پالیسی میں شدّت آئی۔ چنانچہ چند آدمی جاسوسی کے الزام میں قتل کئے گئے۔ مثلاً بلدیو سنگھ جو شہر میں کوڑیا پُل پر رہتا تھا۔ اس کا بھائی لچھمن سنگھ علی پور میں تھانہ دار تھا۔ انگریزوں کا ساتھی تھا۔ بلدیو سنگھ کو دو مرتبہ جاسوسی کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ پہلی دفعہ چھوڑ دیا گیا مگر دوسری مرتبہ معافی نہیں دی گئی بلکہ گولی مار کر اُس کی لاش کو توالی کے سامنے ٹانگ دی گئی۔

پیارے لال مدرس تحصیل مظفر نگر دہلی میں رخصت پر آیا ہوا تھا۔ وہ اسی الزام میں گرفتار ہوا، اور توپ سے اُڑا دیا گیا۔

(۴) جن کے متعلق رسد یا سامانِ جنگ پہنچانے کا شُبہ ہوتا تھا۔ کشمیری اور موری دروازہ کے کچھ نانبائی پہاڑی پر ڈبل روٹی پہنچایا کرتے تھے۔ وہ اسی جُرم میں قتل کئے گئے۔

Marfat.com

حکیم احسن اللہ خاں اور محبوب علی خاں وزیر اس الزام سے بھی نہیں بچے۔ ایک مرتبہ اناج کے چھکڑوں میں گولے اور باروت برآمد ہوئی۔ اس کا الزام بھی ان ہی دونوں پر لگایا گیا۔ مگر اُنہوں نے حلف اُٹھائے اور شُبہ سے پاک ہو گئے۔

(۵) جن کے متعلق توڑ پھوڑ اور انقلابی فوج کے سامان کو نقصان پہنچانے کا الزام ہوتا۔ جیسا کہ چوڑی والان کے میگزین کو تباہ کرنا، جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ ایسے ہی ایک مرتبہ سلیم گڈھ کی توپوں میں اینٹیں اور پتھر بھرے ہوئے نکلے۔ دوسری مرتبہ ان میں میخیں ٹھکی ہوئی نکلیں۔ ان سب کا الزام ان ہی دو بڑوں پر لگایا گیا۔ حکیم احسن اللہ خاں مشیر خاص بہادر شاہ و محبوب علی خاں وزیر۔ مگر اُن کو قسمیں کھانی خُوب آتی تھیں قسمیں کھا کر جان بچالی۔ لُطف یہ ہے کہ محبوب علی خاں لبِ گور تھا۔ استسقاء کا مریض تھا۔ چنانچہ اسی اثناء میں اُس کا انتقال ہو گیا۔ مگر آخری وقت میں بھی وہ ایسا کردار اختیار نہ کر سکا جو شک و شُبہ سے بالا ہوتا۔ باقی رہے حکیم احسن اللہ خاں صاحب، تو اُن کی انگریز دوستی آج ضرب المثل ہے۔

مختصر یہ کہ وہ تمام اسباب اور وجوہات جن کی بناء پر لُوٹ مار یا قتل کے واقعات پیش آتے تھے، وہ بلاشبہ سخت سے سخت اقدام کے مستحق تھے۔ البتہ خرابی صرف یہ تھی کہ اس سے پیشتر کہ فوجی عدالت میں معاملہ پیش ہو کر قانونی طور پر سزا کا فیصلہ ہو، تلنگے اور دوسرے فوجی قانون کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر مجرموں کو سزا دے دیا کرتے تھے۔ ایسے ہنگامی حالات جو اس وقت درپیش تھے، ممکن ہے تلنگوں کو معذور قرار دے دیا جائے، اور کہہ دیا جائے کہ شدّتِ اشتعال میں یہ لوگ بے قابو ہو جاتے تھے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ فوجیوں کا شدّت اشتعال میں بے قابو ہو جانا خود ایک کمزوری ہے۔

Marfat.com

بادشاہ کے تاثرات

اب بہادر شاہ کا ایک طویل خط ملاحظہ فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیے۔ یہ خط مرزا مغل کے نام ہے۔ اس میں بہادر شاہ نے بدنظمی اور ہنگامہ آرائی کا شکوہ کیا ہے جس زمانہ میں انگریزوں کے نام کی تسبیح پڑھی جاتی تھی اور برطانوی اقتدار کو سایۂ رحمت بتایا جاتا تھا تو ہندوستانی فوجوں کی جبر و تعدّی اور ہندوستانیوں کی نااہلیت کے لئے سب سے بڑی دستاویز کے طور پر یہ خط پیش کیا جاتا تھا۔

مگر جبکہ مذکورہ بالا دفعات میں اس خط کا پس منظر آپ کے سامنے آچکا ہے تو خود آپ کی انصاف پسندی کا فیصلہ یہ ہوگا کہ یہ خط ہندوستانیوں کی نااہلیت کے بجائے ان کی امن پسندی، باہمی محبت اور رواداری اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کا بیّن ثبوت ہے۔ اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ اہلِ وطن کی عافیت اور راحت و آرام کے بارے میں مغل بادشاہ کا احساس کس درجہ نازک ہے کہ اس کو وہ خلفشار بھی برداشت نہیں جو ان حالات کا لازمی تقاضا تھا۔ رعایا کی معمولی تکلیف بھی ان کے دل کا درد اور اس کی رُوح کے لئے سوز و گداز ہے۔ جس سے وہ یہاں تک بے چین اور مضطرب ہے، کہ چاہتا ہے کہ اقتدار کے اس جامۂ زرّیں کو اُتار پھینکے اور شاہی کے بجائے گدائی اختیار کرلے۔ وہ مخلوق جو برائے نام رعایا تھی، اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کے سامنے مذہب کا سوال قطعاً نہیں۔ وہ ہندو اور مسلمان ہر ایک کو ایک نظر سے دیکھتا ہے دونوں کو یکساں درجہ دیتا ہے۔

اس کا عقیدہ یہ ہے کہ بادشاہ اور رعایا کا تعلق محبت، دوستی اور خیر خواہی کا تعلق ہے۔ وہ جبر و تعدّی اور خلفشار کو اپنی بادشاہی کی کسرِ شان سمجھتا ہے اور جب اس پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے کہ یہ خط ہنگامۂ انقلاب شروع ہونے سے صرف دس روز بعد[1] کا ہے، تو یہ خط اُن تمام منظّم اور باضابطہ حکومتوں کے لئے سبق بن جاتا ہے، جو

---

[1] جیسا کہ اسی مکتوب کے ایک جملہ سے معلوم ہوتا ہے جس پر خط کھینچ دیا گیا ہے۔

Marfat.com

ہفتے اور مہینے نہیں بلکہ پانچ سات سال گذر چکنے پر بھی عوام کے جذبات پر خاطر خواہ کنٹرول نہ کر سکیں۔

مرزا مغل کے نام بادشاہ نے یہ حکم لکھا ہے کہ:

"ہمارے فرزند کو معلوم ہو کہ جب سپاہ، پیدل اور سوار، اوّل ہی میرے پاس آئے ہیں تو مَیں نے اُن سے خود اپنی زبان سے کہہ دیا تھا، کہ میرے خزانہ اور مال اسباب نہیں ہے، جس سے مَیں اُن کی مدد کر سکوں لیکن اگر میری جان اُن کے کام آئے تو اس میں مجھے دریغ نہیں۔ میرے اس کہنے سے وہ سب خوش اور راضی ہو گئے، اور انہوں نے اقرار کیا کہ وہ میری فرماں برداری و اطاعت میں اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ مَیں نے اُن کو ہدایت کی کہ اُن کا اوّل کام یہ ہے کہ میگزین اور خزانہ کا انتظام ایسا کریں کہ آئندہ اُن کے اور میرے کام آئے۔ اس کے بعد انہوں نے دیوانِ خاص و دیوانِ عام و مہتاب باغ میں، اور اَور مقامات میں جہاں اُن کی خوشی میں آیا، قیام کیا۔ مَیں نے اُن کی جہالت و آسائش و آرام کی خاطر سے اپنے نوکروں کو منع کر دیا کہ وہ اس کام میں اُن کے مزاحم نہ ہوں اگرچہ مَیں نے اُن سے اقرار نہیں کیا تھا، مگر روپیہ قرض لیا گیا کہ پیادہ و سوار کو روزینہ دیا جائے۔ مَیں نے بار بار یہ حکم دیا کہ وہ شہر میں جبر و تعدّی و غارت گری نہ کریں۔ مگر اس سے کچھ کام نہ نکلا۔ آج دس روز گذرے ہیں سب تک وہی خرابیاں چلی جاتی ہیں۔ دیوانِ خاص و دیوانِ عام میں سے رجمنٹیں چلی گئی ہیں۔ مَیں نے اُن کو حکم دیا تھا کہ وہ شہر سے باہر جا کر مقیم ہوں اور کوئی پیدل اور سوار شہر میں ہتھیار باندھ کر نہ پھرے اور شہر کے باشندوں پر زیادتی نہ کرے مگر ایک رجمنٹ دہلی دروازہ میں اور دوسری اجمیری دروازہ میں اور تیسری لاہوری دروازہ میں شہر کی فصیل کے اندر رہتی ہیں۔

Marfat.com

اور بعض بازاروں کو اُنہوں نے بالکل لُوٹ لیا ہے۔ نہ رات کا خیال کریں نہ دن کا۔ وہ لوگوں کے گھروں میں یہ بہانہ بنا کر کہ گھر میں کوئی فرنگی ہے گھس کر لُوٹ لیتے ہیں۔ دکانوں کے قفل توڑتے ہیں، کواڑ نکال لیتے ہیں اور اُن کے اندر کا اسباب بے حجاب لُوٹتے ہیں۔ وہ سواروں کے گھوڑے کھول لے جاتے ہیں۔ باوجودیکہ یہ دستور چلا آتا ہے کہ جو شہر حملے و تیغ زنی سے پہلے لئے جاتے ہیں، وہ لُوٹ مار سے بَری کئے جاتے ہیں۔ مگر اس پر وُہ کچھ خیال نہیں کرتے۔ چنگیز خاں و نادر شاہ بھی جو بڑے ظالم مشہور ہیں۔ وہ شہروں کو پناہ و امن دیتے تھے جو اپنے تئیں بغیر مقابلہ کے اُن کو سُپرد کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ سپاہی میرے ملازموں اور اہلِ شہر کو ڈراتے و دھمکاتے ہیں۔ باوجودیکہ میں نے پیدلوں کو فراش خانہ کے اور سواروں کو مہتاب باغ خالی کرنے کا بار بار حکم دیا ہے، مگر وہ خالی نہیں کرتے، یہ وہ مقامات ہیں جن میں نہ نادر شاہ، نہ احمد شاہ اور نہ کوئی گورنر جنرل ہند گھوڑے پر سوار ہو کر اب تک آیا تھا۔ سپاہ نے اوّل درخواست کی کہ شہزادے اُن کے افسرِ اعلیٰ مقرر ہوں۔ ہم سب ان کی فرماں برداری و اطاعت کریں گے۔ یہ کام اُن کی مرضی کے موافق کیا گیا۔ پھر انہوں نے اس بات پر زور ڈالا کہ اس میں ہمارا اعتبار بڑھ جائے گا، اگر ان شہزادوں کو اُن کے عہدوں کے خلعت مرحمت ہوں۔ جس سے وہ مستقل ہمارے حاکم معلوم ہوں اور تمام قیدی فرنگی ایک ہی دفعہ میں مارے جائیں۔ یہ کام بھی اُن کی مرضی کے موافق کیا گیا، اور اسی دن اشتہار عام دیا گیا، جن پر مہر شاہی لگی ہوئی تھی کہ شہر میں عدالت کی کچہریاں مقرر کی گئیں لیکن اہلِ شہر پر اُن کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ ان باتوں سے قطعِ نظر یہ لکھا جاتا ہے کہ جب برٹش گورنمنٹ کا کوئی اعلیٰ افسر قلعہ میں آتا تھا تو وہ دیوانِ عام کے دروازہ پر

Marfat.com

گھوڑے سے اُترتا تھا اور پیدل پھرتا تھا۔ لیکن یہ سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے دیوانِ خاص اور جلو خانے تک آتے ہیں۔ جن کا لباس نامناسب ہوتا ہے۔ سر پر دستار نہیں ہوتی۔ وہ شاہی آداب کو بجالانا جانتے نہیں۔ دربار میں سپاہ کے افسر اپنے لباس کی پرواہ نہیں کرتے۔ سروں پر ٹوپیاں بجائے پگڑی کے ہوتی ہیں۔ انگریزی عملداری میں اس کے کسی افسر نے ایسا نہیں کیا۔

انہوں نے بے فائدہ میگزین کے کُل اسباب کو خرچ کیا اور خزانہ کے روپیہ کو اُڑا دیا۔ سب بڑا غُل مچا مچا کے اپنا روزینہ اتنے آدمیوں کا، جتنے وہ ہیں نہیں، مانگتے ہیں۔ پھر دکان داروں پر طرح طرح کے ظُلم کرتے ہیں اُن سے اجناس لے لیتے ہیں اور قیمت دیتے نہیں۔ اب شہر کے باہر کا یہ حال ہے کہ سپاہی شہر سے باہر انتظام کرنے کے لئے تو جاتے نہیں اس لئے سینکڑوں آدمی مارے جاتے ہیں اور ہزاروں آدمی لُوٹے جاتے ہیں۔ مُلک کے نظم و نسق کی صورت یہ ہے کہ شاہی سپاہ کافی نہیں، کہ وہ کُل اضلاع کے بندوبست کو سنبھالے۔ تحصیل دار اور پولیس افسر مقرر نہیں ہوسکتے۔ قلعہ و شہر سے باہر نہ کوئی پیدل، نہ کوئی سوار باہر قدم رکھتا ہے کہ انتظام ہو۔ ایسی حالتوں میں رسد کا آنا اور مال گذاری کا وصول ہونا سخت مصیبت ہے۔ ان سب حالتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ شہر اور مُلک کے بالکل تباہ و غارت ہونے کے سوا کچھ اور اُمید نہ ہوسکے۔ ان باتوں پر یہ اور طرہ ہے کہ وہ بادشاہی ملازموں پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ ہمارے مخالف ہیں اور اپنا روزینہ اُن سے بڑی حکومت سے گستاخانہ مانگتے ہیں۔ میرے حکم کے موافق میرے یہ ملازم ان سے بہ لجاجت و خوشامد و بہ منت پیش آتے ہیں۔ مگر اس پر بھی وہ راضی نہیں ہوتے۔ ایسی صورتوں

Marfat.com

میں کب اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ یہ سپاہی مُلک کی صلاح و فلاح چاہتے ہیں یا حکومت شاہی کی اطاعت کے خواستگار ہیں۔

اب ایک اور بات خیال کرنے کی ہے کہ خزانہ میں تو روپیہ نہیں ہے۔ شہر کے مہاجن و سوداگروں میں لُٹ جانے اور تباہ ہونے کے سبب سے استطاعت نہیں رہی کہ وہ روپیہ قرض دیں۔ بس کس طرح سے اُن کو کسی وقت تک روزینہ تقسیم ہو سکتا ہے؟ جب اُن کا یہ روزینہ بند ہو جائے اور ملک سے جو رسد آتی تھی بند ہو جائے گی تو کیا حالت ہوگی۔ پھر تماشا یہ ہے کہ سپاہی خود یہ کرتوت کرتے ہیں جس سے ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کا الزام ملازمانِ شاہی پر لگاتے ہیں۔ "اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے"۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب سپاہ کا یہ حال ہو، تو ظاہر ہے کہ میری پادشاہی بالکل غارت و تباہ ہو جائے گی۔ میری بے کسی و بے چارگی کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ مَیں نے عہد کر لیا ہے، کہ اپنی باقی زندگی یادِ الٰہی میں بسر کروں اور بادشاہی کو سلام کروں جس میں سراسر تکالیف و مصائب ہیں۔ اوّل خواجہ صاحب کے درگاہ میں جاؤں اور وہاں سے اپنا انتظام کر کے مکّہ چلا جاؤں۔ یہ بھی خیال کرنا چاہیئے کہ جب سپاہ آئی تو بادشاہی ملازموں نے اور اہلِ شہر نے اُن کا کسی طرح کا مقابلہ نہیں کیا۔ نہ کوئی کام دشمنی کا اُن کے ساتھ کیا۔ اس لئے اہلِ شہر مستحق نہیں ہیں کہ اُن کی جان و مال عزّت و مال و اسباب تلف ہوں۔ مَیں اپنی رعایا کی طرف سے قائم مقام ہو کر سپاہ کو سمجھاتا ہوں کہ پھر کیوں ہم اُن کے کام میں شریک ہوں۔ اپنی اولاد کو ان کے کاموں میں شریک و معاون بنائیں جو ظلم و تعدّی

Marfat.com

و جبر و جور ہو رہا ہے، اس کو میں اپنی بادشاہی کی کسرِ شان سمجھتا ہوں کہ بادشاہ ہو کر سپاہ کا رفیق بنوں، اور ان کو قتل و غارت کرنے کو پسند کروں۔ یہ بات سوچنے کی ہے کہ ایک طرف بادشاہ اور رعیت کے مابین محبّت و دوستی و نیک خواہی ہو، دوسری طرف سپاہ کے ایسے افعال ہوں کہ وہ اپنے کاموں کو جو دشمن کی سپاہ بھی نہیں کرتی، اپنی نیک کرداری جانے۔ سپاہ کیلئے قابلِ تعریف یہ ہوشیاری و دانائی کا کام سزاوار تھا کہ وہ رعایا کی پرورش اور محافظت کرتی اور ملازمانِ شاہی کے ساتھ یگانگی قائم رکھتی ہے اور اپنے تئیں بادشاہ کے دل پسند بنانے کے لئے غور کرتی۔ ہم کو توقع تھی کہ اگر وہ اس طرح عمل کرتی تو امن و امان رہتا۔

میرے فرزندم پیدل اور سواروں کے افسروں کو بلا کر اُن کے سامنے ان باتوں کو خوب توضیح کے ساتھ بیان کر دو۔ اگر وہ حقیقت میں میری سلطنت کی خدمت کرنی چاہتے ہیں تو ایک تحریری اقرار نامہ لکھیں جس کا مسودہ اُن کے پاس بھیجا جائے گا، اور ان کی دل جمعی کے لئے ہم بھی ایک تحریری اقرار نامہ لکھ دیں گے۔ اُن کو چاہیئے کہ وہ اپنے جبر و تعدّی و ظلم و ستم و ناسزا کاموں کو چھوڑیں جو اب تک کر رہے ہیں اور آج ہی پیدل سپاہ اپنے خیموں کو شہر سے باہر لے جائے۔ اگر کوئی سپاہی کسی باشندہ کو قتل کرے گا یا لوٹے گا، تو جرم ثابت ہونے کے بعد اس کو مناسب سزا دی جائے گی تاکہ اور آدمیوں کو عبرت ہو، اور وہ جانیں کہ ایسے بُرے کاموں کے کرنے سے سزایابی سے وہ بچ نہیں سکتے اور ایک رجمنٹ کو یا کئی رجمنٹوں کو احکام شاہی دیئے جائیں کہ وہ جا کر ملک میں سے فسادوں کو دُور

Marfat.com

کریں اور سینہ زوری کے ساتھ میگزین اور سامان رسد کی نامعقول درخواستیں نہ کریں۔ یہ رجمنٹیں اس حالت میں مراجعت کرنے کا اختیار رکھتی ہیں جب یہ امر تحقیق ہو جائے کہ انگریزی سپاہ قریب آگئی ہے تو پھر وہ جس ترتیب و انتظام سے لڑنا چاہیں لڑیں۔ سپاہ اس امر کا فیصلہ کرے کہ کس قدر سپاہ جُداگانہ مختلف مقامات میں رکھی اور اُن کی تقسیم کس طرح ہو۔ شہر میں بھی سپاہ کے رہنے کی ضرورت ہوگی۔ لیکن بالفعل ضرورت نہیں ہے۔ شہر و ملک دونوں یکساں غارت و تباہ ہو رہے ہیں اور سپاہ شہر سے باہر نکل کر ذرا بندوبست نہیں کرتی۔ یہ ایک اور بات اُن کے سامنے اچھی طرح بیان کرو، کہ اگر وہ بادشاہ کی ان خواہشوں اور ارادہ کے بر لانے میں خوشی و رضامندی سے سعی نہ کرے گی، تو ہم فقیر ہو کر خواجہ صاحب میں جا بیٹھیں گے ہمیں کوئی اس کام کے کرنے میں روکے نہیں۔ وہ شہر و قلعہ و مُلک کے خود مالک ہو بیٹھیں۔ قدیم زمانہ کے بادشاہوں میں سے کسی نے نہ جنگ آزماؤں میں سے جو اُن کے بعد آئے، کسی نے اس زمانہ تک اس شخص پر ظلم کیا ہے، جس نے اُن سے پناہ مانگی اور امن چاہا ہو۔ انہوں نے اُس کو آزادانہ اختیار دیا کہ وہ اپنا طریقہ اختیار کرے۔ تم سپاہ سے کہو کہ اُوپر جو دو باتیں بیان کی گئی ہیں، اُن میں سے وہ ایک بات اختیار کر کے اپنی عرضی میں بیان کر دیں، اور اس پر افسر اپنے دستخط و مہریں کریں۔ اور وہ عرضی ہمارے پاس بھیج دو۔ تم اس بات کو خفیف معاملہ نہ جانو۔ پیرانہ سالی و ضعف حالی کے سبب سے میں ان افکار کا بار نہیں اُٹھا سکتا کسی قوم پر سلطنت کرنی اور سپاہ کو قابو میں رکھنا لڑکوں کا کھیل نہیں ہے۔"

Marfat.com

ذبیحہ گاؤ ذبیحہ گاؤ کے بارے میں مغل بادشاہوں کی پالیسی عموماً نرم رہی ہے۔ مغل بادشاہ اپنے آپ کو ہندو مسلمانوں کا مشترک بادشاہ مانا کرتے تھے۔ مذہبی تقریبات میں بھی اس اشتراک کا لحاظ رکھا کرتے تھے۔ اسی بنا پر بقرعید کو اُونٹ کی قربانی سے اس فرض کی ادائیگی ہوا کرتی تھی۔ اس سال یکم اگست کو مسلمانوں کی بقرعید اور ہندوؤں کی دوج تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں اپنے اپنے متبرک دنوں کی برکتوں سے کامیابی مقصد کا فائدہ حاصل کرنا چاہ رہے تھے۔ چنانچہ

"برہمنوں اور مسلمانوں نے فتح کی دعائیں مانگیں اور بڑے جوش و خروش سے حملے کیے۔"[1]

اس اشتراک و تعاون اور یک جہتی کے موقع پر قربانی گاؤ کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ چنانچہ دُنبوں اور بکریوں کی قربانی کی گئی، اور بادشاہ نے حسبِ معمول اُونٹ کی قربانی کی۔[2]

یہ ہے واقعہ جس کو شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب نے متعدد بار مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ اور لُطف یہ ہے کہ ہر ایک پیرایہ میں انگریز کی چشمِ نیلگوں کا رنگ نمایاں ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من اندازِ قدت را می شناسم

ایک جگہ ارشاد ہے : (لب و لہجہ ملاحظہ ہو)

"بادشاہ عید کو عیدگاہ میں جا کے نماز پڑھتا تھا اور اُونٹ کی قربانی کرتا تھا۔ مگر آج اگر وہ وہاں جاتا تو خود اس کی قربانی ہوتی (کیونکہ یہاں انگریزوں نے ایک مورچہ بنا رکھا تھا)۔

تلنگوں نے مسلمانوں کو گائے کی قربانی نہیں کرنے دی۔ اُن کو سمجھایا کہ گائے کے بجائے فرنگیوں کی قربانی کرو۔ مگر اُن کی قربانی کرنے

---

[1] تاریخ عروج عہدِ انگلیشیہ ص۶۱۳ ۔ [2] ایضاً ص۶۱۳

Marfat.com

میں تو اپنی قربانی ہوتی تھی"[1] الخ

دوسرے موقع پر ارشاد ہے:

"مولوی صاحب (مولانا فضل حق خیرآبادی) نے بادشاہ کے لئے ایک دستور العمل سلطنت کا لکھا تھا۔ جس کی دفعہ اوّل یہ مشہور ہوئی تھی کہ گائے کہیں بادشاہی عملداری میں ذبح نہ ہو۔"[2]

ایک اور جگہ پوری رنگ آمیزی کے ساتھ تحریر ہے اور اس میں بادشاہ کو مجبور ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔[3]

اول تو بادشاہ کا جو صادر ہوا، وہ یہ تھا کہ گائے ذبح نہیں کی جائے گی ۹ جولائی کو ڈھنڈورا پٹوایا کہ جو گائے ذبح کرے گا، وہ توپ کے منہ اُڑایا جائے گا۔ بقرعید کو گائے کی قربانی منع کی گئی۔[4]

اگر بادشاہ کو اختیار ہوتا تو وہ کیوں ہندوراؤ جیسے احکام دیتا۔ مگر تلنگوں کے ہاتھ سے وہ مجبور تھا۔ جو اُس نے اپنی مرضی اور مذہب کے خلاف یہ حکم دیئے۔[5]

گائے قصاب چار مہینے تک اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے رہے

---

[1] تاریخ عروج عہدِ انگلیشیہ ص۶۱۳ ۔ [2] ایضاً ص۶۸۷ ۔ [3] اگرچہ شمس العلماء بادشاہ کے مخالف ہیں مگر چونکہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد مسلمانوں کے جس طبقہ نے انگریزوں کو اپنی اُمیدوں کا مرکز بنا لیا تھا، ان کی کوشش یہ بھی ہوئی کہ مسلمانوں پر جو بانی انقلاب ہونے کا الزام لگایا گیا ہے، اس کو اُٹھایا جائے۔ اس لئے وہ بہادر شاہ کو مجبور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال شمس العلماء کی یہ تحریر ہے۔ [4] ابھی گذر چکا ہے کہ بقرعید یکم اگست کو ہوئی۔ اب یہ سوال حل طلب ہے کہ جو اعلان ۹ جولائی اور یکم اگست کو ہوا، وہ بادشاہ کا سب سے پہلا حکم کس طرح ہو سکتا ہے۔ [5] خود شمس العلماء بار بار فرما چکے ہیں کہ بادشاہ اونٹ کی قربانی آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے کیا کرتا تھا۔ اس کے لئے کس تلنگے نے مجبور کیا تھا۔

Marfat.com

اگر باہر نکلتے تو تلنگے اُن کو اسی طرح ذبح کرتے تھے، جیسے وہ گائے کو ذبح کرتے تھے۔ پانچ چار مسلمان قصائی، ہندو قصائی کے ہاتھ سے ذبح ہوئے۔

پھر تلنگوں نے دوسرا حکم بادشاہ سے صادر کرایا کہ شہر کے ڈلاؤ اور کوڑا جو بیلوں پر لاد کر شہر سے باہر کھیتوں میں ڈالنے کے لئے جاتا ہے، وہ گدھوں پر لد کر جایا کرے۔ بھنگیوں کے ہاتھ جب تک گدھے لگے، شہر میں ڈلاؤ کے ڈھیر لگے۔ مگر بہت دن نہیں لگے کہ حلال خوروں نے اپنے بیل بیچ کر گدھے مول لے لئے۔ پھر کبھی ایّام غدر میں بیلوں کی پیٹھ پر ڈلاؤ لدا ہوا دیکھنے میں نہیں آیا۔

مسلمانوں کو یہ بادشاہی احکام ناگوار گذرے اور انہوں نے کہا یہ اسلام کی بادشاہی نہیں، یہ تو ہندوؤں کا راج ہے۔ پلّے، شُہدے، ذلیل مسلمانوں نے ایک دفعہ اپنا محمّدی جھنڈا ہندوؤں پر جہاد کے لئے لگایا۔ دوسری دفعہ مولوی محمد سعید نے جامع مسجد میں یہ جھنڈا کھڑا کیا۔ تو بادشاہ نے اُن سے کہا۔ یہ کس کے لئے ہے، انگریز تو شہر میں باقی نہیں تو اُنہوں نے کہا کہ ہندوؤں کے لئے لگایا گیا ہے۔ بادشاہ نے اُن کو یہ سمجھا کر اس جھنڈے کو اُکھڑوا دیا کہ سارے تلنگے ہندو ہیں[1]، اُن سے بے چارے مسلمان کیا لڑیں گے۔

---

[1] اس سے زیادہ کوئی جواب تعجب انگیز نہیں ہو سکتا۔ سارے تلنگے ہندو سہی مگر جو سپاہ یہاں پہنچی ہوئی تھی جس کی تعداد جولائی اور اگست میں تقریباً پچاس ہزار تھی، نہ وہ سب کی سب ہندو تھی، نہ اُس کے افسر ہندو تھے۔ اگر یہ واقع صحیح ہے تو بادشاہ نے یہ کہا ہوگا۔ ان بے چاروں سے مسلمان کیا لڑیں گے۔ شمس العلماء نے صرف لفظ "بیچارے" میں تقدیم، تاخیر کر دی۔

Marfat.com

بادشاہ کی شخصیت و عظمت

ہندو اور مسلمانوں کے تعلّقات بادشاہ سے

ارادت و عقیدت یا مخالفت۔ خاندان تیمور کے متعلق ہندوستانیوں کی رائے۔

۱۸۵۷ء کی داستان میں بادشاہ کی شخصیت کا عنوان بھی بہت دلچسپ ہے۔ اس عنوان کے ذیل میں متعدد تاریخی حقیقتیں سامنے آسکتی ہیں۔ اس لئے اس موضوع پر بھی سیر حاصل بحث بہت ضروری ہے۔

سرسید اور شمس العلماء ذکاء اللہ خاں کی رائے سرسید احمد صاحب کو بادشاہ سے اختلاف ہے وہ ان کا تذکرہ کرتے وقت اپنے قابو میں نہیں رہتے۔ زیادہ سے زیادہ رکیک الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ بادشاہ کے متعلق اُن کی رائے ملاحظہ فرمایئے

"دلّی کے معزول بادشاہ کا یہ حال تھا کہ اگر اس سے کہا جاتا کہ پرستان میں جنّوں کا بادشاہ آپ کا تابعدار ہے۔ تو وہ اس کو سچ سمجھتا اور ایک چھوڑ دس فرمان لکھ دیتا۔

دلّی کا معزول (بادشاہ) کہا کرتا تھا کہ میں مکھّی اور مچھر بن کر اُڑ جاتا ہوں، اور لوگوں کی اور ملکوں کی خبر لے آتا ہوں۔ اور اس بات کو وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا، اور درباریوں سے تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے۔[1]

پھر ارشاد ہے:

"دلی کے معزول بادشاہ کی سلطنت کا کوئی بھی آرزومند نہ تھا۔ اس خاندان کی لغو اور بے ہودہ حرکات نے سب کی آنکھوں میں اس کی قدر و

---

[1] اسباب بغاوتِ ہند ص۴ و ۵

Marfat.com

منزلت گرادی تھی۔ ہاں بیرونجات کے لوگ جو بادشاہ کے حالات اور حرکات اور اقتدار و اختیارات سے واقف نہ تھے، بلاشبہ بادشاہ کی بڑی قدر سمجھتے تھے اور اس کو ہندوستان کا بادشاہ اور انریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتظم ہندوستان جانتے تھے۔ اِلّا خاص دِلّی کے اور اس کے قرب و جوار کے رہنے والے بادشاہ کی کچھ بھی وقعت خیال میں نہ لاتے تھے۔ باوجود ان سب باتوں کے ہندوستان کے سب آدمیوں کو بادشاہ کے معدوم ہونے سے کچھ بھی رنج نہ تھا۔[1]

اس کے بعد تحریر ہے:

"دِلّی میں ایک بڑا گروہ مولویوں کا اور اُن کے تابعین کا ایسا تھا کہ وہ مذہب کی رُو سے معزول بادشاہ کو دِلّی کا بہت بُرا اور بدعتی سمجھتے تھے۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ دلّی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبض و دخل اور اہتمام ہے، اُن مسجدوں میں نماز درست نہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جامع مسجد میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔ اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتوے اس معاملہ میں موجود ہیں۔[2]"

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں کا ارشاد ہے:

"دہلی کے مولوی اور اکثر مسلمان خاندانِ تیمور کو ایسا خولخبط جانتے تھے کہ وہ ناممکن سمجھتے تھے کہ اس خاندان کی بادشاہی ہندوستان میں ہو۔ مگر اس کے ساتھ جاہل مسلمانوں کا یہ یقین تھا کہ انگریزی سلطنت کے بدن میں یہ ایسا پھوڑا نکلا ہے کہ وہ جانبر نہیں ہوگی۔[3]"

دوسرے موقع پر تحریر ہے:

"دلّی میں وہابی مولویوں کا گروہ بہادر شاہ کو بڑا بدعتی جانتا تھا اور

---

[1] اسباب بغاوتِ ہند ص۷۔ [2] ایضاً ص۹۔ [3] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۷۵

ان مسجدوں میں نماز پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتا تھا جن میں بادشاہ کی طرف سے امام مقرر ہوتا اور اُن کا اہتمام ہوتا۔"

"بادشاہ کا میلان شیعہ مذہب کی طرف دیکھ کر وہ اس سے زیادہ متنفر ہوتے۔"

جُملہ معترضہ ان اقتباسات سے نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس زمانہ کی اصطلاح میں وہابی کا مطلب تھا "پابندِ شریعت"۔

خود شمس العلماء شاہزادہ مرزا فخرالدین کے تذکرہ میں فرماتے ہیں:

"مرزا فخرالدین اپنے مذہب کا بڑا پابند تھا۔ اُس نے اپنا ختنہ[1] کرایا تھا۔ شہزادے اس کو متشرع ہونے کی وجہ سے وہابی[2] کہتے تھے۔"

بادشاہ کی وجہ سے علماء میں اختلاف سر سید مرحوم اور شمس العلماء نے بہادر شاہ بادشاہ کے متعلق جو شہادتیں پیش کی ہیں۔ اُن کے متعلق مبالغہ آمیزی کا فیصلہ تو کیا جا سکتا ہے مگر اُن کو سرے سے غلط اور بے بُنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ اور خاندانِ تیموریہ کے اِنہیں اطوار کے سبب سے اس جنگِ آزادی کے بارے میں بھی ایک گونہ اختلاف ہو گیا تھا۔

اوّل تو خود ملوکیت علماء کرام کے لئے ناقابلِ برداشت تھی، پھر ایسے خاندان کی ملوکیت جس کی حالت یہ ہو کہ:

"دہلی میں خاندانِ تیموریہ کی بے ہنگ اور نااہل حرکتوں کے سبب سے خواص کی نگاہ میں کچھ عزت باقی نہیں رہی تھی۔[3]"

"قلعہ جو بجائے خود شہر تھا سب قسم کی برائیوں کا گھر تھا جس میں

---

[1] اکبر کے زمانہ میں شہزادوں کی ختنہ بند ہو گئی تھی۔ اکبر کا نیا قانون یہ تھا کہ ساقط الاعضاء بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ ختنہ کرانے سے ایک عضو ساقط ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بادشاہت کے قابل نہیں رہتا۔ (معاذ اللہ)۔ (دیکھو شاندار ماضی حصہ اوّل)۔ [2] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۲۷۸۔ [3] ایضاً ص۲۹۱۔

Marfat.com

عورت مرد ایسی بدکاریاں کرتے تھے کہ وہ اپنے لئے اور اوروں کے لئے خدا کی طرف سے لعنت کا مستحق کرتے تھے۔ مشرق میں جس قدر برائیاں ہیں وہ سب اس قلعہ میں موجود تھیں۔ جن کا حساب سوا اللہ تعالیٰ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ شہر کے متقدس اور متبرک آدمی کہا کرتے تھے کہ اگر کسی مکان میں قلعہ کی اینٹ بھی لگ جائے تو اُس میں رہنا حرام ہے[1]"

جب یہ مقدس اور متبرک آدمی اپنے مکان کی کسی دیوار میں قلعہ کی ایک اینٹ کے روادار بھی نہیں تھے تو وہ اپنے اُوپر قلعہ کی حکومت کیسے برداشت کر سکتے تھے لیکن سیاسی نقطۂ نظر سے ایک دوسری قباحت بھی اس موقع پر درپیش تھی۔ جس کی تفسیر یہ ہے کہ:

"عوام الناس اس کو (بہادر شاہ کو) اپنا بادشاہ جانتے تھے، اور کیوں نہ جانتے۔ جب ہر روز ڈنکہ کی چوٹ ڈھنڈوروں میں یہ سُنتے تھے، کہ "خلقت خدا کی اور ملک بادشاہ کا، حکم سرکار کمپنی کا"۔ تو بادشاہ سے مراد بہادر شاہ ہی جانتے تھے۔ اُن کا ذہن کب اس پر پہنچتا تھا کہ انگلینڈ میں ہندوستان کا بادشاہ رہتا ہے"۔

"سارے ہندوستان کے شہروں میں اُس کے نام کا خطبہ، عیدین اور جمعہ کی نمازوں میں پڑھا جاتا تھا"۔

جب مجسٹریٹ ضلع ایسے احکام جاری کرتا۔ جس سے کوئی فریق ناراض ہو کر اپنے پیشہ اور کام کی ہڑتال کر ڈالتا، تو وہ گروہ جھروکوں میں ریتی میں بادشاہ کے آگے فریادی ہو کر جاتا۔

دھوبیوں، بھنگیوں و قصائیوں نے یہی کیا تھا کہ اپنے کاموں کو سب نے بند کر کے بادشاہ سے فریاد کر کے اپنی داد چاہی۔ دلّی میں بہت سے آدمیوں کو قلعہ سے ایسا تعلق تھا کہ جب شاہ دلّی کی شان کے خلاف

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۳۶۹۔

گورنمنٹ انگریزی کی کوئی حرکت دیکھتے تو بہت ناخوش ہوتے تھے۔
سرطامس مٹکاف صاحب کو بادشاہ فرزند ارجمند شفقوں میں القاب لکھا کرتا تھا۔ جب اُن کے انتقال کے بعد ہاروے صاحب "ایجنٹ" ہو کر دلّی میں آئے تو انہوں نے بادشاہ کو لکھ دیا کہ ہم کو آپ کا فرزند بننا منظور نہیں"۔
پہلے بادشاہ کی سواری کے جلوس کا یہ ادب کیا جاتا تھا کہ کوئی انگریز جلوس کی قطار کو کاٹ کر اپنی سواری میں نہیں جاتا تھا۔ مگر انگریز اب اس قاعدے کے پابند نہ تھے۔ ایسی باتوں کو دیکھ کر دلّی کے مسلمان ناخوش ہوتے تھے کہ اُن کے بادشاہ کی کچھ عزت باقی نہیں رہی[1]۔
پچاس برس سے دہلی کی لال حویلی کا مالک انگریزوں کے تخمینہ میں ایک "جھوٹی نقل" اور خالی "نمائشی سانگ" باقی تھا۔ لیکن اس جھوٹی نقل اور خالی نمائشی سانگ اور نام نے، اپنا زندہ اثر سلاطین اور رعایا ہند پر کبھی موقوف نہیں کیا تھا۔ زمانہ حال تک ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے نام کے سکّے چلتے تھے، اور ہندوستان کے سلاطین خواہ مسلمان ہوں یا ہندو ہوں، اپنے جانشینوں کے لئے بڑے نام شاہی فرمان مانگتے تھے۔ اور ان کو سرکار کمپنی کے فرمان سے زیادہ باوقعت و مستحکم جانتے تھے۔ گو دہلی کے بادشاہ کا افسانہ ہی باقی تھا۔ مگر یہ افسانہ ؎

عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

رعایا کے دلوں میں اور زبانوں پر یہ افسانہ بڑا معزز وظیفہ تھا۔ جس کو وہ جپا کرتی تھی[2]۔
مختصر یہ کہ خاندانِ تیموریہ اور خود بہادر شاہ ظفر کی جملہ ناکارگیوں اور نااہلیتوں کے باوجود عام ہندوستانیوں کو حتیٰ کہ صاحب اقتدار نوابوں اور راجاؤں (سلاطین)

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۳۹۱۔ [2] ایضاً ص۳۶۴۔

Marfat.com

کو اس خاندان سے ایک خاص تعلق تھا جو صرف محبت کی حد تک نہیں بلکہ مذہبی عقیدہ کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ کیونکہ مسلسل دو سو برس تک (از بابر تا اورنگ زیب عالمگیر) ایک ہی خاندان کی پُرشوکت شاہنشاہیت کے سایہ میں کم و بیش دس نسلیں سکون و اطمینان اور خوش حالی کی زندگی گذار چکی تھیں اور اس بنا پر ہر آنے والی نسل کے دل و دماغ پر اس عقیدہ کا رنگ پوری طرح جم چکا تھا کہ ہندوستان میں بادشاہت کا حق صرف مغل خاندان کو ہے۔ وہی مالک ملک ہے اور اسی کو حق پہنچتا ہے کہ کسی کو حکومت و فرماں روائی کی سند عطا کرے۔ اسی عقیدہ کی پختگی کا یہ رعب تھا، کہ سو سال، بلکہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) سے لے کر آج تک (ڈیڑھ سو سال تک) روز افزوں تنزل، پستی اور لاچارگی کے باوجود ایسٹ انڈیا کمپنی کے شاطر و چالاک خداوندانِ بست و کشاد کو لال حویلی (لال قلعہ) میں یہ نمائشی سانگ باقی رکھنا پڑا تھا۔

بیشک آج (۱۸۵۷ء) سے تقریباً تیس سال پہلے انہیں علماء کی جماعت (جن کو آج وہابی کہا جا رہا ہے) حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی زیرِ قیادت، اس ملوکیت اور شاہنشاہیت سے دامن جھاڑ کر خلافتِ راشدہ کے نمونہ پر شمال مغربی سرحدی علاقہ میں ایک حکومت قائم کر چکی تھی، اور آج بھی انہیں علماء کرام کا ایک دستہ مغل شاہنشاہیت اور برطانوی سامراج دونوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ لیکن جب خود "قلب ہندوستان" میں انقلاب کی شکل پیدا ہو گئی، اور کم از کم شمالی ہند کے چپہ چپہ سے اس کی حمایت کیلئے بے نظیر و بے پناہ جذبات اُبلنے لگے، گراں قدر قربانیاں پیش کی جانے لگیں، اور یہ سرزمین جو ایک مدت سے انگریزی مظالم کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی، اس کا ایک ایک ذرہ ان سفید فام درندوں کے خون کا پیاسا معلوم ہونے لگا، تو اب قدرتی طور پر یہ سوال ہر ایک کے سامنے تھا کہ انگریزی سامراج بہتر ہے یا مغل بادشاہت؟

خاندانِ تیمور اور مغل بادشاہ کا تعلق عام ہندوستانیوں سے یہ درست ہے کہ

Marfat.com

خاندانِ تیمور خولہ خبطہ، لاپرواہ اور الّڑ مزاج ہو گیا تھا۔ بادشاہ مذہبی عقائد میں بہت ڈھیلا، اوہام پرست، آرام طلب اور سادہ لوح تھا، لیکن رعایا پروری جو اس خاندان کی فطرت تھی، بہادر شاہ ظفر اس سے بیگانہ نہیں تھا۔ وہ ہندوستانی تھا، ہندو اور مسلمانوں کے مزاج سے واقف، ان کی دلچسپیوں میں برابر کا شریک اور تمام بے بسی اور لاچاری کے باوجود غریبوں اور زیر دستوں کا ہمدرد۔ اُس کی ہمدردیوں کے بہت سے قصّے آج تک مشہور ہیں۔ مثلاً

"سرکار انگریزی نے گھوسیوں کو حکم فرمایا کہ تم اپنی گائیں بھینسیں لے کر شہر سے نکلو، اور بیرون شہر پناہ جا کر آباد ہو۔ تمام شہر میں غلغلہ برپا ہو گیا۔ تمام گھوسی اپنے بال بچوں اور مویشی کو لے کر ریتی[1] میں آ پڑے اب یہ حال ہوا کہ ادھر تو مویشی حیران، پریشان، گھبرائے ہوئے، اُدھر فریادیوں کے بال بچوں کی گریہ زاری کی یہ پکار۔ یہ حال دیکھتے ہی بادشاہ رعیت پناہ کو کہاں تاب تھی۔ بمجرد سُننے زار نالے اُن غریبوں کے، حکم دیا کہ ہمارا ڈیرہ خیمہ بھی ریتی میں لبِ دریا رجمن، ان کی برابر لگا دو۔ اور جو حال رعیت کا وہ ہمارا۔ شاگرد پیشگان نے بمجرد اصدارِ حکم بارگاہِ سُلطانی لے جا کر لبِ دریا ایستادہ کر دیئے۔ یہ خبر صاحب ریزیڈنٹ بہادر کو ہوئی۔ وہ خبر سُنتے ہی بادشاہ کی خدمت میں دوڑے ہوئے آئے اور حضور میں عرض کی کہ حضور یہ کیا کرتے ہیں۔ حضور کے ہمراہ تمام رعیت شہر سے نکل کھڑی ہو گی۔

---

[1] یعنی وہ ریتلا میدان جو دریائے جمنا کے کنارے لال قلعہ تک تھا۔ جہاں برسات میں سیلاب کا پانی بھر جاتا تھا۔ یہ میدان اب باقی نہیں رہا۔ کیونکہ دریائے جمنا قلعہ سے فاصلہ پر پہنچ گئی ہے اور اس میدان میں کچھ عمارتیں بن گئی ہیں۔ بیلا روڈ اسی میدان میں ہو کر گذرتی ہے اور اسی میدان کے ایک کنارہ پر گاندھی جی کی سمادھی ہے

Marfat.com

بادشاہ سلامت: بھئی جہاں میری رعیت وہاں میں۔ رعیت میرے بال بچے ہیں، میں اُن کو کیونکر اپنے سے جُدا کر دوں۔ کہیں گوشت سے ناخن جُدا ہوتے ہیں۔ آج تو گھوسیوں کو شہر بدر کرنے کا حکم ہوا ہے، کل کو کسی اور قوم کو ہوگا، پرسوں کسی اور قوم کے واسطے حکم جاری کیا جاوے گا۔ رفتہ رفتہ سب شہر خالی کرا لیا جائے گا۔ اگر تم صاحبوں کو شہر خالی کرانا منظور ہے، تو صاف مجھ سے کہہ دو۔ میں شہر کی رعیت کو ہمراہ لے کر خواجہ صاحب میں جا بیٹھتا ہوں۔ شہر کا تم کو اختیار ہے جو چاہے وہ حال کرو۔

صاحب ریزیڈنٹ بہادر: حضور ہرگز ہرگز ایسا خیال نہ فرمائیں اسی وقت ان فریادیوں کی دادرسی کرتا ہوں، اور سب کو شہر میں آباد کئے دیتا ہوں۔ حضور اپنا ڈیرہ خیمہ اُٹھوا منگوائیں۔ چنانچہ فوراً گھوسیوں کو اپنے گھروں میں بسنے کی اجازت دے دی گئی اور سابق حکم منسوخ کر دیا گیا[1]۔"

ایک مرتبہ قسائیوں کے متعلق سرکاری حکم جاری ہوا کہ وہ اپنی دکانیں شہر سے باہر لے جائیں۔ اُنہوں نے فریاد کی یہی صورت اختیار کی۔ ریتی پر اپنے گھر بار کو لے کر پہنچ گئے، اور بادشاہ کی دہائی دینی شروع کر دی۔ بادشاہ سلامت نے اب بھی اپنا خیمہ ریتی میں بھجوا دیا۔ جب ریزیڈنٹ کو خبر ہوئی، تو وہ آیا۔ بادشاہ کی خوشامد کی اور اپنا حکم منسوخ[2] کیا۔

---

[1] داستانِ غدر از ظہیر دہلوی۔ [2] جب بادشاہ کو رعیت سے یہ تعلق ہو تو ظاہر ہے، رعایا کو بھی بادشاہ سے یہی تعلق اور ایسی ہی گرویدگی ہوگی۔ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ اور مشہور ہے، الانسان عبد الاحسان۔ انسان تو درکنار، ظہیر صاحب دہلوی نے ایک ہاتھی کا عجیب و غریب قصہ تحریر فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ سے خاص تعلق اور گرویدگی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

بادشاہ سلامت نے ریزیڈنٹ سے گفتگو کرتے ہوئے ایک دردانگیز عبرت آموز

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) انسانوں ہی کو نہیں بلکہ خاص خاص جانوروں کو بھی تھی۔ ظہیر صاحب ہی کے الفاظ میں یہ دلچسپ داستان ملاحظہ فرمائیے، اور دلّی کی پُرانی زبان سے لطف اندوز ہوجیئے۔ ظہیر صاحب فرماتے ہیں:

مولا بخش ہاتھی کا عجیب واقعہ "مولا بخش نامی ایک قدیمی ہاتھی معمر تھا۔ کئی بادشاہوں کو سواری دی تھی۔ اس کی عادتیں بالکل انسان کی تھیں۔ قدوقامت میں ایسا بلند و بالا ہاتھی ہندوستان کی سرزمین پر نہیں تھا اور نہ اب ہے۔ یہ ہاتھی بیٹھا ہوا اور ہاتھیوں کے قد کی برابر ہوتا تھا۔ خوبصورتی میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ دوازدہ ماہ مست رہتا تھا۔ کسی آدمی کو سوائے ایک خدمتی کے پاس نہیں آنے دیتا تھا۔ جس دن بادشاہ کی سواری ہوتی تھی، اُس سے ایک دن پیشتر بادشاہی چوب دار جاکر حکم سُنا دیتا تھا۔ "میاں مولا بخش" کل تمہاری نوکری ہے۔ ہوشیار ہوجاؤ۔ نہا دھو کر تیار ہو رہو۔ بس اُسی وقت سے ہوشیار ہیں۔ فیل بان تھان سے کھول کر جمنا میں لے گئے اور لے جاکر لٹا دیا اور جھانوں سے میل چھڑانا شروع کیا پھر دوسری کروٹ لٹا کر دوسری طرف سے پاک صاف کرکے تھان پر لے آیا۔ نقاش نے سنک پر نقش و نگار کھینچ دیئے۔ وقتِ سواری گدیلہ کس کر کارخانہ میں لے گئے۔ گہنا پہنایا۔ جھولی ڈالی۔ عماری کسی۔ نقارخانہ کی ڈیوڑھی پر لاکر ایستادہ کر دیا۔ برابر اور ہاتھیوں کی قطار کھڑی۔ جس وقت ہوادار سواری پر بادشاہ نقارخانہ کے دروازہ سے برآمد ہوا۔ چیخ مار کر تین سلام کئے اور خود ہی بیٹھ گیا۔ جس وقت تک بادشاہ سوار نہ ہولیں اور خواص نہ بیٹھ لے، کیا مجال کہ جنبش کر جائے۔ جب بادشاہ سوار ہولئے اور فوجدار نے اشارہ کیا، فوراً استادہ ہوگیا۔ ایک خوبی اور تھی کہ وقتِ سواری دو کمانیں اس کے کانوں میں پہنائی جاتی تھیں۔ دو ترکش تیروں کے کانوں کے نیچے آویزاں کئے جاتے تھے اور بہت بڑی سپر فولادی مستک پر نصب کی جاتی تھی۔ اور بہت بڑا حقّہ چاندی کا مع چلم و چنبر نقرہ اس کے سر پر رکھا جاتا تھا اور پیچوان کی سٹک فوجدار خاں اپنے کندھے پر رکھتے۔ بادشاہ ٹھنڈا حقّہ پیتے جاتے تھے اور سواری رواں ہوتی تھی۔ کیا مقدور ہے کہ حقّہ گرنے پائے یا چلم گرے۔ ایسا سبک رفتار تھا، بڑی متحمل رفتار تھی۔ قصہ مختصر جب سواری سے فرصت پائی، پھر ویسا ہی مست ہے جیسا پہلے تھا۔ یہ کمال اس ہاتھی کو تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور وصف بھی تھا کہ تمام دن خورد سال بچے جو بارہ ۱۲ برس کے سن سے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

جُملہ یہ بھی فرمایا :

"دیکھو بھئی تم میری موجودگی میں رعیت کو گھر سے بے گھر نہ کرو اور بعد میرے تم کو اختیار ہے، دِلّی کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کم سن بچّے معصوم ہوتے تھے، اس کے گرد بیٹھے رہتے تھے۔ اُن سے کھیلا کرتا تھا، اور اپنے ہاتھوں سے گنّوں کی پوریاں توڑ کر صاف کر کے اُن کو دیا کرتا تھا۔ دن بھر بچّے اُسے گھیرے رہتے تھے بچّے اُسے کہتے۔ "مولا بخش نکی آوے"۔ تو وہ اپنا ایک اگلا ہاتھ زمین سے اُٹھا لیتا تھا اور ہلایا کرتا تھا، اور بچّے جتنی دیر کی تعداد لگا دیتے کہ گھڑی بھر یا دو گھڑی، اُسی قدر ہاتھ اُٹھائے رکھتا تھا۔ جب بچّے کہتے، ٹیک دو، ہاتھ ٹیک دیتا تھا۔ پھر آپ فوں کہتا۔ بچّے ایک پاؤں سے کھڑے ہو جاتے۔ اگر وہ گھڑی بھر سے پیشتر کہہ دیتے کہ گھڑی ہو گئی، تو سر ہلا دیتا کہ ابھی پوری نہیں ہوئی ہے اور جب گھڑی پوری ہو جاتی، تو خود ہی فوں کہہ دیتا۔ بچے پاؤں ٹیک دیتے تھے۔ جس دن بچّے نہ آتے تو چیخیں مار کر بُلا لیتا۔ بچّوں کو گنّے کھلاتا تھا۔

حیرت انگیز واقعہ جب فیل خانہ شاہی اور اصطبل پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو "اسپ ہمدم" اور "مولا بخش ہاتھی" نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ "اسپ ہمدم" بہت بڑا شاندار گھوڑا، ڈور کا۔ نہایت خوشرنگ اور خوبصورت تھا۔ سواری میں سب کوتلوں سے آگے چلتا تھا۔ زمانۂ ولی عہدی سے بادشاہ کی سواری میں تھا۔ اب اس کی عمر چالیس سال کی ہوئی تھی۔ تمام جسم اس کا منقّش تھا اور چھوٹے چھوٹے گلاب کے پھول کی برابر سُرخ رنگ کے پھول تھے۔ جب ان دونوں نے آب و دانہ ترک کر دیا، تو مولا بخش کے فیل بان نے جا کر "سانڈرس" صاحب کو اطلاع دی کہ "ہاتھی نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے کل کلاں کو نیکی بدی ہو جائے گی تو سرکار مجھے پھانسی دے گی"۔ سانڈرس صاحب کو باور نہ آیا۔ فیلبان کو گالیاں دیں اور کہا کہ ہم چل کر خود کھلوائیں گے۔ اور پانچ روپیہ کے لڈو اور پوریاں ہمراہ لوا کر ہاتھی کے تھان پر پہنچے اور ٹوکرا شیرینی کا ہاتھی کے آگے رکھوا دیا۔ ہاتھی نے جھلّا کر ٹوکرا کھینچ مارا۔ اگر کسی آدمی کے لگتا تو کام تمام ہو جاتا۔ وہ ٹوکرا دُور جا کر پڑا اور تمام شیرینی بکھر گئی۔ سانڈرس بولے۔ ہاتھی باغی ہے، اسے نیلام کر دو۔ اُسی روز صدر بازار میں لا کر ایستادہ کیا اور نیلام کی بولی بولی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

اس کے بعد ظہیر دہلوی کا تاثر بھی ملاحظہ فرمائیے۔ وہ بھی رقّت انگیز ہے۔ ظہیر صاحب فرماتے ہیں:

"چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ کابلی دروازہ سے لے کر قلعہ تک اور دریبہ سے لے کر قلعہ تک اور جامع مسجد سے لے کر دِلّی دروازہ تک، بلاقی بیگم کا کوچہ خانم بازار، خاص بازار، خاں دوران خاں کی حویلی سے دریا گنج تک ہزارہا مکانات منہدم اور مسمار کر کے دِلّی کا چبوترہ بنا دیا گیا، اور چٹیل میدان کر دیا گیا۔"[1]

اس تمام شرح و بسط کے بعد پھر اصل موضوع کی طرف رجوع فرمائیے۔ ارباب فکر اور اصحابِ بصیرت علماء کے سامنے:

(۱) ایک طرف مسئلہ ملوکیت کا تھا کہ کیا اس کو زندہ کیا جائے اور شاہیت کو برقرار رکھا جائے۔

(۲) دوسری طرف انگریزی سامراج کا عفریت تھا۔

(۳) ہندوستانی عوام اور خواص کی مغل بادشاہ سے عقیدت۔

(۴) مغل بادشاہ کی وہ شفقت جس نے رعایا کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کوئی خریدار نہ ہوا۔ بنسی پنساری یک چشم جس کی دکان کھاری باؤلی میں تھی، اُس نے ڈھائی سو روپیہ کی بولی دی۔ اسی بولی پر صاحب نے نیلام ختم کر دیا۔ فیل بان نے ہاتھی سے کہا۔ لے بھائی! تمام عمر تو تُو نے اور مَیں نے بادشاہوں کی نوکری کی، اور اب میری اور تیری تقدیر پھوٹ گئی کہ ہلدی کی گرہ بیچنے والے کے دروازہ پر چلنا پڑا۔ یہ سُنتے ہی ہاتھی کھڑے قدے دھم ویسی زمین پر گر پڑا اور جان بحق ہو گیا اور اسی دن اسپ ہمدم کا بھی خاتمہ بخیر ہوا۔ اس کے بعد ظہیر صاحب فرماتے ہیں۔ سُبحان اللہ ایسے نمک حلال جاں نثار رفیق کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا حیوان، انسان ناسپاس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ خدا انسان کو بھی ایسی ہی توفیق عطا فرمائے۔ (ص۲۴ تا ص۲۶ داستانِ غدر)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] داستانِ غدر ص۳۷۔

Marfat.com

(۵) مغل بادشاہ اور رعایا کا ایسا تعلق کہ رعایا یعنی ہندوستانی بادشاہ کو اپنا سمجھتے تھے، اس کے اقتدار کو اپنا اقتدار، اور اس کی حکومت کو اپنے مُلک کی حکومت سمجھتے تھے۔

ان تمام حالات کا لحاظ کرتے ہوئے عام علماء کرام اور حریت نواز اربابِ فکر نے مغل خاندان، مغل بادشاہ اور ملوکیت و شاہنشاہیت کی قباحتوں کو نظر انداز کیا اور یہی ضروری سمجھا کہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر وطنِ عزیز کو اجنبی عنصر سے پاک کر لیا جائے لیکن کچھ علماء پھر بھی ایسے رہے کہ جو ملوکیت سے انتہائی نفرت کی بنا پر یا اس بناء پر کہ اُن کو کامیابی کی توقع نہیں تھی، اس تحریک سے علیحدہ رہے اور اُنہوں نے خاموشی[1] کو بہتر جانا۔

پس منظر کی مذکورہ بالا وضاحت کے بعد اس مناسبت سے کہ یہ کتاب علماء ہند کے شاندار ماضی کی چوتھی جلد ہے ایک ایسے انقلابی عالم کے چند فقرے ملاحظہ فرمایئے جو اپنے اعلیٰ فکر و دانش کے ساتھ اس دَور کے حالات کا سب سے بڑا واقف اور ماہر تھا۔ یہ مجاہد جلیل حضرت مولانا عبیداللہ سندھی قدس اللہ سرہ العزیز کی واجب التعظیم شخصیت ہے جس کی تحقیق یہ ہے:

"الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلویؒ کی نئی تنظیم[2] پر پورے تیس برس نہیں

---

[1] یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نظریہ کسی بھی عالمِ دین اور مفتی کا نہیں تھا، جو سر سید صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ مسلمان اس حکومت کے مستامن ہیں (زیر پناہ ہیں) اور مستامن (زیر پناہ) کی حیثیت سے حکومت متسلط کا مقابلہ ناجائز ہے۔ [2] اس تنظیم کی وضاحت کے لئے ہم اس سلسلہ کی (علماء ہند کے شاندار ماضی کی) دوسری اور تیسری جلد کے مطالعہ کی درخواست کریں گے۔ ان جلدوں میں واضح کیا گیا ہے کہ سیدنا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سیاسی نظریات کی بنیاد پر کس طرح حضرت شاہ عبدالعزیز نے دماغوں کی تربیت فرمائی۔ پھر حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیل شہید کی زیرِ قیادت اس تربیت یافتہ جماعت نے کس طرح عَلَمِ جہاد بلند کیا اور بے نظیر قربانیوں کی زندہ جاوید تاریخ صفحات گیتی پر نقش کی۔ حضرت سید احمد شہید کی شہادت کے بعد اس جماعت کے سربراہ حضرت مولانا اسحاق صاحب نے جن کو مولانا سندھی (بقیہ صفحہ آئندہ)

Marfat.com

گذرے تھے کہ دہلی کے آخری بادشاہ کی انگریزی کمپنی سے لڑائی ہوگئی۔

(الف) سلطان دہلی اگرچہ بظاہر ایک وظیفہ خوار رئیس کی صورت میں نظر آتا تھا مگر عام لوگوں کی نظروں میں وہ ابتک سارے ہندوستان کا موروثی سلطان مانا جاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی چونکہ اسی کے نام سے عوام پر حکومت کرتی تھی۔ چنانچہ ڈھنڈورے میں کہا جاتا تھا "خلق خدا کی، مُلک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا"۔ اس لئے عوام الناس کی رائے اُسے ملک کا حقیقی مالک ماننے میں تامّل نہیں کرتی تھی۔

(ب) اس واہیہ کبریٰ میں مولانا محمد اسحاق کی نئی جماعت پھر دو حصّوں میں تقسیم ہوگئی۔ الصدر الحمید (مولانا محمد اسحاقؒ) نے جس طائفہ کو نئی تنظیم میں مرکزی اختیارات دیئے تھے وہ طائفہ تو سلطانِ دہلی کا طرف دار ہوگیا، اور سلطانی تحریک کی شکست کے بعد مولانا محمد اسحاق کی طرح حجاز پہنچ گیا۔ چنانچہ امیر امداد اللہ اور مولانا عبدالغنی مولانا محمد یعقوب دہلوی کے ساتھ حجاز میں بیٹھ کر اپنی ہندوستانی تنظیمات کی رہنمائی کرتے رہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد اسحاق کے متبعین کی پہلی صف میں سے علماء اور صوفیہ کا کثیر[1] حصّہ سلطان دہلی کی لڑائی میں غیر جانب[2] دار بن گیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) الصدر الحمید فرماتے ہیں۔ ایک جماعت کی تشکیل کی نئی تنظیم سے یہی جماعت مراد ہے اس کی قیادت پہلے مولانا مملوک علیؒ کے سپرد تھی۔ اُن کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ العزیز اس کے امیر قرار دیئے گئے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] اس موقع پر لفظ کثیر کا مطلب یہ ہے کہ اس جماعت میں بھی بہت سے افراد شامل تھے۔ ورنہ عددی لحاظ سے اکثریت اسی جماعت کو حاصل تھی جو سلطان دہلی کی حامی اور اس جنگ آزادی میں شریک کار تھی مبصرین تاریخ کے نزدیک یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے۔ [2] غیر جانبدار اس بناء پر نہیں کہ وہ انگریزوں کے حامی تھے بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے خیال میں کامیابی ممکن نہیں تھی۔ جس کی تشریح شمس العلماء ذکاء اللہ خاں نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"ہمیں اس وقت تک ان کافروں کی اطاعت کرنی چاہیئے جبتک اُن سے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

اس کا حاصل یہ سمجھنا چاہیئے کہ الصدر الحمید (مولانا محمد اسحاق) کی تنظیم کے بالمقابل اگر پٹنہ[1] میں پارٹی قائم ہو چکی تھی، تو اب خود صدر الحمید کے اپنے فرقہ میں سے ایک مخالف جماعت دہلی میں بھی پیدا ہو گئی مولانا سیّد نظیر حسین دہلوی اور مولانا شیخ محمد تھانوی اس دوسری جماعت کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں[2]۔

محاذِ جنگ اور طاقتوں کا موازنہ

انگریزوں کی تیاری۔ اقدام۔ بہتر مواقع۔ امداد و تعاون کی راہیں

دہلی کا شہری ذوق۔ شہر دہلی محاذِ جنگ کے لحاظ سے

میرٹھ کا واقعہ دونوں کے حق میں اچانک تھا۔ انگریز رنگ رلیوں میں مست، فتوحات کے نشہ میں چُور تھے۔ اور مجاہدینِ حریّت ۳۱ مئی سے پہلے وفاداری کی نمائش کو شک و شبہ کے ہر ایک گرد سے پاک رکھنا چاہتے تھے۔ بس جس طرح اس ہنگامہ سے انقلابی جماعت کے لئے فائدہ اُٹھانا مشکل تھا، ایسے ہی انگریز کیلئے فوری تدارک بھی ناممکن تھا۔

پھر جیسے جیسے میرٹھ اور دہلی کے ہنگامہ کی خبریں پھیلتی رہیں، جذبات کے ہیزم خشک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سرکشی میں کامیابی کی اُمید نہ ہو۔ (ص۳۰۶ تاریخ عروجِ عہدِ انگلیشیہ)

انہیں میں سے ایک بزرگ (مولانا محبوب علی صاحب) کا قصہ مشہور ہے کہ کامیابی کے بعد انگریزوں نے ان کو کئی گاؤں کی جاگیر دی۔ تو آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرما دیا کہ میری غیر جانب داری، انگریزوں کی خوشنودی کے لئے نہیں تھی۔ بلکہ میرے نزدیک مسئلہ ہی اس طرح تھا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] یہ علماء صادق پور کی پارٹی ہے۔ تشریح کے لئے ملاحظہ فرمائیے، شاندار ماضی جلد سوم۔ [2] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص۲۰۱۔

Marfat.com

میں بغاوت کے شعلے بھڑکاتی رہیں۔ اس نے ہر جگہ کے انگریزوں کو اور بھی زیادہ حواس باختہ بنا دیا۔ وہ باغیوں کی سرکوبی کیا کرتے، اُن کو خود اپنی جانوں کے لالے پڑ گئے اور ہر جگہ نفسی نفسی کا عالم برپا ہو گیا۔ دہلی میں کچھ افسر قتل ہو گئے۔ کچھ فرار ہوئے، باقی ماندہ فوج نے ایک پہاڑی کو اپنا مرکز بنا لیا۔

ترقیات کے سو سالہ نشیب و فراز نے اگرچہ اب اس پہاڑی کو دہلی کا ایک محلّہ بنا دیا ہے مگر اس وقت دشوار گذار راستہ کی وجہ سے یہ پہاڑی ایک محفوظ مقام تھی۔ جنگی نقطۂ نظر سے اس کی بلندی ایک عظیم منفعت تھی جو انگریزوں کے لئے مخصوص ہو گئی تھی۔ اس پہاڑی پر نہ خنکی ہے نہ آب رواں کی شادابی مگر دہلی کی سنگین عمارتیں جب مئی جون میں گرمی کی شدت، حبس اور گھٹن کا مظاہرہ بڑھ چڑھ کر کرتی ہیں تو یہ پہاڑی اس مظاہرہ میں شریک نہیں ہوتی۔ بلکہ اُس کی اُونچی چٹانیں ہلکی ہلکی ہوا کے کچھ سانس سمیٹ لیتی ہیں جو اپنے مہمانوں کی خاطر مدارات میں صرف کر دیتی ہیں۔ یہ مہمان نواز پہاڑی، آخر تک سفید فام مہمانوں کی پوری مدارات کرتی رہی۔ بارہا ان مہمانوں کو یہاں سے نکالنے کی کوشش[1] کی گئی۔ مگر اس کی چٹانیں، گرداگرد گھنے درخت اور جھاڑیاں سینہ سپر ہو کر سامنے آتی رہیں۔ انتہا یہ کہ اسی پہاڑی سے فتح کا پرچم لہرایا گیا۔ انگریزی دور میں اس پہاڑی کا نام فتح گڈھ تھا، اور آزاد بھارت میں اس کو جیت گڈھ کہا جانے لگا ہے۔ اس طرح کی پہاڑیوں کا سلسلہ دہلی کے تین طرف تھا، اور اس ایک پہاڑی کے سہارے ان سب پہاڑیوں پر انگریزی فوجوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ جب ہنگامہ کا شباب تھا تو سبزی منڈی کی یہ پہاڑی جاسوسی کا کام بھی کر رہی تھی۔ کیونکہ اس کی بلندی سے وہ سب کچھ نظر آ جاتا تھا جو شہر میں ہوتا تھا۔ اب بھی جب اس پہاڑی کے اُوپر سے گذر ہوتا ہے تو شہر کی پانچ اور چھ منزلہ عمارتیں بھی زیر پا نظر آتی ہیں۔ حالانکہ شہر کی

---

[1] ایک مرتبہ انقلابی فوجیں اس پہاڑی کے عقب تک پہنچ گئیں۔ مگر خاص اس وقت جب وہ دشمن کے سر پر پہنچی ہوئی تھیں، گولہ بارود ختم ہو گیا۔

Marfat.com

عمارتیں اور شہر کی سڑکیں اس پہاڑی کی بہت سی اُونچی اُونچی چٹانوں کو اس سو سال کے اندر ہضم کر چکی ہیں۔

اس انقلاب کے لئے ۳۱ مئی اس لئے طے کی گئی تھی کہ یہ موسم انگریزوں کے لئے بہت سخت ہوتا ہے۔ لیکن ابھی جدّ و جہد انقلاب ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی کہ کم از کم اس علاقہ میں معاملہ برعکس ہو گیا۔ کیونکہ برسات کی بارشوں میں یہ پہاڑی تو ہر دفعہ نہا دھو کر تازہ دم ہوتی رہی اور اپنا تمام پانی سیلاب بنا کر نشیبی حصّوں میں پہنچاتی رہی جہاں بعض اوقات انقلابی فوجوں کے خیمے اور مورچے ہوتے تھے۔ یہ قدرتی ذرائع تھے جو دونوں مقابل فوجوں کے لئے شکست و فتح کے اسباب بن گئے تھے۔

اس کے علاوہ لفٹننٹ ڈیولی نے جس طرح بروقت اسلحہ خانہ اُڑا کر دشمن کو بہت بڑے سامانِ جنگ سے محروم کر دیا تھا، اسی طرح تار گھر کے دو نوجوان سگنیلروں نے انبالہ تار بھیج کر انقلاب کے پہلے ہی لمحہ میں حکومتِ پنجاب اور اس کے ذریعہ مرکزی حکومت اور فوجی مرکزوں کے لئے جنگ کا بگل بجا دیا تھا۔ چنانچہ انگریزی فوجوں کے کمانڈر انچیف جنرل آنسن کو (جو شملہ میں مقیم تھا) فوراً ہی گورنر جنرل لارڈ کیننگ کی ہدایت پہنچ گئی کہ وہ دہلی پر حملہ آور ہوں۔

جنرل آنسن نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پہلا کام یہ کیا کہ پٹیالہ، نابھہ اور جیند وغیرہ ریاستوں کی وفاداری کو پختہ کیا۔ اُن سے فوجیں حاصل کیں، اور پھر کالی اور گوری فوجوں کے ساتھ دہلی کی طرف مارچ شروع کر دیا۔

حالات کی نامساعدت اُن کے بھی دامن گیر تھی۔ چنانچہ جگہ جگہ رکاوٹیں پیش آئیں۔ خود جنرل آنسن کی سرگذشت یہ ہے کہ وہ ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء کو انبالہ سے روانہ ہوا۔ اور ابھی کرنال تک ہی پہنچا تھا کہ ۲۷ مئی ۱۸۵۷ء کو ہیضے کا شکار ہو کر راہی ملکِ عدم ہوا۔ لیکن اس منظم اور باضابطہ فوج کے لئے کمانڈروں کی کیا کمی تھی۔ فوراً ہی ہنری برنارڈ نے کمان سنبھال لی۔ راستہ میں کُشت و خون کرتا ہوا دہلی پہنچا۔ لیکن

Marfat.com

حالات اس درجہ تلخ اور صبر آزما تھے کہ بہت جلد اُس کے جسمانی ڈھانچہ کی ایک ایک چُول ہل گئی اور ابھی ایک چلّہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ۵ جولائی کو ہیضے کی موت سے اُس کا بھی بستر گول ہوگیا۔ اب تیسرے کمانڈر جنرل ریڈ نے کمان سنبھالی۔ لیکن اس دوران میں انقلابی فوجوں کے پے در پے حملے اتنے شدید رہے کہ استعفا دے کر ذمّہ داری کا جُوا اُتار پھینکنے ہی میں اُس نے اپنی کامیابی سمجھی۔ اب یہ وقت تھا کہ انگریزی فوج کی ہمّتیں پست ہو رہی تھیں۔ مگر اسی فوج میں کچھ ایسے جانباز بھی تھے، جو شکست کے مقابلہ میں موت کو پسند کر رہے تھے۔ جنرل ولسن ایسا ہی بہادر کمانڈر تھا۔ جنرل ریڈ کے ہٹتے ہی اُس نے فوج کی کمان ہاتھ میں لی۔ کہا جاتا ہے، ہمّتِ مرداں مددِ خدا۔ قدرت نے اس کی ہمّت کی مدد کی، اور فوراً ہی ایک اور کمانڈر دو ہزار فوج لے کر اس کی امداد کو پہنچا۔ اس کمانڈر کا نام "نکلسن" تھا، جو تنہا دو ہزار کی برابر مانا جاتا تھا۔ جس کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ اُس نے اپنے خون کی بھینٹ چڑھا کر دلّی حاصل کی۔

اسی طرح جنرل ہڈسن انگریزی فوج کو میسّر آگیا جس کی تفریح گاہ میدانِ جنگ اور زخمیوں کی آہ و بکا جس کے لئے باعثِ سرور تھی۔ جس کی پیاس صرف خُون کے گھونٹوں سے بُجھتی تھی۔ جس نے نہ صرف نادر شاہ کی یاد کو تازہ کیا بلکہ اُس پر پانی پھیر دیا۔

اس کے علاوہ پٹیالہ، نابھہ وغیرہ ماورائے ستلج کی ریاستیں جو انگریز دوستی کا تاریخی پس منظر رکھتی تھیں، جنہوں نے رنجیت سنگھ کے زمانہ میں بھی متحدہ سکھ یونین کے مقابلہ میں انگریز دوستی کو ترجیح دی تھی۔ جن کی پُرانی دوستی کو جنرل "آنسن" نے بغاوت کی خبر پاتے ہی از سرِ نو تازہ اور مضبوط کر لیا تھا۔ اس مصلحت اندیش دوستی نے نہ صرف انگریز کی کمر مضبوط کر دی تھی بلکہ انگریزی فوجوں کو رسد وغیرہ کی ضرورتوں سے مستغنی کر کے اُن کے عقب کو ہر ایک خطرہ سے محفوظ کر دیا تھا۔ پنجاب کے اس زرخیز فوجی خطّہ کی مخلصانہ امداد کے علاوہ فیض محمد خاں والی رامپور اور نواب بہادر خاں کی

Marfat.com

باہمی چشمک نے روہیلوں کو خانہ جنگی میں مبتلا کر کے انگریزوں کو وہ مدد پہنچائی کہ اتنی مدد جنرل بخت خاں، بہادر شاہ کو نہیں پہنچا سکا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی جو حکومت کے ساتھ مہاجنی کاروبار بھی کرتی چلی آتی تھی اس کے بھرپور خزانوں میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ تاہم زمینداروں اور ساہوکاروں نے جس طرح دل کھول کر اس کی امداد اس موقع پر کی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ضلع بجنور کے صرف دو گاؤں سے مبلغ دس ہزار روپے انگریز دوستی کے نذر کر دیئے گئے۔ جبکہ انقلابی فوجوں کی مالی امداد کسی اور طرف سے تو کیا ہوتی، خود انقلابی فوجیں جو روپیہ سرکاری خزانوں کو ضبط کر کے قبضہ میں لایا کرتی تھیں، وہ بھی صحیح مصرف میں صرف نہیں ہوتا تھا۔

انقلابی محاذ اور دہلی کا شہری مزاج

انگریزی محاذ کی مختصر کیفیت یہ تھی۔ اس کے بالمقابل میرٹھ کی جلد باز فوج جس شخصیت کے گرد جمع ہوئی تھی، وہ عظمتِ ہندوستان، ہمدردیٔ خلق اور تاریخ رعایا پروری کی ایک تصویر ضرور تھی۔ مگر حسرت زدہ، عزم و ہمت سے خالی، تجربہ سے تہی دامن، مزید براں پیرانہ سالی نے حوصلوں اور ولولوں کی رہی سہی دیواروں کو بھی ہلا ڈالا تھا۔

دہلی، جس کو انقلاب کا مرکز بننا پڑا تھا، قرون وسطےٰ کے سب سے زیادہ خوش حال بادشاہ، شاہجہاں کا بسایا ہوا وہ نازک اور خوب صورت شہر تھا، جو پہلے ہی دن سے فوجی کرختگی کے بجائے تہذیب، شائستگی، نفاست اور ناز و نعم کا گہوارہ تھا۔ وہ نادر شاہ کی بربریت کے بعد بھی محمد شاہ کی راجدھانی بنا رہا تھا۔ جہاں جنگی اور فوجی رعب داب کے بجائے شعر و سخن کی بزم آرائی تھی۔ یا علمی موشگافیوں کی گرم بازاری۔ بقول مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ:

"اُن[1] کے (شاہ ولی اللہ المتوفی ۱۷۶۳ء کے) زمانہ کی دہلی ایک ایسا مرکز تھی

[1] حاشیہ بر صفحہ آئندہ

Marfat.com

جس میں اقوامِ عالم کے سب نمونے ملتے تھے۔ دہلی میں یہ استعداد تھی کہ اُس کے توسط سے یہ تعلیم سارے ہند اور پھر ساری دنیا میں پھیل سکے۔"

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ؎ سیدنا شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے زمانہ کی دلی کا تذکرہ ایک عربی قصیدہ میں کیا ہے۔ اس کے چند اشعار ترجمہ سمیت پیش کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

ان البلاد اماء وھی سیدۃ و انھا درۃ والکل کالصدف

تمام شہر باندیاں ہیں اور دہلی ان کے مقابلہ میں ملکہ ہے۔ دہلی ایک موتی ہے، اور باقی تمام شہر گویا سیپ

فاقت بلاد الوریٰ عزًا ومرتبۃ غیر الحجاز وغیر القدس والنجف

دہلی عزت و منزلت میں سب شہروں پر فوقیت رکھتی ہے، باستثناء حجاز شریف، بیت المقدس اور نجف کے

سکانھا خیر اھل الارض قاطبۃ خلقا وخلقا بلا عجب ولا صلف

دہلی کے باشندے دنیا بھر میں سب سے بہتر ہیں۔ صورت میں، سیرت میں۔ اس میں نہ تعجب کی بات ہے، نہ حیرت کی بات

بھا مدارس لو طاف البصیر بھا لم تفتتح عینہ الا علی الصحف

دہلی میں بے شمار مدرسے ہیں جو تعلیمی فرائض کی انجام دہی میں ایسے منہمک رہتے ہیں کہ اگر کوئی سیاح ان مدرسوں کا چکر لگائے تو کتابوں اور صحیفوں کے علاوہ کسی اور چیز پر اس کی نظر ہی نہ پڑ سکے۔

کم مسجد زخرفت فیھا منارتہ لو قابلتہ الشمس الضحو تنکسف

کتنی ہی حسین اور خوب صورت مسجدیں ہیں۔ ان کے مینار ایسے مزین اور بارونق کہ اگر دوپہر کے وقت آفتاب اُن کا مقابلہ کرے تو اس کو گہن لگ جائے۔

لا عزوان زانت الدنیا بزینتھا کم من ابا قد علا بابن ذُری شرف

آج دہلی پوری دنیا کے لئے وجہِ زینت ہے اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیٹے کی عزت اور ناموری سے باپ عزت و عظمت کی بلندیوں پر بالانشیں ہو جاتا ہے۔

وماء جوف جری من تحتھا فحکیٰ انھار خلد جرت فی اسفل الغرف

دریائے جمنا دہلی کے نیچے جاری ہے وہ نمونہ پیش کر رہا ہے جنت الفردوس کی نہروں کا جو جنت کے عالیشان محلات اور بالاخانوں کے نیچے بہ رہی ہیں۔

Marfat.com

اس زمانہ کی دہلی میں ایک طرف خرابی پیدا ہوگئی تھی تو اس کے ساتھ ابھی تک ایک خوبی بھی یقیناً باقی تھی۔ طبقہ اُمراء میں آصف جاہ جیسا فرزانہ اور طبقہ صوفیاء میں مرزا محمد جانِ جاناں اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ شہر میں مختلف کتب خانے اور باکمال اساتذہ موجود تھے۔ گویا ایک مفکّر کے لئے کافی وسیع میدان موجود تھا۔

محمد شاہ کے بعد احمد شاہ رنگیلے کی طبع رنگین نے فنون لطیفہ اور مجلسی تکلّفات کی رنگینیوں میں اور اضافہ ہی کیا۔ انتہا یہ کہ مرہٹوں کی چیرہ دستی اور پھر انگریزوں کی خوں آشام پالیسی کے بعد بھی بہادر شاہ کے دور حکومت میں اس نازک اور خوش مزاج شہر کی حالت یہ تھی۔

"چیزیں سستی تھیں۔ روپے کی کمی نہ تھی۔ حرفت وصنعت فروغ پر تھی۔ لوگ خوش حال اور زندہ دل تھے۔ شہر فصیل[1] کے اندر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی۔ خاص کر چاندنی چوک میں، جس کے بیچوں بیچ نہر بہتی تھی، وہ رونق تھی کہ نظر لگتی تھی۔ ہندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح ایسی صلح و آشتی سے رہتے تھے کہ آج کل اس کا یقین کرنا مشکل ہے۔ ایک دوسرے کی غمی، شادی اور تہواروں میں بلا تکلّف شریک ہوتے

---

[1] قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان کا لق و دق میدان جو ۱۹۵۰ء تک تقریباً ایک میل لمبا اور میل چوڑا تھا پھر جانب شمال میں کشمیری گیٹ تک اور جانب جنوب میں دہلی دروازہ تک چوبیس پچیس برس پہلے تک سنسان علاقہ تھا۔ یہ سب فصیل شہر میں داخل تھا، جو ۹ ستمبر ۱۸۵۷ء تک کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس میں سات بازار تھے، بے شمار مسجدیں اور مندر، چوک اور مزارات۔ ۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کے بعد تقریباً دس روز تک اس علاقہ میں چپہ چپہ زمین پر خونریز جنگ ہوئی۔ ہر ایک مکان مورچہ تھا جس کے نتیجہ میں وہ گولوں اور گولیوں کا نشانہ بنا اور پھر جب انگریزی قبضہ مکمّل ہوا، تو مسمار کر کے یہ پورا علاقہ چٹیل میدان اور بقول راقم الدولہ ظہیر دہلوی چبوترہ کر دیا گیا۔ اب دہلی کی آزاد حکومت اس علاقہ کو دوبارہ آباد کر رہی ہے مگر پوری طرح آباد کرنے کے لئے اربوں روپیہ کی ضرورت ہے۔

Marfat.com

اور کسی قسم کی غیریت نہیں برتتے تھے۔ بادشاہ اگرچہ نام کے بادشاہ تھے لیکن کیا ہندو کیا مسلمان، سب اُن سے محبت کرتے اور اُن پر جان فدا کرتے تھے۔ بادشاہ کا برتاؤ بھی دونوں سے یکساں تھا۔ چنانچہ مسٹر ٹیلر (سابق) پرنسپل دہلی کالج اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ "قلعہ معلّٰے میں عجیب ماجرا تھا۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ اگرچہ قدرتاً ہمدردی تھی، لیکن اس کے باوجود جتنے ملازمین شاہی تھے (ایسی خدمات پر جہاں فارسی اردو کی ضرورت رات دن پڑتی تھی) سب کے سب ہندو تھے۔ اگرچہ تعلیم آج کل کی طرح عام نہ تھی لیکن تہذیب اور ذوق جو تعلیم کی غایت ہے، عام طور پر پایا جاتا تھا، یہاں تک کہ اَن پڑھ بھی اہلِ ذوق کی صحبت سے صاحبِ ذوق نظر آتے تھے۔ خوش اطواری اور سلیقہ دِلّی کا جوہر تھا۔ زبان کی تو ٹکسال ہی تھی۔ جس نے "دِلّی" نہیں دیکھی، یا جو "دِلّی" نہیں رہا۔ وہ زبان داں ہی نہیں۔ گویا جامع مسجد کی سیڑھیاں "ادبستانِ زبان" تھیں۔ شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ خود بادشاہ شاعر تھے۔ شعر و سخن کے قدر دان تھے۔ قلعہ معلّٰے کی زبان فصاحت کی جان تھی"[1]

ہندوستان کے مشہور، اصلاح پسند اور ہمدردِ قوم شاعر مولانا الطاف حسین حالی مرحوم جنہوں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد کے دونوں زمانے دیکھے ہیں۔ انہوں نے حکیم محمود علی خاں صاحب کا مرثیہ کہتے ہوئے دہلی کے متعلق بھی چند شعر کہہ دیئے ہیں یہ اشعار گویا دہلی کا مرثیہ ہیں۔ ان میں انہیں خوبیوں کا ماتم کیا ہے جو اُوپر کی سطروں میں آپ نے مطالعہ فرمائیں۔ مولانا حالی فرماتے ہیں:

---

[1] بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد ص۵۰۶ تذکرہ دِلّی کالج

Marfat.com

خاک سے اُٹھے ہیں تیری جیسے جیسے نکتہ ور
اِک جہاں شیوہ بیانی سے ہے اُن کی باخبر
راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر
سرو کو ہوگی نہ راس اتنی ہوائے غاتفر[1]
حُسنِ صورت میں اگر ضرب المثل تُو شاد تھا
حُسنِ معنٰے تیرا حصّہ اے جہاں آباد تھا
لے کے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو عُلوم
جن میں تھی اسلامیوں کی چار سُو عالم میں دُھوم
دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم
کھیتیوں پر تیری ابر آتے تھے اُن کے جھُوم جھُوم
آئی گُلشن میں نہ تیرے بھُول کر فصلِ خزاں
تیری سرحد میں رہا ہر علم و دانش کا سماں
جس طرح تھا فضل و دانش میں ترا مشہور نام
تھے تمدّن میں بھی پیرو تیرے جمہور انام
آدمیّت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص و عام
شہری و بدوی[2] تری تقلید کرتے تھے مدام
رسم میں، آئین میں، اوضاع میں، اطوار میں
طرز میں، انداز میں، رفتار میں، گفتار میں
رہ گیا باہر سے آکر جو کہ تجھ میں چند سال
ڈھل گئے سانچے میں گویا اُس کے عادات و خصال

---

[1] غاتفر۔ سمرقند کے قریب ایک قطعہ زمین ہے، جہاں کا سرو خوبی، زیبائی اور راستی میں ضرب المثل ہے۔ [2] بدوی۔ دیہاتی۔

Marfat.com

آ کے بن جاتا تھا یاں نقصان انسان کا کمال
تیری پرچھائیں سے موتی بن کے جاتے تھے سفال
آتے ہی انسان کی کایا پلٹ جاتی تھی یاں
چار دن میں اور ہی صورت نکل آتی تھی یاں
تیرا معمورہ تھا اِک عالم میں مرجع اور مآب
آن کر لیتے تھے یاں ٹھیکی جہاں کے انتخاب
بستے تھے اطراف سے آ آ کے تجھ میں شیخ و شاب
کر دیا تھا تیری آبادی نے مُلکوں کو خراب
جمگھٹا تھا تجھ میں ترک و فرس روم و زنگ کا
دستہ تھا گویا کہ تُو گلہائے رنگا رنگ کا

(ماخوذ از مرثیہ حکیم محمود علی خاں مرحوم)

یہ عجیب بات ہے کہ اسی سرزمینِ نازک کی اسی نازک فضا میں علماء کی وُہ جماعت پیدا ہوئی جس کی جفاکشی، صبر آزمائی، جس کے عزم و ہمّت، اور جس کی ایثار و قربانی نے اس دَور کی تاریخ کو انقلاب آفریں بنا دیا۔ جس نے مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحیؒ اور مولانا نصیرالدین قدس اللہ اسرارہم جیسے کوہ وقار اور پیکرِ استقلال پیدا کئے۔ جنہوں نے ہزاروں میل کی سیاحت و مسافت کے بعد سرحد و کشمیر کی گھاٹیوں میں پہنچ کر جامِ شہادت نوش کیا۔ مگر یہ حقیقت بھی ناقابلِ تردید ہے، کہ دہلی کے ہزاروں ارادت مندوں میں سے جو اس جادۂ سرفروشی و جاں بازی پر گامزن ہوئے وہ انگلیوں کی گنتی سے بھی کم تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ مصنوعی تہذیب جس کو آج کل کی تہذیب میں "فن لطیف" کہا جاتا ہے جس کے ساتھ بہت سے اخلاقی مرض جن کو "فن کثیف" کہنا چاہیئے، ساتھ ساتھ رہتے ہیں، ان فنونِ لطیفہ اور کثیفہ نے باشندگانِ دہلی کو رزم سے ناآشنا بزم کا دلدادہ بنا دیا تھا۔[1]

Marfat.com

بہادر شاہ بادشاہ جو اسی دہلی کا رہنے والا تھا، اسی کی آب و میں اس کا نشو و نما ہوا تھا۔ وہ گویا ایک آئینہ تھا جس میں دہلی کے اسی مزاج کی عکاسی ہوتی تھی۔ مزاجوں کی اس ہم آہنگی کا یہ اثر تھا کہ تمام کمزوریوں اور بے چارگیوں کے باوجود بہادر شاہ دلّی والوں کا محبوب تھا اور دلّی والے بہادر شاہ کی آنکھ کے تارے۔

بہر حال اس امن پسند، راحت طلب، پُر تکلف، باوضع اور خوش طبع شہر دہلی پر پہلی مصیبت خود انقلابی فوجوں کی آمد تھی۔ یہ فوجیں جذباتِ انقلاب سے خواہ کتنی ہی سرشار ہوں، مگر اپنی طبیعتوں، مراسم اور معاشرت کے لحاظ سے دہلی والوں سے قطعاً اجنبی اور نامانوس اور وہ بھی ہزار دو ہزار نہیں بلکہ ساٹھ ہزار۔ اس نامانوس ہجوم کو اگر کوئی چیز مانوس بنا سکتی تھی تو وہ صرف مقصد کا متحد ہونا تھا۔

مقصد کے اس اتحاد نے بے شک تعاون پر آمادہ کیا۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے دہلی والوں نے اس فوج کی آؤ بھگت خُوب کی۔ مگر اوّل تو خود دہلی والوں کی طبیعت جنگجو نہ تھی جو یہ موافقت پائیدار ہوتی۔ اس پر طرہ یہ کہ انگریزوں کے خُفیہ حامی اس تعاون میں رخنے پیدا کرتے رہتے تھے۔ جن کی بِنا پر جان سے نہیں بلکہ صرف مال سے مدد کرنا جو اخلاقی فرض تھا بسا اوقات باشندگانِ دہلی کو جبر اور تاوان معلوم ہونے لگتا تھا۔

جہاں تک فوجی نظام کا تعلق تھا، تو سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ یہ تمام سپاہی وہ تھے جنہوں نے دوسروں کی زیر کمان کام کیا تھا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اپنی کمان میں کام لے سکے۔

ان ناتجربہ کاروں کے خیال میں بادشاہ تمام خوبیوں کا حامل اور بادشاہ زادے افسری اور جرنیلی کے فطرتاً مستحق تھے۔ حالانکہ ان شاہزادوں میں اس کے سوا اور کوئی خُوبی نہ تھی کہ وہ بہادر شاہ کے فرزند یا اُس کے ہم جد تھے۔ چنانچہ پہلی مرتبہ خود فوجیوں کی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ؎ چنانچہ طوائف کے بازار گرم تھے اور جاں بازی کے علاوہ کوئی بھی بازی ایسی نہ تھی جس سے دہلی کے شوقین مزاجوں کو دلچسپی نہ ہو۔

Marfat.com

خواہش کے مطابق بادشاہ زادوں کو فوجوں کی کمان سپرد ہوئی۔ ناتجربہ کار قیادت کا نتیجہ شکست کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مئی اور جون کا وہ مہینہ جو پراگندہ حال انگریزوں کو ختم کرنے کا سب سے بہتر زمانہ تھا، ناتجربہ کار، ناز پروردہ، عیش پرست شاہزادوں کی طفلانہ اور خفیف حرکتوں کی نذر ہو گیا۔

۲ر جولائی کو جنرل بخت خاں ایک منظم اور باضابطہ فوج لے کر دہلی پہنچا۔ مگر اس وقت تک ایک طرف باشندگانِ شہر اور ڈیڑھ دو ماہ سے آئی ہوئی فوجوں میں بددلی کا مرض سرایت کر چکا تھا، اور دوسری جانب انگریز اپنی پراگندگیوں کو ختم کر کے مقابلہ کیلئے پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔

جنگی نقطۂ نظر سے شہر دہلی کا محلِ وقوع بھی قطعاً غیر موزوں تھا۔ ایک طرف جمنا اور تین طرف پہاڑیاں اس کی محافظ بن سکتی تھیں جب کہ پہاڑیوں پر اپنی فوجوں کا قبضہ ہوتا۔ لیکن معاملہ برعکس تھا، اور اس بنا پر دہلی کا پورا رقبہ توپوں کی زد میں تھا۔

مالی نظام اور مالی امداد دہلی اور قرب و جوار کے رؤسا اور نواب جو ہم نوا ہو گئے تھے بادشاہ کی طرف سے اُن کو احکام بھیجے گئے کہ وہ مالیہ وصول کر کے شاہی خزانہ میں بھیجیں۔ مگر اوّل تو وہ خود ضرورت مند تھے۔ اس کے علاوہ جو حوصلے انگریزوں کی امداد کے لئے فراخ اور

---

[1] شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب فرماتے ہیں۔ اوّل اوّل جب شہر میں باغی سپاہ داخل ہوئی ہے تو وہ دین دین پکارتی تھی اور اپنی بغاوت کا سبب فقط یہی بتاتی تھی کہ انگریز اُن کو بے دین کرنا چاہتے تھے۔ مگر دو مہینے کے بعد اس بات کا ذکر سُننے میں نہیں آتا تھا۔ ہر ایک رجمنٹ اور رسالہ میں تلنگے اور سوار ایسے اشراف اور بھلے مانس تھے کہ وہ کہتے تھے کہ یہ دنگا اور فساد مچانا اور افسروں کو قتل کرنا ہم میں سے صرف تھوڑے سے آدمیوں کا کام ہے ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم نے ان کو یہ کام کرنے دیا۔ اس خیال میں سب متفق تھے کہ اس جرم کے سبب سے انگریز ہم کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اُن کے افسر اکثر پژمردہ رہتے تھے۔ اُن کو اپنی تنخواہوں، اپنی عزت اور آخر عمر میں اپنی پنشنوں کا خیال آتا تھا۔ سپاہی ان کے حکم نہیں مانتے تھے۔ اور اُن کو ایسی باتیں سُنا دیتے تھے جن سے وہ شکستہ خاطر ہوتے تھے۔ (تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۶۹۹)

Marfat.com

وسیع ہو جاتے تھے، اس مصیبت زدہ بادشاہ اور انقلابی فوجوں کے حق میں اُن کی تمام بلندیاں پست ہو جاتی تھیں۔ مثلاً دہلی کے مہاجن جن سے روپیہ وصول کرنے کا بہت شور ہے۔ جیون لال صاحب نے اپنے روزنامچہ میں اس کی تفصیل یہ لکھی ہے:

"۳۱ مئی ۱۸۵۷ء گردار سنگھ اور گردھاری لال مہاجن نے دو لاکھ اور چند ہزار روپے شاہی خزانے میں جمع کئے۔

۴ جون ۱۸۵۷ء۔ بادشاہ کے احکام کے مطابق ایک جلسہ ہوا۔ جس میں ایک لاکھ روپیہ جمع ہوا۔

۳۱ اگست۔ فوجی عدالت کے ممبروں نے مہاجنوں کو بلایا، اور اُن سے روپیہ مانگا (حکماً طلب نہیں کیا)۔ مہاجنوں نے جواب دیا کہ شاہزادگان ہم سے تین لاکھ ستر ہزار روپیہ لے چکے ہیں۔ اب ہم میں مزید روپیہ دینے کی طاقت نہیں۔"

دوسری جانب ان کی دراز دستی ملاحظہ فرمایئے جن کے پاس کروڑوں کے خزانے محفوظ تھے۔ پٹیالہ، کشمیر، رام پور اور حیدرآباد جیسے راجاؤں اور نوابوں کی ہر طرح کی امدادیں اُن کو حاصل تھیں۔ یہاں تک کہ پٹیالہ اور رام پور نے تو اس جنگ کو خود اپنے اسٹیٹ کی جنگ تصور کر لیا تھا۔ یہی جیون لال اپنی ڈائری میں رقم طراز ہیں:

۲ جون ۱۸۵۷ء۔ متھرا کے مشہور و معروف مہاجن لکشمی چند کے گماشتہ نے محل میں یہ خبر دی کہ انگریزوں نے جنگی اخراجات کے لئے سیٹھ لکشمی چند سے ۲۵ لاکھ روپے قرض مانگے ہیں۔

۶ جون ۱۸۵۷ء۔ انگریزوں نے پانی پت اور کرنال کے مہاجنوں سے تین لاکھ روپے وصول کئے۔

۷ جون۔ خبر ملی، مہاراجہ پٹیالہ (نریندر سنگھ) نے جو پانچ لاکھ روپے انگریزی فوج کے لئے بھیجے تھے، وہ انگریزی لشکر میں بحفاظت تمام پہنچ گئے۔

Marfat.com

۲۲ جولائی - خبر ملی کہ لالہ چونی پرشاد نے لفٹنٹ گورنر سے وعدہ کر لیا ہے کہ جس قدر روپیہ کی ضرورت ہوگی، میں دوں گا - خبر ملی کہ مہاجن روزانہ ذخائر لے کر انگریزی کیمپ میں پہنچا کرتا ہے۔"

یہ رضاکارانہ امداد آگرہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں تھی - بلکہ انگریزوں کے اور بھی بہت سے وفادار تھے، جو منہ مانگے سے زیادہ پیش کر دینا اپنے مستقبل کے لئے فال نیک سمجھتے تھے -

جوں جوں وقت گذرتا گیا، جگہ جگہ ہندو مسلم سوالات کھڑے کر کے جلب منفعت کی کامیاب کوشش کی جانے لگی - چنانچہ بقول سر سید صاحب مرحوم ضلع بجنور میں فرقہ وارانہ سوال پوری شدت سے اُٹھا - مسٹر الیگزنڈر شیکسپیر ضلع بجنور کے کلکٹر اور مسٹر جارج پامر، جو آنٹ مجسٹریٹ تھے - اُن کے فرار کے بعد نواب محمود علی خاں[1] نے زمام حکومت سنبھال لی تھی - ایک پرگنہ کے ہندوؤں کو جارج پامر صاحب نے اشارہ کیا اور انہوں نے دو قسطوں میں دس ہزار روپیہ اُن انگریزوں کے پاس بھیج دیا، جو نینی تال میں پناہ گزیں تھے - ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

بادشاہ نے متعدد راجاؤں، نوابوں اور زمینداروں سے امداد کی اپیل کی - بہت سے راجاؤں اور نوابوں اور ذی اقتدار افراد کے نام انقلابی فوج کے افسروں کی فرمائش پر بادشاہ نے خطوط لکھے - مگر راجہ بلب گڑھ (ضلع گوڑگانوہ) نواب جھجر یا نواب مالاگڈھ جیسے چند زمینداروں کے علاوہ نامور راجاؤں اور مہاراجوں نے جواب دینا بھی پسند نہیں کیا اور جنہوں نے جواب دیا انہوں نے خود امداد کی درخواست کی - کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے امداد کا وعدہ کیا مگر یہ وعدہ آخر تک شرمندۂ وفا نہ ہو سکا -

پہلے ہی روز میگزین کی تباہی انگریزوں کے لئے نشان کامرانی اور انقلابی فوجوں کے بڑے منصوبے کی ناکامی تھی - اس کے بعد جد و جہد کر کے چوڑی والان میں دوسرا میگزین

---

[1] نواب محمود علی خاں صاحب کے حالات مضافات دہلی کے باب میں ملاحظہ فرمایئے -

Marfat.com

بنایا گیا۔ جس کو انگریز کے خفیہ خیر خواہوں نے تباہ کر کے مفلوک الحال بادشاہ اور اس کے انقلابی ساتھیوں کی رہی سہی توانائی بھی ختم کر دی۔ شہر کے بڑے لوگوں کی مجلس بادشاہ نے ۱۲ مئی ہی کو بنا دی تھی۔ خوراک اور رسد وغیرہ کے جملہ انتظامات اُس کے سپرد کر دیئے تھے۔ پھر جنگی کونسل اور فوجی عدالت بھی قائم کر دی۔ پھر ۴ ستمبر کو جے پور، جودھ پور، الور اور بیکانیر کے راجاؤں کو یہ بھی لکھ دیا کہ وہ مجلس بنالیں، شاہی اختیارات اُن کے سپرد کر دیئے جائیں گے[1] مگر افسوس صدائے برنہ خاست۔

خرچہ جنگ انقلابی فوج کی تعداد دہلی میں پچاس ہزار کے قریب تک پہنچ گئی تھی۔ اوسطاً فوج کا ماہانہ خرچ پانچ لاکھ تہتر[2] ہزار روپیہ تھا۔ اس طرح چار ماہہ دورِ حکومت میں تقریباً تئیس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ دہلی شہر کے علاوہ متعدد فوجیں اپنے ساتھ کچھ خزانے لائی تھیں۔ بہت تھوڑی رقم محصولات کے ذریعہ وصول ہوئی۔ بہادر شاہ کے پاس جو کچھ تھا، یہاں تک کہ سامانِ آرائش اور فرنیچر[3] وغیرہ، وہ بھی فروخت کیا گیا تب یہ مصارف پورے ہو سکے، اور وہ شاہزادے جن کی چیرہ دستیوں اور استحصال بالجبر کے قصّے آج تک بیان کئے جاتے ہیں، بقول شمس العلماء ذکاء اللہ خاں اُن پر ایسے وقت بھی گذرے کہ لوگ اُن کو مبارک باد دیتے تھے کہ بادشاہت اُن کے گھر آئی۔ وہ مبارکباد کے جواب میں کہتے کہ اس بادشاہت سے وہ غلامی بہتر تھی کہ دو وقت کھانے کو مل جاتا تھا، اب تو اس کے بھی لالے پڑے ہوئے ہیں۔

بہر حال جب حالات یہ ہوں تو شکست کے یقینی ہونے میں کس کو تامّل ہو سکتا ہے۔ بس وہ شکست اور تباہی جو ماہ ستمبر میں پیش آئی، حیرت انگیز نہیں۔ البتہ حیرت انگیز یہ ہے کہ چار ماہ مسلسل ایسی شان سے مقابلہ ہوتا رہا، کہ بار بار انگریزی فوجوں کے چھکّے چھوٹ گئے ہمّتیں ٹوٹ گئیں۔ انہیں پریشانیوں اور رات دن کی گھٹن میں دو کمانڈر جان سے گئے۔ ایک نے استعفیٰ دے کر جان بچائی۔

---

[1] غدر کی صبح و شام ص۲۴۲ و ص۲۴۳۔ [2] ایضاً ص۲۳۸۔ [3] ایضاً ص۲۴۲ وغیرہ

Marfat.com

مگر انگریزوں کا اقبال سامنے تھا۔ کچھ غیر معمولی ہمت اور حوصلے کے کمانڈر میسّر آتے رہے، بلکہ آگے بڑھ کر کمان سنبھالتے رہے۔ تازہ دم فوج کی بھیڑ کے ساتھ بے شمار سامانِ جنگ سے پوری دہلی کا محاصرہ کر لیا گیا۔ پھر تقریباً ایک ماہ تک جس شدّت سے دہلی شہر پر گولہ باری اور حملے ہوتے رہے، اُس کا اندازہ کرنے کے لئے ایک چشم دید شاہد کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔

راقم الدولہ ظہیر دہلوی کا بیان ہے :

"ادھر پہاڑی پر فریزر کی کوٹھی سے باؤلے (فلیگ اسٹاف) تک انگریزی فوج کے مورچے تھے۔ ادھر کشمیری دروازہ کے بُرج سے کابلی دروازہ کے سیاہ بُرج تک، اور لاہوری دروازہ کے بُرج سے فراش خانہ کی کھڑکی کے بُرج تک توپیں چڑھی ہوئی تھیں، اور باہم شبانہ روز گولہ باری ہوتی تھی، اور شیل اور بم کے گولے شہر پر پڑتے تھے۔ بم کا گولہ، خدا پناہ میں رکھے[1]، جس وقت پھٹتا تھا، اور صدہا ٹکڑے اُس کے اُڑ جاتے تھے، اگر سات درجے کے مکان پڑا تو تہ کو اُتر گیا، اور سب کا ستیاناس کر دیا۔ اگر زمین پر گرا، تو دس گز زمین

---

[1] مگر دہلی والوں کی خوش طبعی کا یہ رنگ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس حالت میں جس سے ظہیر صاحب پناہ مانگ رہے ہیں، اُن کی تفریح اور خوش مزاجی ختم نہیں ہوئی تھی۔ بقول خواجہ حسن نظامی مرحوم و مغفور، انگریزی توپوں کی گولہ باری اُن کے لئے شب برات کی آتش بازی کی طرح تماشا ہو گئی تھی۔ مکانوں کی چھتوں پر لوگ چڑھ جاتے اور گولوں کی سیر دیکھتے۔ جب گولہ آتا، تو غُل مچاتے، وُہ آیا وُہ آیا۔ گرتا تو شور مچاتے، وہ مارا۔ کہیں قریب میں گرتا تو سینکڑوں دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے۔ خواجہ حسن نظامی رحمۃ اللہ علیہ کے والد مرحوم ہمایوں کے مقبرہ کی چھت پر چڑھ کر تماشا دیکھا کرتے تھے۔ اس تماشے ہی میں اُن کو اس کا بھی احساس ہوا کہ آواز کی رفتار سے، روشنی کی رفتار زیادہ تیز ہے کیونکہ گولہ چھوٹنے کے وقت روشنی پہلے نظر آتی تھی۔ پھر کچھ وقفہ کے بعد آواز کانوں میں پہنچتی تھی۔
(داستانِ غدر اور دہلی کی جان کنی)

Marfat.com

میں پیوست ہو کر پھوٹا، اور تمام مکان کو اُڑا دیا۔ غرض ایک قہرِ خدا تھا۔ دس دس گولے برابر کاغذ کے پرچوں کی طرح رات کو اُڑتے چلے آتے تھے۔"

۱۴ دسمبر کو کشمیری دروازہ اُڑایا جا چکا تھا۔ انگریزی فوجیں شہر میں گھس چکی تھیں، اور چار حصّوں میں تقسیم ہو کر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ مگر دہلی کے گلی کوچوں میں اس شدّت سے مدافعت جاری تھی اور وطن عزیز کے ایک ایک چپّہ پر محبّانِ وطن اس طرح جانیں قربان کر رہے تھے کہ انگریزی فوج پھر ایک مرتبہ ہیبت زدہ ہو گئی۔ کیونکہ بڑے بڑے فوجی افسر کام آ چکے تھے، اور وہ بہادر جرنیل "نکلسن" جو تنہا دو ہزار کی برابر مانا جاتا تھا، ۱۴ ستمبر کو زخموں سے چُور ہو کر ہسپتال میں داخل اور زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔

آج ۱۵ ستمبر ۱۸۵۸ء کی صبح ہے۔ انگریزی جرنیل "ولسن" شش و پنج میں پڑا ہوا ہے کہ فوجوں کو پیش قدمی کا حکم دے یا پسپائی کا۔ مگر انگریزوں کی خوش قسمتی سے ابھی تک اپنی قوم پر قربان ہونے والے بہادر "نکلسن" کے بدن میں جان باقی تھی۔ اُس کے ہوش و حواس درست اور جذبات زندہ تھے۔ اُسے معلوم ہوا کہ "ولسن" شش و پنج میں پڑا ہوا ہے، اور بہت ممکن ہے، فوجوں کو واپسی کا حکم دے دے۔ وہ اپنی تکلیف بھول گیا۔ زخموں سے کراہنے والی آواز غصّہ اور جوش سے بھرّا گئی، اور اُس نے دانت پیس کر کہا:

"ابھی مجھ میں اتنی طاقت باقی ہے کہ "ولسن" کو گولی سے اُڑا دوں"۔

مرنے والے کی اس گرج نے زندہ دلوں میں نئی زندگی پیدا کی۔ شش و پنج کی بجائے نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا، اور فوجوں کو پیش قدمی کا حکم دے دیا گیا۔ مگر دوسری طرف وطن عزیز کی حرمت پر قربان ہونے والوں کی حالت یہ تھی کہ اُنہوں نے دو روز تک پیش قدمی کو ناممکن بنائے رکھا۔ اور جب شہیدوں کے پشتوں پر گذرتے ہوئے

Marfat.com

انگریزی فوجوں نے لال قلعہ کی طرف بڑھنا شروع کیا تو ایک ایک قدم پر وہ خونریز لڑائی لڑنی پڑی کہ کشمیری گیٹ سے لال قلعہ تک صرف ۶ فرلانگ کا راستہ پانچ دن میں طے ہو سکا، اور وہ بھی اس لئے کہ بادشاہ لال قلعہ کو خالی کر چکا تھا۔

دیوانِ خاص پر قبضہ اور ملکہ وکٹوریہ کا جامِ صحت ۱۹ ستمبر کو بادشاہ قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں پناہ گیر ہوا۔ تو ۲۰ ستمبر کو بعد دوپہر "ولسن" نے قلعہ میں داخل ہو کر دیوانِ خاص کو اپنا صدر مقام بنایا، اور تختِ طاؤسی کے چبوترے پر بیٹھ کر بادۂ نافرجام سے ملکہ وکٹوریہ کا جامِ صحت نوش کیا[1]۔

جنرل بخت خاں کی آخری کوشش۔ ناکامی ابھی بادشاہ لال قلعہ سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ جنرل بخت خاں باریاب ہوا۔ اُس نے بادشاہ کو تسلّی دی کہ یہ ناکامی فیصلہ کن نہیں ہے۔ صرف ایک شہر ہاتھ سے نکلا ہے، پورا ملک آپ کے لئے جان قربان کر رہا ہے۔ دہلی شہر جنگ کے لئے موزوں مقام نہیں تھا۔ دشمن کی فوجیں بلندی پر تھیں۔ شہر نشیب میں ٹھیک اُن کی توپوں کی زد میں تھا۔ سامانِ رسد اور اسلحہ کی فراہمی بھی مشکل تھی۔ اور ابتدا میں ناواقف افسروں کی ناتجربہ کاری سے جو نقصان ہو چکا تھا اُس کی تلافی ناممکن ہو گئی تھی۔ اور پھر مرزا مغل کی خودغرض ضدی طبیعت کی مداخلت نے آخر تک نظام کو درست نہیں ہونے دیا تھا۔ آپ ہرگز مایوس نہ ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ بادشاہ نے جنرل بخت خاں کی کسی دلیل کی بھی تردید نہیں کی۔ بظاہر اس کا میلان بھی یہی تھا مگر اس وقت اُس نے کوئی جواب بھی نہیں دیا، اور جنرل بخت خاں کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ کل کو ہمایوں کے مقبرے میں ملاقات کریں۔ فیصلہ اس وقت ہو گا۔

ادھر "گرگِ باراں دیدہ" انگریزی افسر بھی یہ سمجھتے تھے کہ اگر بادشاہ نکل گیا تو اُن کی

---

[1] لال قلعہ ۱۶۴۸ء میں مکمّل ہوا تھا۔ دو سو نو سال کے بعد اُس کے در و دیوار نے پہلی مرتبہ اجنبی حکمران کا جامِ صحت تجویز ہونے کی صدا سُنی۔ (غلام رسول مہر)

Marfat.com

ساری کوششوں پر پانی پھر جائے گا اور پھر فتح اور کامیابی ناممکن نہ سہی، تو مشکل ضرور ہو جائے گی۔ لہٰذا اپنے تمام ذرائع بادشاہ کو روک لینے میں صرف کر دیئے۔

منشی رجب علی، انگریزوں کی کارروائیوں کا سب سے بہتر مہرہ تھا۔ مرزا الٰہی بخش بہادر شاہ کا سمدھی جس کے دل میں مفاد پرست جذبات کی موجوں کے ساتھ یہ خلش بھی ہمیشہ رہتی تھی کہ پہلا ولی عہد جو صحیح معنی میں ولی عہدی کے اہل تھا، اس کا قابل داماد فخر الدین فتح الملک عرف "مرزا فخرو" تھا، جس کی ناوقت موت کے بارے میں لوگوں کا گمان یہ بھی تھا کہ اس کو زہر دے دیا گیا تھا۔

غرض یہی الٰہی بخش جو اس خلش کے ساتھ یہ نیک نامی بھی لئے ہوئے تھا کہ انگریزوں کا تنخواہ دار ہے، دوسرا مہرہ تھا۔ بادشاہ کی چہیتی بیگم زینت محل جس کی تمام تمنائیں اس پر منحصر ہو گئی تھیں کہ اُس کا لڑکا "جواں بخت" ولی عہد بنا دیا جائے۔

غرض جب یہ مختلف عناصر ہر طرف سے بوڑھے بادشاہ کو گھیرے ہوئے تھے، جس کو حوادث نے اب ضعیف الرائے بلکہ ضعیف العقل بھی بنا دیا تھا، تو ناممکن تھا کہ جنرل بخت خاں کی مخلصانہ درخواست منظور ہوتی۔

مرزا الٰہی بخش نے ایک چُبھتی ہوئی بات بادشاہ کو یہ بھی بتائی کہ بخت خان روہیلہ پٹھان ہے۔ پٹھان ہمیشہ مغلوں کے مخالف رہے ہیں۔ شیر شاہ نے ہمایوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اور ابھی ساٹھ ستّر برس پہلے کی بات ہے کہ غلام قادر روہیلہ نے جہاں پناہ کے دادا خلد آشیاں شاہ عالم بادشاہ کو کس طرح ذلیل کیا تھا اور اُن کی آنکھیں نکال لی تھیں۔ غرض ۲۰ ستمبر کو جنرل بخت خاں، بادشاہ سے ملا تو بادشاہ کا جواب یہ تھا۔ بیشک آپ کی رائے ٹھیک ہے، مگر میرا بڑھاپا اس پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ میں اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں۔ آپ اپنا کام کرتے رہیں۔

بخت خاں بادشاہ کا جواب سُن کر رخصت ہوا، اور اپنی پوری فوج کے ساتھ جمنا پار کر کے روہیل کھنڈ پہنچ گیا۔ اس بہادر جرنیل کے جنگی کمالات جو کچھ بھی ہوں

Marfat.com

اس کے تدبّر اور حُسنِ انتظام کی بہترین مثال یہ ہے کہ دو ماہ کی معرکہ آرائی کے بعد اپنی پوری فوج کو صحیح سالم نکال کر لے گیا۔ جب آیا تھا تو پوری فوج کی چھ ماہ کی تنخواہ پہلے ادا کر چکا تھا۔ مزید مصارف کے لئے مبلغ چار لاکھ روپیہ ساتھ لایا تھا۔ غرض وہ یا اس کی فوج کا کوئی فرد شاہی خزانہ یا باشندگانِ دہلی پر بار نہیں بنا۔ بخت خاں کی روانگی کے بعد تاخیر کی کیا ضرورت تھی۔ اگلے ہی روز بادشاہ گرفتار کر لیا گیا۔ جواں بخت کے علاوہ جو شاہزادے آج ہاتھ لگے، وہ آج قتل کر دیئے گئے۔ خاندان شاہی کے باقی افراد کی تلاش جاری رہی۔ جہاں ملے، قتل کر دیئے گئے یا پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ زینت محل کے علاوہ شاہی خاندان کی باقی خواتین جان بچانے کیلئے محلوں سے نکلیں اور خدا جانے کتنی کتنی مصیبتیں اُٹھا کر آخری انجام کو پہنچیں۔ اس داستانِ پارینہ سے عبرت لینی ہو تو خواجہ حسن نظامی مرحوم کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے اور ۱۹۵۷ء میں جو بہت سی تصانیف شائع ہوئی ہیں، ان میں بادشاہ کی گرفتاری سے لے کر اس کی وفات تک کے حالات تحریر کئے گئے ہیں، اُن کو مطالعہ کر لیا جائے۔ احقر کی جانب سے کسی قدر تغیر کے ساتھ یہ معذرت قبول فرمالی جائے۔

نہ شہم نہ شاہ پرستم کہ حدیث شاہ گویم
من بندہ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

ایک سوال اور اس کا جواب جنرل بخت خاں کے ساتھ بادشاہ کا جانا اگر انقلابی فوجوں کے لئے حوصلہ افزائی کا سبب تھا تو انگریزوں کے حق میں دہلی کی فتح بھی کچھ کم حوصلہ افزا نہ تھی۔ کیونکہ یہ فتح انگریزوں کے حامیوں کے لئے "راس اُمید" تھی جو اُن کے عہدِ وفا میں صرف استحکام ہی نہیں، بلکہ ولولے بھی پیدا کر رہی تھی۔ جنرل بخت خاں نے دہلی سے واپس ہو کر روہیل کھنڈ کا مورچہ سنبھالا۔ وہ غالباً بادشاہ کو بھی یہیں لاتا۔ اُس وقت لکھنؤ، کانپور اور روہیل کھنڈ کی حدود میں آزاد حکومت آسانی سے قائم ہو سکتی تھی۔ لیکن جبکہ جنوبی ہند اور پنجاب کا بیشتر حصّہ انگریزوں کا ہمنوا اور مددگار تھا۔

Marfat.com

بندرگاہوں پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ جن کے راستے سے ہر قسم کی امداد انگریزان کو دوسرے مقبوضات اور خود انگلستان سے پہنچ سکتی تھی، اور انگریزوں کو بہترین جرنیل اور اپنے مضبوط و مستعد مرکزوں کی رہنمائی اور امداد بھی حاصل تھی، تو شمالی ہند کی اس نوخیز مملکت کے لئے کامیابی تو پھر بھی قدرت کے کسی معجزہ پر موقوف رہتی۔ البتہ یہ ہوسکتا تھا کہ آپس کی مفاہمت سے خود مختار ریاستیں قائم ہو جاتیں اور وہ بے پناہ جانی و مالی نقصان جو ۱۸۵۷ء کے بعد سالہا سال تک ہندوستانیوں کو بالخصوص محبّانِ وطن کو برداشت کرنا پڑا، اس سے پناہ مل جاتی۔

بہرحال یہ ماضی کے متعلق ایک قیاس لاحاصل ہے جس کو طویل کرنے کے بجائے مختصر کر دینا بلکہ ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السّبیل۔

فتویٰ کی نوعیت اور اس کی ضرورت

جہاد، اور جب تک جہاد کی طاقت نہ ہو تو جہاد کی تیاری۔ یہ فتوےٰ تو اُسی وقت سے تھا، جب نصف صدی پہلے دنیاء اسلام کے مفتیٔ اعظم حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا تھا کہ:

"اس اطراف میں اور یہاں سے لے کر کلکتہ تک نصاریٰ کا حکم جاری ہے۔ وہ بلا روک ٹوک جو کچھ چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ عبادت گاہوں تک کو مسمار کر ڈالتے ہیں۔ مذہب کا کوئی احترام اُن کی نظر میں نہیں ہے"[1]۔

اس فتویٰ پر عمل کرتے ہوئے آپ کے مریدِ خاص اور آپ کی تحریک کے علمبردار حضرت سیّد احمد صاحب شہید نے مہاراجہ گوالیار سے امداد کی اپیل کی تھی اور شکوہ کیا تھا کہ:

"بیگانگاں بعید الوطن، ملوک زمین و زماں گردیدہ و تاجرانِ متاع فروش بپایہ سلطنت رسیدہ"

---

[1] ماخوذ از فتاوی عزیزیہ۔ ملاحظہ ہو شاندار ماضی جلد ۲

Marfat.com

"سات سمندر پار کے اجنبی، زمین و زماں کے بادشاہ بن گئے ہیں، اور بیچنے والے سوداگر سلطنت کے مرتبہ پر پہنچ گئے ہیں[1]"

پس اگر آج دین اور دھرم کے نام پر ہندو اور مسلمان اُٹھتے ہیں اور ان "تاجرانِ متاع فروش اور بیگانگانِ بعید الوطن" سے اپنے وطنِ عزیز کو پاک کرنے کے لئے تن مَن دھَن کی بازی لگا دیتے ہیں، تو اس کے لئے نہ مسئلہ پوچھنے کی ضرورت ہے، نہ فتوے حاصل کرنے کی حاجت۔

چنانچہ نہ میرٹھ کے فوجیوں نے کسی سے مسئلہ پوچھا، اور نہ جب دہلی کے باشندوں نے دہلی میں اُن کا استقبال کیا تو اُن کو کسی فتوے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے فتوے کے بعد انگریزی ڈپلومیسی کا دارالافتاء[2] بھی برابر کام کرتا رہا۔ اس نے پہلے حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کو وہابیت زدہ اور معاذ اللہ لادین قرار دیا۔ پھر مسئلہ کو اُلجھانے اور کُھلی ہوئی حقیقت کے چہرہ پر نقاب ڈالنے کے لئے انوکھا پہلو یہ پیش کر دیا کہ:

"انگریز حاکمِ وقت ہے مسلمان اس کی پناہ میں ہیں (مستامن ہیں) پس اطاعت واجب ہے اور غدر حرام"۔

اس نظر فریب مغالطہ کو جس طرح مفاد پرست، سرکاری ملازموں اور خود غرض اقتدار پرستوں نے اپنے بچاؤ اور اپنی کرتوتوں کے جواز کے لئے سند بنایا تھا، ایسے ہی کچھ سادہ لوح علماء اور مشائخ بھی اس فریب میں آگئے تھے[3]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، شاندار ماضی جلد دوم۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، ہمارے ہندوستانی مسلمان (از ڈاکٹر ہنٹر) کا ضمیمہ، بالخصوص ضمیمہ نمبر ۳۔ [3] حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں۔ اس داہیہ کبریٰ (۱۸۵۷ء کے انقلابی حادثہ) میں مولانا محمد اسحاق صاحب کی نئی جماعت پھر دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ الصدر الحمید (مولانا محمد اسحاق صاحب) نے جس طائفہ کو نئی تنظیم میں مرکزی اختیارات دیئے تھے، وہ طائفہ تو سلطانِ دہلی کا طرف دار ہوگیا اور سلطانی تحریک (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

سر سیّد مرحوم کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بھی اس ڈپلومیسی کو کام میں لانے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ ایک فتویٰ مرتب کیا گیا کہ یہ ہڑبونگ اور فساد ہے، جہاد نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں شرکت حرام ہے۔

اس فتویٰ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی اشاعت نہیں ہو سکی، اور اس کی اصل بھی ایسی ناپید ہو گئی کہ سر سیّد صاحب کو بھی دستیاب نہیں ہوئی۔ صرف اس کی نقل مل سکی، اور وہ بھی کسی قابلِ اعتماد، باوثوق شخص کے ذریعہ نہیں بلکہ ایسے ذریعہ سے جو خود سیّد صاحب کے نزدیک غیر قابلِ اعتبار تھا۔[1]

بہر حال فتویٰ ہو یا نہ ہو، مگر واقعہ یہ ہے کہ خود سر سیّد صاحب کا مسلک یہی تھا اور اسی وجہ سے وہ انگریز کی وفاداری میں یہاں تک بڑھے ہوئے تھے کہ اس کی حمایت میں اپنے ملک اور اپنی ملّت کے کسی بھی بڑے آدمی کی کوئی وقعت اُن کی نظر میں نہیں تھی۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی شکست کے بعد مولانا محمد اسحاق کی طرح حجاز پہنچ گیا۔ چنانچہ امیر امداد اللہ (حاجی امداد اللہ صاحب) اور مولانا عبد الغنی، مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی کے ساتھ حجاز میں بیٹھ کر اپنی ہندوستانی تحریک کی رہنمائی کرتے رہے ——— اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد اسحاق کے متبعین کی پہلی صف میں سے علماء اور صوفیہ کا کثیر حصّہ سلطان دہلی کی لڑائی میں غیر جانبدار بن گیا۔ اس کا حاصل یہ سمجھنا چاہیئے کہ الصدر الحمید کی تنظیم کے بالمقابل اگر پٹنہ میں پارٹی قائم ہو چکی تھی تو اب عود الصدر الحمید کے اپنے فرقہ میں سے ایک مخالف جماعت دہلی میں بھی پیدا ہو گئی۔ مولانا سیّد نذیر حسین دہلی اور مولانا شیخ محمد تھانوی اس دوسری جماعت کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں۔ (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صفحہ ۲۰۰)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] کس قدر دلچسپ تماشا ہے کہ جن کو سر سیّد، پُلّے، شہدے جیسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، اُن کے پاس تو وہ فتویٰ موجود ہے جس پر اس دَور کے پُر تقدّس اور متّقی و پرہیزگار علماء اور مفتیانِ کرام کے دستخط ثبت ہیں اور سر سیّد صاحب کے ہمنوا جو سر سیّد صاحب کے ارشاد کے مطابق مقدّس، پرہیزگار، باوقار اور سنجیدہ ہوں گے، وہ فتوے سے محروم یہاں تک کہ جو فتویٰ انہوں نے مرتّب کرایا ہوگا، اس کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی کوئی قابلِ اعتبار شخص میسّر نہیں آیا۔

Marfat.com

انتہا یہ کہ مجاہدین حریت اور محبّانِ وطن کے تذکرہ کے وقت وہ کچھ ایسے بے قابو ہو جاتے ہیں کہ دہلی کی روایتی تہذیب کا دامن بھی اُن کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور ایک ایسا انداز اختیار کر لیتے ہیں جس پر بازاری لوگوں کو بھی شرم آجاتی ہے۔

اچّھا، اب آپ اس اندازِ نگارش کو نظر انداز فرما کر سیّد صاحب کی تحریر ملاحظہ فرمایئے، جس سے فتوے کے مسئلہ پر روشنی پڑے گی۔ سر سیّد صاحب اسبابِ بغاوتِ ہند میں تحریر فرماتے ہیں:

"مسلمانوں کا بہت روزوں سے آپس میں سازش اور مشورہ کرنا اس ارادہ سے کہ ہم باہم متفق ہو کر غیر مذہب کے لوگوں پر جہاد کریں اور اُن کی حکومت سے آزاد ہو جائیں، نہایت بے بنیاد بات ہے جبکہ مسلمان ہماری گورنمنٹ کے متامن تھے، کسی طرح گورنمنٹ کی عملداری میں جہاد نہیں کر سکتے تھے۔"

---

[1] حضرت سیّد احمد شہید بالخصوص مولانا اسمٰعیل شہید جو اسی دہلی کے رہنے والے تھے۔ سر سیّد صاحب نے اُن کے جہاد کی تاویل یہ کر دی کہ:

"بیس تیس برس پیشتر ایک بہت بڑے نامی گرامی مولوی محمد اسمٰعیل نے ہندوستان میں جہاد کا وعظ کہا۔ اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ اس وقت اُس نے صاف بیان کیا کہ ہندوستان کے رہنے والے جو سرکار انگریزی کے امن میں رہتے ہیں، ہندوستان میں جہاد نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہزاروں آدمی جہادی ہر ایک ضلع ہندوستان میں جمع ہوئے اور سرکاری عملداری میں کسی طرح کا فساد نہیں کیا اور غربی سرحد پنجاب پر جا کر لڑائی کی" (اسباب بغاوتِ ہند ص ۸۵)

سر سیّد مرحوم کی اس تاویل کے متعلق محترم غلام رسول صاحب مہر کی تحقیق بھی ملاحظہ فرمایئے۔ مہر صاحب فرماتے ہیں۔ "میں جہاں تک تحقیق کر سکا ہوں، سب سے پہلے سر سیّد احمد خاں مرحوم نے سیّد صاحب شہید کے جہاد کا رُخ انگریزوں سے ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرا (سیّد احمد شہید ص ۲۵۲)۔ مزید تحقیق کیلئے اصل کتاب ملاحظہ ہو۔ نیز شاندار ماضی جلد دوم میں بھی اس پر کافی بحث گذر چکی ہے۔

Marfat.com

اس کے بعد فرماتے ہیں :

"اور یہ جو ہر ضلع میں پاجی[1] اور جاہلوں کی طرف سے جہاد کا نام ہوا، اگر ہم اس کو جہاد ہی فرض کریں تو بھی اس کی سازش و اصلاح قبل دسویں مئی ۱۸۵۷ء مطلق نہ تھی۔ غور کرنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں جن لوگوں نے جھنڈا جہاد کا بلند[2] کیا، ایسے خراب اور بد رویّہ اور بد اطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ و رنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ اُن کا نہ تھا۔ بھلا یہ کیونکہ پیشوا اور مقتدا جہاد کے گنے جا سکتے تھے۔ اس ہنگامے میں کوئی بات بھی مذہب کے مطابق نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ سرکاری خزانہ اور اسباب جو امانت تھا، اس میں

---

[1] مولانا احمد اللہ شاہ، مولانا لیاقت علی، مولانا فیض احمد، مولانا کفایت علی، مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی جیسے اکابر علماء کو خدا جانے سیّد صاحب نے ان دونوں لفظوں کا مصداق سمجھا ہے یا کسی ایک کا (تفو بر تو اے چرخِ گردوں تفو) ہاں سر سیّد صاحب کی طرف سے یہ معذرت کی جا سکتی ہے کہ اُن کے پیش نظر مغل شاہزادے اور اطراف و جوانب کے وہ نواب اور راجہ ہیں جو اگرچہ اس وقت تحریکِ انقلاب میں پیش پیش تھے۔ مگر اُن کی اخلاقی زندگی ہمیشہ خراب و خستہ رہی تھی۔ [2] سیّد صاحب نے مسلمانوں کی طرف سے صفائی دیتے ہوئے یہ کتاب لکھی ہے۔ سیّد صاحب صدر امین ضرور تھے مگر وکیل نہ تھے۔ اگر سیّد صاحب قابل وکیل ہوتے یا صفائی دینے کے لئے کسی قابل وکیل سے مشورہ ہی کر لیتے تو علمبردارانِ حریّت پر یہ غلط الزام نہ لگاتے۔ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں نے صرف جہادی وہابیوں پر اس بغاوت کی ذمّہ داری ڈالی ہے جن کا ایک ایک فرد شہید ہو چکا تھا۔ سیّد صاحب بھی یہی طریقہ اختیار کرتے تو موجودہ مسلمانوں کی طرف سے صفائی ہو جاتی یعنی جہادی باغی شہید ہو چکے اور جو اس وقت موجود ہیں وہ ہمیشہ وفادار رہے۔ مگر علماء اور اکابرِ دین کو دشنام دہی جو سیّد صاحب کا مخصوص ذوق تھا وہ تشنہ رہ جاتا۔ افسوس۔

Marfat.com

خیانت[1] کرنا، ملازمین کو نمک[2] حرامی کرنی مذہب کی رو سے درست نہ تھی۔ صریح ظاہر ہے کہ بے گناہوں کا قتل علی الخصوص عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا، مذہب کے بموجب گناہِ عظیم[3] تھا۔ پھر کیونکر یہ ہنگامۂ غدر جہاد ہو سکتا تھا۔ ہاں البتہ چند بد ذاتوں نے دُنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پُورے کرنے اور جاہلوں کے بہکانے کو، اور اپنی ساتھ جمعیت جمع کرنے کو جہاد کا نام لے دیا۔ پھر یہ بات بھی مفسدوں کی حرمزدگیوں میں سے ایک حرمزدگی تھی، نہ واقع میں جہاد۔"

پھر ارشاد ہوتا ہے:

"دہلی میں جو فتوئے جہاد کا چھپا، وہ ایک عُمدہ دلیل جہاد کی سمجھی جاتی ہے، مگر میں نے تحقیق سے سُنا ہے، اور اس کے اثبات پر بہت دلیلیں

---

[1] یہ سید صاحب کا قصورِ فہم اور اُن کے نظریہ کی غلطی ہے۔ مجاہدین ان بعید الوطن بیگانوں کو حاکم اور امیر نہیں تسلیم کرتے تھے بلکہ اُن کو غاصب، بدعہد اور خائن سمجھتے تھے۔ سرکاری خزانہ اور اسباب، امانت نہیں تھا بلکہ مال مغصوبہ تھا، اس کے اصل مالک ہندوستانی تھے۔ انگریزوں نے جبر و قہر سے جس کو قانون کی شکل دیدی گئی تھی۔ ہندوستانیوں کا مال لوٹا تھا، چھینا تھا۔ لہذا ہندوستانیوں کو اس مال کے واپس لینے کا حق تھا۔ انقلابی مجاہدین نے اپنا یہی حق حاصل کیا تھا۔ [2] یہ ملازمت دفع الوقتی تھی۔ اپنی معاشی ضرورتوں کے لئے ہر وقت اس ملازمت کو ختم کر دینے کا حق تھا۔ مجاہدین نے جو کچھ کیا، ملازمت ختم کرنے کے بعد کیا۔ اور نمک حرام ہندوستانی ملازم نہیں تھے بلکہ انگریز تھے جنہوں نے شاہ عالم سے دیوانی حاصل کر کے اتنی بڑی نمکحرامی کی تھی کہ نمک حرامی کی پوری تاریخ میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے [3] بیشک گناہِ عظیم تھا بلکہ اس سے بھی بدتر لفظ اس کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نکتہ سنجانِ قضا و قدر کا انکشاف تو یہ ہے کہ یہی بے عنوانی اس تحریک کی ناکامی کا سبب بنی۔ معاذ اللہ۔ باقی یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک ایک کے بدلہ میں سو سو اور کہیں اس سے بھی زیادہ کو قربان کرنا پڑا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کو قتل اس بنا پر کیا کہ یہ جاسوسی کر رہے تھے۔ البتہ اتنی کمی ضرور ہوئی کہ مصنوعی عدالت میں ان کو پیش کر کے کورٹ مارشل نہیں کرایا گیا۔

Marfat.com

ہیں کہ وہ محض بے اصل ہے۔ مَیں نے سُنا ہے کہ جب فوج نمک حرام میرٹھ سے دہلی میں گئی تو کسی نے جہاد کے باب میں فتویٰ چاہا۔ سب نے فتویٰ دیا کہ جہاد نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس پہلے فتویٰ کی میں نے نقل دیکھی ہے، مگر جبکہ وہ اصل فتویٰ معدوم ہے تو مَیں اس نقل کو نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں تک لائق اعتماد کے ہے۔ مگر جب بریلی کی فوج دہلی میں پہنچی اور دوبارہ فتویٰ ہوا، جو مشہور ہے اور جس میں جہاد کرنا واجب لکھا ہے بلاشبہ اصلی نہیں۔ چھاپنے والے اس فتوے کے نے جو ایک مفسد اور نہایت قدیمی بدذات آدمی تھا، جاہلوں کے بہکانے اور ورغلانے کو لوگوں کے نام لکھ کر اور چھاپ کر اس کو رونق دی تھی۔ بلکہ ایک آدھ مُہر ایسے شخص کی چھاپ دی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا۔ مگر مشہور ہے کہ چند آدمیوں نے فوج باغی بریلی اور اُس کے مفسد ہمراہیوں کے جبر اور ظلم سے مُہریں بھی کی تھیں۔"

"دہلی میں[1] ایک بڑا گروہ مولویوں اور اُن کے تابعین کا ایسا تھا کہ مذہب کی رُو سے معزول بادشاہ دِلّی کو بہت[2] بُرا اور بدعتی سمجھتے تھے۔ اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ دِلّی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبض و دخل اور اہتمام ہے، اُن مسجدوں میں نماز درست نہیں چنانچہ وہ لوگ جامع مسجد

---

[1] درست ہے مگر اس سے فتویٰ جہاد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ جہاد اس لئے نہیں تھا کہ معزول کو دوبارہ بادشاہ بنا دیں بلکہ جہاد کی غرض انگریزوں کو نکالنا تھا جیسا کہ آئندہ فتوے کے سوال اور جواب سے ظاہر ہوگا۔ البتہ چونکہ اس وقت میرٹھ کی فوج نے بہادر شاہ کو بادشاہ بنا لیا تھا، اس لئے اہلِ علم کی رائے میں اختلاف ضرور پیدا ہو گیا۔ جیسا کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے جو پہلے حاشیہ میں گذر چکی ہے۔ [2] مگر انگریزوں سے بُرا کوئی بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اسی بنا پر انہیں علماء کی اکثریت نے جہاد میں حصّہ لیا اور جامِ شہادت سے سرشار ہوئے۔ رحمہم اللہ۔

Marfat.com

میں نماز نہیں پڑھتے تھے اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتوے اس معاملہ میں موجود ہیں۔ پھر کبھی عقل قبول کر سکتی ہے کہ ان لوگوں نے جہاد کے درست ہونے میں اور بادشاہ کو سردار بنانے میں فتوے دیا ہو۔"

"جن لوگوں کی مہر اس فتویٰ پر چھاپی گئی ہے، اُن میں سے بعضوں نے عیسائیوں کو پناہ دی[1]، اور اُن کی جان و عزت کی حفاظت کی۔ اُن میں سے کوئی شخص لڑائی پر نہیں چڑھا۔ مقابلے پر نہیں آیا۔ اگر واقع میں وہ ایسا ہی سمجھتے، جیسا کہ مشہور ہے تو یہ باتیں کیوں کرتے[2]۔"[3]

سر سید صاحب کی اس طویل تحریر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے:

(۱) مجاہدینِ حریت کے خلاف اس وقت بھی بدگمانیاں پھیلانے کی کوشش کی گئی، اور نظامِ حکومت درہم برہم ہونے کے وقت جو حرکتیں عام شرارت پسند اور شہر کے اوباش کیا کرتے ہیں، اور جو حرکتیں شاہی خاندان کے آوارہ منش ناتجربہ کار نوجوانوں سے ہوئیں، اُن کو با اخلاص مجاہدین اور شریف الطبع محبّانِ وطن کے

---

[1] دشمن اگر پناہ مانگے تو پناہ دینا فتویٰ جہاد کے خلاف نہیں بلکہ جس کلامِ پاک کی روشنی میں جہاد کا فتویٰ دیا جاتا ہے اس کا حکم ہے وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتّٰی یسمع کلام اللہ "اگر برسرِ جنگ مشرکوں میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو۔ تاکہ اس کو توفیق ہو کہ اللہ کی بات سُنے اور اس پر عمل کرے (سورۂ توبہ) بالخصوص عورت کا معاملہ تو بہت ہی نازک ہے حدیث میں خصوصیت سے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے قتل کی ممانعت ہے۔ [2] غلط ہے۔ مولانا محمد سرفراز علی صاحب جنرل بخت خاں کے پیر و مرشد جن کی سربراہی میں جنرل بخت خاں دہلی پہنچے اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی جیسے بزرگوں کے جہاد کا ہمیں علم ہے اور باقی کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ علاوہ ازیں جب ماہر جنگ سپاہ اور فوج موجود تھی، تو لازم بھی نہیں تھا کہ جو جنگ کے ماہر نہ ہوں وہ میدان میں کودیں۔ "ہر کسے را بہر کارے ساختند"۔ [3] اسباب بغاوت ہند ص ۱۰۷۔

Marfat.com

سر تھوپا گیا۔ (معاذ اللہ)

(۲) ابتدا میں جہاد کا فتوےٰ نہیں تھا۔ جنرل بخت خاں جب دہلی آئے تب فتویٰ مرتب کیا گیا۔

سر سیّد کے ہم نوا شمس العلماء ذکاء اللہ خاں بھی یہی فرماتے ہیں اُن کی تحریر ملاحظہ ہو:

"جب تک دہلی میں بخت خاں نہیں آیا، جہاد کے فتوے کا چرچا[1] شہر میں بہت کم تھا۔ مساجد میں ممبروں پر جہاد کا وعظ کمتر ہوتا تھا۔ دلّی کے مولوی اور اکثر مسلمان خاندانِ تیموریہ کو ایسا خولہ خبط جانتے تھے کہ وہ ناممکن سمجھتے تھے کہ اس خاندان کی بادشاہی ہندوستان میں ہو مگر اس کے ساتھ جاہل مسلمانوں کو یہ یقین تھا کہ انگریزی سلطنت کے بدن میں یہ ایسا پھوڑا نکلا کہ وہ جانبر نہیں ہوگی۔

یہ کام لُچّے شہدے[2] مسلمانوں کا تھا کہ وہ جہاد جہاد پکارتے پھرتے تھے۔ مگر جب "بخت خاں" جس کا نام اہلِ شہر نے "کم بخت[3] خاں" رکھا تھا دلّی میں آیا تو اُس نے یہ فتویٰ[4] لکھایا کہ مسلمانوں پر جہاد اس لئے فرض ہے کہ اگر کافروں کی فتح ہوگی تو وہ اُن کے بیوی بچّوں کو قتل کر ڈالیں گے اُس نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتوے پر دستخط و مہریں اُن کی کرالیں اور مفتی صدر الدین نے بھی اُن کے جبر سے اپنی جعلی مہر کر دی۔ لیکن مولوی محبوب علی اور خواجہ ضیاء الدین نے

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فتویٰ پہلے سے تھا لیکن اس کا چرچا نہیں تھا اور مسجدوں میں جہاد کے وعظ بھی کم ہوتے تھے۔ [2] خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد۔ [3] برعکس نام نہند زنگی کافور۔ [4] یہ شمس العلماء کا خیال ہے۔ فتوے کے الفاظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا تفصیل آئندہ ملاحظہ فرمائیے۔

Marfat.com

فتوی پر مہریں نہیں کیں اور بے باکانہ کہہ دیا کہ شرائطِ جہاد موافق مذہب اہل اسلام موجود نہیں[1]۔

اس فتوی کا اثر یہ تھا کہ جاہل مسلمانوں کا جوش مذہبی زیادہ ہوگیا جن مولویوں نے فتوی پر مہریں کی تھیں وہ کبھی پہاڑی پر انگریزوں سے لڑنے نہیں گئے۔ مولانا نظیر حسین جو وہابیوں کے مقتدا اور پیشوا تھے اُن کے گھر میں ایک میم چھپی بیٹھی تھی۔ اس فتوی پر کچھ مہریں اصلی اور کچھ جعلی تھیں۔ ایک مولوی کی مہر تھی جو غدر سے پہلے قبر میں سو چکا تھا[2]۔

(۳) سرسید اور شمس العلما، دونوں کے بیان اس پر متفق ہیں کہ فتوے پر کچھ دستخط اور مہریں فرضی تھیں۔ کچھ نے اپنی رائے کے خلاف زور زبردستی سے دستخط کئے۔ مگر یہ نہیں فرمایا کہ ایسے بے کس و مجبور کون تھے جنہوں نے رُعب میں آکر ایسے خطرناک فتوے پر جس کے نتیجہ میں موت سامنے تھی، دستخط کر ڈالے، اور جب کہ مولانا محبوب علی صاحب اور خواجہ ضیاء الدین مرعوب نہیں ہوئے، اُنہوں نے کھلے بندوں مخالفت کی اور کوئی اُن کا بال بیکا نہیں کر سکا، تو اُن کے مرعوب اور مجبور ہونے کی کیا وجہ تھی۔

شمس العلما نے مفتی صدرالدین صاحب کا نام لیا ہے کہ اُن کی مہر جعلی تھی۔ اور دستخط مجبوراً ہوئے تھے، اور ایک صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ مفتی صاحب نے ازراہ ذکاوت دستخط سے پہلے لکھ دیا، شہدت بالحر۔ یعنی "بالحر" پر نقطے نہیں لگائے تھے، علما نے بالخیر پڑھا۔ اور انگریزی تسلط کے بعد جب گرفتاری ہوئی تو مفتی صاحب

---

[1] یعنی سرسید مرحوم کی طرح انگریزوں سے جہاد کو جائز نہیں کہا، بلکہ یہ عذر کیا کہ جہاد کی شرطیں مثلاً مقابلہ کی پوری قوت وغیرہ موجود نہیں ہیں۔ یہی عذر حضرت شیخ محمد صاحب تھانوی نے بھی پیش کیا تھا۔ [2] ملاحظہ ہو تاریخ عروجِ عہدِ انگلیشیہ ص ۶۷۵۔

Marfat.com

نے اس کو بالجبر پڑھ کر فرما دیا کہ میں تو پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ دستخط جبراً کئے ہیں لیکن اوّل تو فتوے پر دستخط سے پہلے یا بعد میں یہ لفظ "شہدت بالخیر" بے معنی ہے۔ نہ یہ شہادت کا موقع ہے، اور نہ بالخیر کا لفظ موقع اور محل سے کوئی مناسبت رکھتا ہے آخر اس کے کیا معنی کہ میں نے گواہی دی خیر سے یا خیر کے ساتھ۔

اس کے علاوہ دوسری بات یہ کہ فتوے کی جو نقل صادق الاخبار میں چھپی ہے اُس میں مولانا کی مہر یا دستخط کے آگے پیچھے سرے سے کوئی عبارت ہی نہیں۔

پھر "جعلی مہر" بھی وضاحت طلب ہے۔ اگر مفتی صاحب نے دستخط کئے تھے تو مہر کی کیا ضرورت۔ اور اگر دستخط کے بجائے مہر لگا دی تھی تو وہ جعلی کیسے ہوئی۔

(۴) مولانا سیّد نذیر حسین صاحب کے متعلق بیانات مختلف ہیں۔ سر سیّد اور شمس العلماء دونوں نے اُن کو مخالف قرار دیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کی تحقیق بھی یہی ہے کہ:

"حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سے مولانا سیّد نذیر حسین صاحب اور مولانا شیخ محمد تھانوی وہ بزرگ ہیں جو سلطان دہلی کی لڑائی میں غیر جانب دار رہے[1]"

منشی محمد جعفر تھانیسری نے تو ان کے متعلق بہت ہی سخت[2] الفاظ لکھے ہیں بایں ہمہ اس موقع پر نہیں تو مقدمہ انبالہ کے سلسلہ میں راولپنڈی میں ایک سال تک یہ بھی نظر بند رہے[3]

بہر حال فتویٰ کے دستخطوں میں اس نام کے متعلق یہ بیان اہمیّت اختیار کر لیتا ہے کہ کچھ دستخط جبراً ہوئے۔ اگرچہ ہمیں اب بھی اطمینان نہیں، جس کی وجہ چند سطروں کے بعد ظاہر ہوگی۔

---

[1] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صفحہ ۲۰۰ ملخصاً۔ [2] ملاحظہ ہو تواریخ عجیب عرف کالا پانی صفحہ ۲۰۰ شائع کردہ اقبال اکیڈمی لاہور۔ [3] تراجم علماء حدیث ہند صفحہ ۱۴۹۔

Marfat.com

(۵) سرسید اور شمس العلماء دونوں کی تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علماء کرام بادشاہ کے حامی نہیں تھے اور شاہی خاندان کے متعلق بھی وہ اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ شمس العلماء کے الفاظ میں "وہ اُن کو خولہ خبط جانتے تھے"۔

(۶) ان باتوں میں اتفاق کے باوجود ایک نہایت اہم اور نازک مسئلہ میں سرسید اور شمس العلماء کی مذکورہ بالا تحریریں مختلف ہیں۔ سرسید صاحب فرماتے ہیں کہ "جب کہ مسلمان ہماری گورنمنٹ کے مستامن تھے۔ کسی طرح گورنمنٹ کی عمل داری میں جہاد نہیں کر سکتے تھے"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان انگریزوں کو ہندوستان کا جائز حکمران تسلیم کر چکے تھے۔ لہٰذا اس کی مخالفت غدر اور بغاوت تھی، جو جائز نہیں ہو سکتی اور نہ اس کو جہاد کہا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، انگریز ڈپلومیسی یہی سبق دے رہی تھی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء تک کم از کم دہلی کے علماء نے اس سبق کو ذہن نشین نہیں کیا تھا۔ وہ انگریزوں کو غاصب اور متغلب ہی سمجھتے تھے۔ سرسید کی تحریر کے خلاف شمس العلماء نے ایک جگہ اختلاف کی وجہ یہ تحریر کی۔

"شرائطِ جہاد موافق مذہب اہلِ اسلام موجود نہیں"۔

شمس العلماء کے بیان کے بموجب مولانا محبوب علی صاحب اور خواجہ ضیاء الدین صاحب نے یہی وجہ بیان کی تھی۔

اس توجیہ اور استدلال کا مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کو جائز حکمران تو نہیں مانا جاتا۔ مگر چونکہ مقابلہ کی طاقت نہیں ہے، اس لئے جہاد کا فتوےٰ بھی نہیں دیا جاتا۔

اصل حقیقت (۷) مذکورہ بالا تفصیلات کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ابتداء میں اسی نظریہ پر اتفاق رہا جو پچاس سال پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز

Marfat.com

صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے پیش کیا تھا۔ جس کی کامیابی کے لئے حضرت سید احمد صاحب شہید اور اُن کے پاک باز رفقاء نے جانیں قربان کی تھیں اور جو مسلمانوں کے دماغوں میں راسخ ہو چکا تھا کہ:

"ہم ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان ہمارا وطن ہے۔ سات سمندر پار سے انگریز سوداگری کی غرض سے ہندوستان آئے۔ حکومتِ ہند نے اُن کو تجارت کی اجازت دی۔ ان غیر ملکیوں نے غیر ملکی رہتے ہوئے رفتہ رفتہ ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ یہ قبضہ بالجبر اور یہ تسلّط غاصبانہ ہے۔ باشندگانِ وطن کا فرض ہے کہ اس بیرونی طاقت سے وطنِ عزیز کو آزاد کرائیں"۔

اس نظریہ کی بنا پر جب یہ موقع آیا کہ کچھ فوجیں برگشتہ ہوئیں اور مُلک کو آزاد کرانے کے لئے اُنہوں نے جان کی بازی لگا دی تو اب پس و پیش کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور نہ اس واضح مقصد کے لئے فتوے کی ضرورت تھی۔

لیکن آغازِ تحریک (یعنی ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء) سے چند روز بعد ہی یہ صورت پیش آئی کہ ایک طرف جن کو زمامِ قیادت سپرد کی گئی تھی، اُن میں قیادت و سیادت کی صلاحیت نہیں تھی اور دوسری جانب انگریز کے خفیہ حامی جو نہایت خاموشی سے شہر میں کام کر رہے تھے، اُن کی طرف سے یہ دل کو لگنے والا سوال اُٹھا دیا گیا کہ ہماری طاقت غیر قابلِ اعتماد ہے اور ممکن ہے بادشاہ کی اہلیت و صلاحیت کا سوال بھی پیدا کر دیا گیا ہو، تب لامحالہ علماء کی رائے میں اختلاف ہو گیا۔ اور مان لیجئے کہ حضرت شاہ اسحاق صاحب اور حضرت مولانا عبدالغنی صاحب رحمہما اللہ سے تعلق رکھنے والے علماء جو بادشاہ کو بدعتی، ضعیف الرائے اور نااہل سمجھتے تھے، وہ کنارہ کش ہونے لگے۔ لیکن چند روز بعد جب ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو جنرل بخت خاں فوج، اسلحہ اور نقد رقم لے کر مولانا سرفراز علی صاحب اور دوسرے

Marfat.com

علما کے ساتھ دہلی پہنچ گیا اور بادشاہ نے کمانڈر انچیف اور نائب السلطنت کی حیثیت دے کر اختیارات اُس کے سپرد کر دیئے۔ یہاں تک کہ بیرونِ دہلی انقلابی افواج کو بادشاہ کی جانب سے ہدایات جنرل بخت خاں ہی دینے لگے، تو جہاں تک، بادشاہ کی نااہلیت وغیرہ کا سوال تھا وہ خود بخود ختم ہو گیا۔ کیونکہ جنرل بخت خاں اور اُس کے پیر و مرشد مولانا سرفراز خان صاحب اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے جس کو بادشاہ کے متعلق اعتراض تھا۔ جنرل بخت خاں، مولانا سرفراز علی صاحب کے معتقد تھے اور مولانا سرفراز علی صاحب حضرت سید صاحب سے وابستہ تھے، اور گورکھپور کے علاقہ میں حضرت سید صاحب کے نام پر بیعت لیتے رہے تھے۔

اب صرف ایک سوال باقی رہ گیا۔ یعنی کیا ہم میں طاقت، مقاومت اور قوّتِ مقابلہ اس درجہ کی ہے کہ ہم فتح پا سکیں یا نہیں؟ اسی پر غور کرنے کے لئے جامع مسجد میں اجتماع کیا گیا۔ مولانا محبوب علی صاحب کی رائے اس وقت بھی یہی رہی کہ ہم میں قوّتِ مقابلہ نہیں ہے لہٰذا شرط جہاد اسلامی اصول کے مطابق نہیں پائی جاتی، اور وہ اسی رائے پر آخر تک باقی رہے۔ مگر خواجہ ضیاء الدین صاحب نے پہلے مخالفت کی۔ پھر آپ بھی متفق ہو گئے۔ چنانچہ فتوے پر آپ کے دستخط بھی موجود ہیں۔

بہرحال دستخط کے وقت نہ مرعوبیت تھی نہ جبر و قہر۔ بلکہ سوچ سمجھ کر بحث تمحیص کے بعد دستخط کئے گئے۔ ہاں ناکامی کے بعد جب دار و گیر کا سلسلہ شروع ہوا، تو ممکن ہے کچھ علماء نے جبر کا عذر پیش کر دیا ہو۔

اب آپ وہ فتوے ملاحظہ فرمائیے جس کی تمہید کا طویل سلسلہ چند صفحات سے چل رہا ہے۔ سوال و جواب کی عبارت پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت اربابِ فتویٰ اور اہلِ علم کے سامنے نہ یہ تصوّر ہے کہ انگریز حاکم ہے، اور ہم

Marfat.com

اس کی مستامن رعایا۔ نہ بادشاہ اور خاندانِ تیموریہ کی اہلیت، یا نا اہلیت کا مسئلہ پیش نظر ہے، اور نہ یہ بات سامنے ہے کہ انگریز اگر قابض ہوگئے تو زن و بچّہ کا استیصال کر دیں گے۔ یہ سب نکتے بعد الوقوع اور اُن مصنّفین کے تصنیف فرمودہ ہیں جو بارگاہِ انگریز میں خطابات سے سرفراز ہوئے۔ سوال اُس وقت صرف ایک تھا کہ آیا ہم میں مقابلہ کی طاقت ہے یا نہیں؟ چنانچہ عبارت سوال یہ ہے۔

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلّی پر چڑھ آئے اور اہلِ اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں، اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو وہ فرضِ عین ہے یا نہیں؟ اور لوگ جو اور شہروں اور بستیوں والے ہیں اُن کو بھی جہاد چاہیئے یا نہیں۔ بیان کرو، اللہ تم کو جزاء خیر دے۔

جواب

درصورت مرقومہ فرض عین ہے، اُوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے بسبب کثرتِ اجتماعِ افواج کے اور مہیّا اور موجود ہونے آلاتِ حرب کے۔ تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا۔ اور اطراف و احوال کے لوگوں پر جو دُور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں، مقابلے سے یا سُستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں اُن پر بھی فرض ہو جاوے گا۔ اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہلِ زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہوگا۔ اور جو عدو اور بستیوں پر ہجوم اور قتل و غارت کا ارادہ کریں، تو اس بستی والوں

Marfat.com

پر بھی فرض عین ہو جائے گا بشرط اُن کی طاقت کے۔

العبد المجیب احقر : نور جمال عفی عنہ

اس فتوے کا عکس جو سوتنتر[1] دہلی اور نوائے آزادی[2] میں شائع ہوا ہے اس میں اس جواب کے نیچے مندرجہ ذیل علماء کے دستخط اور مہریں بھی ہیں۔

۱ : سیّد محمد نذیر حسین۔ ۲ : رحمت اللہ۔ ۳ : مفتی محمد صدر الدین۔ ۴ : مفتی اکرام الدین معروف سیّد رحمت علی۔ ۵ : محمد ضیاء الدین۔ ۶ : عبد القادر ۷ : فقیر احمد سعید احمدی۔ ۸ : محمد میر خاں (یا میر محمد خاں یا میر خان محمد)۔ ۹ : محمد عبد الکریم۔ ۱۰ : فقیر سکندر علی۔ ۱۱ : محمد کریم اللہ۔ ۱۲ : مولوی عبد الغنی۔ ۱۳ : خادم العلماء محمد عبد الغنی۔ ۱۴ : فرید الدین۔ ۱۵ : محمد سرفراز علی۔ ۱۶ : سیّد محبوب علی جعفری۔ ۱۷ : ابو احمد محمد حامی الدّین۔ ۱۸ : سیّد احمد علی۔ ۱۹ : الٰہی بخش۔ ۲۰ : محمد مصطفیٰ خاں ولد حیدر شاہ نقشبندی۔ ۲۱ : محمد انصار علی۔ ۲۲ : مولوی سعید الدّین۔ ۲۳ : حفیظ اللہ خاں۔ ۲۴ : محمد نور الحق عفی عنہ۔ ۲۵ : سراج العلماء ضیاء الفقہاء مفتی عدالت العالیہ محمد رحمت علی خاں۔ ۲۶ : واللہ الغنی وانتم الفقراء۔ ۲۷ : حیدر علی ۲۸ : سیف الرحمٰن۔ ۲۹ : سیّد عبد الحمید عفی اللہ عنہ۔ ۳۰ : محمد ہاشم۔ ۳۱ : یا سید حافظ ۳۲ : محمد امداد علی عفی عنہ۔ ۳۳ : خادمِ شرع شریف رسول الثقلین قاضی القضاۃ محمد علی حسین۔

---

[1] یہ ڈاکٹر اظہر عباس صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کی لکھی ہوئی ہندی زبان کی کتاب ہے جس کو حکومت یوپی نے ۱۸۵۷ء کی یادگار میں شائع کیا ہے۔ اس کے آخر میں بہت اہم کاغذات کے عکس بھی چھاپ دیئے گئے ہیں۔ ان کے منجملہ صادق اخبار دہلی مؤرخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کا فوٹو بھی ہے۔ اس کے ایک صفحہ پر فتوئے جہاد بھی موجود ہے۔ مدیر اخبار نے اس فتویٰ کی سُرخی یہ دی ہے۔ نقل استفتاء از اخبار الظفر دہلی اُردو۔ [2] مرتب و شائع کردہ ادبی پبلشرز شعبۂ اشاعت انجمن اسلام بمبئی ضمیمہ ص ۸

Marfat.com

نیچے تحریر ہے : حسبِ فرمان واجب الاذعان شاہی در جمیع المطابع دہلی جمیل الدین خاں مہتمم طبع نمود۔

دستخطوں یا مہروں میں جو الفاظ لکھے ہوئے ہیں، وہ بجنسہٖ سطور بالا میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا جناب مولانا مفتی صدر الدین صاحب کے متعلق جو روایت مشہور ہے کہ آپ نے دستخط سے پہلے شہدت بالخر بھی لکھ دیا تھا اور ناکامیٔ تحریک کے بعد جب آپ سے باز پرس کی گئی تو آپ نے اپنی معذرت میں پیش کر دیا کہ میں نے خود ہی لکھا ہے۔ شہدت بالجبر یعنی یہ دستخط جبراً کئے ہیں۔ پس یہ معذرت قبول ہوئی اور آپ بری کر دیئے گئے۔ صرف کچھ جائداد ضبط ہوئی۔

مذکورہ بالا عکس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بے حقیقت ہے ظرافت یا کسی رقابت کی بناء پر اختراع کی گئی ہے۔

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب نے مولانا رحمت اللہ صاحب کے متعلق تحریر فرمایا ہے :

> اس دانش مند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی، بلکہ ایک ہنگامہ فساد برپا تھا۔"

شمس العلماء کا یہ خیال بھی غلط ہے۔

حضرت مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کے دستخط بھی اس فتوے پر نہیں ہیں کیونکہ مولانا موصوف اس فتوے کی ترتیب اور جامع مسجد کے اجتماع سے کئی ہفتہ بعد وسط اگست میں دہلی تشریف لائے تھے۔

Marfat.com

نظم و تنظیم۔ انقلابی جماعتیں

تحریک حضرت سیّد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے باقیات

اور وہابی مجاہدین

نظم و تنظیم یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جو انقلابی معرکے ہوئے، اُن میں نظم نہیں رہا تھا۔ نظم و ضبط سے محرومی کا پہلا نشان تو یہ ہے کہ طے شدہ وقت سے تقریباً تین ہفتہ پہلے یہ آتش فشاں میرٹھ میں پھٹ گیا۔ اس کے بعد جہاں جہاں شعلے بھڑکے اُن کا وقت ایک نہیں تھا۔

مثلاً تحریک کے ابتدا کے لئے ۳۱ مئی کی تاریخ مقرر تھی اور یہ بھی طے تھا کہ جہاں جہاں اقدام ہوگا۔ ایک ہی تاریخ میں ہوگا۔ مگر جذبات اس طرح بے قابو ہوگئے کہ ۳۱ مئی کا انتظار ناممکن ہوگیا۔

پھر میرٹھ میں اگر ۱۰ مئی کو یہ بے قابو جذبات برافروختہ ہوگئے تھے۔ تو کان پور، لکھنؤ وغیرہ میں ڈیڑھ دو ماہ تک افسردہ پڑے رہے اور جب وہ شعلہ بار ہوئے تو اس طرح کہ وحدتِ مقصد اور غائبانہ ہمدردیوں کے علاوہ ضابطہ کا کوئی رابطہ آپس میں قطعاً نہ تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ بے ربطی اس بناء پر تھی کہ یہ تحریک ابتدا ہی سے نظم و ضبط اور باہمی ربط سے ناآشنا تھی یا جذبات کی فراوانی اور ناتجربہ کاری نے نظم و ضبط کے دھاگے توڑ ڈالے تھے۔ انگریز مؤرخین کا اصرار یہی ہے کہ یہ تحریک نظم و ضبط سے قطعاً ناآشنا تھی۔ اُن کے نزدیک اس تحریک کی حقیقت سرکش فوجوں کی وقتی ہنگامہ آرائی سے زیادہ نہ تھی۔ اُن کو یہ اصرار اس لئے بھی ہے، کہ

Marfat.com

پہلے سے کسی تنظیم کا اعتراف انگریزی افسروں کی نااہلیت کا ثبوت بن جاتا تھا۔ اور انگریز افسروں کا تکبّر و غرور اس کو گوارا نہیں کرتا تھا کہ پہلے سے کسی خفیہ تنظیم کا اعتراف کر کے اپنی نااہلیت اور غفلت کو تسلیم کریں۔ اور خود اُن کے ہم رنگ و ہم نسل ہزاروں انگریز جو ان معرکوں میں ہلاک ہوئے تھے، اُن کے خون کا بار اپنی گردن پر لیں۔ اسی بناء پر وہ تمام واقعات جو تنظیم کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ انگریز افسروں اور (اُن کی تائید کرتے ہوئے) انگریز مؤرخین نے اُن کی توجیہ کر دی مثلاً:

چپاتیوں اور کنول کے پھول وغیرہ کی تقسیم کو ہندوستانیوں کی اوہام پرستی کا نتیجہ قرار دیا اور آٹے میں ہڈیوں کی راکھ ملا دینے کے الزام یا اس قسم کے اور پراپیگنڈوں کو جو بانیان کی تحریک کی طرف سے ملک میں پھیلائے گئے، اُن کو تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔

تنظیم کا اعتراف ونائک دامودر ساورکر غالباً سب سے پہلے مصنّف ہیں جنہوں نے انگریزی اثرات سے آزاد رہ کر اس تحریک کی تاریخ مرتب کی۔ آپکی رائے یہی ہے کہ خفیہ تنظیمات نے اس تحریک کی پرداخت کی تھی۔ آپ نے ایک مستقل باب میں خفیہ تنظیمات کا تذکرہ کیا ہے۔ آپ کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ:

دھوندو پنت نانا اور اُن کے مشیرِ خاص عظیم اللہ خاں نے اس تحریک کی داغ بیل ڈالی۔

عظیم اللہ خاں جو یورپ کا سفر کر چکے تھے اور روس پہنچ کر ایک میدانِ جنگ کا مشاہدہ بھی کر چکے تھے، اُنہوں نے بیرونی ممالک سے بھی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نانا صاحب نے اپنے خاص قاصد ہندوستان بھر میں بھیجے۔ بہت سے آدمیوں کو فقیروں، پنڈتوں اور سنیاسیوں کے بھیس میں ملک کے فوجی اور غیر فوجی حلقوں میں بھیجا۔ مسلمانوں کے لئے علماء کرام کا تعاون حاصل کیا۔"

ساورکر کی یہ رائے اُن واقعات پر مبنی ہے جو اس زمانہ میں ظہور پذیر ہوئے

Marfat.com

جن کا اقرار وہ بھی کرتے ہیں جنہیں خفیہ تنظیمات سے انکار ہے۔ مثلاً لارڈ رابرٹس نے لکھا ہے کہ عظیم اللہ خاں کے متعدد خطوط میں دو خط عمر پاشا کے نام تھے جو قسطنطنیہ کا ایک فوجی افسر تھا۔ نانا صاحب واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد لکھنؤ گئے، جہاں اُن کا پُرتپاک استقبال کیا گیا۔

میرٹھ میں ایک فقیر پہنچا۔ اُس کے ساتھ اُس کے پیرو بھی تھے اور سفر کے لئے ہاتھی گھوڑے اور بہت سی سواریاں تھیں۔ اُس کے ساتھ فوج کے سپاہی بھی جاتے رہتے تھے۔ پولیس کو اُس کے متعلق شُبہ ہوا، تو اس نے میرٹھ سے چلے جانے کا حکم دیا۔ وہ میرٹھ سے چلا گیا۔ مگر اپنے اثرات چھاؤنی کے سپاہیوں میں چھوڑ گیا۔

مدراس میں ایک برہمن پکڑا گیا۔ اُس کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ کیونکہ وُہ فوجوں کو اُکسا رہا تھا۔ علی گڈھ میں بغاوت کی آگ ایک برہمن کو پھانسی دینے سے بھڑکی۔ اُس کا جُرم بھی یہی تھا۔ جب اُس کو پھانسی دی جا چکی۔ تو ایک سپاہی نے پُکار کر کہا۔ یہ "دین" کی خاطر شہید ہوا۔ اس پر دوسروں کے جذبات بھڑک اُٹھے۔ یہاں تک کہ انگریز علی گڈھ سے فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"ہندوؤں کے پنڈت، مسلمانوں کے مولویوں کی نسبت انگریزوں سے عداوت کرنے میں کچھ کم نہیں تھے۔ کئی دفعہ انہوں نے پتروں کو دیکھ بھال کر لڑنے کی کی شُبھ مُہورت نکال کر تلنگوں کو بتلائے اور اُن کو یقین دلایا کہ ان میں اگر لڑنے جاؤ گے تو فتح پاؤ گے۔ ایک عجیب تماشا چاندنی چوک اور بازاروں میں یہ دیکھنے میں آتا تھا کہ پنڈتوں کے ہاتھ میں پوتھیاں ہیں اور وہ ہندوؤں کو دھرم شاستروں کے احکام سُنا رہے ہیں کہ انگریز ملکشوں سے لڑنا چاہئے

Marfat.com

جب لڑائیوں میں تلنگوں کی لاشیں چارپائیوں پر اُن کے سامنے آتیں تو وہ ہندوؤں کو اُپدیش دیتے کہ ان سُرگ باشیوں کی طرح سُرگ میں چلے جاؤ۔ جن کے لئے نہ ارتھی کی ضرورت ہے نہ کرم کریا کی۔ (تاریخ عروجِ عہدِ انگلیشیہ ص۶۷۶)

شمس العلماء پنڈتوں کے اس اشتعال کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ انگریزی تعلیم اور اُن قوانین سے جو متعدد رسومات کے متعلق وضع کئے جا چکے تھے پنڈتوں کے وقار اور اُن کی عزت و عظمت میں کمی آ رہی تھی۔ لیکن ظاہر ہے اس سے کسی تنظیم کی نفی نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ بانیانِ تنظیم نے پنڈتوں کے اس اشتعال سے فائدہ اُٹھا کر اُن کو آمادۂ کار کر دیا ہو۔

ان کے علاوہ آٹے میں ہڈیوں کی راکھ ملانے کا پراپیگنڈہ اور اس قسم کے اور واقعات ساور کر کے خیال کی تصدیق کرتے ہیں کہ ایک خفیہ تنظیم کام کر رہی تھی۔

جہادی تنظیم کے اثرات یہ ایک ایسی تنظیم کی بحث ہے جس کو ۱۸۵۷ء کی تحریک اور اس سلسلہ کے پراپیگنڈے کا ذمہ دار قرار دیا جا سکے۔ لیکن اس کے علاوہ ملک میں دو تنظیمیں اور تھیں جنہوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس تحریک کو مدد پہنچائی۔ مگر ان دونوں کا تعلق مسلمانوں کے علماء اور مذہبی طبقہ سے تھا جس کو بدقسمتی سے اس زمانہ میں وہابی کہا جاتا تھا، اور جہادِ آزادی کی مناسبت سے لفظ جہادی کا اور اضافہ کر دیا گیا تھا۔ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب اور دوسرے مؤرخین جگہ جگہ وہابی جہادیوں کا تذکرہ کرتے ہیں مثلاً شمس العلماء کا ارشاد ہے:

(۱) سو دو سو کے قریب وہابی جہادی بن کر ٹونک سے آئے۔

(۲) جے پور، ہانسی، حصار، بھوپال سے بھی جہادی آئے۔ تین چار سو جہادیوں کا مجمع ہو گیا۔

(۳) دہلی میں جب باغی سپاہ کے افسرِ اعلیٰ بخت خاں و غوث محمد خاں،

Marfat.com

و مولوی امام خاں رسالدار جمع ہوئے اور اُن کے ساتھ مولوی عبدالغفار اور مولوی سرفراز علی آئے، تو پھر وہابیوں کا اجتماع دہلی میں شروع ہوا، اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کے میر لشکر اور بخت خاں اس کا معاون ہوا۔[1]

(۴) الہ آباد سے مولوی لیاقت علی خاں جہادیوں کے سرغنہ کی عرضی آئی۔[2]

(۵) غلام معین الدین رسالدار نے بادشاہ کو عرضی دی کہ فدوی ٹونک سے تقریباً پانچ سو آدمیوں کے ساتھ آیا۔ اُن کو سپاہ کی صورت میں مرتب کیا۔ اور پندرہ سو اور جہادی غازی یا شہید بننے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔[3]

منشی جیون لال کے روزنامچہ میں بار بار جہادیوں کا ذکر آیا ہے مثلاً

۲۵ رجون ۱۸۵۷ء : گوڑگاؤں اور قرب و جوار کے دوسرے علاقوں سے چار سو مجاہدین دہلی میں آئے۔

۳۰ رجون ۱۸۵۷ء : پانچ سو مجاہد انگریزوں کے پاس سے ایک ہاتھی چھین کر لائے اور اُسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔

۲ رجولائی ۱۸۵۷ء : بخت خاں نے اطلاع دی کہ شہر کے باہر میں حسبِ ذیل فوج کے ساتھ لڑنے کی تیاری کر رہا ہوں۔

چار پیدل فوجیں۔ سات سو سوار۔ چھ بھاری توپیں جنہیں کھینچنے کیلئے گھوڑے استعمال کئے جاتے ہیں۔ تین میدانی توپیں۔ ایک سو مجاہدین۔

۹ رجولائی ۱۸۵۷ء : جنرل بخت خاں نے سواروں اور پیدل فوج کے سپاہیوں کے ساتھ انگریزی کیمپ میں گھس کر حملہ کیا اور بہت سے افسروں اور سپاہیوں کو

---

[1] تاریخ عروجِ عہد انگلیشیہ ص۶۷۵۔ [2] ایضاً ص۶۷۰۔ [3] ایضاً ص۶۸۶

Marfat.com

تہ تیغ کر دیا۔ کہتے ہیں، توپچیوں نے جنرل بخت خاں کو پہچان لیا۔ اس معرکہ میں جہادی بھی شریک تھے۔

۲۱ر جولائی ۱۸۵۷ء : ٹونک سے چھ مجاہد آئے اور آج بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ اُنہوں نے اطلاع دی کہ ابھی دو ہزار مجاہد اور آنے والے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ میرے پاس تم لوگوں کے رسد کا انتظام نہیں ہے۔

۲۴ر جولائی ۱۸۵۷ء : نجیب آباد سے تقریباً دو سو جہادی آئے اور شہر کے باہر قیام پذیر ہوئے۔

۳۱ر جولائی ۱۸۵۷ء : جہادیوں کا ایک قائدِ اعظم ٹونک سے آیا اور بادشاہ کی خدمت میں نذر پیش کی۔

۳۱ر جولائی ۱۸۵۷ء : میر فیاض علی نے معروضہ پیش کیا کہ جہادی بھوکے مر رہے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ انہیں کھلانے کے لئے میرے پاس روپیہ نہیں رہا فیاض نے کہا۔ شہر والوں کو حکم دیجئے کہ وہ اُن کے کھانے کا بندوبست کریں۔

۳ر اگست : نصیر آباد سے چند جہادیوں کا معروضہ موصول ہوا کہ چھ ہزار سپاہی ایک دل ایک جان ہو رہے ہیں۔

۵ر اگست : جہادیوں نے شکایت کی کہ صرف ہم ہی ایسے ہیں جو انگریزوں سے نہایت جوشش کے ساتھ لڑتے ہیں، اور فوج کے آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔

۹ر اگست : مولوی صدرالدین خاں کے مکان پر آج پچاس سپاہیوں نے یورش کر دی لیکن یہ دیکھ کر کہ وہاں ۷۰ جہادی مقابلہ کیلئے تیار ہیں، واپس ہو گئے۔

۲۰ر اگست : محمد میر خاں کے صاحبزادے بڈھن نے آج جہادیوں میں دو ہزار روپے کی رقم تقسیم کی۔

۲ر ستمبر : خبر ملی کہ چند ہزار جہادی مولوی جلال الدین کی سرکردگی میں کھلے

Marfat.com

میدان میں لڑنے کے لئے نکلے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی اور ان کے کئی سو ساتھی مارے گئے۔

۱۴ ستمبر : گوروں اور سکھوں کی فوج ہمت کر کے جامع مسجد پہنچ گئی۔ جامع مسجد میں پردیسی مسلمان جمع تھے۔ انہوں نے انگریزوں پر حملہ کیا اور اُن کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ (اس واقعہ کی تفصیل آئندہ آئے گی۔ انشاء اللہ)۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے جن میں جہادی مجاہدین یا وہابی جہادی کے الفاظ آئے ہیں، ثابت ہوتا ہے :

(۱) دہلی کے بھی کچھ مسلمان ایسے تھے جن کو وہابی جہادی کہا جا سکتا تھا۔

(۲) باہر سے جہادیوں کی آمد ۲۵ جون سے شروع ہوئی۔

(۳) ان کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

(۴) بادشاہ نے ان کے مصارف کی ذمہ داری نہیں لی۔

(۵) یہ وہابی جہادی مولانا مفتی صدر الدین صاحب سے خاص تعلق رکھتے تھے، یہاں تک کہ اُن کی حمایت و حفاظت میں لڑنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

(۶) یہ جہادی زیادہ تر گوڑگانوہ کے قرب و جوار ہانسی، حصار نیز جے پور، بھوپال، نصیر آباد، نجیب آباد اور ٹونک سے آئے تھے۔

ان اقتباسات اور ان کے نتائج ملاحظہ کرنے کے بعد دو باتیں قابلِ توجہ ہیں۔

(۱) مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ اب آپ اس طرف توجہ فرمائیے کہ جب مولانا موصوف ہجرت کر کے سندھ تشریف لے گئے تو آپ نے کہاں کہاں قیام فرمایا تھا۔

پہلے گذر چکا ہے کہ مکان سے روانہ ہو کر عرب سرائے میں قیام رہا۔ پھر آپ ریواڑی تشریف لے گئے۔ عید الاضحیٰ کی نماز آپ نے ریواڑی میں ادا کی۔ ایک ہفتہ سے زیادہ قیام فرما کر ۱۵ ذی الحجہ کو یہاں سے روانہ ہوئے۔ یہی علاقہ ہے جس کو گوڑگانوہ کے قرب و جوار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ہانسی، حصار اور رہتک بھی اسی

Marfat.com

علاقہ کے خاص خاص مقامات ہیں۔

حضرت مولانا نصیر الدین صاحب کے راستہ کی منزلوں میں جے پور، ٹونک اور حمیر کے نام بھی خاص طور پر ذکر کئے گئے ہیں۔ جے پور میں ایک ہفتہ اور اس سے بھی زیادہ ٹونک میں قیام رہا۔ یہاں کے قیام کی مختصر روئداد یہ ہے۔

نواب وزیر الدولہ (فرماں روائے ٹونک) نے اعلےٰ پیمانہ پر مہمان داری کی۔ ایک روز دعوت میں اپنے اعزہ و اقارب، عمائدین ریاست اور بہت سے احباب کو شریک کیا۔ پھر سب نے صفیں باندھ کر مولانا سید نصیر الدین صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اس موقع پر (والئے ٹونک) نواب وزیر الدولہ نے فرمایا۔ حضرت امیر المومنین (حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ) ٹونک تشریف لائے تھے، تو میں تحصیل علوم سے فارغ نہیں ہوا تھا۔ آپ تشریف لے گئے۔ مجھے ہوش آیا تو اپنی محرومی پر حد درجہ افسوس ہوا۔ میں نے بہت سے درویشوں کو دیکھا، جو فیض سید صاحب سے پایا، وہ کسی دوسری جگہ سے حاصل نہیں ہوا۔ مولانا سید نصیر الدین صاحب میں اسی فیض کا پرتو نظر آتا ہے۔

مولانا سید نصیر الدین صاحب ٹونک سے روانہ ہوئے تو بہت سے اسلحہ، باربرداری کی سواریاں، اونٹ، خچر اور اعلیٰ قسم کے متعدد گھوڑے پیش کئے گئے۔

یہی ٹونک ہے جہاں سے مجاہدین کی آمد کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد دو ہزار یا دو ہزار سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

نصیر آباد، جہاں سے ایک فوج باغی ہو کر پہلے پہنچ چکی

Marfat.com

ہے اور چھ ہزار مجاہدین بادشاہ کی اجازت کے منتظر بیٹھے ہیں۔

یہاں حضرت مولانا سیّد نصیر الدّین صاحب یا اُن کے شیخ حضرت سیّد احمد شہید نہیں تشریف لے جاسکے، اور غالباً اس علاقہ میں جانا ممکن بھی نہیں تھا کیونکہ یہ تمام علاقہ فوجی تھا۔ البتہ اس کے مرکزی شہر "اجمیر شریف میں حضرت مولانا سیّد نصیر الدین صاحب نے ایک مہینہ کے قریب قیام فرمایا تھا۔

ان تفصیلات کے بعد اس دَور کی تاریخ کے دقیق النظر محقق و مبصّر حضرت مولانا عبید اللہ سندھی قدس اللہ سرہ العزیز کے مختصر ارشادات ملاحظہ فرمائیے۔ اپنی مشہور تصنیف "شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک" میں فرماتے ہیں۔

"الصدر الحمید (مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب) مکّہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا مملوک علی صاحب کی صدارت میں مولانا قطب الدّین دہلوی مولانا مظفر حسین کاندھلوی، مولانا عبد الغنی دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنا دیا، جو اس نئے پروگرام کی اشاعت کر کے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے گا۔ ص۱۸۱

مولانا مملوک علی[1] سرکاری مدرسہ کے ملازم تھے، اُن کی نگرانی میں یہ کام شبہات سے بالا رہ کر چل سکتا تھا۔ ورنہ ریزیڈنٹ کی نظر نہایت تیز تھی۔ اب مولانا مملوک علی صاحب کو آزاد کام کرنے والے ساتھیوں کی ضرورت تھی۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت شاہ اسحاق صاحب کے مدرسہ کے پُرانے طالب علم اور اُن کے (شاہ اسحاق صاحب کے) داماد مولانا سیّد نصیر الدین صاحب

---

[1] توفی الشیخ ۱۲۶۷ھ و دفن فی مقبرۃ الامام ولی اللہ الدہلوی۔ سیاسی تحریک ص۱۸۲

Marfat.com

کے شاگرد تھے۔ اُن کی طبیعت عالمانہ رنگ کی نہ تھی۔ امیر شہید (حضرت سیّد احمد صاحب شہید) سے ملتی جلتی طبیعت رکھتے تھے۔ اس لئے وہ سیّد صاحب کا نمونہ تھے۔ مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد اُن کے ساتھ اس طرح کام کرتے رہے جیسے امیر شہید کے ساتھ مولانا عبدالحیؒ اور مولانا شہید (مولانا اسمٰعیل صاحب) تھے۔ ص۱۸۲

اس جماعت کی صدارت سب سے پہلے استاذ اساتذۃ الہند مولانا مملوک علی صدر مدرّس دہلی کالج کے لئے مخصوص رہی۔ اُن کے بعد مولانا محمد اسحٰق صاحب نے (جو بقول مولانا سندھی مکّہ معظمہ میں بیٹھ کر ہندوستانی تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے ص۱۸۴) مولانا امداد اللہ کو اس کام کے لئے مقرّر کیا۔ ص۱۸۴

یہ دہلوی جماعت اس وقت تک اپنے گھر میں کام کرتی رہی جب تک دہلی کا شاہی اقتدار بحال رہا۔ ص۱۸۵

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے دیوبندی نظام کی حقیقت اور اُسکی سیاسی مصلحت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ اشارات کئے ہیں۔ اس لئے اُنہوں نے صرف وہی نام یہاں ذکر کئے ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے بانی اور معمار تھے، اور اس بنا پر یہ واضح نہ ہو سکا کہ دوسرے مقامات کے جن علما کرام نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصّہ لیا، اُن کا تعلّق حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ یا اس نظام سے کیا تھا۔ لیکن اتنی بات واضح ہے کہ جن علما کرام نے اس تحریک میں حصّہ لیا اُن میں سے اکثر و بیشتر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرّہ العزیز یا حضرت سیّد احمد شہیدؒ سے عقیدت یا تلمذ کا رابطہ رکھتے تھے۔

مثلاً مولانا سرفراز علی صاحب جن کو ذکاء اللہ خاں صاحب نے بخت خاں کا سرپرست و مُربّی قرار دیا ہے، جو امیرِ جہاد بنائے گئے تھے۔ حضرت سیّد احمد شہیدؒ

Marfat.com

کی تحریک کے داعی تھے۔ ایک عرصہ سے گورکھ پور کے اطراف میں انگریزوں کے خلاف خفیہ طور پر بیعتِ جہاد لے رہے تھے۔[1]

مولانا لیاقت علی صاحب جن کو الہ آباد کا امیر اور گورنر بنایا گیا تھا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بالواسطہ تلمذ رکھتے تھے۔

اسی طرح مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین صاحب، مولانا پیر محمد صاحب (پٹنہ) مولانا فیض احمد صاحب فیض اور دوسرے سربرآوردہ علماء مجاہدین حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز یا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب یا حضرت سید احمد صاحب شہید یا مولانا نصیرالدین صاحب سے رابطہ اور تعلق قائم کئے ہوئے تھے (تفصیلات کتاب کے دوسرے جزء میں ملاحظہ فرمائیے)۔

بہرحال یہ ایک تنظیم تھی جس کے اثرات دُور دُور پھیلے ہوئے تھے۔ یہ ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت کی محرک تو نہیں تھی لیکن تحریک شروع ہونے کے بعد جان کی بازی لگا کر اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کے اکثر افراد شہید ہو گئے جو باقی بچے وہ ہجرت پر مجبور ہوئے۔ ورنہ حبسِ دوام اور قید و بند کی سُنّتِ یوسفی پر عمل کرنے کے بعد ابدی سرفرازی حاصل کی۔

دوسری تنظیم | جو اس تحریک کے زمانہ میں موجود تھی، وہ تنظیم ہے جس کو وہابی تحریک کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے جس کا مرکز "صادق پور" تھا۔ یہ تنظیم بحیثیت تنظیم تحریک سے الگ رہی۔ بلکہ اگر مولانا عبدالرحیم صاحب مصنف "الدر المنثور" کا قول صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ تنظیم ۱۸۵۷ء کی تحریک کی مخالف رہی۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کے کچھ افراد نے انفرادی طور پر اس تحریک میں حصہ لیا اور یہ تنظیم بحیثیت تنظیم ہندوستان میں نہیں تو اُس کی سرحد پر وہ سب کچھ کرتی رہی جو انقلابی فوجوں نے ہندوستان کے اندر کیا۔ تفصیلات شاندار ماضی کی تیسری جلد میں بیان کی جا چکی ہیں، جو قابلِ مطالعہ ہیں

[1] ابوظفر بہادر شاہ از مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی ص۴۱۔

Marfat.com

یہاں صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ جب جانبازانِ حریت حدودِ ہند میں چپہ چپہ کو خونِ شہادت کا لالہ زار بنا رہے تھے تو خاص اُس وقت یا اس سے کچھ پہلے اور بہت بعد تک اس تنظیم کے سرفروش مجاہد کس طرح اپنی قربانیاں پیش کرتے رہے۔ مسلمانانِ ہند کی سیاسیات کے ریسرچ ڈاکٹر ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر کا ارشاد ہے۔

"میں اُن بے عزتیوں، حملوں اور قتل و غارت کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا جو ۱۸۵۶ء میں سرحدی جنگ کا باعث ہوئے۔ اس دوران میں مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اُکسائے رکھا۔ ایک ہی بات سے حالات کا بڑی حد تک اندازہ ہو جائے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ سولہ فوجی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے۔ جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد ۳۵ ہزار ہو گئی تھی اور ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۰ء تک ان فوجی مہموں کی گنتی بیس تک پہنچ گئی تھی۔ اور باقاعدہ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تک ہو گئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔ اس اثناء میں ستیانہ کیمپ جو ہر وقت ہمارے خلاف سرحد میں تعصب کے جذبات کو اُبھارتا رہتا تھا، نہایت عقل مندی سے ہماری فوج کے ساتھ براہِ راست مقابلہ کرنے سے گریز کرتا رہا۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں اُنہوں نے ہمارے خلاف عام اتحاد کی بنا ڈالی۔ جس میں قبیلہ یوسف زئی اور قبیلہ پنج تار نے خاص طور پر حصہ لیا۔ اس سال ان لوگوں نے یہاں تک گستاخانہ دلیری سے کام لیا کہ اس علاقہ میں معین سرکاری افسران سے تخویف مجرمانہ میں مدد کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ انکار کرنے پر وہ اس قدر برانگیختہ ہو گئے کہ ہمارے علاقہ پر چڑھ دوڑے اور لفٹننٹ

Marfat.com

ہوآن کے کیمپ پر شب خون مارا جو اس علاقہ کا اسسٹنٹ کمشنر تھا اور اُس نے بڑی مشکل سے جان بچائی۔ اب ہمارے لئے زیادہ دیر کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ سر سٹنی کوٹن پانچ ہزار فوج کی معیت میں پہاڑی علاقہ میں داخل ہوا۔ الخ۔ (ماخوذ از ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے شاندار ماضی جلد سوم)۔

بہرحال اس تنظیم سے تعلق رکھنے والے مجاہدین نے جو کچھ قربانیاں پیش کیں وہ اپنی جگہ قابلِ قدر اور واجب الاحترام ہیں۔ مگر یہاں بحث ان مجاہدین سے ہے، جنہوں نے اندرونِ ہند تحریک میں حصہ لیا بالخصوص وہ مجاہدین ذی احترام جو محاذ دہلی پر شہید ہوئے۔ آئندہ صفحات میں اُن کے متعلق کچھ تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

وہابی مجاہدین کا کردار، اور شانِ جانبازی

یادش بخیر، سر سید احمد خاں صاحب کا بیان ملاحظہ فرمایئے:

"اس زمانہ میں جن لوگوں نے جھنڈا جہاد کا بلند کیا، ایسے خراب اور بدرویہ اور بداطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ و رنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ اُن کا نہ تھا۔[1]

چند بدذاتوں نے دُنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پُورے کرنے کو اور جاہلوں کو بہکانے اور اپنے ساتھ جمعیت جمع کرنے کو جہاد کا نام لے دیا۔[2]

پھر یہ بات بھی مفسدوں کی حرمزدگی تھی نہ واقع میں جہاد۔[3]

یہ دہلی کے علمبردارانِ حریت کے متعلق ارشاد ہے۔ کیونکہ دہلی کے علاوہ اور مقامات کے محبانِ آزادی کے متعلق ایک سطر اُوپر یہ گوہر فشانی ہو چکی ہے:

---

[1] اسبابِ بغاوتِ ہند ص۸۔ [2] ایضاً ص۸۔ [3] ایضاً

Marfat.com

"اور یہ جو ہر ضلع میں پاجی اور جاہلوں کی طرف سے جہاد کا نام ہوا، الخ[1]

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب کا ارشاد ہے:

"یہ کام لچے شہدے مسلمانوں کا تھا کہ وہ جہاد جہاد پکارتے پھرتے تھے"[2]

محبانِ حریت اور کشتگانِ خنجرِ آزادی کے لئے جو الفاظ بلا استثناء ان نامورانِ قوم نے استعمال فرمائے ہیں، ممکن ہے سر اور شمس العلماء جیسے خطابات کی تمنائیں اس کے بغیر پوری نہ ہوتی ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طرز و انداز نہ صرف ان کی عزت و عظمت کے لئے بلکہ دہلی مرحوم کی روایتی تہذیب و شرافت کے لحاظ سے بھی باعثِ ننگ و عار ہے۔ یہ دونوں صاحب اسی شہر دہلی کے رہنے والے ہیں جو آج کچھ بھی ہو، مگر اُس زمانہ میں ادبِ اُردو کا قلعۂ معلّٰی تھا۔ کیا ادبِ اُردو کی متانت و سنجیدگی اس بے ادبی کو برداشت کر سکتی ہے؟

الفاظ کی کراہت و نکارت سے قطع نظر، حقیقت کا جائزہ لیا جائے، تو واقعات کا دامن ان الزامات سے سرتاپا پاک ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

بے شک اتنی بات صحیح ہے کہ بقول حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی، رحمۃ اللہ اس تحریک میں ایسے ناتجربہ کار سامنے آگئے تھے جن کی پوری زندگی عیش و عشرت میں گذری تھی۔ جن میں نہ ہمت و جرأت تھی، نہ استقلال و استقامت۔ غور و فکر و اصابتِ رائے سے محروم تھے اور ہر قسم کی نااہلیت کے ساتھ سب سے بڑی اہلیت یہ رکھتے تھے کہ بادشاہ سے اُن کا کوئی رشتہ تھا، اور یہ بھی صحیح ہے کہ

---

[1] اسبابِ بغاوتِ ہند ص۸۔ [2] تاریخ عروجِ عہدِ انگلیشیہ ص۶۷۶۔

Marfat.com

یہی نااہل و ناتجربہ کار جن کی بدکرداریوں کے باعث[1] ہلاکت و بربادی ان کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔ اس پوری تحریک کی ناکامی کا سبب بنے۔ مگر اُن کی طرف لفظ جہاد کا انتساب نہ صرف لفظ جہاد کی توہین ہے بلکہ حق و صداقت کی ایسی پردہ پوشی ہے جس کو فنِ تاریخ کی حقیقت پسندی ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں کر سکتی۔

یہ لوگ جہاد کا جھنڈا تو کیا بلند کرتے، جو "علمبرداران جہاد" تھے، خود سر سید صاحب اسی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ وہ مجاہدین اُن کو بہت بُرا سمجھتے تھے۔ شمس العلماء کا ارشاد ہے کہ وہ ان کو خولہ خبط جانتے تھے۔

ستم رسیدہ فوجیں جنہوں نے اپنی اپنی چھاؤنیوں میں انقلاب برپا کر کے دہلی کا رُخ کیا، یا اپنی ہی جگہ جنگِ آزادی میں مصروف ہو گئیں، ان کی قربانیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اور جس بے جگری کے ساتھ عواقب و نتائج سے بے ہو کر عوام نے اُن فوجیوں کا ساتھ دیا، اور جس طرح ہر قسم کی تباہی اور بربادی کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا، عوامی تحریکات کی تاریخ میں وہ بھی ایک انوکھی اور نادر مثال ہے جس کی نظیر تاریخِ عالم میں بہت کم ملتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن کو وہابی جہادی کہا جاتا ہے وہ ان سب سے ممتاز گروہ ہے۔

پہلے باب میں تنظیم کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ تو بتایا جا چکا ہے کہ دہلی کے اصل باشندوں کی تعداد بقول شمس العلماء تقریباً دو سو تھی۔ یہ سرفروش و جانباز زیادہ تر بیرون جات سے آئے ہوئے تھے۔ جن میں "ٹونک" کو یہ خاص شرف حاصل تھا

---

[1] شاہی خاندان کی بدکرداری جو اس درجہ رسوائے عالم ہو چکی تھی کہ بقول شمس العلماء ذکاء اللہ خاں مشرق میں جس قدر برائیاں ہیں وہ سب اس قلعہ میں موجود تھیں۔ شہر کے مقدس اور متبرک آدمی کہا کرتے تھے کہ اگر کسی مکان میں قلعہ کی اینٹ بھی لگ جائے تو اس میں رہنا حرام ہے (تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۳۶۹) جب اس بدکرداری پر نظر پڑتی ہے تو فوراً قرآن پاک کی آیت ذہن میں آجاتی ہے۔ واذا اردنا ان نھلك قریة الخ

Marfat.com

کہ وہاں سے کم و بیش دو ہزار آئے تھے۔

اس باب میں اُن کے کردار پر روشنی ڈالنی مقصود ہے۔ سب سے پہلے وجہ تسمیہ معلوم کر لیجئے، وہ خود ایک روشنی ہے جس میں ان جانبازانِ صداقت کے نُورانی چہرے صاف نظر آتے ہیں۔

وہابی شاندار ماضی جلد دوم میں بہت تفصیل سے واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ لفظ سب سے پہلے برطانوی پولٹیکل ایجنٹوں اور ڈپلومیٹک ایجنسیوں نے حضرت سیّد احمد صاحب شہید، حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اور اُن کے ساتھیوں کے لئے استعمال کیا تھا اور اسی کی غیر معمولی تاثیر سے آزاد قبائل کے سادہ لوح پٹھانوں کو مشتعل کر کے حضرت سیّد صاحب کے ہزاروں ساتھیوں کو ان کے ہاتھوں اچانک شہید کرا دیا تھا۔ یہ ۱۸۳۰ء کا واقعہ تھا۔ ستائیس سال کے عرصہ میں اس لفظ کی اصطلاح میں عجیب و غریب انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب عرفِ عام میں اس کے معنی ہو گئے "پابندِ شریعت"۔

اس بارہ میں شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب سے بڑھ کر کس کی شہادت معتبر ہو سکتی ہے۔ شاہزادہ ولی عہد سابق مرزا فخر الدین کی ولی عہدی کا قصہ بیان کرتے ہوئے شمس العلماء فرماتے ہیں:

> "مرزا فخر الدین اپنے مذہب کا بڑا پابند تھا۔ اُس نے اپنا ختنہ کرایا تھا۔ شہزادے اُس کو متشرّع (پابندِ شریعت) ہونے کے سبب سے وہابی کہتے تھے"۔[1]

یہ وہابی کی تشریح تھی۔ اب لفظ جہادی کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے۔

مجاہد یا جہادی یعنی "رضاکار"۔ تشریح یہ ہے کہ نہ وہ وہ پیشہ ور سپاہی تھے، نہ تنخواہ دار فوجی۔ نہ اُن کے پیشِ نظر ملازمت تھی نہ بادشاہی تقرب۔ وہ اس

---

[1] تاریخِ عروجِ عہدِ انگلیشیہ ص ۳۷۸

Marfat.com

جنگ کو ایک مذہبی فرض سمجھ کر اس عزم کے ساتھ آئے تھے کہ :

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

جیسا کہ غلام معین الدین رسالدار نے بادشاہ سے کہا تھا :

"فدوی ٹونک سے تقریباً پانچ سو آدمیوں کے ساتھ آیا ہے۔ پندرہ سو اور جہادی غازی یا شہید بننے کے لئے جمع ہوئے ہیں"۔

یعنی اگر وہ زندہ رہے تو غازی فی سبیل اللہ، اور مر گئے تو شہید فی سبیل اللہ۔

اسی دور کے مجاہدِ جلیل حضرت مولانا لیاقت علی صاحب نے فرمایا تھا :

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمعِ بلاد
اہلِ اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد

مال و اولاد کی اور گھر کی محبت چھوڑو — راہِ مولیٰ میں خوشی ہو کے شتابی دوڑو
گر پھرے جیتے تو گھر بار میں پھر آؤ گے — اور گئے مارے تو جنت کو چلے جاؤ گے[1]

اقبال نے انہیں کے متعلق کہا ہے :

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے — جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ فدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ اُن کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو — عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

کردار کے چند آثار و نشانات | حضرات مؤرخین معاف فرمائیں، اقتدار پرستی کو شجرِ ممنوع قرار دینے کے باوجود تحریر و تفصیل کے دامن اسی کی شاخوں اور کونپلوں میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ بادشاہ اور اُس کے حواریوں کی تو نقل و حرکت تک قلم بند ہے۔ مگر مجاہدین باخلاص کے نام اور حسب نسب

[1] تاریخ بغاوت ہند ص ۳۰۰

Marfat.com

تو درکنار کسی مجبوری سے ان کے کردار کا تذکرہ کرنا پڑا ہے، تو اس طرح کہ گویا روشنائی خشک ہوگئی اور جنبشِ قلم پر لرزہ طاری ہوگیا ہے۔ بہرحال انہیں مُنتشر جملوں اور بہکے بہکے فقروں سے مطلب کی باتیں سمجھنی ہیں۔ اب غور فرمایئے۔

استحصال بالجبر سے اجتناب، فاقہ منظور منشی جیون لال اور منشی ذکاء اللہ (شمس العلماء) دونوں مجاہدین کے مخالف ہیں۔ دونوں نے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر دونوں کے اندازِ بیان جُدا جُدا ہیں۔ منشی جیون لال نے ۳۱ر جولائی کے روزنامچہ میں لکھا ہے:

> میر فیاض علی نے معروضہ پیش کیا کہ جہادی بھوکے مر رہے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ انہیں کھلانے کے لئے میرے پاس روپیہ نہیں رہا۔ فیاض نے کہا کہ شہر والوں کو حُکم دیجئے کہ وہ اُن کے کھانے کا بندوبست کریں۔ بادشاہ نے اس تجویز کو پسند کیا۔

اب منشی ذکاء اللہ خاں صاحب کا توہین آمیز اور دل خراش بیان ملاحظہ فرمایئے۔

> اکثر جہادی بھُوکے مرتے تھے۔ اُن کے بدن پر کپڑے بھی ثابت نہیں تھے۔ مگر بغل میں تلوار یا کمر میں خنجر یا کندھے پر توڑے دار بندوق ضرور تھی۔ بادشاہ سے یہ جہادی فریاد کرتے کہ بھُوکے مرتے ہیں تو وہ کہہ دیتا کہ خزانہ میں روپیہ نہیں۔ مگر اُس نے اُن کے لئے یہ انتظام کرا دیا کہ اہلِ شہر خیرات کی روٹیاں کھلایا کریں، اور ثواب کمایا کریں نواب محی الدّین خاں عرف بڈھے خاں نے اُن کو دو ہزار روپے[1] دیئے۔

(۱) اندازِ بیان کے تفاوت کے علاوہ دونوں بیانوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ منشی ذکاء اللہ خاں نے ان پاک باز و پاک طینت بزرگوں کو بادشاہ کی خدمت میں بھوک کی خاطر فریادی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ مگر وقائع نگار منشی جیون لال کی درج روزنامچہ اطّلاع یہ ہے کہ خوراک کا مطالبہ خود ان جہادیوں نے نہیں کیا

---

[1] تاریخ عروجِ عہد انگلیشیہ ص ۶۷۵

Marfat.com

تھا، بلکہ ایک صاحبِ خیر، میر فیاض علی صاحب نے بادشاہ کو توجّہ دلائی تھی جس پر بادشاہ نے تہی دستی کی معذرت کر دی، اور پھر میر فیاض علی کی اس تجویز پر کہ "شہر والوں کو اُن کی امداد کی طرف متوجہ کیا جائے" پسندیدگی کا اظہار کیا اور بظاہر عمل بھی کر لیا۔ جس کے نتیجہ میں اہلِ شہر نے اُن کی امداد شروع کی۔ حتیٰ کہ نواب محی الدّین عرف بڈھے خاں نے دو ہزار روپے دیئے۔

(۲) بہرحال یہ تو شمس العلماء کے نزدیک بھی مسلّم ہے کہ جس طرح اور فوجی تنخواہوں کے لئے طوفان برپا کرتے رہتے تھے، ان جہادیوں نے تنخواہ یا روزینہ کی فریاد نہیں کی۔ صرف "بھوکے مرنے کی فریاد کی" اور وہ بھی ۳۱ر جولائی کو جبکہ اُن کے پاس اپنا اندوختہ ختم ہو گیا تھا اور دہلی میں ایک طرح کا قحط رونما تھا۔

(۳) بادشاہ کا عذر اور میر فیاض علی صاحب کی تجویز بھی قابلِ توجّہ ہے۔ فوجیوں کی تنخواہ کا مطالبہ ہوتا تھا تو بادشاہ جنرل بخت خاں یا مرزا مغل وغیرہ کے حوالہ کر دیا کرتے تھے کہ وہ انتظام کریں۔ لیکن جہادیوں کی خوراک کا معاملہ کسی گورنر یا جرنیل کے حوالہ نہیں کیا جا رہا۔

یہی ایک اہم نکتہ ہے جس سے ان مجاہدین کا کردار نمایاں ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ پیشہ ور فوجیوں کے سامنے حلال و حرام کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ بالخصوص زمانۂ جنگ میں وہ ہر مال کو جو اُن کے سامنے آ جائے جائز سمجھتے ہیں۔

یہ تو بہت پُرانی بات ہے کہ شاہ سبکتگین[1] کے فوجیوں نے کچھ مرغیاں پکڑ لیں تو حکم دے دیا کہ اُن کے کان چھید دیئے جائیں مگر جب سے مغربی تہذیب کا آفتابِ سیاہ طلوع ہوا ہے، ان روایاتِ کہنہ کی تاریخی ختم ہو گئی ہے۔ نئی روشنی نے فوجیوں کے اختیارات میں بے پناہ وسعت پیدا کر دی ہے۔ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ یورپ کی اسی جنگِ عظیم کے دوران میں (جو ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک دنیا میں بموں

---

[1] سلطان محمود غزنوی کے باپ۔

Marfat.com

کی بارش برساتی رہی تھی) ہم نے خود دیکھا ہے کہ اس مہذب اور متمدن زمانہ کی تربیت یافتہ فوجیں جب سفر کرتی تھیں تو اسپیشل کی آمد کی خبر سُنتے ہی اسٹیشن کے تمام اسٹال بند ہو جاتے تھے اور خوانچے والے اپنے خوانچے لے کر باہر بھاگ جاتے تھے کیونکہ فوجیوں کی بے تکلفی کے سامنے نہ اُن کے خوانچے باقی رہ سکتے تھے اور نہ اسٹالیں محفوظ رہ سکتی تھیں۔

اور اس سے پہلے زمانۂ امن میں جب ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی میں تبدیل ہونے والی فوجیں پا پیادہ مارچ کیا کرتی تھیں تو دیہات کے باشندے اپنے بیل اور چھکڑے تو اس لئے چھپا دیتے تھے کہ اُن کو بیگار کا خوف رہتا تھا، جو صحیح ہوا کرتا تھا، ساتھ ہی قیمتی سامان اور جوان عورتوں کو بھی چھپا دیا کرتے تھے، کیونکہ فوجوں کے ذوقِ غارت گری و عصمت دری کے سامنے نہ کسی کے مال کی کوئی وقعت و حرمت ہوتی، نہ کسی کی عزّت و عصمت کی۔

دہلی میں آنے والی انقلابی فوجوں کی لُوٹ مار کے جو قصّے بیان کئے جاتے ہیں، اُن کو مبالغہ سے پاک کر لیا جائے تب بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جس طرح انگریزی فوجوں نے قہر و جبر سے روپیہ وصول کیا۔ انقلابی فوجوں کا دامن بھی اس سے پاک نہیں رہا۔ مگر یہ جہادی صرف اس مال کو حلال اور جائز سمجھ سکتے تھے جو غنیم سے میدانِ جنگ میں حاصل کیا گیا ہو۔ لیکن وہ مال جو خود اپنی رعایا سے جبراً و قہراً حاصل کیا گیا ہو، اُس کے مقابلہ میں فاقہ کشی اور بھوکے مر جانے کو ہزار درجہ غنیمت جانتے تھے۔

راہِ خدا میں جان کھپا دینا اُن کا نصب العین تھا، وہ دشمن کی گولی سے ہو یا فاقہ اور بھوک سے۔ لیکن جن کو دشمن سے بچانے کے لئے نکلے تھے، اُنہیں کو نوچنا اُن کے بلند اور اعلیٰ نصب العین کے لحاظ سے خودکشی کے ہم معنی تھا۔ بادشاہ اُن سے خواہ کتنا ہی ناراض ہو کہ یہ لوگ اس کو بدعتی سمجھتے تھے اور آئندہ بھی توقع نہیں تھی کہ وہ بہادر شاہ کی ذات کے ہوا خواہ بن کر رہیں گے مگر اُن کے

Marfat.com

احساس کی نزاکتوں کو وہ سمجھتا تھا۔ اسی بنا پر اُس نے اُن معاملہ نہ کسی شہزادے کے سپرد کیا کہ اُن پر غبن وخیانت کے الزامات پہلے ہی سے لگے ہوئے تھے اور کسی جرنیل اور کرنیل کو بھی اُن کے لئے انتظام کا حکم نہیں دیا کیونکہ وہ استحصال بالجبر سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔

باقی رہا شاہی خزانہ تو اس کی بھی تمام رقمیں جہادیوں کی شرائط کے بموجب قابلِ استعمال نہیں تھیں۔ لہٰذا بادشاہ نے بلا رو رعایت روکھا جواب دے دیا۔ ذکاء اللہ خاں صاحب اس پر طنز کر رہے ہیں۔ حالانکہ صاحب نظر کے نزدیک بھی یہ بات قابلِ قدر ہے۔

چشم حسود کہ بر کندہ باد

عیب نماید شش ہنرم در نظر

البتہ میر فیاض علی صاحب نے جو تجویز پیش کی، وہ ان حضرات کے لئے قابلِ قبول تھی۔ کیونکہ بقول منشی ذکاء اللہ خاں خیرات ہی کی روٹیاں سہی، مگر برضا و رغبت اور بخوشنودی تمام ہوں تو جبر و قہر اور لوٹ مار کے پلاؤ قورمے سے خیرات کی سوکھی روٹی ہزار درجہ بہتر ہے۔

مختصر یہ کہ ان غازیانِ دین اور مجاہدین فی سبیل اللہ نے یہ کسی طرح پسند نہیں کیا کہ کسی طرح سے جبر و قہر اور ظلم و جور سے کچھ حاصل کریں۔ البتہ یہ شکل اُن کے لئے ناقابلِ برداشت تھی کہ لوگ فی سبیل اللہ خود اپنی طرف سے اُن کے کھانے کا انتظام کریں۔

جنگ جو بہادروں کے لئے رسد کی یہ مثال بالکل نئی تھی۔ تاریخ میں اس کی کوئی نظیر ملنی بہت مشکل ہے مگر اس سے ان حضرات کے نظریات کی پاکیزگی اور اہل شہر کی ہمدردیاں ثابت ہوئی ہیں وہ یاد رکھنے کی بات ہے۔

Marfat.com

جذباتِ ایثار کی سرمستیاں

ذوقِ فنا اور جذبۂ فداکاری کی یہ عجیب و غریب تاثیر ملاحظہ ہو کہ ظالمانہ انتقام کی تیز نفسی نے اعضاء بدن کو چکنا چور کیا۔ فاتحانہ رعونت کی ستم نوازیوں نے گدھوں اور چیلوں کے نوچے ہوئے ڈھانچوں کو دریا برد کیا تو صفحاتِ تاریخ نے بھی بے سوچے سمجھے خونِ شہادت کے ان پاک دھبوں کو اپنے دامنوں سے کھرچ دیا تاکہ فنانیت مکمّل ہو جائے۔

عُریانی تن بود غبارِ رہِ دوست
آں نیز بہ تیغ از سرم وا کردند

ہاں کہیں کہیں کچھ نشانات باقی ہیں جن کو ان سطروں میں سے پھر اُجاگر کیا جا رہا ہے۔

کم و بیش چار ہزار مجاہدین جو ٹونک، اجمیر، جے پور، بھوپال، ہانسی حصار اطرافِ گوڑگانوہ اور خود دہلی کے گلی کوچوں سے اکٹھے ہو گئے تھے کہاں گئے؟ دیکھو کچھ نشانات ملتے ہیں، شاید وہ انہیں کے نقشِ پا ہیں۔

منشی جیون لال کے روزنامچہ کے اقتباسات پہلے گذر چکے ہیں۔ اُن میں سے چند سطریں دُہرائی جاتی ہیں۔

۲ر جولائی۔ بخت خاں نے اطّلاع دی کہ شہر کے باہر حملہ کے لئے جا رہا ہوں ساتھ جانے والوں کی تفصیل میں ایک عدد یہ بھی ہے۔ "ایک سو مجاہدین"۔

۹ر جولائی۔ جنرل بخت خاں نے انگریزی کیمپ میں گھس کر حملہ کیا۔ اس معرکہ میں جہادی بھی شریک تھے۔

۵ر اگست۔ جہادیوں نے شکایت کی کہ حملہ کے وقت جہادی توپ سے

Marfat.com

جوش کے ساتھ لڑتے ہیں اور فوج کے آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔

حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی جہادیوں کے اس گروہ میں شامل نہیں تھے، مگر جہادیوں کے اس دعویٰ کی وہ بھی تصدیق فرماتے ہیں۔

منهم من كان يجالد و	انہیں مجاہدین میں سے وہ تھے
يحارب ويجاوب النصارىٰ	جو ہر طرح نصاریٰ پر حملہ کرتے اور
ويضارب ۔	اُن کا دفاع کرتے تھے۔

۲ ستمبر۔ خبر ملی کہ چند ہزار جہادی مولوی جلال الدین کی سرکردگی میں کھلے میدان میں لڑنے کے لئے نکلے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی اور اُن کے کئی سو ساتھی مارے گئے۔

یہ ۲ ستمبر تک کے دھندلے سے نشانات ہیں۔ ۷ ستمبر ۱۸۵۷ء سے انگریزوں نے مورچے تیار کر کے بڑی بڑی قلعہ شکن توپوں سے گولہ باری شروع کی اور ایک ہفتہ کی شبانہ روز گولہ باری اور آتش فشانی کے بعد ۱۴ ستمبر کو اس قابل ہوئے کہ کشمیری گیٹ کے دراڑ (شگاف) سے فوج کا ایک کالم شہر کے اندر داخل کر سکیں، جہاں ۱۹ ستمبر تک قدم قدم پر اتنا شدید مقابلہ ہوتا رہا کہ بارہا انگریزی فوجوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ ان دو ہفتوں میں انقلابی فوجوں کے متفرق دستوں نے جس طرح داد شجاعت دی، وہ فراموش نہیں کی جا سکتی۔ مگر وطن عزیز کے پایۂ تخت کے ایک ایک چپہ پر جنہوں نے اپنے سر کٹوائے، جانیں قربان کیں۔ شہر پناہ کی سنگین حصار میں شگاف پڑ جانے کے بعد جنہوں نے اپنے بہادر سینوں کی چٹانوں سے ان شگافوں کو بند کئے رکھا، وہ کون تھے۔ اس کے لئے شاہد علینی کی شہادت کے الفاظ ملاحظہ کیجئے جو اُس نے زندگی کے آخری لمحات میں قلم بند کئے تھے جب وہ وطن سے بہت دُور انگریزوں کی نظر عنایت سے قطعاً مایوس اور اپنے خالق و مالک کی بارگاہ میں سُرخ رُوئی کے ساتھ حاضری کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ شہید جفا مولانا فضل حق خیرآبادی

Marfat.com

کے الفاظ ہیں :

فطفق النصارىٰ يحملون	پھر نصاریٰ (انگریزی فوجیں)
على البلاد وابوابه و	شہر اور اُس کے پھاٹکوں پر دربانوں
يسطون على درابنته و	اور محافظوں پر حملے کرنے لگے ادھر
حجابه - والمجاهدون	حالت یہ تھی کہ جہادی جوہر وقت
الشهود وفريق من الجنود	حاضر رہتے تھے اور انقلابی فوجوں
يعوقونهم عن البلد و	کی ایک جماعت شدّت سے اُن
يصاولون ويجولون بينهم	کو شہر سے روکتی بھی تھی اور اُن پر
وبين ما يجاولون يتجالدُ	حملے بھی کرتی رہتی تھی اور نصاریٰ
الفريقان ليلاً ونهاراً	جو کچھ چاہ رہے تھے قدم قدم پر
ركباناً و رجالاً -	اُن کے آڑے آتی تھی۔ دونوں فریق

کے پیدل اور سواروں کا شدید مقابلہ پُوری قوّت سے دن رات جاری رہتا تھا۔

یہ تو ان دو ہفتوں کی بات ہے جب فتح و شکست کا آخری مرحلہ درپیش تھا اور جب باشندگانِ شہر کے دو گروہ اور عناصر جو اب تک انگریزوں کی حمایت خفیہ طور سے کر رہے تھے، اب کُھل کر سامنے آگئے تھے اور بڑی تعداد شکست کے آثار دیکھ کر شہر سے نکلنے لگی تھی۔ اس سے پہلے خاص اس زمانہ میں جب شہر کا گوشہ گوشہ انقلابی فوجوں سے پٹا پڑا تھا، اور شہر کے ایک ایک کوچہ سے انگریز دشمنی کے آوازے بلند ہو رہے تھے، اس عینی شاہد کی شہادت خاص اس دَور کے متعلق بھی یہ ہے :

كانت الحرب بينهم اربعة	چار ماہ تک برابر کی جنگ جاری
اشهر سجالاً ولم يجد	رہی اور باوجودیکہ دشمن (انگریز)

Marfat.com

العدی فی تلك المدة مع
غاية الشدة وكثرة
العدة والعُدّة - الى
دخول البلد سبيلا و
مجالا - بل كلّما هجموا
صدوا ومهما اقدموا
رُدّوا - كان المجاهدون
الغزاة الحماة الكماة
يدافعونهم اشد دفاع
ويقارعونهم اشد قراع
يثبتون عند التحام
الاقدام ويتقدمون
على كل مقدام - لدى
الاقدام - فذاق كثير
منهم شهد الشهادة
وسعدوا وصعدوا معارج
السعادة وللذين احسنوا
الحسنٰى وزيادة ومابقى
من المجاهدون الّا قليل
يبيتون جياعًا ويصبحون
الى الغزو سراعًا فيقارعون
العدو قراعًا فكانوا مع

ہر طرح مضبوط تھا۔ اس کے پاس
فوجیں بھی زیادہ تھیں اور سامانِ
جنگ بھی بہت تھا مگر کسی طرح
بھی وہ شہر میں داخل ہونے کا موقع
نہ پا سکا۔ اس کے حملوں کو روکا
جاتا اور اس کے ہر اقدام کو پسپا
کر دیا جاتا تھا۔ یہ غازی غیور و
باحمیّت مجاہد شدّت سے جوابی
کارروائی کرتے اور ڈٹ کر میدانِ
جنگ میں مقابلہ کرتے تھے گمسان
کے وقت ثابت قدم رہتے۔ جہاں
بھی موقع ملتا پینترا بدل کر آگے بڑھتے
اسی میں ایک بڑی تعداد نے شربتِ
شہادت نوش جان کیا اور سعادتِ ابدی
اور اعلیٰ درجات پر فائز ہوئے اور
قرآن پاک کی اس بشارت سے مشرف
ہوئے کہ جن کے کارنامے اچھے ہیں
اُن کو اُن کے کارناموں سے بڑھ چڑھ
کر اضافہ اور زیادتی کے ساتھ انعام
دیا جائے گا۔ ان سرفروش مجاہدین میں
بہت ہی کم زندہ بچے۔ جن کی حالت
یہ تھی کہ بھوکے پیٹ رات گذارتے،

Marfat.com

جمع من الجیش یحفظون السور ویسدون الثغور۔ اور جیسے ہی صبح ہوتی میدانِ جنگ کی طرف دوڑ جاتے اور بڑی شدّت سے جنگ کی کارروائی شروع کر دیتے۔ کبھی باضابطہ فوج (تلنگوں) کے ساتھ شہر پناہ کی حفاظت کرتے اور کبھی اپنی حدود کی ناکہ بندی کرتے۔

بقول مولانا خیرآبادی یہ تھوڑے سے مجاہدین جو باقی رہ گئے تھے، اُنہوں نے اپنی جانیں کہاں قربان کیں اور بھوک پیاس کی یہ گرانی کس طرح رفع کی۔ اس کا قصّہ بھی سُن لیجئے:

جامع جہاں نما اور شہادت کی گرم بازاری | جامع جہاں نما یا شاہجہانی مسجد یعنی جامع مسجد دہلی جو اس پوری صدی میں وقارِ ملّت کے قبلہ نما کی حیثیت سے نمایاں رہی ہے۔ ۱۴ ستمبر کو اس کی سیڑھیوں کے نیچے کُھلے میدان میں ایک معرکہ ہوا۔ جس کا تذکرہ تمام مؤرخین نے کیا ہے۔

ہم اس معرکہ کی تفصیل خواجہ حسن نظامی مرحوم[1] کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ جن کا دعویٰ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بہت سے واقعات اُنہوں نے شہر کے بڑے بوڑھوں سے (جو ۱۸۵۷ء میں صاحبِ شعور تھے) زبانی دریافت کر کے قلمبند کئے ہیں۔ خواجہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> فوج کا ایک حصّہ سر طامس مٹکاف کے ماتحت تھا۔ وہ شہر کے حال سے خوب واقف تھے کیونکہ وہ دہلی کے کلکٹر و مجسٹریٹ رہ چکے تھے۔ اس لئے وہ اپنی فوج کو ایسے راستوں سے لے گئے جہاں دشمنوں کی آتش باری بہت کم تھی۔ وہ جامع مسجد تک پہنچ گئے، اور جہاں آجکل ڈفرن ہسپتال ہے (یعنی جامع مسجد کے شمالی جانب کے سامنے جہاں اُس وقت میدان

---

[1] یہ اقتباس خواجہ صاحب کی مشہور تصنیف "دہلی کی جان کنی" سے ماخوذ ہے جو ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی تھی۔ ملاحظہ ہو دیباچہ ص۱۔

Marfat.com

تھا) وہاں کھڑے ہو کر کمک کا انتظار کرنے لگے۔ اُن کو خیال تھا کہ اجمیری دروازہ، کابلی دروازہ اور سبزی منڈی کی فوجیں حسبِ وعدہ یہاں پہنچ جائیں گی۔ اُنہوں نے آدھ گھنٹہ ٹھہر کر انتظار کیا۔ جامع مسجد میں اُس وقت ہزارہا مسلمان نماز کے لئے جمع تھے۔ اُن کو معلوم ہوا، کہ انگریز مسجد کو بارود سے اُڑانا چاہتے ہیں۔ اُن سب کے پاس تلواریں تھیں، بندوقیں نہ تھیں۔ اُن کا ایک آدمی منبر پر چڑھا اور اُس نے مسلمانوں سے پکار کر کہا۔ تمہارے امتحان کا وقت آگیا ہے۔ دشمن سامنے کھڑا ہے، جس کو مرنا ہو، وہ میرے ساتھ شمالی دروازہ کی طرف آئے اور جس کو جان پیاری ہو، وہ جنوبی دروازہ کی طرف چلا جائے کہ ادھر دشمن کی فوج نہیں ہے۔ یہ تقریر سُن کر مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اُن میں سے ایک بھی جنوبی دروازہ کی طرف نہیں گیا۔ اُن سب نے تلواریں میانوں سے کھینچ لیں۔ سب سے پہلے میانوں کو کاٹ کر پھینک دیا۔ پھر شمالی دروازہ کی طرف دوڑے۔ مٹکاف کی فوج نے بندوقوں کی ایک باڑھ ماری جس سے دو سو آدمی شہید ہو کر گر پڑے۔ مسجد کی سیڑھیاں اُنکی لاشوں سے بھر گئیں۔ مگر مسلمان تڑپتی ہوئی لاشوں کو چھوڑ کر اس پھرتی سے آگے بڑھے کہ مٹکاف صاحب کو دوسرے گراپ مارنے کی مہلت نہ مل سکی اور تلواروں کی دست بدست لڑائی ہونے لگی۔ مٹکاف صاحب اور اُن کی فوج کو ان پرجوش آدمیوں کے مقابلہ سے شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔ مسلمانوں نے کشمیری کے گرجا تک اُن کا تعاقب کیا۔

خواجہ صاحب کا ایک وضاحت طلب جملہ سطورِ بالا میں خواجہ صاحب کا یہ ارشاد خاص طور پر وضاحت طلب ہے کہ:

لہ دہلی کی جان کنی صفحہ ۳۳ و ۳۴

Marfat.com

"جامع مسجد میں اس وقت ہزارہا مسلمان نماز کے لئے جمع تھے۔"

خواجہ صاحب نے اس کی تصریح نہیں فرمائی کہ یہ مسلمان شہر کے باشندے تھے، یا باہر سے آئے ہوئے تھے۔ جہاں تک شہری مسلمانوں کا تعلق ہے، بیشک جمعہ کے روز وہ ہزاروں کی تعداد میں جامع مسجد میں حاضر ہوتے ہیں۔ مگر یہ جمعہ کا دن نہیں تھا۔

یہ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے (۲۴ محرم الحرام ۱۲۷۴ھ)۔ ۱۴ ستمبر کو جمعہ نہیں بلکہ دوشنبہ (سوموار) تھا۔ اور جیسا کہ چند سطر بعد معلوم ہوگا۔ تقریباً ۱۲ بجے کا وقت ہے۔ یہ کسی نماز کا بھی وقت نہیں۔ پس ستمبر کی گرمی میں دوپہر کے وقت انتہائی خطرہ کی حالت میں بال بچوں اور گھر بار کو چھوڑ کر جامع مسجد میں شہری مسلمانوں کا جمع ہونا قیاس میں نہیں آتا۔ اب ایک چشم دید گواہ کی شہادت ملاحظہ فرمائیے۔

یہ راقم الدولہ ظہیر دہلوی ہیں جو ۸ بجے صبح سے حالات کا جائزہ لینے کے لئے گھوم رہے ہیں اور اس حادثہ سے تقریباً ایک گھنٹہ بعد جامع مسجد پہنچے ہیں۔ اور اُنہوں نے بچشمِ خود دیکھا ہے کہ کوتوالی سے لے کر جامع مسجد تک لاشیں پڑی ہوئی ہیں اور خاص جامع مسجد کے قریب لاشوں کا ایسا انبار ہے کہ جیسے لکڑیوں کی ٹال لگی ہوئی ہے[1]۔ اُن کا بیان یہ ہے کہ "یہ مسافر" تھے۔ اُن کے دلچسپ اور پُراز معلومات عینی بیان کا خلاصہ یہ ہے:

"صبح کے پانچ بجے سے سینکڑوں توپیں جن کی صحیح تعداد اللہ تعالےٰ ہی کو معلوم ہے، دونوں طرف سے آگ برسا رہی تھیں۔ شہر کی زمین دہل رہی تھی۔ مکان لرز رہے تھے۔ دس بجے تک یہی قیامت برپا رہی۔ میں (ظہیر) پانچ چھ آدمی لے کر تقریباً ۸ بجے صبح کو مکان سے نکلا۔ قلعہ کا ارادہ کیا۔ راستے بند تھے۔ بہرحال جوں توں کر کے ہم

---

[1] داستانِ غدر ص ۱۱۳

Marfat.com

قلعہ کی حد میں پہنچے۔ دروازہ بند تھا۔ دروازہ پر ایک آدمی کھڑا ہوا میدانِ جنگ کے حالات دیکھ رہا تھا اور نیچے لوگوں کو بتا رہا تھا، کہ کونسی فوج کس جگہ کیا کام کر رہی ہے۔ بہرحال قلعہ میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملا تو ہم مکان واپس ہوئے۔ راستہ میں کوتوالی کے قریب انگریزی فوج کے ایک دستہ نے ہم پر گولیوں کی باڑ ماری مگر ہم سب محفوظ رہے۔ ایک ساتھی کے گولی لگی۔ مگر اس کے گلے میں تقریباً چار انگل لمبا چوڑا چمڑا اور ایک مڑا ہوا تعویز پڑا ہوا تھا۔ گولی اُس چمڑے اور تعویز میں گھس کر اپنا زور ختم کر چکی تھی۔ تاہم اُس کے پیٹ پر ایک بالشت لانبی گہری خراش آگئی تھی۔

بہرحال خدا خدا کر کے ہم گھر پہنچے (یعنی تقریباً دس بجے) اب مَیں (ظہیر) گھر پہ پہنچ کر تشویش میں پڑ گیا کہ اب انگریزی فوج قبضہ کرلے گی اور باشندگانِ شہر کا قلع قمع کر دے گی۔ ایک ڈیڑھ گھڑی کا عرصہ گذرا کہ یکایک بہت قریب سے توپ چلنے کی آواز آئی (یعنی تقریباً ۱۱ بجے)۔ مَیں چونک کر گھر سے نکلا۔ دو تین آدمیوں کو ساتھ لے کر گلی میں پہنچا۔ آمد و رفت برابر جاری تھی۔ مَیں نے دریافت کیا کہ کیا ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ انگریزی فوج کو مار کر بھگا دیا ہے۔ پھر مَیں وہاں سے چاوڑی بازار میں جا پہنچا۔ تو دیکھا کہ واقعی ہزاروں آدمی لاٹھی، پونگا، تلوار، گنڈاسا وغیرہ لئے ہوئے شہر میں پھرتے ہیں۔

غرض کہ جامع مسجد کے نیچے ہو کر گلیوں کے بازار میں پہنچا۔ تو وہاں عجیب تماشا نظر آیا۔ لاشوں کا ایک ایسا انبار تھا، جیسے لکڑیوں کی ٹال لگی ہوئی ہے۔ اور یہ موقع ہے جہاں چار ماہ پہلے مجھے ایک مست درویش مجذوب نے بتایا تھا کہ یہاں کشت و خون

Marfat.com

ہوگا۔ وہاں سے آگے بڑھا تو اور لاشیں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے بازار کے لوگوں سے ماجرا پوچھا۔ لوگوں نے بتایا۔

ایک بزن (کالم) انگریزی فوج کا مسجد کی سیڑھیوں تک آ پہنچا تھا۔ اور کچھ لوگ فوج کے رعایا کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کرنے لگے۔ ادھر فوجیوں نے یہ چاہا کہ جامع مسجد میں داخل ہو جائیں مسجد میں جو مسلمان مسافر جمع تھے، انہوں نے دیکھا کہ اب یہ خدا کے گھر میں آکر کشت و خون کریں گے۔ آؤ بہتر تو یہ ہے کہ مسجد سے نیچے اُتر کر اُن سے سمجھ لیں۔ یہ کہہ کر وہ مسجد کے دروازہ سے باہر نکل کر سیڑھیوں سے اُترنے لگے۔ فوج والوں نے اُن پر بندوقیں سر کیں۔ مگر جو زندہ رہے وہ سامنے چلے اور باہم جنگ مغلوبہ دست بدست ہونے لگی۔ ایک غُل شور برپا ہوا۔ لوگ گھروں میں سے لکڑیاں، پلنگ کی پٹیاں، تلواریں لے لے کر دوڑ پڑے۔ اس کالم کے کچھ آدمی مارے گئے جن کی لاشیں پڑی ہیں۔ باقی بھاگ کر اپنے لشکر کو چلے گئے۔ میں یہ تماشا دیکھتا ہوا بڑے دریبے میں ہو کر خونی دروازے سے نکل کر کوتوالی کے آگے پہنچا۔ میں نے جامع مسجد سے لگا کر کوتوالی تک لاشیں برابر پڑی دیکھیں[1]۔

بہرحال ظہیر صاحب کے بیان سے واضح ہو گیا کہ یہ مسلمان جس تعداد میں بھی تھے، شہر کے باشندے نہیں تھے، بلکہ مسافر تھے۔ لیکن یہ مسافر کون تھے، تازہ وارد تھے یا کچھ دنوں سے دہلی کی مسجدوں میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ کونسے بہادر مسافر تھے، جو اس پُرآشوب زمانہ میں جب کہ شہر میں داخلہ کی بھی ممانعت تھی اور کاروبار بھی بند پڑے تھے، سیر و سیاحت یا تماشائے جنگ کے لئے دہلی پہنچے اور ایک دو نہیں

---

[1] داستانِ غدر ص۱۱۱ تا ص۱۱۲

Marfat.com

خواجہ صاحب کے الفاظ میں ہزاروں۔

قیاس و وجدان کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ مسافر وہی وہابی جہادی تھے جن کا مسکن مسجد اور جن کا رصد ہر ایک مسلمان کا گھر تھا، جن پر منشی ذکاء اللہ خاں نے طنز کرتے ہوئے بتایا تھا کہ بدن پر کپڑے ثابت نہیں تھے مگر کمر میں تلوار ضرور تھی۔ جن کے کھانے انتظام بادشاہ نے کرا دیا تھا کہ اہلِ شہر خیرات کی روٹیاں کھلایا کریں اور ثواب کمایا کریں۔

یہ انہیں خیرات کی روٹیوں کی برکت تھی کہ اُن کے اقدام نے انگریزی فوج کے چھکے چھڑا دیئے۔ مٹکاف کو جان بچا کر بھاگنا پڑا، اور کُشتوں کے پُشتے پیچھے چھوڑ گیا۔ یہ اسی اکلِ حلال کی برکت تھی کہ جامع مسجد اس وقت محفوظ رہ گئی، اور پھر برطانوی سامراج بھی اسے محفوظ رکھنے پر مجبور ہوا۔ آج اگر اس کی بلند عمارت اور اونچے منارے ہستیٔ مسلم کے لئے قبلہ نما ہیں، اور اگر اس کی عظمت کے آگے نہ صرف وزیر اعظم جمہوریہ ہند بلکہ دہلی میں آنے والے ہر ایک وزیر اعظم کی گردن حیرت و استعجاب سے خم ہوتی ہے تو وہ صرف شاہ جہاں کی حُسنِ نیت اور اعلیٰ صنعت کا نتیجہ نہیں بلکہ ان مجاہدینِ ایثار شیوہ کی قربانی اور اُن کے اس ذبحِ عظیم کی تجلّی ہے جس نے اس کی منزلت کو دوبالا کر دیا ہے اور اُس کے حُسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر
تُو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

مختصر یہ کہ یہ مسافر وہی وہابی جہادی تھے جو دس گیارہ بجے تک دشمن کے مقابلہ پر لڑتے رہے اور اب جب انقلابی فوج شکست کھا کر پیچھے ہٹی، بُزدل سپاہیوں نے راہِ فرار اختیار کی، تو یہ مجاہدینِ با اخلاص اُسی کے گھر آ پڑے جس کے نام پر قربان ہونے کے لئے آئے تھے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بہت سوں نے قربان ہو کر اپنی تمنائیں پُوری کر لیں۔

Marfat.com

سر جُدا کرد از تنم شوخے کہ با ما یار بود
قصّہ کوتاہ کرد ورنہ دردِ سر بسیار بود

گر عاشق صادقی بکشتن مگریز مرد ار بود ہر آن کہ او را نکشد

زخمی مجاہدین کا دار الشفا یاد رکھنے کی بات ہے شمس العلماء فرماتے ہیں:

انگریزی غلبہ کے بعد جن کے لئے بلا تامّل قتل یا پھانسی کا عمل جاری کر دیا جاتا تھا، اُن کی چند قسمیں تھیں۔

(۱) زخمی جہادی۔ جو مسجدوں میں پڑے ہوئے ملتے تھے[1]۔ پہلے یہ زخمی ہوئے تھے، اب دار و رسن کی سنّت ادا کرتے تھے۔

عمرے ست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

باقی قسمیں بھی اسی وقت ملاحظہ فرمایئے۔

(۲) بادشاہی خاصہ بردار۔

(۳) میگزین کے ملازم۔ جن کا سردار کریم بخش تھا۔ جو میگزین پر انقلابی فوج کو قبضہ دلانے کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ پھر میگزین اُڑنے کے وقت کسی صورت سے بچ گئے تھے۔

(۴) اجمیری دروازہ کے موچی۔ کیونکہ کچھ موچیوں نے مٹکاف کا تعاقب کیا تھا۔ جب وہ ۱۱ مئی کو فرار ہو رہا تھا۔

(۵) تلنگے۔ جو کہیں سے چھپے ہوئے مِل جاتے تھے۔

مختصر یہ کہ مجاہدینِ با اخلاص جن کو خود اُن کے بھائی "وہابی" کہہ کر مطعون کرتے تھے۔ جنہوں نے نہ کسی سرکاری خزانہ پر قبضہ کیا تھا، نہ بہادر شاہ کے فوجی فنڈ نے اُن کی امداد منظور کی تھی، نہ اُن کے پاس ڈیرے خیمے تھے، نہ کسی دیوان خانے

---

[1] تاریخ عروجِ عہدِ انگلشیہ ص۱۱۷

Marfat.com

پر اُن کا قبضہ تھا صرف اللہ کے نام پر گھروں سے نکلے تھے۔ اسی کے لئے بال بچوں کو چھوڑا تھا۔ اسی کے نام پر اُن کی زندگی تھی اور جب زندگی سے مایوس ہوئے، تو اسی کے گھر کو اپنی پناہ گاہ بنایا۔ یہی مسجدیں اُن کی دارالشفا تھیں۔ کیا دُنیا کے اسکاؤٹس، رضاکار اور والنٹیر اس ایثار و قربانی، شوق فدائیت اور ولولۂ شہادت کی مثال پیش کر سکتے ہیں؟ رحمہم اللہ و رضی عنہ۔

اب چند سطروں میں اُن عمارتوں کی سرگذشت ملاحظہ فرمائیے جہاں یہ پناہ پکڑا کرتے تھے۔

دہلی کا تباہ شُدہ علاقہ

راقم الدولہ ظہیر دہلوی

کابلی دروازہ سے لے کر قلعہ تک، اور دریبہ سے لے کر قلعہ تک اور جامع مسجد سے لے کر دِلی دروازہ تک۔ بلاقی بیگم کا کوچہ، خانم بازار، خاص بازار، خان دوران خاں کی حویلی سے دریا گنج تک، ہزار ہا مکانات منہدم اور مسمار کر کے دِلی کا چبوترہ بنا دیا گیا اور چٹیل میدان کر دیا گیا۔[1]

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں

بلاقی بیگم کا کوچہ، خانم بازار، خان دوران خاں کی حویلی، گلیوں کا بازار، دریا گنج کی گھاٹی، انگوری باغ، دیگوا باڑی وغیرہ میں بعض بالکل، بعض کے حصّے منہدم کر دیئے گئے۔[2]

قلعہ کے نیچے میدان کرنے میں ایک بڑی عالی شان مسجد

---

[1] داستانِ غدر ص۳۷۔ ان کے علاوہ تباہ ہونے والے بازاروں میں فیض بازار اور اردو بازار کے نام بھی لئے گئے ہیں جو اسی علاقہ میں تھے۔ [2] تاریخ عروجِ عہدِ انگلشیہ ص۷۲۔

Marfat.com

اکبر آبادی بالکل منہدم ہوئی، اور بہت سی چھوٹی چھوٹی مساجد مسمار ہوئیں[عہ]

مسمار کرنے اور منہدم کرنے اور مسجدوں اور مندروں کو تباہ و برباد کرنے کا قصّہ جتنا طویل ہے اتنا ہی دردناک بھی۔ مگر اب اس ماتم سے کیا فائدہ؟ ہم نے یہ ذکر یہاں اس لئے چھیڑا کہ اس تباہی کی وجہ دریافت کریں۔

بے شک ایک وجہ تو کھلی ہوئی تھی کہ انقلابی فوجوں کی بود و باش زیادہ تر اسی علاقہ میں رہی جو طول میں کشمیری گیٹ سے دہلی دروازہ تک تقریباً دو میل اور شرقاً غرباً عرض میں تقریباً ایک میل ہے۔ اس علاقہ میں وہ بھی رہا کرتے تھے، جن کا تعلّق بادشاہ سے رہتا تھا، اور یہی علاقہ ہے جہاں چپّہ چپّہ پر انگریزوں کا مقابلہ کیا گیا۔ لیکن ان سب سے زیادہ انتقامی جذبات کو مشتعل کرنے والی وجہ یہ ہے کہ ان وہابی جہادیوں کہ مرکز انہیں محلوں اور یہاں کی مسجدوں میں تھے، شمس العلماء کا بیان ہے کہ:

مولوی رحمت اللہ کرانہ سے اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے۔ وہ قلعہ کے پاس مولوی محمّد حیات کی مسجد میں اُترے۔

سر سیّد مرحوم کی مشہور تصنیف "آثار الصنادید" پہلی بار اس انقلاب سے دس سال پہلے ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں شائع ہوئی تھی "مصنّفہ، سیّد احمد خاں مصنّف" اس کی تاریخ ہے۔ سیّد احمد خاں صاحب اسی مسجد کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

یہ مسجد ایسی آباد ہوگئی ہے کہ اب اس کو باعتبار کثرتِ عبادات اور وفورِ طاعات خیر المساجد اور افضل المساجد کہنا چاہیئے۔

زینت المساجد عرف گھٹا مسجد شہید تو نہیں کی گئی۔ البتّہ بیکری اور کچن وغیرہ کے استعمال میں اس کو عرصہ تک لایا جاتا رہا[1]۔ یہ مسجد دریا گنج میں ہے۔

---

[1] چند سال تک پامال کرنے کے بعد جب انگریزی فوج کا رسالہ یہاں سے منتقل ہوا (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

عہ تاریخ عروج عہدِ انگلیشیہ ص ۱۷۱

Marfat.com

اس کی مشرقی جانب میں چند گز کے فاصلہ پر شہر پناہ کی دیوار اور ایک پھاٹک تھا۔ جس سے دریائے جمنا کے گھاٹ پر جایا کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے اُس کو گھٹا مسجد بھی کہتے ہیں۔ اپنے طول و عرض اور خوب صورتی میں یہ مسجد بے نظیر ہے۔ جامع جہاں نما (جامع مسجد دہلی) کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ شاہدرہ سے دہلی جاتے ہوئے صرف دو مسجدوں کے مینار نظر آتے ہیں۔ ایک جامع مسجد کے اور دوسرے اسی زینت المساجد کے۔ سر سیّد احمد صاحب مرحوم فرماتے ہیں، اس مسجد کو شاہزادی زیب النساء بیگم دختر اورنگ زیب عالمگیر نے بنوایا تھا۔ اس کا مدفن بھی اسی مسجد کے صحن میں شمال کی طرف ہے۔ اس کی قبر کے پاس ایک چھوٹا بُرج تبرّکات رکھنے کا ہے۔ اس کے نیچے دو مُحجّر ہیں۔ ایک سنگ باسی کا اور دوسرا سنگِ مرمر کا، جس کا فرش بھی سنگِ مرمر کا ہے۔

سر سیّد نے جس مُحجّر کا پتہ دیا ہے، اب اس کا وجود باقی نہیں ہے صرف دو پختہ قبریں ہیں، ان پر نہ کتبہ ہے گُنبد۔

مسجد کا قصور | ایک[1] قصور تو یہ ہے کہ دریا گنج میں ہے[2]۔ شاہی محلات سے متصل

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) تو بیکری اور کچن وغیرہ کی حیثیت ختم کر کے پھر مسجد کی اصل صورت بحال کی گئی سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ سابق صدر جمعیۃ علماء ہند کو اس مسجد سے بے حد انس تھا۔ کیونکہ اُن کے والد ماجد نے اسی مسجد کی ایک صحن چی کو اپنا نشیمن بنالیا تھا۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ کے بچپن کا ایک حصّہ اسی مسجد میں گذرا تھا۔ پھر یہ مسجد آثارِ قدیمہ کی فہرست میں داخل ہوگئی۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [2] دریا گنج میں ہونے کے سبب سے اس مسجد پر دوسری افتاد تقسیم ہند کے زمانہ (۱۹۴۷ء) میں پڑی۔ جب اس علاقہ میں مسلمانوں کے خلاف اشتعال کے شعلے بھڑکے، تو اس مسجد میں شرنارتھیوں کے بہت سے خاندان آباد ہوگئے۔ تقریباً چار سال بعد مجاہدِ ملّت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جو سُنّی مجلسِ اوقاف کے چیئرمین بھی تھے (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

اور اسی علاقہ میں سب سے پہلے انقلابی فوج نے انگریزوں کا خاتمہ کیا تھا۔

۲: ممکن ہے اس عام شہرت نے بھی جرم و قصور کی حیثیت اختیار کر لی ہو کہ حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ جب پیراکی کی مشق کیا کرتے تھے۔ تو آپ کا فرودگاہ اور آرام گاہ یہی مسجد ہوا کرتی تھی۔

اکبری مسجد جو مسجدیں منہدم کی گئی ہیں، اُن میں اکبری مسجد یہ خصوصیت رکھتی ہے کہ اُس کو شہید کر کے اس کی جگہ ایڈورڈ کا مجسّمہ نصب کیا گیا۔ مجسّمہ نصب کرنے سے پہلے جو پارک بنایا گیا، اس کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کی بنیاد جارج پنجم نے رکھی تھی۔ ایڈورڈ پارک جامع مسجد دہلی کی مشرقی جانب تقریباً دو فرلانگ کے فاصلہ پر آج بھی موجود ہے۔

جس وقت پارک میں مین ہموار کی جانے لگی تو مسجد کا چبوترہ اور بنیادیں جوں کی توں مثل گنجِ نہاں زمین میں مدفون تھیں، ویسے ہی ڈھک دی گئیں فیض بازار جس کا تذکرہ تباہ شدہ بازاروں کے سلسلہ میں گذرا، یہ مسجد اسی بازار میں تھی شاہجہاں بادشاہ کی بیگم اعزاز النساء عرف اکبر آبادی محل نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ کر کے یہ عظیم الشان مسجد بنوائی تھی۔ مسجد کا مسقّف حصّہ ۶۳ گز لمبا اور سترہ گز چوڑا تھا۔ مسجد کے تین گنبد اور سات در تھے۔ دائیں بائیں خوب صورت اور بہت بلند مینار تھے۔ سامنے ۶۳ گز لمبا اور اتنا ہی چوڑا صحن تھا جو زمین سے تین گز اونچا تھا۔ اس کے گرد

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) بہت مشکل سے اس مسجد کو خالی کرا کر پھاٹک بند کرا دیا اور آمد و رفت کے لئے غربی جانب ایک چھوٹا سا دروازہ باقی رکھا۔ لیکن چونکہ آس پاس کئی کئی فرلانگ تک کوئی مسلمان اس علاقہ میں نہیں تھا، کچھ دنوں یہ مسجد ویران پڑی رہی۔ پھر جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے یہاں دینی تربیتی مرکز قائم کیا گیا۔ محلہ چوڑی والان کے ایک مشہور صاحبِ خیر حاجی زین العابدین نے کئی سو روپیہ صرف کر کے بجلی کی فٹنگ کرائی اور بیت الخلاء تیار کرائے۔ مراد آباد کے مشہور بزرگ حضرت مولانا مظفر الدّین صاحب کی مدد سے کئی ہزار روپیہ صرف کر کے اس کی ایک جانب کی صحنچیاں درست کرا لی گئیں۔ الحمد للہ اب یہ مسجد آباد ہے۔

Marfat.com

تین گز اونچا کٹہرا بنا ہوا تھا۔ صحن کے سامنے ۱۲×۲ گز حوض تھا جس میں نہر سے پانی آتا تھا۔

در آں حوضے بصد آب و تاب
درخشندہ چوں چشمۂ آفتاب

پوری عمارت سنگِ سرخ کی تھی۔ سامنے کی طرف سنگِ مرمر کی سیلیں بنی ہوئی تھیں۔ مسجد کے شمال جنوب اور مغرب میں تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر خوب کھلے اور صاف حجروں کی قطاریں تھیں۔ حجروں کے سامنے برآمدے تھے۔ گویا مسجد خاص طور اسی مقصد کے لئے بنائی گئی تھی کہ طلبہ حجروں میں رہیں اور مسجد میں درس دیا جائے۔ یہ مسجد کی ظاہر عمارت کی باتیں تھیں۔ اب باطنی اوصاف ملاحظہ فرمائیے۔

یہ ہی مسجد تھی جہاں مترجم قرآن کریم حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب محدّث اور اُن کے برادر محترم مولانا شاہ رفیع الدّین صاحب درس دیتے رہے تھے۔ جماعت مجاہدین کے سالارِ قافلہ اور جہادی وہابیوں کے پیر و مُرشد امیرالمومنین حضرت سیّد احمد شہید جب عہدِ شباب میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی کی خدمت میں کسبِ فیض کے لئے حاضر ہوئے اور حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز نے آپ کی تربیت حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے سپرد کی، تب آپ کا قیام اسی مسجد میں رہا تھا[1]۔ اس کے بعد جب آپ نواب امیر علی خاں کے یہاں سے رخصت ہو کر اپنے شیخ و مُربّی حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے، تب بھی آپ کا قیام حسبِ معمول اسی مسجد میں ہوا، اور یہیں سے بیعت کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے حکم سے خاندان کے تمام متعلّقین داخل ہوئے۔ جن میں سے حضرت مولانا عبدالحیٔ صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب شہید نے مشیرِ خاص، وزیر اور معتمدِ خصوصی کی

---

[1] سیرت سیّد احمد شہید ص۷۸۔ [2] ایضاً ص۸۹

Marfat.com

حیثیت حاصل کی۔ یعنی قافلۂ جہاد کی داغ بیل یہیں سے پڑی[1]۔

چند صفحات پہلے حضرت مولانا سید نصیر الدین صاحب کا ذکرِ خیر گذر چکا ہے۔ آپ نے حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کی شہادت کے بعد علمِ جہاد بلند کیا تھا، ۱۸۵۷ء کے مجاہدین زیادہ تر آپ سے وابستگی رکھتے تھے جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ اس میں اتنا اضافہ اور کر لیجئے کہ جب تک آپ دہلی میں رہے، آپ کا زیادہ وقت اسی مسجد میں گذرتا تھا اور یہی مسجد آپ کی دار المشورہ تھی[2]۔

محترم غلام رسول صاحب مہرؔ نے اس مسجد کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد یہ شعر تحریر کیا ہے:

آسماں سجدہ کند بر سرِ خاکے کہ برو
یک دو تن یک دو نفس بہرِ خدا بنشینند

غالباً اس کی یہی عظمت تھی کہ برطانوی طواغیت نے اپنے عروج کے وقت دہلی کے تمام مجسّموں میں اس جگہ سب سے بڑا اور سب سے اُونچا مجسّمہ قائم کرنا ضروری سمجھا۔ حالانکہ یہ مسجد ایسے موقع پر تھی کہ اگر اس کو باقی رکھا جاتا تو وہ اس وسیع میدان کے لئے، جو مسجد اور لال قلعہ کے درمیان ہزاروں[3] مکانوں کو منہدم کر کے بنایا گیا تھا، زینت کا کام دیتی، اور اس سے میدان کی خُوب صورتی بڑھ جاتی۔

دار البقاء اور دار الشفا شاہجہاں بادشاہ نے جامع مسجد تعمیر کرائی تو اس کے دائیں بائیں رُوحانی اور جسمانی امراض کے علاج کے ادارے بھی قائم کر دیئے یعنی ایک پہلو میں مدرسہ دار البقاء اور دوسری جانب شفاخانہ دار الشفاء[4]۔ ۱۸۵۷ء

---

[1] محترم غلام رسول صاحب مہر کا ارشاد ہے۔ تنظیمِ جہاد کا کاروبار اسی مسجد میں بیٹھ کر شروع کیا تھا۔ سرگذشت مجاہدین ص۱۳۷۔ [2] ایضاً۔ [3] ایڈورڈ کا یہ مجسمہ ۱۹۱۱ء میں قائم کیا گیا مگر اسکی تیاریاں بہت پہلے سے تھیں (ملاحظہ فرمایئے واقعات دار الحکومت دہلی جلد ۲)۔ [4] ایک روایت یہ ہے کہ ایک لاکھ مکان منہدم کئے گئے (دہلی کی سزا ص۴۷)۔ [4] آثار الصنادید از سر سید مرحوم و واقعات دار الحکومت دہلی از بشیر الدین احمد صاحب۔

Marfat.com

میں مدرسہ دارالبقا کے منتظم اور نگران حضرت مولانا مفتی صدرالدین صاحب تھے۔ جن کے یہاں جہادیوں کا جھگڑا رہتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ کچھ شرارت پسند فوجیوں نے کسی غلط فہمی سے مفتی صاحب کے مکان پر یورش کر دی تو ستّر جہادی جو وہاں موجود تھے، مقابلہ پر آگئے۔ جب مکان پر یہ جھگڑا رہتا تھا تو مدرسہ دارالبقا میں کیا ممانعت ہو سکتی تھی۔ لہٰذا اکبری مسجد کی طرح یہ مدرسہ بھی مستحقِ ہدم تھا۔ دستِ انتقام نے اس حق کو ادا کر دیا۔

لقد صدق اللہ۔ ان الملوك اذا دخلوا قرية فسدوها

نامور عُلماء و فضلاء

۱۸۵۷ء کی پوری تاریخ تو نہیں، مگر بہت سی ضروری باتیں لکھی جا چکی ہیں کچھ ایسے پہلو بھی سامنے آگئے ہیں جن پر اب تک ناواقفیت کی چادر پڑی ہوئی تھی۔ یا بے التفاتی اور لاعتنائی کے دھندلکوں میں وہ چھپے ہوئے تھے۔ اب ایک نظر مضافاتِ دہلی پر ڈالنی ہے لیکن اس مناسبت سے کہ یہ شاندار ماضی کی ایک جلد ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے اس تذکرہ کو علماء کرام کے ذکرِ خیر پر ختم کیا جائے لہٰذا چند اربابِ فضل و کمال کے مختصر حالات سے کتاب کے اس حصّہ کو متبرّک بنایا جا رہا ہے۔ فتبارك الله احسن الخالقين۔

حضرت مولانا مفتی صدرالدّین خاں آزردہ

حضرت مولانا مفتی صدرالدین صاحب ابن مولانا لطف اللہ صاحب کشمیری یعنی وہ جامع کمالات شخصیت جس کا ذکر آیا تو سرسید کے قلم کو گویا وجد آ گیا۔ سب سے پہلے بے تحاشا یہ شعر تحریر فرمایا ؎

Marfat.com

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی ست

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں :

قلم کو کیا طاقت کہ ان کے اوصافِ حمیدہ سے ایک حرف لکھے اور زبان کو کیا یارا کہ ان کے محامدِ پسندیدہ سے ایک لفظ کہے۔ قطعِ نظر اس کے کہ اس زبدہ جہاں و جہانیاں کی صفات کا احصا (پوری شمار) محالات سے اور کمالات کا حصر مرتبہ متعسرات سے ہے جس وقت قلم چاہتا ہے کہ کوئی صفت صفات میں سے لکھے یا زبان ارادہ کرتی ہے کہ کوئی مدح مدائح میں سے کہے، جو کہ ہر صفت قابلیت حال لکھنے کی اور مدح لیاقت پہلے بیان کرنے کی رکھتی ہے، مدت تک یہی عقدہ بندِ زبانِ تحریر اور گرہ لسان تقریر رہتا ہے کہ کونسی صفت سے اور کونسی مدح سے ابتدار کرے۔ شعر

مجلس تمام گشت و بیاباں رسید عمر
ما ہمچناں در اوّل وصفِ تو ماندہ ایم

بے شائبۂ تکلف و بے آمیزشِ مبالغہ، ایسا فاضل اور ایسا کامل کہ جامع فنون شتّٰی (مختلف و متعدد) اور مستجمع علوم بے منتہا ہو اب سوائے اس "سرگروہِ علماء روزگار" کے بساطِ عالم پر جلوہ گر نہیں ——— (تقریباً ایک صفحہ میں آپ کے یکتا اور سرگروہ ہونے کے دلائل بیان کرنے کے بعد سر سیّد فرماتے ہیں)

راہِ حق میں تیز رو اور مسلکِ دنیا میں کامل کوش۔ لیکن تونگری ظاہری درویشی معنوی کی پردہ پوش ہے۔

Marfat.com

کسانیکہ راہِ خدا داشتند چنیں خرقہ زیرِ قبا داشتند

اگر مولوی جامی زندہ ہوتے تو یہ بیت

چو فقر اندر لباسِ شاہی آمد

بہ تدبیر عبید اللّٰہی آمد

سوائے اُس برگزیدۂ انفس و آفاق کے اور کسی کی شان میں نہ کہتے۔ آخر میں تحریر ہے :

باوجود ان مراتبِ بلند اور اس منصبِ ارجمند کے خُلقِ محمدی اختیار کیا ہے کہ افادۂ علوم اور افاضۂ مسائلِ دین کے وقت ہر ادنیٰ کو اجازتِ سخن ہے[1]۔

مولانا فقیر محمد صاحب جہلمی ثم الدہلوی مصنّف حدائق الحنفیہ تحریر فرماتے ہیں :

مفتی صدرالدین خاں صدر الصدور تمام علوم صَرف، نحو، منطق، حکمت، ریاضیات، معانی، بیان، ادب، انشاء، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور درس دیتے تھے۔ آبا و اجداد آپ کے کشمیر کے اہلِ بیت علم و صلاح تھے۔ مگر آپ کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ علومِ نقلیہ، فقہ، حدیث وغیرہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی اور اُن کے بھائیوں سے حاصل کئے اور ان کی سندیں لیں، اور فنونِ عقلیہ کو مولوی فضل امام خیرآبادی والد مولوی فضل حق سے اخذ کیا اور شیخ (شاہ) محمد اسحاق دہلوی نے بھی آپ کو حدیث کی اجازت لکھ کر دی۔ آپ بڑے صاحبِ وجاہت و ریاضت اور اپنے زمانہ میں یگانۂ روزگار اور نادرۂ عصر تھے۔ ریاستِ درس و تدریس خصوصاً افتائے ممالکِ محروسہ مغربیہ بلکہ شرقیہ و شمالیہ دہلی

---

[1] تذکرہ اہلِ دہلی ص۵۹

Marfat.com

اور امتحانِ مدارس و صدارت حکومتِ دیوانی آپ پر منتہی ہوئی۔ بجز شاہِ دہلی کے تمام اعیان و اکابر، علماء و فضلاء خاص دہلی اور اُس کے نواح کے آپ کے مکان پر حاضر ہوتے تھے۔ طلباء واسطے تحصیلِ علم اور اہلِ دنیا واسطے مشورۂ معاملات اور منشی لوگ (انشاء پرداز) بغرض اصلاحِ انشاء اور شعراء واسطے مشاعرہ کے آتے تھے۔ اس اخیر وقت میں ایسا فاضل بایں جمعیۃ اور قوّتِ حافظہ و حُسنِ تحریر و متانت تقریر فصاحت بیان اور بلاغتِ معانی کے صاحبِ مُروّت و اخلاق اور احسان دیکھا نہیں گیا۔ طلبہ مدرسہ دارالبقا[1] (جو جامع مسجد کے نیچے تھا) اکثر طعام و لباس و بعضے ماہوار، جناب سے پاتے۔ اور آپ سے اور دیگر علماء سے تحصیلِ علم کرتے تھے۔

۱۲۷۳ھ میں دہلی کے غدر میں آپ کو سخت زخمِ چشم پہنچا کہ تعلّقِ روزگار بھی ہاتھ سے گیا اور تمام جائداد و املاک بھی جو تیس ۳۰ سال کی ملازمت میں پیدا کی ہوئی تھی، سرکار میں ضبط ہو گئی۔ بلکہ فتویٰ جہاد کے اشتباہ میں چند ماہ تک نظر بند رہے۔ چونکہ اصل میں بے قصور[2] تھے، آخر کو رہائی پا کر لاہور میں تشریف لائے اور واسطے اپنے کتب خانہ

---

[1] سر سیّدؒ آثار الصنادید میں تحریر فرماتے ہیں۔ شاہجہانی عہد سے زیر جامع مسجد مدرسہ دارالبقاء چلا آرہا تھا۔ وہ سلطنت کی تباہی کے ساتھ برباد ہوا۔ مفتی صاحب نے اپنے روپے سے دوبارہ بنوا دیا۔ عمارت درست کرائی۔ درس و تدریس کا اہتمام کیا۔ اساتذہ اور طلبہ کو اپنے پاس سے تنخواہ اور وظیفہ دیتے۔ منتہی طلباء کو عدالت کے کام سے فارغ ہو کر اسباق خود پڑھاتے۔ اور تعطیل کے دن سب کو لے کر باغات کی سیر کراتے اور لذیذ کھانے کھلاتے تھے۔

[2] محض خدا کا فضل یا سفارشوں کا اثر سمجھئے کہ پھانسی سے محفوظ رہے ورنہ ہزاروں بے قصور معمولی شُبہ پر اور بہت سے محض تفریحاً تختۂ دار پر لٹکا دیئے گئے۔

Marfat.com

مالیتی تین لاکھ روپے کے جو دہلی کی لوٹ میں نیلام ہوگیا تھا، حضور "لارڈ جان لارنس" صاحب کے پاس جو اُس وقت پنجاب کے چیف کمشنر تھے اور مولانا ممدوح کے دہلی میں بڑے مہربان رہ چکے تھے، مطالبہ کیا۔ لیکن چونکہ جائداد منقولہ کے نیلام کا واپس ہونا متعذر تھا اس لئے اپنے مطلب میں کامیاب نہ ہوئے۔ لیکن اتنا ہوگیا کہ جائداد غیر منقولہ جو سرکار میں ضبط ہوگئی تھی، واگذار ہوگئی، اور مولانا موصوف دہلی میں واپس تشریف لے جاکر چندے بستی حضرت نظام الدین اولیاء اور پھر اپنی حویلی خاص[1] واقع دہلی میں خانہ نشین

---

[1] مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اپنی عجیب و غریب تصنیف "دلی کی آخری شمع" میں تحریر کیا ہے چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدرالدین صاحب کا مکان تھا۔ اس کے نزدیک مٹیا محل میں نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ رہتے تھے۔ مکان کوٹھی کے نمونہ کا ہے۔ انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا۔ صحن بہت بڑا نہیں۔ اس میں مختصر سی نہر ہے۔ سامنے دالان در دالان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں۔ دالانوں سے ملا ہوا اونچا صحن چبوترہ ہے۔ چبوترہ کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے۔ اُن پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوتے تھے۔ مفتی صاحب کی عمر کوئی ۵۶ سال کی تھی۔ گداز جسم، سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر دھنسی ہوئیں، بھری ہوئی داڑھی، بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی تھے۔ ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں بدن میں سفید ایک برکا انگرکھا، سفید پاجامہ، سفید کرتا اور سفید ہی عمامہ تھا (حاشیہ میں تحریر ہے) پرانے زمانے میں شرفاء گھر پر بھی پورا لباس پہنے رہتے تھے۔ زنانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے۔ ورنہ سارا وقت مردانے میں ہی گذرتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا تھا۔ عالم ہوتے تو درس کا حلقہ ہوتا۔ شاعر ہوتے تو شعر کا چرچا ہوتا۔ غرض کوئی وقت بیکار نہ گذرتا۔ خاص خاص دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوتی، ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت لئے دیئے رہتے تھے۔ جہاں جاؤ یہی معلوم ہوتا تھا کہ دربار لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دوزانو مؤدب بیٹھا ہے۔ بے ضرورت نہ بات کی جاتی ہے نہ جواب دیا جاتا ہے کوئی

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

ہوئے اور اپنی حیات کے باقی ایام کو وظائف و عبادات اور تدریسِ علومِ دینیہ میں بسر کیا۔

مشاغل مفتی صاحب نے غالباً زمانۂ اسارت میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کو ایک خط لکھا تھا جس میں پچھلی زندگی کے مشاغل کا تذکرہ تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:

"شکر ہے اُس پروردگارِ عالم کا جس نے مجھے ایسی دلدل سے کہ ہمہ تن اُس میں غرقاب تھا، نکالا۔ کیسے علائق میں جکڑ بند تھا کہ نکلنا اُن سے سوائے اس صورت کے جو پیش آئی، ممکن نہ تھا۔ مقدمات اصلی کا فیصل کرنا، منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سُننا۔ رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات کے دوران میں فتوے دینا، کمیٹیوں میں حاضر ہونا، طلبہ مدرسہ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا، احکامِ آخر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا، ہزارہا کاغذات پر دستخط کرنا، پھر گھر میں آکر طالب علموں کو پڑھانا[1] اور اطراف و جوانب کے سوالاتِ شرعی کا جواب دینا، وہابیوں اور بدعتیوں کے جھگڑے میں حَکَم (ثالث) ہونا، مجلس شادی و غمی اور اعراس میں جانا، شعر و شاعری کی صحبت گرم رکھنا، باغات کی سیر اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا۔"

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) ہنسی کی بات ہوئی، ذرا مسکرا دیئے۔ کھلکھلا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ بڑھ کر بولنا یا اُونچی آواز میں بات کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا۔ (طبقہ ۳۹ و ۴۰ دہلی کی آخری شمع)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مفتی صاحب محکمہ نزول کے کام میں اتنے مشغول ہوئے، کہ درس کے لئے کوئی وقت نہ نکال سکے۔ کئی دن تک درس بند رہا۔ ایک منچلے طالب علم نے ایک نظم لکھ کر مفتی صاحب کے پاس بھیج دی۔ نظم کا آخری شعر یہ تھا ؎

ہاتف بدستِ چپ سر بینی فشرد و گفت — بیماریِ نزول بہ صدر الصدور شد

(غدر کے چند علماء ص ۴۹)

Marfat.com

سیاسی بصیرت اور رئیس المجاہدین کی رہبری

ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے تقریباً دس سال پہلے جب رئیس المجاہدین حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب دہلی تشریف لائے تھے (تو جیسا کہ شاہ صاحب کے تذکرہ میں تفصیل سے بیان کیا جائے گا) یہی دانش مند فرزانۂ روزگار حضرت مولانا مفتی صدر الدین صاحب تھے جنہوں نے شاہ صاحب موصوف کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی جدّ و جہد کا مرکز دہلی کے بجائے آگرہ بنائیں۔ پھر آپ ہی نے اپنے خط کے ذریعہ شاہ صاحب کا تعارف آگرہ کے اُن زعماء اور علماء سے کرایا، جو ایک طرف سرکاری حلقوں میں باوقار تھے تو دوسری جانب قومی اور ملّی کارکنوں کا اعتماد اُن کو حاصل تھا۔

جنوبی ہند کا ایک غیر معروف نوجوان جو دہلی میں ناکام ہو چکا تھا، اُس نے اس دَورِ بے آئین[1] میں جو سیاسی لحاظ سے بہت ہی نازک[2] تھا۔ پولیس اور سی آئی ڈی کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہتے ہوئے چند ہی مہینوں میں وہ غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی، جس کی نظیر بہت ہی مشکل سے کہیں کہیں ملتی ہے۔ یہ بیشک حضرت شاہ صاحب کی غیر معمولی صلاحیت و قابلیت کی برکت ہے لیکن ایک منصف مزاج حقیقت پسند کو اس پر بھی تامّل نہ ہونا چاہیئے کہ حضرت مفتی صاحب کے تعارفی خط نے بھی اساس اور بنیاد کا کام کیا ہے۔ دار الحکومت آگرہ کے اعلیٰ سیاسی طبقہ میں ایک غیر معروف شخص کے لئے رسوخ اور اعتماد حاصل کرنے کی کٹھن منزل جو سالہا سال میں طے ہوتی، حضرت مفتی صاحب کا مکتوبِ گرامی اور سیاسی طبقہ سے مفتی صاحب کا گہرا تعلق ہی تھا جس نے اس کو نہایت آسانی سے چند لمحوں میں طے کرا دیا۔

انقلابی سرگرمی سے خاموش دلچسپی

خاص اس ہنگامہ کے دوران مفتی صاحب

---

[1] اس دَور کو کمپنی کی نادر گردی کا دَور کہنا چاہیئے کہ نہ کوئی آئین تھا نہ آئین ساز مجلس۔ اظہارِ رائے کی معمولی آزادی بھی سلب کی جا چکی تھی۔ [2] مولانا شاہ احمد اللہ صاحب کے حالات میں ان نزاکتوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

Marfat.com

کسی محاذ پر پیش پیش نظر نہیں آتے۔ مگر تحریکِ انقلاب سے آپ کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ کا درِ دولت جس طرح عام حالات میں مرجع رہا کرتا تھا، اس وقت بھی انقلابی عناصر کا پناہ گاہ بنا رہا۔ انگریزوں کے سب سے زیادہ خطرناک دشمن جن کو مجاہدین کہا جاتا تھا، جن کی انگریز دشمنی کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری کی بنا پر نہیں تھی بلکہ ان کی حریت پسند فطرت نے اس کو عقیدہ کی حیثیت دے رکھی تھی۔ ان سربکف مجاہدین کا ہجوم جس کے درِ دولت پر رہتا تھا ـــــ وہ مفتی صدرالدین صدرالصدور ہی تھے۔

چنانچہ ۹ اگست ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے کہ کسی غلط فہمی کی بنا پر پچاس سپاہیوں کا ایک دستہ حضرت مفتی صاحب کے مکان پر چڑھ دوڑا۔ اس پر منشی جیون لال کا تحریری بیان ہے:

"یہ دیکھ کر کہ وہاں ستّر جہادی مقابلہ کے لئے تیار ہیں، وہ واپس آگیا۔"[1]

ہندوستانی حکومت سے وفاداری بیشک مفتی صاحب صدرالصدور تھے۔ کمپنی کی حکومت کی طرف سے آپ کو تنخواہ ملتی تھی۔ مگر یہ صرف ایک ضابطہ کا تعلق تھا۔ آپ کے دل کا لگاؤ اور آپ کی حقیقی وفاداری سلطنتِ مغلیہ کے آخری نشان "بہادر شاہ ظفر" کے ساتھ مخصوص تھی اور اسی پر آپ کو فخر اور ناز تھا جس کا اظہار آپ نے ایک مرتبہ دہلی کے کمشنر سے برملا کر دیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ:

"بادشاہ سلامت کے خزانہ سے مفتی صاحب کے منصب کے دو روپے آٹھ آنے ملتے تھے۔ محبوب علی خاں خواجہ جب وزیر ہوا تو اُس نے بند کر دیئے۔ مفتی صاحب نے بادشاہ کے یہاں ڈھائی روپیہ کا مقدمہ لڑ کر پھر جاری کرائے۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے مفتی صاحب سے کہا کہ آپ کو ہماری سرکار ہزار روپیہ سے اُوپر دیتی ہے۔ آپ نے

---

[1] روزنامچہ منشی جیون لال اردو ص ۲۱۲

ڈھائی روپیہ کے لئے اتنی کھیکڑ کیوں اُٹھائی۔ مفتی صاحب نے فرمایا۔ آپ کے ہزار بارہ سو روپیہ سے ڈھائی روپے بھاری ہیں یہ تبرک ہے، اس پر ہمیں فخر ہے[1]۔

زمانۂ انقلاب میں دربار سے تعلق یہ درست ہے کہ مفتی صاحب نے ابتداء میں کنارہ کشی مناسب سمجھی۔ چنانچہ انقلاب سے دو تین روز بعد ۱۴ مئی کو جب بہادر شاہ ظفر نے آپ کو شہر کا مجسٹریٹ مقرر فرمایا، تو آپ نے عدمِ صحت کی بناء پر معذوری ظاہر کی[2]۔ مگر یہ وہ وقت تھا کہ اب تک بہادر شاہ خود بھی مذبذب تھے۔ اور اس ذمہ داری کو اُٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوئے تھے جو انقلابی فوجوں نے آپ کے سر کر دی تھی۔ لیکن یہی مفتی صدر الدین صاحب ہیں جو دربار میں برابر حاضر ہوتے ہیں۔ فرائضِ صدارت انجام دیتے ہیں اور اس خوبی سے کہ وہی باغی جن کی سرتابی اور سرکشی سے ہر ایک ابن الوقت لرز رہا تھا، یہاں تک کہ خود بادشاہ کو اُن کی شورہ پشتی کی شکایت تھی۔ وہ شورہ پشت مفتی صاحب سے اس درجہ متاثر تھے کہ جو کام دوسرے نہیں کرا سکتے تھے، بادشاہ کو یقین تھا کہ مفتی صاحب کرا سکتے ہیں۔ چنانچہ حکیم احسن اللہ خاں کا سامان لوٹ لیا گیا تو ۱۲ اگست کو برسرِ دربار :

"بادشاہ نے مولوی صدر الدین خاں سے کہا کہ جب تک حکیم احسن اللہ خاں کا مال جسے سپاہیوں نے لوٹ لیا ہے واپس نہ کر دیا جائے گا اُس وقت تک تمہیں دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی جائے گی[3]"

ظاہر ہے کہ انقلابی فوج مفتی صاحب سے اس درجہ متاثر اسی وجہ سے تھی کہ مفتی صاحب کی خاموش دلچسپی انقلابی سرگرمیوں سے وابستہ تھی۔

فتویٰ جہاد ۱۱ جولائی کو جنرل بخت خاں دہلی پہنچے اور چند روز بعد ہی علماء دہلی

---

[1] لال قلعہ کی ایک جھلک از ناصر نذیر فراق ص۴۷ بحوالہ "بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد"۔ [2] روزنامچہ منشی جیون لال۔ [3] ایضاً روئداد ۱۲ اگست۔

Marfat.com

سے اس جد و جہدِ آزادی کی حیثیت مشخّص کرانا چاہی، تو یہ بتانا تو مشکل ہے کہ فتویٰ مرتّب کرنے میں حضرت مفتی صاحب کا کہاں تک دخل تھا۔ البتہ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جن بزرگوں نے فتویٰ پر سب سے پہلے دستخط کئے، اُن میں حضرت مفتی صاحب کا اسمِ گرامی بھی آج تک زیبِ قرطاس[1] ہے۔

حضرت مفتی صدرالدّین صاحب اور زمانۂ داروگیر | انگریزوں کے تعلّقات

حضرت مفتی صاحب سے خواہ کتنے ہی اچھے رہے ہوں، مگر ۱۸۵۷ء کی قیامت خیزی کے

---

[1] لوگوں کا قاعدہ ہے کہ اہلِ کمال کے متعلق کچھ قصّے اور کہانیاں گڑھ لیا کرتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب اس درجہ تحریک سے وابستہ رہتے ہوئے سزائے موت یا سزائے عبورِ دریائے شور سے محفوظ رہے۔ یہ بہت ہی عجیب و غریب واقعہ ہے۔ مؤرخین کو اس پر حیرت ہے۔ غالباً اسی بنا پر ایک افسانہ گڑھ لیا گیا کہ حضرت مفتی صاحب کی ذکاوت و ذہانت نے دستخط کے وقت بھی تاریک پہلو سامنے رکھ کر تحفّظ کی صورت پیدا کر لی تھی کہ آپ نے فتوے پر دستخط کئے تو یہ بھی لکھ دیا کہ "شہدت بالحر۔ فتویٰ لینے والوں نے تو یہ سمجھا کہ آپ نے "شہدت بالخیر" لکھا ہے (یعنی مَیں نے خیر کے ساتھ گواہی دی) اور اس کو "بالجبر" پڑھا جاتا تو اس کا مفہوم یہ ہوتا کہ مَیں نے مجبوراً شہادت دی۔ چنانچہ جب مقدمہ چلا تو مفتی صاحب نے بتایا کہ "شہدت بالجبر" لکھا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جبر و قہر کی بناء پر اس فتویٰ کی تصدیق کر دی ہے۔ یہ ظاہر ہے یہ افسانہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ دستخطوں کے متعلق بالفرض عذر مان بھی لیا جاتا، تو اس کا کیا جواب تھا کہ مفتی صاحب بہادر شاہ کی حکومت کے ایک رکن اور اعلیٰ عہدہ دار رہے تھے۔ ان کا دیوان خانہ مجاہدین کی پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں افسانوی طور پر تو یہ ممکن ہے کہ کسی فتویٰ کی تصدیق و تائید کے لئے "شہدت بالخیر" لکھ دیا جائے۔ مگر جہاں تک ادبی ذوق اور اصحابِ فتویٰ کے محاورات و اصطلاحات کا تعلّق ہے، یہ لفظ قطعاً بے محل اور بے ربط ہے۔ مفتی صاحب جیسا ہر ایک زبان کا ادیب اس بے محل اور بے موقع لفظ کو استعمال نہیں کر سکتا تھا، اور نہ فتوے پر دستخط کرنے والوں کا ذوق اس قدر ناقص اور معدوم تھا کہ وہ اس لفظ کو برداشت کر لیتے اور مفتی صاحب سے اس کی تصحیح کا مطالبہ نہ کرتے۔ پھر کسی تاویل و توجیہ سے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

بعد ناممکن تھا کہ مفتی صاحب کی سیاسی دلچسپیاں نظر انداز ہو جاتیں۔ چنانچہ بقول مولانا فقیر محمد صاحب آپ کو سخت زخم چشم پہنچا کہ تعلق روزگار بھی ہاتھ سے گیا، اور تمام املاک و جائداد بھی ضبط ہوئی اور چند ماہ نظر بند رہنا پڑا۔ مرزا غالب، اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں :

> حضرت مولوی صدر الدین صاحب بہت دنوں حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹننٹ گورنر نے از راہ ترحم نصف جائداد واگذاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ اگرچہ بامداد (واگذاشت جائداد کی آمدنی) اُن کے گذارے کو کافی ہے۔ اس واسطے کہ ایک آپ اور ایک آپ کی بی بی تیس چالیس

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) "شہدت بالجبر" مان بھی لیا جائے تو شہادت بالجبر کا وہاں موقع کہاں تھا؟ متعدد علماء وہ تھے جنہوں نے اس فتوے پر دستخط نہیں کئے تھے۔ اور وہ اس قیامت خیز دور میں بھی تحریک کے مخالف ہوتے ہوئے دہلی میں رہے۔ انہوں نے فتوے پر دستخط نہیں کئے، اور نہ اُن کو مجبور کیا گیا۔

بے شک سر سید اور شمس العلماء نے ضرور لکھا ہے کہ کچھ علماء سے جبراً دستخط لئے گئے مگر ان دونوں کی تصنیفیں اس وقت کی ہیں، جب ۱۸۵۷ء کو ختم ہوئے کئی سال گذر چکے تھے، اور اب ہمدردانِ ملت کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کو انگریزوں کا وفادار ثابت کریں، اور یہ ظاہر کریں کہ جو کچھ ہوا، اُس کی ذمہ دار انقلابی فوج تھی، جو ختم ہو چکی ہے اور جس کے افسر اور راہنما مارے جا چکے ہیں یا فرار ہو گئے ہیں۔ ان سب کے علاوہ نہایت ہی واضح بات یہ ہے کہ یہ فتویٰ جس اخبار میں پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا، اُس کا عکس شائع ہو چکا ہے۔ اس میں مفتی صاحب کا صرف نام لکھا ہوا ہے۔ اس مفروضہ عبارت کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔

Marfat.com

روپیہ مہینہ کی آمدنی۔ لیکن امام بخش کی اولاد اُن کی "عترت" ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ فراغ بالی سے نہیں گذرتی۔ ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرہ ثامنہ کے اواخر میں ہیں۔ یعنی اسّی برس کے قریب عمر ہوگئی۔ خدا سلامت رکھے۔ بہت غنیمت ہیں[1]

جامع مسجد دہلی اور مفتی صاحب کا کارنامہ جامع مسجد غدر میں انگریزی قبضہ میں آگئی تھی۔ یہ مقدس عمارت تقریباً دو سال تک فوجی استعمال میں رہی مسلمانانِ دہلی فریضہ نماز کی ادائیگی سے محروم تھے۔ جب دہلی میں امن جمّی ہوگئی تو مفتی صاحب نے عمائد شہر کی ہم نوائی میں مسجد کی واگذاشت کی سعی کی۔ آپ کے شرکاء میں شاہی خاندان کے مرزا الٰہی بخش بھی تھے۔ چنانچہ گورنمنٹ نے یہ مسجد مسلمانوں کے حوالہ کی، اور مسلمان اکابر شہر کی ایک مختصر سی جماعت کی انتظامیہ کمیٹی بنا کر مسجد اس کو تفویض کی۔ اس منتظمہ جماعت میں مفتی صاحب اور مولوی اکرام اللہ خاں وغیرہ تھے[2]

زندگی کا آخری دور اور وفات مولانا فقیر محمد صاحب مصنف "حدائق الحنفیہ" تحریر فرماتے ہیں:

"یہ مؤلف بھی ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹،۶۰ء) میں جب مولانا موصوف بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں اقامت گزیں تھے، اُنکی خدمت میں حاضر ہوا، اور تیرہ ماہ تک اُن کی خدمت میں مشرف رہ کر علوم نقلی وعقلی کا استفادہ کرتا رہا۔ اس وقت مولانا موصوف باوجودیکہ چوہتر سال کے تھے، مگر ذوقِ شعر وسخن میں جوانانِ عاشق مزاج سے زیادہ مذاق رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو میں نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ آزردہ تخلّص تھا اور بمقتضاء اُس کے ہمیشہ فرطِ عشق اور ولولۂ محبت سے آزردہ خاطر، افسردہ خاطر، دیدہ گریاں، سینہ بریاں رہتے تھے۔

---

[1] غدر کے چند علماء۔ از مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی۔ [2] ایضاً صہ ۸۳

Marfat.com

اشعار کے پڑھنے میں نہایت دل شگاف آواز، لحنِ حزیں اور صورت درد انگیز رکھتے تھے۔ جس نے آپ کی زبان سے سخنِ موزوں سُنا ہے وہی اس کی کیفیت جانتا ہے کہ کیا انشاء و شعر تھا یا ایجاد سحر۔

آخر عمر میں ایک دو سال مرض فالج میں مبتلا رہ کر اکاسی[81] سال کی عمر میں یوم پنجشنبہ ۲۴ ربیع الاوّل ۱۲۸۵ھ میں فوت ہوئے۔[1]

مولوی ظہور علی صاحب مخاطب بہ شمس الشعراء نے آپ کی تاریخ وفات حسبِ ذیل لکھی ہے:

چو مولانا صدرالدّین کہ دہر — امامِ اعظم آخر زماں بود
زہے صدرالصدور نیک محضر — بعدل و داد چوں نوشیرواں بود
بروز پنجشنبہ کرد رحلت — کہ ایں عالم نہ جاء جاوداں بود
ربیع الاوّل و بست و چہارم — وداعِ او سوء دارالجناں بود
ظہور افسوس آں اُستاد ذی قدر — پدر دارم ہمیشہ مہرباں بود
چراغش ہست تاریخ ولادت — کنوں گفتم چراغِ دوجہاں بود

۱۲۰۴۰ — ۱۲۰۴ + ۶۹ + ۱۲

---

[1] حدائق الحنفیہ ص ۴۸۲

Marfat.com

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ

مسند آرائے جاہ وجلال، زیب دہ مکنت و اقبال، عمدہ اراکین دولت، اسوۂ اساطینِ حشمت، صاحب مرتبہ عالی، مہبطِ انوار سعادتِ ازلی، مورد انظارِ مراحم لم یزلی، نبض شناس شخصِ سخن فہمی وسخن دانی، قانون دانِ پردہ نکتہ سنجی ونکتہ دانی، حاتمِ کرم، عطارد رقم، رستم توان، نواب محمد مصطفٰے خاں بہادر (سر سید[1] مرحوم)

تعارف نواب مصطفٰے خاں صاحب خلف نواب مرتضٰے خاں[2] بہادر ۱۸۰۶ء دہلی میں پیدا ہوئے۔ عظیم الدولہ، سرفراز ملک آپ کے خطابات تھے، اور شیفتہ

---

[1] آثار الصنادید۔ [2] نواب مرتضٰی خاں، نواب محمد خاں بنگش رئیس فرخ آباد کے ہمجد تھے پہلے فرخ آباد ہی رہتے تھے۔ عرصہ تک مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر کی فوج میں ممتاز عہدہ پر فائز رہے۔ مہاراجہ جسونت راؤ اور نواب امیر علی خاں والی ٹونک کا جب "لارڈ لیک" سے مقابلہ ہو رہا تھا تو نواب مرتضٰی خاں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور پھر آپ ہی کی موقع شناسی اور اصابت رائے کی بدولت صلح ہوئی۔ اس اثناء میں لارڈ لیک کو نواب مرتضٰی خاں کے جوہر قابل ہونے کا تجربہ ہوا۔ تو پلول (جو دہلی سے ۲۵ میل گوڑگانوہ ضلع کی تحصیل ہے) کا علاقہ نواب صاحب کے حوالہ کر دیا۔ جس کا سالانہ محصول تین لاکھ روپیہ تھا۔ ۱۸۱۴ء میں آپ نے جہانگیر آباد کا علاقہ جو پہلے راجہ کھودس رائے کی ملکیت تھا، اور مال گذاری ادا نہ ہو سکنے کے باعث نیلام ہو رہا تھا، نواب مصطفٰے خاں صاحب کے نام پر خرید لیا۔ نواب صاحب کی رحلت کے بعد پلول کا علاقہ گورنمنٹ نے واپس لے لیا، اور اس اور اس کے عوض اراکین خاندان کی پنشن کر دی، جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہی۔ (بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد ص ۴۸۱)۔

Marfat.com

تخلص کرتے تھے۔

شیفتہ شاعر منش نواب زادہ ہی نہیں تھے بلکہ شعر و سخن میں اگر بقول سرسیّد مرحوم نبض شناس و سخن دان، نکتہ سنج و نکتہ دان، اخلاق و خصائل میں مہبطِ انوارِ سعادت اور حاتمِ کرم، تہذیب و شائستگی میں زیبِ دہ مکنت و اقبال، خاندانی شرف و عظمت میں مسند آرائے جاہ و جلال تھے، تو اسی طرح علمی قابلیت میں بدرِ منیر اور ماہِ تاباں، تقویٰ طہارت اور خدا پرستی میں زاہدِ شب زندہ دار تھے۔

دہلی کے کامل فنِ اساتذہ سے عربی اور فارسی کی تکمیل کی مولانا حاجی نور محمد صاحب دہلوی سے حدیث و قرأت کی کتابیں پڑھیں۔ ذوقِ سخن کی اصلاح کے لئے مومن خاں مومنؔ کے شاگرد بنے۔ پھر اتنی ترقی کی کہ استاد اور شاگرد کا امتیاز مشکل ہو گیا۔

حج بیت اللہ ایک مخصوص سعادت جو اس زمانہ میں لاکھوں میں کسی کو نصیب ہوتی تھی، وہ بیت اللہ شریف کی زیارت اور مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حاضری تھی۔ شیفتہ صاحب میاں[1] جی مالا مال کے شاگرد تھے۔ تو جس طرح ریاست و دولتِ دنیا سے مالا مال تھے، ۱۲۵۵ھ میں حج بیت اللہ شریف کی دولت سے بھی مالا مال ہوئے اور اس دولت کے ساتھ ایک اور دولت سے بھی دامن پُر کیا کہ وہاں کے مشہور محدثین شیخ عبداللہ سراج حنفی مکّی اور شیخ محمد عابد سندھی مقیم مدینہ منوّرہ کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر اُن سے سندِ حدیث حاصل کی۔

اخلاق ان تمام سعادتوں[2] نے آپ کو مکارمِ اخلاق کا پیکر بنا دیا تھا۔ آپ بے انتہا

---

[1] میاں جی مالا مال۔ دہلی کے مشہور استاد تھے۔ شیفتہ صاحب نے فارسی عربی انہیں سے پڑھی۔ [2] باطنی خوبیوں کے ساتھ ظاہری خوبیوں میں بھی آپ کو فوقیت نصیب ہوئی۔ بقول مرزا فرحت اللہ بیگ (مصنّف دہلی کی آخری شمع) جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں کے بعد دہلی میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ ہی کا نمبر تھا۔ ان کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ لیکن ناک و نقشہ غضب کا

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

خلیق اور صاحبِ مروّت تھے۔ نہایت مستقل مزاج، تسلیم و رضا کی دولت خصوصیّت سے عطا ہوئی تھی۔ ہر حال میں خوش رہنا آپ کی زندگی کا نمایاں وصف تھا۔ طبیعت میں استغنا بہت تھا۔ مہمان نوازی اور فیّاضی میں مشہور تھے۔

رُوحانی خصوصیّات آپ مجدّدی نقشبندی سلسلہ میں بیعت تھے۔ بہت پابندِ شرع، منہیات و منکرات سے حد درجہ مجتنب۔ آپ کے زمانہ میں نواب، اور رئیس تو کیا، مشائخ کے یہاں بھی سماع اور قوالی کا رواج تھا۔ مگر آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ترنّم کے ساتھ اشعار سُننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ خود آپ کا قول ہے ؎

ڈر ہے کہ نہ ہو شوقِ مزامیر شیفتہ
ورنہ کبھی سماع مجرّد سُنا کروں

آپ ہمیشہ رات کو تین بجے سے بیدار ہو جاتے۔ نماز تہجّد کے بعد سُنّت کے مطابق کچھ لیٹتے۔ پھر سب سے پہلے مسجد میں حاضر ہو کر نماز صبح جماعت کے ساتھ ادا کرتے۔

صبر و استقلال شمس العلماء ذکاء اللہ صاحب کی شہادت ہے کہ نواب شیفتہ جیسا صبر و استقلال میں نے کسی انسان میں نہیں دیکھا۔

تسلیم و رضا کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے کہ جب آپ گرفتار تھے، تو ایک دن محافظ پولیس کے دستہ میں پا پیادہ سڑک پر جا رہے تھے۔ آپ نے آسمان کی طرف دیکھا پھر آپ کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا:

"تیری شان کریمی کے قربان کہ اتنی ہی سزا دی۔ میں تو اس سے بہت زیادہ کا مستحق تھا۔"

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) پایا تھا۔ اس پر نیچی سیاہ گول داڑھی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا۔ لباس میں بھی زیادہ تکلّف نہیں تھا۔ تنگ مُہری کا سفید پاجامہ، سفید کرتا، نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبہ نما چوگوشہ ٹوپی۔ یہ آپ کا حلیہ اور آپ کی وضع قطع تھی۔

Marfat.com

مصائب سے لطف اندوز ہونا صوفیاء کی اصطلاح میں اخص الخواص[1] کا صبر کہلاتا ہے۔ یہ تھے ۱۸۵۷ء کے دنیا دار نواب۔

تصنیف و تالیف ترغیب السالک الی احسن المسالک، تذکرہ گلشنِ بے خار وغیرہ آپ کی تصانیف، آپ کی اعلیٰ قابلیت کی شہادت ہیں۔

سیاسی ذوق استخلاصِ وطن کی امنگ نے آپ کو نواب ولی داد خاں، رئیس مالاگڈھ سے وابستہ کر دیا تھا۔ بادشاہ سے خط و کتابت آپ ہی کے سپرد تھی۔ لیکن یہ وابستگی انگریز کی نظر میں ایک گردن زدنی جرم تھا۔ چنانچہ ہنگامہ فرو ہوا تو آپ گرفتار کر لئے گئے۔ مگر آپ کے ساتھ خاص رعایت کی گئی کہ پھانسی کے بجائے صرف سات سال کی قید تجویز ہوئی۔ پھر نواب صدیق حسن صاحب والیِ بھوپال نے آپکی رہائی کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ نتیجہ میں کامیابی نصیب ہوئی۔ یعنی قید سے رہا کر دیئے گئے۔ لیکن وظائف سرکاری بند اور ذاتی جائداد کا بھی نصف حصہ ضبط۔

مرض الوفات اور وفات آپ کو ذیابیطس کا عارضہ تھا۔ آخر میں سرطان بھی ہو گیا۔ ڈاکٹر آپریشن کیا کرتا تھا اور ناقص گوشت کاٹا کرتا تھا جس سے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ اُوپر والوں سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ چنانچہ ایک روز صاحبزادے محمد علی خاں، بے اختیار رونے لگے۔ آپ نے فوراً صاحبزادہ کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا۔ اس جسم فانی کے زوال پر رونا بڑی کم ہمتی کی بات ہے۔ بہرحال تریسٹھ سال کی عمر پا کر ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ حضرت شیخ سلطان المشائخ نظام الدین محبوب الٰہیؒ کی درگاہ میں اپنے جد امجد کے مزار کے پاس دفن کئے گئے۔ رحمہ اللہ

(ماخوذ از دارالحکومت دہلی۔ غدر کے چند علماء۔ دہلی کی آخری شمع۔ اور تصانیف منشی ذکاء اللہ خاں)۔

---

[1] مصیبت پر جزع فزع نہ کرنا عوام کا صبر ہے۔ راضی برضا رہنا خواص کا صبر اور مصیبت سے لطف اندوز ہونا اخص الخواص کا صبر ہے۔

Marfat.com

صہبائی شہید

مولانا امام بخش صہبائی خلف مولانا محمد بخش تھانیسری۔ ایک غریب گھرانے کے فرد۔ پَر خانوادۂ علم کے چشم و چراغ، محفل علم و ادب کے گوہر شب تاب۔ داستانِ جور و جفا کے شہید ستودہ صفات۔ سرسید کے الفاظ میں:

کمالاتِ ظاہری اور جلائلِ باطنی، حُسن خلق اور حمائد اطوار میں پسندیدۂ خلائق و مقبول خلائق، خلق نوازش آپ کا آئینۂ بہار، اور اوضاعِ حمیدہ آپ کے محمود روزگار، ایسا فردِ زمان ایسی جامعیت کے ساتھ کم کوئی نظر سے گذرا ہے، اور طرفہ یہ ہے کہ فنونِ متعارفہ و سخن وری مثل تحقیق لغت و اصطلاحاتِ زباں وری اور تدقیقِ مقاماتِ کتابی اور تکمیل عروض و قافیہ و استکمالِ فنِ معمّہ وغیرہ میں ایسا کمال بہم پہنچایا ہے کہ ہر فن میں یک فنی کہنا چاہیئے۔

بر یہ فتہ از ہر فنے روشنی
جُداگانہ در ہر فنے یک فنی[1]

خاندان اور نسب مرزا قادر بخش صابر گورگانی گلستانِ سخن میں لکھتے ہیں:

"سلسلہ اُن کے نسب کا اُن کے والد ماجد مرحوم و مغفور کی طرف سے تو فارق حق و باطل حضرت فاروق بن خطاب علیہ رضوان اللہ الوہاب تک، اور والدہ کی جانب سے سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے[2]۔"

آپ کے والد ماجد مولانا محمد بخش صاحب تھانیسر سے دِلّی آئے اور کوچہ

---

[1] آثار الصنادید ص۹۸۔ [2] بحوالہ دلّی کالج اردو میگزین نمبر۔ قدیم دِلّی کالج نمبر ۱۸۵۳ء ص۶۸

Marfat.com

چیلاں میں رہ پڑے۔[1]

حُلیہ درمیانہ قد، کھلتا ہوا گندمی رنگ، منہ پر چیچک کے داغ، مہندی سے رنگی ہوئی سُرخ داڑھی، پُرانی وضع کا لباس، ایک بر کا سفید پاجامہ، سفید انگرکھا، کشمیری کام کا جُبّہ، سر پر چھوٹا سا سفید صافہ، دُبلے پتلے اور لاغر اندام۔[2]

ملازمت ڈاکٹر عبدالحق صاحب دِلّی کالج میں آپ کے تقرّر کے متعلق لکھتے ہیں:

اُن کے تقرّر کا عجیب واقعہ ہے۔ ۱۸۴۰ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامسن لفٹننٹ گورنر بہادر مدرسہ کے معائنہ کے لئے آئے تو اُنہوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستعد فارسی مدرس کا تقرّر ہونا چاہیئے مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور نے لفٹننٹ گورنر سے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے اُستاد صرف تین ہیں۔ ایک مرزا نوشہ (مرزا غالب) دوسرے حکیم مومن خاں، تیسرے امام بخش صہبائی۔

لفٹننٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بُلوایا۔ مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگے تھے۔ اُنہوں نے تو انکار کر دیا۔ مومن خاں نے یہ شرط پیش کی کہ سو روپیہ[1] ماہانہ سے کم کی قیمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔ انہوں نے یہ خدمت چالیس روپیہ ماہانہ کی قبول کر لی۔ بعد کو پچاس روپیہ ہو گئے۔[2] لیکن کچھ عرصہ بعد پرنسپل بوترس کے عہد میں آپ مدرّسِ اوّل کے عہدے پر سرفراز کئے گئے۔[3]

---

[1] اگر غلہ کے نرخ کو معیار قرار دیا جائے تو اُس وقت کے سو روپیہ آجکل کے سولہ سو روپے ہوں گے کیونکہ اس وقت ایک روپیہ من گیہوں تھا اور آجکل سرکاری نرخ سے سولہ روپے من اور غیر سرکاری دکانوں پر تیس روپیہ من تک گیہوں مل رہا ہے۔ [2] مرحوم دلّی کالج ص ۱۴۹۔ [3] دلّی کالج اردو میگزین۔

Marfat.com

حادثۂ شہادت مولانا صہبائیؔ کے حقیقی بھانجے مولانا میر قادر علی صاحب جو مولانا صہبائیؔ کے ساتھ مولانا ہی کے گھر میں رہا کرتے تھے، بیان کیا کرتے تھے :

مَیں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائیؔ کے ساتھ کٹرہ مہر پرور میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دَن دَن کرتے آپہنچے۔ پہلی رکعت تھی کہ امام کے صاف سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ شہر کی حالت نہایت خطرناک تھی اور دلّی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔ ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاعیں سرکار میں دے دی تھیں۔ اس لئے ہم سب گرفتار ہو کر دریا کے کنارے پر لائے گئے۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا کہ موت تمہارے سر پر ہے۔ گولیاں تمہارے سامنے ہیں اور دریا تمہاری پُشت پر ہے۔ تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہیں وہ دریا میں کُود پڑیں۔

مَیں بہت اچّھا تیراک تھا مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائیؔ اور اُن کے صاحبزادے مولانا سوزؔ تیرنا نہیں جانتے تھے۔ اس لئے دل نے گوارا نہ کیا کہ اُن کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا، اس لئے مَیں دریا میں کُود پڑا۔ پچاس یا ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں اور صف بستہ گِر کر مر گئے[1]

وجہِ شہادت خواجہ حسن نظامی مرحوم فرماتے ہیں[2]

دہلی کے تمام محلوں سے زیادہ چیلوں کے کوچہ پر مصیبت آئی تھی۔ اسی محلّہ میں بڑے بڑے شرفاء اور نامور علماء رہتے تھے۔ مولانا شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کا گھرانا اسی محلّہ میں آباد تھا سر سیّد خاں کا گھر بھی اسی محلّہ کے ایک حصّہ میں تھا۔ مولانا صہبائیؔ

---

[1] دلّی کی آخری بہار ص۷۸ و ۷۹۔ [2] ملاحظہ ہو "دہلی کی جان کنی" مصنفہ خواجہ حسن نظامی مرحوم۔

Marfat.com

بھی اسی محلّہ میں رہتے تھے۔ غرض یہ محلّہ بڑے بڑے صاحبِ کمال لوگوں کا مخزن[1] تھا۔ منشی ذکاء اللہ خاں بھی اسی محلّہ کے باشندہ تھے۔"

منشی ذکاء اللہ خاں صاحب لکھتے ہیں:

"اس مصیبت کا خاص سبب یہ ہوا کہ نواب شمشیر جنگ کے بیٹے محمد علی خاں نے اور یا حکیم فتح اللہ خاں نے کسی انگریزی سپاہی کو زخمی کر دیا تھا کیونکہ وہ اُن کے زنانہ مکان میں بُرے ارادہ سے جانا چاہتا تھا۔ اس کی خبر انگریزی کمان افسر کو پہنچی۔ اُس نے حکم دیا کہ اس محلّہ کے تمام مردوں کو قتل کر دو یا گرفتار کر کے لے آؤ۔

اس حکم کی تعمیل ایسی بے دردی سے ہوئی کہ محلّہ میں کوئی مرد زندہ نہ بچا۔ یا تو سپاہیوں نے گھروں میں گھُس کر مار ڈالا یا گرفتار کر کے حاکم کے سامنے لے گئے۔ حاکم نے اُن کو دیکھ کر حکم دیا کہ سب کو دریا کے کنارے لے جاؤ اور گولی مار دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

شہادت کا منظر ان لوگوں کو رسّی سے باندھا گیا۔ دریا کی ریتی میں قطار بنا کر کھڑا کیا گیا اور گولیوں کی باڑھ اُن پر چلائی گئی جس سے سب مر کر گر پڑے۔ صرف دو آدمی زندہ بچے جن کے گولی نہ لگی تھی۔ جب سپاہی گولیاں مار کر چلے گئے تو یہ دونوں اُٹھ کر بھاگے۔ ان میں ایک مرزا مصطفٰے بیگ تھے جو بعد میں رسالہ میں نوکر ہو گئے تھے اور

---

[1] استاذ العلماء مولانا مملوک علی صاحب نے بھی اسی محلہ میں مکان لیا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند زمانۂ طالب علمی اور اس کے بعد جب تک دہلی میں رہے اسی محلّہ میں قیام فرما رہے۔ مفتیِ اعظم ہند حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب نے بھی اسی محلّہ میں مکان بنایا تھا اور دورِ حاضر کے مشہور عالم سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب سابق صدر جمعیۃ علماء ہند کا مکان بھی اسی محلہ کے ایک کوچہ (کوچہ ناہر خاں) میں ہے۔ رحمہم اللہ

Marfat.com

دوسرے مولانا صہبائیؔ کے داماد اور بھانجے وزیرالدین نامی تھے، جو بعد میں کانپور میں ججی کے سررشتہ دار ہو گئے تھے۔

شہداء میں آفتاب و ماہتاب ان شہداء میں آفتاب ہند مولانا صہبائیؔ کے علاوہ دوسرے استاد فن سیّد محمد امیر عرف "میر پنجہ کش" بھی تھے جن کی خوشنویسی کا لوہا تمام ہندوستان مانتا تھا اور اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حرف سونے چاندی کے عوض خریدے جاتے تھے۔ وہ بھکاری فقیروں کو ایک حرف لکھ کر دے دیتے تھے جو ایک روپیہ کے نوٹ کی طرح ہر جگہ روپیہ کو بکتا تھا۔ (افسوس کہ یہ صاحبِ کمال بھی دریا کی ریتی میں مارا گیا)۔

تعداد کوچہ چیلان کے اُن شہداء کی صحیح تعداد کا علم کسی کو نہیں مگر اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف مولانا صہبائیؔ کے کنبہ کے اکیس آدمی اس قطار میں مارے گئے۔

راقم الدولہ ظہیر دہلوی نے انہیں دردناک حوادث کو نظم کا مختصر لباس پہنایا ہے۔

جہاں کی تشنۂ خوں تیغ آب دار ہوئی
سنانِ نیزہ ہر اک سینہ سے دوچار ہوئی
رسن ہر اک بشر کے گلے کا ہار ہوئی
ہر اک سمت سے فریاد گیر و دار ہوئی
ہر اک دشتِ قضا میں کشاں کشاں پہنچا
جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہنچا

ہر ایک شہر کا پیر و جواں قتل ہوا
ہر ایک قبیلہ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک اہلِ زبان خوش بیان قتل ہوا
غرض خلاصہ یہ ہے ایک جہان قتل ہوا
گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے، نہ کفن ہے، نہ رونے والے ہیں

Marfat.com

اس کے بعد ظہیر صاحب رقم طراز ہیں :

"غرض کہ جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے، اُن میں کئی اشخاص باکمال نامور فرد روزگار مارے گئے ہیں جو دہلی کی ناک اور یگانۂ آفاق تھے، جن کی نظیر آج تک پیدا نہیں ہوا، اور نہ ہوگا۔ میاں محمد امیر پنجہ کش خوش نویس جن کا ثانی روئے زمین پر نہیں، مولوی امام بخش صہبائی اور اُن کے دو بیٹے اور میر نیاز علی واقعہ خواں اور چیلوں کے کوچے کے اور بہت سے شریف خاندان لوگ۔ سُنا گیا ہے کہ اس محلّہ کے چودہ سو آدمی گرفتار کر کے راج گھاٹ کے دروازہ سے دریا پر لے جا کر بندوقوں کی باڑھیں مار دی گئیں، اور لاشیں دریا میں پھینکوا دی گئیں۔ عورات کا یہ حال ہوا کہ گھروں میں سے نکل کر بچّوں سمیت کنوؤں میں جا گریں۔ چیلوں کے کوچہ کے تمام کنویں لاشوں سے پٹ گئے تھے۔"[1]

حضرت آزردہ کا تاثر مفتی صدرالدین صاحب آزردہ کو صہبائی کی شہادت کی خبر پہنچی تو بے اختیار زبان سے نکلا :

کیونکر آزردہ نکل جائے، نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

صہبائی کا مرثیہ :

ندانم کجا رفت آں نعشِ پاک — فلک بُرد یا ماند بر روئے خاک
ندانم کسے داد او را کفن — و یا ماند چوں سایہ بر خاک تن
ندانم چہ کردست با او سپہر — ز جامہ کفن کرد یا تاب مہر
بخاکش نمودند او را نہاں — و یا مرتفع کردند سوئے آسماں

---

[1] داستان غدر ص ۱۲۸

Marfat.com

کسے فاتحہ ہم بر و خواندہ است — بعطر گلابی برافشاندہ است
کدامی گل و بلبل و باد و دشت — بخاکش بحسن عقیدت گذشت[1]

الٰہی بیامرز مظلوم را — کلاہِ شہی دہ بملکِ بقا
بفردوس اعلےٰ بود جاء او — بہشتِ بریں باد ماوا راو

دہلی کا مرثیہ دہلی مرحوم کے مرثیے بہت کچھ لکھے گئے۔ یہاں صرف مولانا حالی مرحوم کے چند اشعار پیش کر کے دہلی کا یہ جاں گداز تذکرہ ختم کیا جا رہا ہے۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلّی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
چپّہ چپّہ پہ ہیں یہاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
غالب و شیفتہ، نیّر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
بزمِ ماتم تو نہیں، بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

---

[1] مفتی انتظام اللہ شہابی

Marfat.com

مضافاتِ دہلی

ضلع میرٹھ - مظفّر نگر - سہارن پور - بلند شہر علی گڑھ اور روہیل کھنڈ

ضلع میرٹھ

سرگذشت دہلی کا آغاز میرٹھ کے جرأت مندانہ مگر عاجلانہ اقدام سے ہوتا ہے۔ اس لئے میرٹھ واقعات ۱۸۵۷ء کا سرنامہ اور ٹائیٹل پیج ہے۔ چنانچہ دہلی کے تذکرہ میں سب سے پہلے میرٹھ کی انقلابی فوج کا ذکر آچکا ہے۔ اس موقع پر اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ہاں مضافات میرٹھ نے میرٹھ کی امداد کس طرح کی؟ اس کے لئے یہ چند سطریں مطالعہ فرمایئے۔ ایک ریسرچ کرنے والے کے لئے بڑی قیمتی یادداشت ہے۔

(۱۰ مئی ۱۸۵۷ء) میرٹھ کی مسلح فوجوں نے اپنے فرائض کا احساس کر کے جنگ آزادی کی بسم اللہ شروع کر دی۔ میرٹھ اور اس کے مضافات کے رہنے والے عوام کی جُملہ امکانی امداد نے ان آزادی پسند افواج کے حوصلے اور بلند کر دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام ضلع تحریکِ آزادی کا مرکز بن گیا۔ مضافات میں یہ مرکز محفوظ مقامات پر قائم تھے۔ ایک مضافاتی مرکز سکوتی نام کے موضع میں قائم کیا گیا۔ اس زمانہ میں اس موضع میں سب سے بااثر و معزز ہستی مرزا انور بیگ نے پیرانہ سالی کے باوجود اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر اُٹھایا (اگرچہ یہ موضع آج بھی اُن کے جدِ امجد سخاوت مرزا جو ہمایوں کے بہنوئی مرزا خضر خواجہ کے خالہ زاد بھائی تھے، کے نامِ نامی سے موسوم ہے)

Marfat.com

وطن کے حریت نواز جوانمردوں کی جماعت اُن کے گرد اکٹھا ہوگئی۔ سلاوہ کیلی، بھانبوری، سردھنہ سے شہباز خاں، کرم دین، ٹھاکر جنم جے سنگھ اور زبیر سنگھ، دورالہ دادری، روہانہ، اٹیرنہ وغیرہ سے دلیل سنگھ، کرم سنگھ، شیودت، ہزاری لال، سید احسان علی، سعادت حسین، نصیر احمد، کرمو، عارف، مین گروہ در گروہ پہنچے۔ تقریباً چھ سو افراد نے مرنے مارنے اور جاں نثاری کا حلف اُٹھانا۔ راجہ نین سنگھ کی شکستہ گڑھی کی مرمت کی گئی۔ فصیلوں پر پہرہ چوکیاں اور نواحی جنگلات میں حفاظتی دستے تعینات کئے گئے۔ آدھی جمعیت پنڈت شیودت، سید احسان علی، رشید مرزا، قادر بیگ، اور ٹھاکر زبیر سنگھ کی قیادت میں پابلی، عارف پور، عابد پور اور غازی آباد کے آزادی کے دیوانوں کو ساتھ لیتی ہوئی ظلِ سبحانی اعلیٰ حضرت بہادر شاہ کی فوجوں سے جا ملی۔ ان تمام گمنام شہیدوں نے اپنی لاشیں خاکِ دہلی کے قدموں میں پیش کر دیں۔ صرف قادر مرزا زخموں سے نڈھال بصد دقت کسی طرح بچ نکلے۔ مرزا نور بیگ، سکندر مرزا، حسین بیگ، کرم سنگھ، ہزاری لال وغیرہ نے مظفر نگر اور میرٹھ کے قریباً اٹھارہ مواضعات میں پرچم آزادی بلند کر دیا۔ مرزا وزیر بیگ، نصیر احمد، ہری رام وغیرہ بڑھتے ہوئے سردھنہ کے قریب پہنچ گئے۔ اس وقت یہ عالم تھا کہ انگریز جان بچانے کے لئے گرجا گھر اور قلعے کی سرنگوں میں چھپ گئے تھے۔ سردھنہ خاص میں علماء کرام کا ایک گروہ جو کہ وہابی تحریک میں پیش تھا، مقامی باشندوں کو لے کر جنگِ آزادی کے لئے برسرِ پیکار تھا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اچانک شکستوں کی خبریں آنے لگیں۔ کمزور دل بھاگ کھڑے ہوئے۔ محاصرہ ہٹا لیا گیا، اور پسپائی شروع ہوگئی۔ کپتان رابنسن کی سرکردگی میں انگریزی فوجوں نے سکوتی کو گھیر لیا۔ گڑھی کو آگ لگا دی گئی۔ قدیر بیگ، نجم اللہ اور ہری رام وہیں جل کر راکھ ہوگئے جنم جے سنگھ، تھنبو خاں اور دلاور کو پیپل کے درخت میں پھانسی دے دی گئی ان کی لاشیں تین دن تک بے گور و کفن لٹکی رہیں۔ شہباز خاں کو گولی سے اُڑا دیا گیا۔ نور بیگ

Marfat.com

ناظم مرزا، دیوان اور کرموں دست بدست کی جنگ میں شہید ہو گئے۔ اس علاقہ کے ایک "لوک گیت" میں رابنسن کے مظالم اور نور بیگ کی بہادری کی داستان کچھ اس پیرایہ میں بیان کی گئی ہے کہ آج سو سال بعد بھی اُسے سُن کر خون کھولنے لگتا ہے[1]۔

ضلع مظفر نگر و سہارن پور

دہلی کے شمال کی جانب تقریباً چالیس میل کے فاصلہ سے شروع ہونے والا وہ علاقہ جو کہیں (حضرت شاہ عبدالعزیز کی زبان میں) مارجون آب جمنا سے سیراب ہوتا ہے اور کہیں اس کی سرسبز و شاداب وادیاں دریائے گنگ کی فیاضیوں سے ہم کنار ہوتی ہیں۔ جس نے کبھی تاریخ میں اپنا کوئی مستقل نام پسند نہیں کیا۔ جس کی نشان دہی آج کل ضلع مظفر نگر اور ضلع سہارن پور سے کی جاتی ہے جس طرح وہ زرعی لحاظ سے زرخیز ہے ویسے ہی انسانیت کے نقطۂ نظر سے مردم خیز اور بلحاظ سیاست انقلاب انگیز واقع ہوا ہے۔ اس علاقہ میں مسلمان اگرچہ تعداد میں کبھی بھی زیادہ نہیں ہوئے۔ مگر جہاں تک ڈھائی سو سال کی تاریخ کا تعلق ہے اخلاق، کردار اور ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے ان کا درجہ ممتاز رہا ہے۔

تھانہ بھون، کیرانہ، کاندھلہ، شاملی، پہلت، کھاتولی، جانسٹھ، جھنجھانہ، ٹبھانہ، دیوبند، نانوتہ، گنگوہ، منگلور، رڑکی، انبیٹھ، رائے پور، رام پور منہیاران، نکڑ، اس علاقے کے مشہور قصبے ہیں۔

سیدنا شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز جن کے تعمیر کردہ صراطِ مستقیم پر اس دور کے علماءِ احرار قدم بڑھاتے رہے۔ ان کی دادھیال[2] اگرچہ سونی پت میں تھیں مگر ننھیالی رشتہ اسی علاقہ سے تھا اور قصبہ پہلت میں آج تک وہ مکان (بلکہ وہ کوٹھڑی) موجود ہے جو آپ کا مستقط راس تھا۔

---

[1] اختر چغتائی ۲۲۱۔ احمد نگر جیل کوٹھی میرٹھ بحوالہ سنڈے ایڈیشن الجمعیۃ۔ [2] انفاس العارفین، شاندار ماضی جلد دوم

Marfat.com

حسن علی خاں اور عبداللہ خاں سے کون واقف نہیں جنہوں نے سلطنتِ مغلیہ کے آخری دَور میں وزارت ہی نہیں کی، بلکہ بادشاہ گر رہے۔ اُن کا اور اُن کے خاندان یعنی سادات بارہ کا مسکن یہی[1] علاقہ رہا، اور پھر جب با احساس ہندوستانیوں کے سیاسی شعور نے وارد انگریزوں کے مقابلہ کے لئے تیر کمان درست کرنے شروع کئے تو یہی علاقہ تھا جس نے حضرت سیّد احمد شہید کے مجاہدانہ اقدام کے لئے سب سے پہلے اپنی حدود کو فرشِ راہ بنایا۔

حضرت سیّد احمد صاحب شہید کی تحریک کا تذکرہ شاندار ماضی کی جلد دوم میں گذر چکا ہے۔ آپ کا سب سے پہلا دورہ اسی علاقہ کے رہنماؤں کی دعوت پر ہوا تھا، اور اس علاقہ سے خود سیّد صاحب کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے سردھنہ ضلع میرٹھ سے سہارن پور تک تقریباً چالیس میل کے خطّہ کو اپنے اوقاتِ عزیز کے تین ماہ عطا فرمائے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا عبدالحیؒ صاحب جو حضرت سیّد احمدؒ صاحب شہید کے نہ صرف مشیرِ خاص بلکہ اس تحریک کے لئے دماغ اور قلب کی حیثیت رکھتے تھے، اُن کا وطن اسی علاقہ کا قصبہ بڈھانہ تھا۔ اس آفتابِ رشد و ہدیٰ یعنی حضرت سیّد صاحب کے فیوض کی کرنیں اس علاقہ کے مسلمانوں نے کس طرح سمیٹیں اور اس کے سوز و حرارت کو کس طرح قلب و جگر میں پیوست کیا، اس کے متعلق اپنے دَور کے نبض شناس اور صاحبِ بصیرت فاضل مؤرخ مولانا سیّد عبدالحیؒ صاحب[2] کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت سیّد صاحب کے دورہ سے

---

[1] قصبہ بانسٹھ ضلع مظفر نگر آج کل بھی سادات بارہ کا مرکزی قصبہ سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اس وقت ایک پس ماندہ قصبہ ہے جس کو ریلوے لائن بھی نصیب نہیں۔ [2] مولانا سید عبدالحیؒ صاحب مصنّف ارمغانِ احباب و نزہۃ الخواطر وغیرہ ہمارے زمانے کے مشہور عالم مولانا سیّد ابوالحسن علی صاحب کے والد ماجد رحمہ اللہ۔

Marfat.com

تقریباً ایک صدی[1] بعد اس مبصر و مفکر کا احساس یہ ہے :

اس وقت تک سہارن پور کے جس قدر قصبوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے وہاں ہر فرد و بشر کو سید صاحب کا دم بھرتے پایا ہے جو ہے اُن کی محبت میں چور ہے ..... میں نے اپنی عمر میں سید صاحب کا اتنا چرچا کہیں نہیں دیکھا۔[2]

پھر جس کو یہ معلوم ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب "اسیر مالٹا" جنہوں نے بیسویں صدی عیسوی کے پہلے عشرہ میں ریشمی رومال والی انقلابی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ جن کے فیضِ صحبت سے مولانا عبید اللہ سندھی، ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری، مفتی اعظم ہند مولانا محمد کفایت اللہ صاحب، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمہم اللہ اور رہنمار سرحد خان عبد الغفار خان صاحب جیسے جنگِ حریت کے سپہ سالاروں اور آسمانِ سیاست کے چاند تاروں نے جوشِ عمل اور نورِ بصیرت حاصل کیا۔ یہ شیخ الہند اسی علاقہ کے رہنے والے تھے۔

مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور انصاری رحمۃ اللہ علیہ جو اسی تحریک کے سلسلہ میں جلا وطن ہو کر افغانستان پہنچے اور تقریباً تیس سال جلا وطن رہ کر وہیں کی ڈھائی گز زمین کو ہمیشہ کے لئے آرام گاہ بنا لیا۔ ان کا مولد و مسکن بھی اسی علاقہ کا مشہور قصبہ (انبیٹھہ) تھا جو گیارھویں صدی ہجری میں قطبِ وقت حضرت شاہ ابو المعالی[3] کے فیوض و برکات کا مطلع اور مرکز رہا ہے۔

آزادیِ ہند کی وہ غیر متشددانہ (نان وائلنس) تحریک جو مقاومت بالصبر کے

---

[1] ۱۳۱۲ھ میں۔ [2] ارمغانِ احباب بحوالہ سید احمد شہید مصنفہ سید ابو الحسن علی ص ۱۱۱۔ [3] متوفی ۱۱۱۲ھ شاہ بھیکؒ متوطن ٹھیکہ میراں جی ضلع انبالہ جو محمد شاہ بادشاہ کے وزیر روشن الدولہ کے پیر تھے۔ وہ انہیں حضرت شاہ ابو المعالی کے خلیفہ تھے۔ دوسرے مشہور خلیفہ حضرت شاہ مدار صاحب تھے جو حضرت شاہ ابو المعالیؒ کے جانشین ہوئے اور انبیٹھہ ہی میں ساری عمر گذاری اور یہیں ان کا مزار ہے۔ (تذکرۃ الخلیل ص ۶۹۵)

Marfat.com

اصول پر ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک تیس سال متواتر چلتی رہی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اس تحریک کا مرکز یہی علاقہ تھا۔

بے شک خان عبدالغفار خاں اور اُن کے ساتھیوں "خدائی خدمت گاروں" کی بے شمار قربانیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ جانباز تھے جن کے خُونِ شہادت نے اضلاعِ صوبہ سرحد کے چپّہ چپّہ کو لالہ زارِ مظلومیّت بنایا مگر کون نہیں جانتا کہ ان پٹھان سرمستوں کو جس میکدہ سے بے خودی اور وارفتگی کی یہ دولت نصیب ہوئی تھی، وہ یہی دیوبند تھا جہاں علّامہ انور شاہ کشمیری[1] جیسا جہبذِ وقت بادۂ حرّیت کو شریعت کے جامِ زرّیں میں ڈھال رہا تھا اور قطبِ ارشاد مولانا سیّد حسین احمد جیسا مجاہدِ جلیل و علمبردارِ حرّیت اپنے نقشِ پا سے جادۂ حرّیت کے نشانات اُبھار رہا تھا۔

کیا آپ بھُول گئے "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کی برطانوی پالیسی کا پہلا حربہ "جُداگانہ انتخاب" جب تقریباً چالیس سال تک کام کرنے کے بعد کند ہونے لگا اور اُس نے ایک نئے حربہ، دو قومی نظریہ کو مقبولِ عام بنانے کیلئے نئے رنگروٹ

---

[1] ۱۹۲۸ء میں ہندوستان میں سائمن کمشن آیا تھا۔ اسی کے بائیکاٹ سے کانگریس کی تحریکِ آزادی میں جو ۱۹۲۲ء کے بعد سرد پڑ گئی تھی، دوبارہ گرمی آئی اور ۱۹۲۹ء میں لاہور میں انڈین نیشنل کانگریس نے مکمّل آزادی کی تجویز پاس کی۔ جس کی حمایت کرتے ہوئے ۱۹۳۱ء میں بازار قصّہ خوانی کا مشہور واقعہ پیش آیا۔ جس میں تقریباً ایک ہزار سرحدی پٹھان (خدائی خدمت گار) بیک وقت برطانوی فوج اور پولیس کی فائرنگ سے شہید ہوئے۔ سائمن کمشن سے کچھ پہلے ۲ دسمبر ۱۹۲۷ء، ۶ جمادی الاوّل ۱۳۴۶ھ پشاور میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس حضرت علّامہ مولانا سید انور شاہ صاحب کی زیرِ صدارت ہوا تھا۔ آپ نے اُس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا تھا "آزادی عطا نہیں کی جاتی بلکہ وہ طاقت و ہمّت سے حاصل کی جاتی ہے ص۳۳۔ اگر ہندوستان اپنی زندگی اور موت کا فیصلہ دوسروں سے کرانا چاہتا ہے ..... تو ابھی اس نے آزادی اور غلامی کے مفہوم ہی کو نہیں سمجھا (ص۳۵ و ۳۶)

Marfat.com

بھرتی کئے۔ نئی انجمنیں اور نئی محفلیں آراستہ کیں تو جس مجاہدِ حق پرست نے سب سے پہلے اس سیاسی طلسم کو چیلنج کیا، جس کی صدائے حق نواز نے ان انجمنوں اور ان محفلوں میں تہلکہ ڈال کر دہشت و اضطراب کی قیامت برپا کی اُس کے دائرہ عمل کا مرکز یہی علاقہ تھا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہ العزیز و نوّر مرقدہٗ اپنے اُستاذ محترم حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ہمراہ ریشمی رومال کی تحریک کے سلسلہ میں چار سال تک نظر بند رہنے کے بعد جب مالٹا سے رہائی پاکر ہندوستان پہنچے تو یہی علاقہ تھا جس نے اپنی عظمت و برتری کی دستار آپ کے قدموں میں ڈالی۔ ایک معزز مہمان کی طرح آپ کو سر اور آنکھوں پر بٹھایا اور آپ کی ہر ایک دعوت پر لبیک کہتے ہوئے جنگِ آزادی میں آگے بڑھ کر حصہ لیا۔ ملک میں دو قومی نظریہ کی ہوا چلنے لگی تو ڈٹ کے اس کی مخالفت کی اور جب ۱۹۴۶-۴۵ء میں تقسیم ہند کے سوال پر الیکشن ہوا تو تقریباً ہر ایک سیٹ پر اس کو شکست دی۔

مختصر یہ کہ جب اس علاقہ کی تقریباً ڈھائی سو سالہ تاریخ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو جس طرح وہ عزم و ہمت، بلندیٔ فکر، روشن خیالی، وطن پروری اور حریت نوازی کی ایک سنہری زنجیر نظر آتی ہے، جس کی کوئی بھی کڑی کہیں سے ٹوٹی ہوئی نہیں ہے تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے، ۱۸۵۷ء کے انقلابی دور میں اس علاقہ کا کردار کیا رہا، اور یہاں کے علماء و زعماء بالخصوص اُس طبقہ نے جو حضرت سیّد صاحب سے وابستہ تھا، کیا خدمت انجام دی۔

اس موقعہ پر تاریخ کے ایک طالب علم کی حیرانی ناقابلِ بیان ہو جاتی ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ صفحاتِ تاریخ پر مالاگڈھ اور فرخ نگر جیسے گمنام مقامات کے نام موجود ہیں، لیکن اس علاقہ اور اُس کے مجاہدین کا کوئی تذکرہ نہیں۔

Marfat.com

۱۸۵۷ء کے دہلوی مؤرخ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں کی ایک دلچسپ تحریر

دہلی کے مشہور مؤرخ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب نے اپنی مشہور کتاب "تاریخِ عروجِ عہدِ انگلیشیہ" کے تقریباً آٹھ سو صفحات ۱۸۵۷ء کی نذر کر دیئے ہیں۔ تعجب ہے ان آٹھ سو صفحات میں سے کوئی ایک صفحہ تو درکنار ایک سطر بھی اس علاقہ کے مجاہدین کے حصہ میں نہیں آسکی۔ ہاں اس کتاب کے صفحہ ۶۷۵ پر ایک عبارت ملتی ہے۔ سیاق و سباق سے بے جوڑ اور خود اپنے مفہوم کے اعتبار سے بھی ایک قسم کا معمہ ہے۔ مگر ہمارے موضوعِ کلام سے اس کا تعلق بہت گہرا ہے۔ لہٰذا آغازِ باب میں اس عبارت کو پیش کیا جا رہا ہے۔

شمس العلماء فرماتے ہیں :

"سب سے اوّل مولوی رحمت اللہ کیرانہ سے اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے۔ وہ بڑے عالم فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے رد میں صاحبِ تصنیف تھے۔ وہ قلعہ کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اُترے۔ اس دانش مند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی۔ بلکہ ایک ہنگامۂ فساد برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن چلا گیا۔

یہ مولانا رحمت اللہ صاحب کون ہیں؟ ان کی تشریف آوری کی کیا اہمیت تھی، اور جب وہ تحریک میں حصہ لئے بغیر واپس تشریف لے گئے تو پھر کیا بات رہ گئی تھی کہ اُن کا تذکرہ شمس العلماء نے ضروری سمجھا؟

حقیقت یہ ہے کہ مولانا رحمت اللہ مجاہدین کی ایک جلیل القدر جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے حالات کا جائزہ لینے کے لئے تشریف لائے تھے۔ شمس العلماء نے کسی وجہ سے[1]

---

[1] منشی ذکاء اللہ خاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کے بعد اگرچہ وہ پالیسی اختیار کی جس کے نتیجہ میں اُن کو انگریزی سرکار نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ مگر اس علاقہ کی جماعت سے جو ہمدردی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

اس جماعت کا نام[1] لینا یا اس کی طرف اشارہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر تاریخ کے ایک اہم واقعہ کی حیثیت سے نمائندہ جماعت کی تشریف آوری کو نظر انداز

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان کو شروع میں تھی غالباً وہ آخر تک اس کو ختم نہیں کر سکے منشی ذکاء اللہ خاں صاحب دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ جہاں حضرت مولانا مملوک علی صاحب نے مدرس اور صدر مدرس کی حیثیت سے اپنی زندگی ختم کی تھی۔ تھانہ بھون کی اس جماعت کے تمام بزرگ اور رہنما مولانا مملوک علی صاحب کے شاگرد اور ان کے عزیز و قریب تھے۔ یعنی شمس العلماء کے ہم سبق، شریک جماعت اور دوست احباب شمس العلماء کی یہ کتاب اگرچہ ۱۸۵۷ء سے تقریباً پندرہ سال بعد طبع ہوئی ہے جب کہ ۱۸۵۷ء کے مقدمات کی مسلیں داخل دفتر ہو چکی ہوں گی۔ مگر دوسری تحریک یعنی علمائے صادق پور کی زیر قیادت وہابی تحریک کے اثرات شدّ و مد سے پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے شکوک و شبہات کا دور باقی تھا۔ اس علاقہ کے بزرگ خاص مقاصد کے پیش نظر ایک عظیم الشان ادارہ دیوبند میں قائم کر چکے تھے، اور دوسری طرف انہیں حضرات نے حجازِ مقدس میں بساطِ سیاست بچھا رکھی تھی۔ اور یہی مولانا رحمت اللہ قسطنطنیہ پہنچ کر ترکی سلطان کے یہاں اعتماد حاصل کر چکے تھے۔ ان وجوہات کی بناء پر شمس العلماء نے اس پوری جماعت کے تذکرہ کو قصداً نظر انداز کیا اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے متعلق بھی جو بات لکھی، وہ ان واقعات کے خلاف تھی جو بعد میں نمودار ہوئے۔ اس طرح تاریخ کے حق میں ایک کوتاہی ضرور ہوئی مگر جماعتی مفاد کے پیش نظر اس کوتاہی کا ارتکاب قرینِ مصلحت اور نہایت ضروری تھا۔ محمد میاں

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] جو صاحب حالات سے ذاتی طور پر واقفیت رکھتے ہیں انہیں اس بات کو تسلیم کرنے میں تامّل نہیں ہوگا کہ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں اور اسی طرح دوسرے مؤرخین نے صرف انہیں کے نام لئے ہیں جو مر چکے تھے یا کسی طرح گرفت میں آ چکے تھے۔ اور جو لوگ محفوظ رہ گئے تھے اُن کو قصداً یا لاعلمی کی بناء پر نظر انداز کر دیا، اور تحقیق کی جائے تو صرف تھانہ بھون کے بزرگ ہی نہیں، بلکہ ایسے افراد کی تعداد بہت زیادہ ملے گی جن کے نام نہیں لئے۔

Marfat.com

بھی نہ کر سکے۔

مجاہدین کی یہ جماعت وہی ہے جس نے شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی زیرِ قیادت اس علاقہ میں کام کیا۔ جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آرہی ہے۔

بظاہر یہ صحیح ہے کہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے اُس وقت کے حالات دیکھ کر یہی رائے قائم کی جو شمس العلماء نے تحریر فرمائی ہے۔ لیکن آخر تک مولانا رحمت اللہ اور اُن کی جماعت اس تحریک سے کنارہ کش نہیں رہی۔ جہاد کا وہ فتویٰ جس پر اسی کتابچہ میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے، اس پر ایک دستخط "رحمت اللہ" کے بھی ہیں۔ جانے پہچانے مولانا رحمت اللہ یہی ہیں اور اس دستخط کی شہادت یہ ہے، کہ مولانا رحمت اللہ اور ان کی جماعت نے تحریک میں پوری سرگرمی سے کام کیا۔ البتہ یہ بھی صحیح ہے کہ شروع میں نہیں بلکہ اُس وقت جب جنرل بخت خاں اور امیر جماعت مولانا سرفراز علی صاحب نے دہلی پہنچ کر تحریک کو منظم کر لیا اور انقلابی کارروائیوں میں باضابطہ جہاد کی شکل پیدا کر دی۔ خود مولانا رحمت اللہ صاحب کے تحریک میں حصہ لینے اور شکست کے بعد ہندوستان سے ہجرت کرنے کی تفصیل مولانا موصوف کے پوتے مولانا کے پوتے مولانا محمد عارف الاسلام عثمانی الجلالی کے بیان سے واضح ہوگی جو بعد میں پیش کیا جائے گا۔

مولانا کے علاوہ دوسرے بزرگوں کے کارناموں کے متعلق ذیل کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

تذکرۃ الرشید جلد اوّل کے اقتباسات | اس کتاب کے مؤلف و مرتب مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی ہیں (رحمہ اللہ) آپ ۱۸۵۷ء کے مشاہدین میں سے نہیں ہیں لیکن مشاہدہ کرنے والوں کو آپ نے قریب سے دیکھا ہے اور بہت سے مردانِ کار کے حالات خود اُن کی زبانی سُنے ہیں۔ مگر چونکہ تذکرۃ الرشید کی تصنیف و ترتیب کا

Marfat.com

وہ وقت تھا جب برطانوی سامراج کا نقطۂ عروج خطِ استواء پر پہنچا ہوا تھا اور نہ صرف زبان اور قلم بلکہ لوگوں کے ضمیر بھی اس کی عظمت و ہیبت سے متاثر تھے۔ تو آپ کو بھی اپنی تحریر میں وقت کے تقاضے کی تعمیل کرنی پڑی ہے۔ انتہا یہ کہ بعض چیزوں کے اعتراف و اقرار کے لئے بھی انکار کا پیرایہ اختیار کرنا پڑا ہے۔

امامِ ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات لکھتے وقت یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ۱۸۵۷ء اور اُس کے نتائج و اثرات مابعد کا ذکر ہی نہ کریں اور شمس العلماء کی طرح دامن بچا کر نکل جائیں۔ البتہ تقاضائے وقت یا اپنے طبعی میلان کے باعث آپ نے اپنے بزرگوں کو الزام سے بچانے کی کوشش زیادہ سے زیادہ کی ہے چنانچہ اس علاقہ میں بغاوت کا اصل بانی اور علمبردار جناب قاضی عنایت علی صاحب[1] رئیس تھانہ بھون کو قرار دیا ہے اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے جو بیعت کی گئی تھی، اس کی تاویل یہ کی:

> اس بدامنی کی حالت میں عام باشندگانِ قصبہ (تھانہ بھون) کی حالت یہ ہوئی کہ گویا اُن کا مُربّی و منتظم بادشاہ سر سے اُٹھ گیا اور شرعی و طبعی ضروریات و مخصصات میں بھی کوئی خبر گیراں نہ رہا جس کی رائے پر عمل کریں۔ پس یہ لوگ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گذران دشوار ہے کیونکہ گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اُٹھا لیا، اور بذریعہ اشتہارِ عام اطلاع دے دی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہیئے۔ اس لئے آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں اس لئے دنیاوی نظمِ حکومت کا بار بھی اپنے سر رکھیں اور امیر المؤمنین بن کر ہمارے باہمی قضیئے چکا دیا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰحضرت کو

---

[1] قاضی صاحب کے حالات ص۵۴۲ پر ضمیمہ میں ملاحظہ فرمایئے۔

Marfat.com

اُن کی درخواست کے موافق اُن کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا اور آپ نے دیوانی و فوجداری کے جُملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے موافق چند روز تک قاضی شرع بن کر فیصل بھی فرمائے۔ اسی قصہ نے مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مخبروں کو جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا۔ حضرت امام ربّانی (مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی) قدس سرہٗ دس برس ہوئے، اعلیٰ حضرت کو اپنے دین و دنیا کا سردار بنا ہی چکے تھے۔ ہمیشہ آمد و رفت رہتی ہی تھی۔ اب جب کہ ہر طرف بدامنی تھی آپ کے لئے یہاں رہنے سے زیادہ بہتر کوئی جگہ دنیا میں نہ تھی۔ ادھر اعلیٰ حضرت (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب) کو حکومت کے فیصلے اور شرعی قضا میں مولوی کی ضرورت تھی کہ حق بات میں اعانت کرتا رہے۔ اس لئے آپ اور مولانا محمد قاسم صاحب مع دیگر خدّام کے یہیں رہ پڑے۔[1]

مولانا عاشق الٰہی صاحب کی تاویل کی حقیقت کچھ بھی ہو، مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوگیا کہ:

۱: تھانہ بھون ایک مرکز بنایا گیا۔

۲: سیّدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ امیر مقرّر کئے گئے۔

۳: اُن کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

۴: ایک نظام حکومت قائم کیا گیا جس میں فصل خصومات یعنی عدالت جیسے محکمے حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے سپرد کئے گئے۔

تشکیلِ حکومت کے بعد وقت کے مناسب اور ضرورت کے عین مطابق ان بزرگوں نے جو اقدام کیا، مولانا عاشق الٰہی صاحب کے ایک انکاری بیان میں اس کا

---

[1] تذکرۃ الرشید جلد اوّل صـ۷۴

Marfat.com

اعتراف بھی ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا موصوف تحریر فرماتے ہیں (رحمہ اللہ)۔

جب بغاوت و فساد کا قصہ فرو ہوا اور رحم دل گورنمنٹ نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی، تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں۔ انہوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا اور یہ مخبری کی کہ تھانہ بھون کے فساد میں اصل اصول یہی لوگ تھے، اور شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والا یہی گروہ تھا۔ بستی کی دکانوں کے چھپر تحصیل کے دروازہ پر انہوں نے جمع کئے اور ان میں آگ لگا دی۔ یہاں تک کہ جب آدھے کواڑ جل گئے تو ابھی آگ بجھنے بھی نہ پائی تھی کہ ان نڈر ملانوں نے جلتی آگ میں قدم بڑھائے، اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر خزانۂ سرکار کو لوٹا تھا۔[1]

یہ دو اقتباس مولانا عاشق الٰہی صاحب کی تصنیف سے پیش کئے گئے ہیں ان میں ضرورت سے زیادہ اجمال اور اختصار سے کام لیا گیا ہے، تب بھی یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اس علاقہ کے سرفروشان حریت نے "تھانہ بھون" کو مرکز بنا کر تحریک میں حصہ

---

[1] تذکرۃ الرشید جلد اوّل ص۷۶۔ اس کے بعد مولانا عاشق الٰہی صاحب ان بزرگوں کی صفائی میں رقم طراز ہیں۔ "حالانکہ یہ کمل پوش، فاقہ کش، نفس کش حضرات فسادوں سے کوسوں دور تھے۔ ملک و مال کے جھگڑے اگر سر کتے تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی۔ کوئی کلیر کا ڈپٹی ہوتا اور کوئی کہیں کا صدر الصدور کچہری کے عالی شان کمرے اور عدالت کے وسیع اور اونچی چھتوں والے مکانات کو چھوڑ کر قبر کی تنگی یاد دلانے والے حجروں اور کھرے بوریہ کے فرش والے تاریک گوشوں میں کیوں پڑتے۔ مگر

کون سنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری

(تذکرۃ الرشید جلد اوّل ص۷۶)

Marfat.com

لیا اور جرأتِ مردانہ سے وہ سب کچھ کیا جو انگریزوں کی جڑیں اُکھاڑنے کیلئے دوسرے مقامات پر کیا گیا تھا۔

اب اس مجمل اور مختصر کی کسی قدر تفصیل پیش کی جا رہی ہے اور ضرورت کے مطابق ذمہ دار بزرگوں کے مختصر حالات بھی لکھے جاتے ہیں۔

واقعاتِ تھانہ بھون و شاملی

اور تعارفِ رہنما

تعارفِ رہنما حضرت حاجی امداد اللہ صاحب[1] فاروقی تھانوی جن کو امیر اور رہنما منتخب کیا گیا تھا جو بعد میں شیخ العرب والعجم اور قطب العالم تسلیم کئے گئے ۱۲۳۳ھ[2] (۱۸۱۸ء) میں "نانوتہ" میں پیدا ہوئے جہاں آپ کی ننھیال تھی۔ آپ کی فطری صلاحیتوں کے متعلق مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے:

آپ کی طبیعت عالمانہ رنگ کی نہ تھی۔ امیر شہید (حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ) سے ملتی جلتی طبیعت رکھتے تھے۔ اسی لئے وہ سید صاحب

---

[1] والدین کا رکھا ہوا نام امداد حسین تھا اور جب آپ ۱۲۶۰ھ میں جب کہ عمر تقریباً ۲۷ سال تھی، حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ نے آپ کا نام بدل کر امداد اللہ رکھ دیا۔ (التمہید بحوالہ سیاسی تحریک ص۱۸۳)۔

[2] روز چہارشنبہ ۱۳ جمادی الاول ۱۳۱۷ھ تاریخ وفات ہے۔ عمر ۸۴ سال، تین ماہ بیس دن (ضمیمہ جدیدہ کراماتِ امدادیہ از حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ) اس حساب سے تاریخِ ولادت ۲۳ صفر ۱۲۳۳ھ (۳ جنوری ۱۸۱۸ء) ہوگی۔ دو سال پہلے ۱۲۳۱ھ میں حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ اس علاقہ کا دورہ فرما چکے تھے۔

Marfat.com

کا نمونہ تھے[1]

تعلیم ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے وطن میں پائی۔ پھر آپ[2] دہلی تشریف لے گئے۔ دہلی کے بہت سے مکتبوں اور مدرسوں میں مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی کی بھی ایک درس گاہ تھی جہاں علمِ ظاہر کے ساتھ عشق و معرفت کا درس بھی دیا جاتا تھا[3]۔

---

[1] حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے آپ کے اساتذہ میں شیخ محمد قلندر اور شیخ الٰہی بخش کاندھلوی رحمہما اللہ کا نام بھی لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں اخذ عن الشیخ محمد قلندر و الشیخ الٰہی بخش الکاندھلوی و اخذ عن الشیخ نصیر الدین الدھلوی (التمہید بحوالہ سیاسی تحریک ص۱۸۳)۔ [2] خود حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے۔ ہم نے ایک باب اور دیباچہ گلستان کا اور ایک باب بوستاں کا اور کچھ مفید نامہ اور کچھ دستور المبتدی اور چند ورق زلیخا کے پڑھے تھے۔ اور حصن حصین حضرت قلندر صاحب سے پڑھی۔ بعد میں شوق ورد و وظائف کا ہوا، اور دہلی میں آکر حضرت شاہ نصیر الدین دہلوی سے بیعت کی۔ بعد اُن کے وصال کے پھر کسی کامل کی جستجو ہوئی (کراماتِ امدادیہ ص۸)۔ [3] چنانچہ نوجوان امداد اللہ نے جس طرح مولانا نصیر الدین صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، سی پارہ دل کے اوراق بھی اسی اُستاد کے سامنے کھول کر رکھ دیئے۔ یہ تلمذ اور یہ بیعت جس جذبہ اور اخلاص کے ساتھ ہوئی تھی، اس کا اندازہ خود آپ کے ایک بیان سے ہوتا ہے جس کے راوی حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ہیں۔ مولانا تھانوی اپنے رسالہ کراماتِ امدادیہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ آپ نے (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے) فرمایا کہ ظاہر میں اوّل بیعت میری طریقہ نقشبندیہ میں حضرت نصیر الدین صاحب دہلوی خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق صاحب سے ہوئی اور باطن میں بلا واسطہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک بلند جگہ پر رونق افروز ہیں اور حضرت سید احمد شہید کا ہاتھ آپ کے دست مبارک میں ہے، اور میں بھی اسی مکان میں بوجہ ادب کے دُور کھڑا ہوں۔ حضرت سید صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے دیا۔

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی کا ذکرِ خیر ابتداء میں گذر چکا ہے۔ یہ حضرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ایک اور روایت بھی ملاحظہ فرمائیے تاکہ حضرت حاجی صاحب کے سلسلۂ بیعت کی پوری پوری تفصیل سامنے آجائے۔ حضرت مولانا تھانویؒ، مولانا عبدالغنی صاحبؒ عظیم آبادی رحمہما اللہ کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت حاجی صاحبؒ نے خواب میں دیکھا کہ مجلس اعلیٰ واقدس سرورِ عالم مرشدِ اتم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وازواجہٖ واتباعہٖ وسلم میں حاضر ہوں۔ غایت رُعب سے قدم آگے نہیں بڑھتا ہے کہ ناگاہ میرے جدِّ امجد حضرت حاجی حافظ بلاقی صاحب رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور میرا ہاتھ پکڑ کر حضورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچا دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر حوالہ ایک بزرگ کے کر دیا اور اس وقت تک بعالم ظاہر حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی اور کسی طرح کا تعارف بھی نہیں تھا۔ حاجی صاحب بیان فرماتے ہیں کہ جب میں بیدار ہوا، عجیب انتشار وحیرت میں مبتلا ہوا کہ یارب یہ کون بزرگوار ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دے دیا اور خود مجھ کو اُن کے سپرد فرما دیا اسی طرح کئی سال گذر گئے۔ ایک دن حضرت اُستاذی مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی، رحمہ اللہ تعالیٰ نے میرے اضطرار کو دیکھ کر بکمال شفقت وعنایت فرمایا کہ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ موضع لوہاری یہاں سے قریب ہے، وہاں جاؤ اور حضرت میاں جی نور محمد صاحب سے ملاقات کرو، شاید مقصودِ دلی کو پہنچو اور اس حیض بیض سے نجات پاؤ۔ چنانچہ میں نے فوراً پا پیادہ لوہاری کی راہ لی۔ آستانہ شریف پر حاضر ہوا، اور جیسے ہی جمال باکمال جناب شان (حضرت میاں جی نور محمد صاحب) ملاحظہ کیا۔ صورتِ انور کو خواب میں دیکھا تھا، بخوبی پہچانا۔ اور محوِ دارافتگی ہو کر قدموں میں گر پڑا۔ حضرت میاں جی صاحب نے میرا سر اُٹھایا اور سینہ نورِ گنجینہ سے لگا لیا اور بکمال رحمت وعنایت فرمایا کہ تم کو اپنی خواب پر کامل وثوق ویقین ہے یہ حضرت میاں جی صاحب کی پہلی کرامت تھی جس نے میرے دل میں اُن کی محبت مستحکم کر دی۔ (ص ۲۴، ۲۵ کراماتِ امدادیہ) کرامت یہ ہے کہ ملاقات ہوتے ہی خواب پر تبصرہ فرما دیا (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

سید احمد صاحب شہیدؒ کے درس گاہِ معرفت و سیاست کے فاضل تھے اور اب اس جھنڈے کو بلند کرنے کی کوشش کر رہے تھے، جو حضرت سید صاحب کی شہادت کے بعد سرنگوں ہو گیا تھا۔

نوجوان امداد اللہ ابھی درجہ وسطیٰ کی کتابیں پڑھ رہا تھا کہ حضرت مولانا نصیر صاحب دہلوی کے جہادی قافلہ نے اپنا کوچ شروع کر دیا (۳ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۲ اپریل ۱۸۳۵ء)۔

حضرت اُستاد کے اس سفر نے دل و دماغ پر ایسا اثر کیا کہ کتابوں کی ورق گردانی بار معلوم ہونے لگی[1]۔ البتہ با احساس فطرت نے حضرت استاذ کے پاک اور مقدس جذبات سے جو سبق لیا، وہ عمر بھر فراموش نہ ہوا۔

مکتبِ عشق کا یہ دستور نرالا دیکھا
اس کو چھٹی ہی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

صرف پانچ سال ہی گذرے تھے کہ حضرت سید نصیر صاحب دہلوی ۱۸۴۰ء ۱۲۵۶ھ میں خدا کو پیارے ہوئے اور اُن کے خسر حضرت مولانا شاہ اسحٰق صاحب دہلوی نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حالانکہ اس سے پہلے اس کا کوئی تذکرہ نہیں آیا تھا۔ مختصر یہ کہ حضرت حاجی صاحب نے پہلے بیعت حضرت سید نصیر الدین صاحب سے کی تھی۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت میاں جی نور محمد صاحب سے طریقۂ چشتیہ میں بیعت کی۔ آپ کی زیر تربیت مراحل سلوک طے کر کے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ رحمہما اللہ۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] آپ نے رواج کے مطابق درسی کتابوں کی تکمیل نہیں کی تھی۔ مگر مطالعہ سے آپ نے وسیع معلومات حاصل کر لی تھیں۔ احادیث پر آپ کی نظر بہت وسیع تھی۔ اور اسرارِ شریعت و طریقت کے ماہر تھے۔ جیسا کہ آپ کی تصانیف اور آپ کے ارشادات سے جو کمالاتِ امدادیہ وغیرہ میں نقل کئے گئے ہیں، معلوم ہوتا ہے۔

(ملاحظہ ہو کراماتِ امدادیہ کرامت ۳۸)

Marfat.com

سفرِ آخرت اختیار کر کے مکہ معظمہ کو تحریک کا مرکز بنا لیا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی تحقیق کے بموجب اگرچہ اب مرکز مکہ معظمہ ہو گیا تھا جہاں ترکوں اور اُن کے حلیفوں سے مدد لے کر ہندوستان کی تحریکِ حریت کو کامیاب بنایا جا سکتا تھا لیکن ہندوستان کے سیاسی مرکز یعنی دار السلطنت میں ایک نظام کے قائم رکھنے اور ترقی دینے کی پھر بھی ضرورت تھی۔ جس کے لئے پہلے مولانا مملوک علی صاحب کی زیرِ صدارت[1] ایک بورڈ بنایا گیا، جس کے خصوصی ارکان حضرت مولانا

---

[1] مولانا مملوک علی رحمۃ اللہ علیہ جن کے متعلق سر سید صاحب تحریر فرماتے ہیں آپ کو علمِ معقول و منقول میں استعدادِ کامل اور کتبِ درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے تو اُن کے لوحِ حافظہ سے پھر اُن کی نقل ممکن ہے (آثار الصنادید) ان کا اصل وطن قصبہ نانوتہ (ضلع سہارن پور) ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت قاسم بن محمد ابن ابی بکر صدیقؓ سے وابستہ ہے۔ آپ سے چار پشت اوپر آپ کے مورث جناب شیخ محمد ہاشم صاحب رحمہ اللہ نانوتہ تشریف لائے تھے۔ سلطان عالمگیرؒ کی طرف سے آپ کو یہاں جاگیر بھی دے دی گئی تھی۔ آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا رشید الدین صاحب، (شاگرد رشید حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب قدس اللہ سرہم) کا اسمِ گرامی خاص طور پر مستحقِ تذکرہ ہے۔ عرصہ دراز تک دہلی کی عربی یونیورسٹی میں جو اُس وقت مدرسہ شاہجہان آباد یا مدرسہ غازی الدین کہلاتا تھا، عربی علوم و فنون کا درس دیتے رہے۔ پھر یہاں شعبۂ عربی کے صدر بنا دیئے گئے۔ اس دَور کے بلند پایہ فضلاء اور علماء زیادہ تر آپ ہی کے شاگرد تھے۔ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی۔ امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سر سید احمد صاحب (بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی (صاحب ترجمہ) شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب اور آپ کے فرزند رشید حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جو دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس بنائے گئے جو اپنے والد ماجد کی طرح علومِ عقلیہ و نقلیہ کے بہترین فاضل اور جامع ترین شخصیت تسلیم کئے جاتے تھے۔ تقویٰ، طہارت اور تزکیۂ باطن (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

قطب الدین صاحب[1] دہلوی، مولانا مظفر حسین[2] صاحب کاندھلوی اور مولانا عبد الغنی[3]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں بھی آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ چنانچہ آپ جس طرح فقیہ شریعت تھے ایسے ہی شیخ طریقت بھی تھے۔ یہ سب آپ کے شاگرد تھے۔ مولانا مملوک علی صاحب کا چونکہ مستقل قیام دہلی میں رہتا تھا، اس لئے آپ نے کوچہ چیلاں میں مکان بھی خرید لیا تھا۔ سرکاری درس گاہ میں سالہا سال ملازم رہنے کے باوجود انگریز سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ ریزیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آتے تو آپ کے علم اور رتبے کے خیال سے ہاتھ ملایا۔ جب تک صاحب بہادر وہاں رہتے تو مولانا نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے جسم کو کئی بار دھویا۔ (دہلی کی آخری شمع از مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب فرحت دہلوی) ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰ء) میں آپ نے دہلی میں وفات پائی اور یہیں مہندیوں میں (جہاں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور اُن کے فرزندانِ گرامی کے مزارات ہیں) آپ دفن کئے گئے رحمۃ اللہ علیہ (سوانح قاسمی، جلد اوّل۔ سیاسی تحریک۔ آثار الصنادید۔ دہلی کی آخری شمع وغیرہ)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] مولانا قطب الدین صاحب خلف نواب غلام محی الدین خاں بہادر ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۴ء) میں پیدا ہوئے۔ ۶ نومبر ۱۸۴۶ء، ذی الحجہ ۱۲۶۲ھ کو والد کی جگہ آپ کو بہادر شاہ بادشاہ نے خلعت اور خطاب عطا فرمایا۔ اب پورا نام یہ ہو گیا — فخر الاسلام نواب محمد قطب الدین خاں بہادر۔ آپ کے متعلق سرسیدؒ تحریر فرماتے ہیں۔ تحصیلِ علم و فضل خصوصاً فقہ و حدیث خدمت بابرکت مولانا اسحاق صاحب مرحوم و مغفور سے کی۔ اتباعِ شریعت میں سب پیش روانِ مسلکِ دین سے آپ کا قدم آگے بڑا ہوا ہے۔ وضع اور لباس میں اپنے استاد عالی نہاد سے ایسے مشابہ ہیں کہ جس نے اُن کو نہ دیکھا ہو، ان کو دیکھ لے۔ اخلاق و علم کے علاوہ فضل و کمالِ علمی ایسا آپ کی ذات میں جمع ہے کہ اوروں میں بہت کم پایا گیا۔ تقوی اور ورع (پرہیزگاری) کا تو حساب ہی نہیں آپ کے اجداد والا تبار اعلی خاندان والا دودمان ہمیشہ پیش گاہ سلطنت سے مناصب جلیلہ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) رکھتے تھے۔ اب اس جزو زمان میں بھی آپ کو تقرب حضرت سلطانی سے وہ عزت وجاہ حاصل ہے جو چاہیئے۔ چوتھے دن اپنے اُستاد کی پیروی اور خلق کی رہنمائی کے لئے مجلسِ وعظ منعقد فرماتے ہیں۔ اکثر رسائل زبان ریختہ میں (اُردو میں) فوائدِ عوام کے لئے تحریر کئے اور ان میں مسائلِ ضروریہ ہر طرح کے مندرج فرمائے۔ اور حق یہ ہے کہ ان رسالوں سے خلق کو بہت فائدہ ہوا کہ ضروریاتِ دین سے ہر شخص مطلع اور آگاہ ہوگیا اللّٰھمّ زد فزد۔ اب جو شخص راہِ خدا پر چلے گا، ثواب اس کا انہیں کے جریدۂ اعمال میں درج ہوگا (تذکرہ اہل دہلی از سرسید صـ۸۳)۔ آپ کے تراجم اور تصنیفات میں چند مشہور کتابیں جو آج تک مقبول ہیں یہ ہیں۔ مظاہر حق ترجمہ اردو مشکوٰۃ شریف۔ ظفر جلیل ترجمہ اُردو حصنِ حصین۔ جامع التفاسیر خلاصہ جامع صغیر وغیرہ وغیرہ تقریباً ۲۵ تصانیف (ملاحظہ ہو حدائقِ حنفیہ صـ۴۸۸) بہرحال قدرت کی فیاضیوں نے جس طرح آپ کو دین اور دُنیا کی دولتیں عطا فرمائی تھیں، تاریخ میں اس کی نظیریں بہت کم ہیں۔ آپ چوتھے پانچویں سال زیارت بیت اللہ شریف کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء سے پندرہ سال بعد ۱۸۷۲ء (۱۲۸۹ھ) میں مکہ معظمہ میں انتقال کیا۔ "مُروّجِ احکامِ شریعت" تاریخ وفات ہے (حدائق الحنفیہ صـ۴۸۸)

۲۔ مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی۔ مولانا محمد بخش صاحب کے فرزندِ رشید اور اس دور کے مشہور عالم، مفتی اور مجاہد حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کے برادر زادہ ہیں۔ (مولانا محمود بخش صاحب اور مفتی الٰہی بخش صاحب دونوں حقیقی بھائی ہیں) مفتی الٰہی بخش صاحب کا ذکرِ خیر شاندار ماضی جلد دوم میں گذرا۔ آپ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے مشہور تلامذہ میں سے تھے۔ حضرت سیّد احمد صاحب شہیدؒ کی تحریک کے بہت بڑے حامی اور مددگار۔ علم وفضل اور تقویٰ طہارت، غرض ہر لحاظ سے آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ مثنوی مولانا روم کے دفترِ ہفتم کی تکمیل آپ نے ہی کی۔ مولانا مظفر حسین صاحب نے ابتدائی تعلیم انہیں مفتی صاحب سے حاصل کی۔ اُن کی وفات کے بعد آپ دہلی آئے اور حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں داخل ہو کر آپ نے تکمیل کی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

دہلوی تھے۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور شاہ صاحب کے بھائی مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے بیعت ہوکر مراحلِ سلوک طے کئے۔

سادہ زندگی کے عادی تھے۔ گاڑھے کا کُرتہ پاجامہ اور نیلی لنگی، آپ کا لباس تھا۔ ایک مرتبہ آپ کی صاحبزادی نے موٹی ململ کا کُرتا بنا دیا۔ آپ نے جمعہ کے روز باصرار پہنا اور نماز کے بعد اُتار کر واپس کر دیا کہ اس سے طبیعت میں تکبّر پیدا ہوتا ہے۔ آپ ہمیشہ پیدل سفر کرتے۔ سواری پر کبھی سوار نہ ہوتے تھے۔ لوٹا، لُنگی، چھڑی اور ایک مشکیزہ رختِ سفر ہوتا تھا۔ جہاں رات ہو جاتی، وہیں قیام فرما لیتے۔ آپ نے درس تدریس کا سلسلہ نہیں رکھا اصلاحی وعظ آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ آپ نے بہت سی اصلاحی خدمات بھی انجام دیں وہ تبلیغی سلسلہ جس کی آج کل پورے ہندوستان بلکہ بیرونِ ہند میں بھی دھوم ہے، اس کے بانی حضرت مولانا الیاس صاحبؒ انہیں مولانا مظفر حسین صاحب کی صاحبزادی کے نواسہ تھے۔ چھ مرتبہ آپ نے حج بیت اللہ کیا۔ جب ساتویں مرتبہ آپ حج کے لئے تشریف لے گئے تو ۱۰ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ، ۲۵ مئی ۱۸۶۶ء کو مدینہ منورہ میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ جنّت البقیع میں خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مزار شریف کے قریب آپ کو خواب گاہ میسّر ہوئی۔ کُرتا، پاجامہ، لُنگی، لوٹا اور مشکیزہ آپ کا کُل ترکہ تھا حسبِ وصیت لوٹا اور مشکیزہ بیت المال میں داخل کر دیا گیا لُنگی مریدین میں تقسیم کر دی گئی۔ کُرتا، پاجامہ صاحبزادیوں کے پاس بھیج دیا گیا۔ جس میں سے پاجامہ معتقدین میں تقسیم کر دیا گیا۔ کُرتا بطور تبرک صاحبزادیوں کے پاس رہا۔ (ملاحظہ ہو تذکرۃ الخلیل مصنفہ مولانا عاشق الٰہی صاحب از ص۵۱ تا ص۵۶)۔

[3] مولانا شاہ عبدالغنی صاحب محدث خلف شاہ ابوسعید صاحب جلیل القدر عالم حضرت مولانا شاہ اسحٰق صاحبؒ کے شاگردِ رشید اور آپ کے جانشین ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد آپ نے ہجرت فرمائی اور تقریباً ۱۹ سال حجاز مقدس میں قیام کرنے کے بعد ۱۲۹۹ھ ۱۸۸۸ء میں آپ نے مدینہ طیبہ میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص۱۸۱ و ص۱۸۳۔

Marfat.com

اور جب ۱۲۶۱ھ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب پہلی بار حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تو مولانا شاہ اسحاق صاحبؒ نے حاجی امداد اللہ صاحب کو اسی کام کے لئے مقرر فرما دیا۔[1] مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور تصنیف "التمہید" میں فرماتے ہیں :-

جاء الامیر امداد اللہ	امیر جماعت حضرت حاجی امداد اللہ
الی الحرمین فی سنہ ۱۲۶۱	صاحب (جو ۱۲۶۱ھ میں وطن سے
ولقی الشیخ محمد اسحاق	روانہ ہوئے تھے) ۱۲۶۱ھ میں مکہ معظمہ
واخذ عنہ طریق	پہنچے۔ حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب
الدعوۃ ثم عاد الی	کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے
الھند فی سنہ ۱۲۶۲ھ	تحریک کا لائحہ عمل اور پروگرام معلوم
وقصدہ الناس من	کیا۔ پھر ۱۲۶۲ھ میں ہندوستان
اطراف البلاد واجتمع	واپس ہوئے۔ وہ لوگ جو اس سلسلہ
علیہ الاکابر اھل	سے وابستہ تھے انہوں نے حضرت
العلم مثل مولانا محمد	حاجی صاحب کو اپنے تعلقات کا
قاسم ومولانا رشید	مرکز بنا لیا۔ اکابر اہل علم مثلاً حضرت
احمد والشیخ فیض الحسن	مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی،
السھارنفوری وجمع	مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی،
کبیر من علماء الھند۔[2]	مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری

اور ان کے علاوہ علماء ہند کی جمع کبیر (ایک بڑی جماعت) آپ کے گرد جمع ہو گئی۔

یہ جمع کبیر اور جماعتِ کثیر جو حضرت حاجی صاحب کے گرد جمع ہو گئی تھی، اگر اس کے ناموں کا کوئی رجسٹر ہوگا تو ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں ضائع ہو گیا ہوگا۔

---

[1] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص۱۸۱ و ص۱۸۲ ۔ [2] ایضاً ص۱۸۲ حاشیہ۔

Marfat.com

سو سال کے بعد تو اس کا تو کوئی پُرزہ بھی دستیاب نہیں ہو سکتا، البتہ جو بیانات چند سطروں کے بعد آپ کے سامنے آنے والے ہیں، اُن کی بنا پر چار ناموں کا اور اضافہ کر لیجئے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، جس کا تذکرہ شمس العلماء نے دوسرے انداز سے کیا ہے۔ مولانا محمد مظہر صاحب، مولانا محمد منیر صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی۔

جہاد ۱۸۵۷ء یہاں دوبارہ اس بحث کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی ابتداء جیسے انگریزوں کے حق میں اچانک تھی، ایسے ہی انقلابی جماعتوں کے حق میں بھی دفعۃً تھی۔ پس جو لوگ کسی جماعت سے منسلک نہیں تھے، اُن کے لئے آسان تھا کہ وہ پہلی ہی فرصت میں شرکت یا علیحدگی کا فیصلہ کر لیں۔ لیکن جو اپنی زندگی کسی نظام سے وابستہ کئے ہوئے تھے، اُن کے لئے یہ جلد بازی درست نہیں تھی کہ اپنے مرکزی نظام یا جماعت کے فیصلے سے پہلے ذاتی طور پر کوئی فیصلہ کر کے کام شروع کر دیں۔

پس یہ جماعت جو شاہ ولی اللہ کی جماعت کہلانے کی صحیح طور پر مستحق تھی جیسے ہی رمضان شریف کے آخر میں اس کو دہلی کے انقلاب کی خبر پہنچی تو غور و خوض کا ایک اہم موضوع اس کے سامنے آیا جس کے لئے ہنگامی اجلاس ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو نانوتہ[1] اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب کو گنگوہ[2] سے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ان دنوں سہارن پور تھے، اُن کو وہاں سے طلب کیا گیا[3] اور اسی موقع پر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کو تحریک کی حقیقت و نوعیت معلوم کرنے کے لئے دہلی بھیجا گیا۔ مئی کے آخر یا جون کے شروع میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب دہلی پہنچے، اس وقت تک تحریک بوڑھے بادشاہ اور ناز پروردہ شہزادوں کی ناتجربہ کاریوں کے حوالہ تھی۔ انقلابی سپاہیوں نے بے شک نام قیادت

---

[1] سوانح قاسمی ص۱۵۵ جلد ۲۔ [2] تذکرۃ الرشید جلد ۱ ص۷۴۔ [3] سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب از مولانا محمد یعقوب صاحب۔

Marfat.com

انہیں کے حوالہ کی تھی لیکن کسی سنجیدہ یا اصولی جماعت کے لئے ان پر اعتماد کرنا بہت مشکل تھا۔ اس وقت جو بدنظمی اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی، اس کو دیکھ کر مولانا رحمت اللہ صاحب کو وہی فیصلہ کرنا چاہیئے تھا جو شمس العلماء نے بیان کیا۔

تنظیمِ نو یا تشکیلِ حکومت لیکن یہ مردانِ احرار جو سالہا سال سے حرّیتِ کاملہ اور مکمّل آزادی کی تمنّائیں دلوں میں لئے ہوئے تھے جن کے دماغوں نے خدا جانے کتنے نقشے بنائے اور بگاڑے تھے، اُن کیلئے یہ بات بہت ہی تکلیف دہ اور افسوس ناک تھی کہ ایسے وقت جب کہ فضا اس قدر ہموار اور ماحول اتنا سازگار ہو، وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھے رہیں، اور موسم کی خوش گوار تبدیلی سے کچھ بھی فائدہ نہ اُٹھائیں لیکن جس شریعتِ غرّا اور جس پاک تعلیم کی روشنی میں وہ آگے قدم بڑھا سکتے تھے، اس کی پہلی شرط یہ تھی کہ جو قدم بھی بڑھایا جائے، وہ ضبط و نظم، سنجیدگی اور قانون کی پوری پابندی کے ساتھ آگے بڑھے۔ بہر حال اس پہلے اجتماع میں اتنا کام تو کر لیا گیا کہ وہ جماعتی نظم جو اب تک ایک (اصلاحی یا سیاسی) پارٹی کی حیثیت رکھتا تھا، اب اس کو نظامِ حکومت کی شکل دے دی گئی۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب "امیر"، اور مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب، حافظ ضامن صاحب، اور مولانا محمد منیر صاحب جیسے زعماء اور اکابر کو فوج، حفاظت، فصلِ خصومات اور عدل و قانون وغیرہ کے شُعبے سپرد کئے گئے۔ اور اس موقع پر یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ خود بادشاہ کو بھی ضبط و نظم قائم کرنے اور اس بےسلیقے نظام میں داخل ہونے کا مشورہ دیا جائے۔

چنانچہ نواب شبیر علی[1] مراد آبادی کو جو بادشاہ کے منہ چڑھے اور بے تکلف مصاحب

---

[1] ان کے صاحبزادے نواب محی الدین صاحب جو عرصہ تک بھوپال میں عہدہ قضا پر فائز رہے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے تقریباً ۱۹۳۰ء میں اُن کی وفات ہوئی۔ ان کی زیارت کا شرف احقر کو بھی حاصل ہوا ہے۔ ان کے اخلاف اب بھی مراد آباد میں موجود ہیں مگر پریشان اور خستہ حال۔ اللہ تعالیٰ اُن پر اپنا فضل و کرم فرمائے۔ محمد میاں

Marfat.com

تھے، اسی مقصد کے لئے دہلی بھیجا گیا۔[1]

شاہ حسن عسکری[2]، جو بادشاہ کے پیر[3] اور اس تحریک کے ایک ممتاز رُکن بلکہ بانی اور محرک اوّل کی حیثیت رکھتے تھے، اسی[4] علاقہ کے رہنے والے تھے، اور ان بزرگوں

---

[1] مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے حضرت مولانا محمد طیب صاحب کے حوالہ سے (سوانح قاسمی جلد دوم ص۱۳۷ پر) ایک روایت نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ نواب شیر علی صاحب کو اس لئے بھیجا گیا تھا کہ بادشاہ کو (جہاد اور استخلاص وطن و ملت کی جنگ پر) آمادہ کریں۔ مولانا محمد طیب صاحب کے حوالہ سے ایک دوسری روایت اسی صفحہ پر یہ بھی نقل کی گئی ہے کہ مولانا شیر علی صاحب کو بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ دہلی سے شاملی کی طرف یلغار کریں اور یہ حضرات اس طرف سے، تو یہ پورا خطہ اس عنصرِ خبیث سے پاک ہو جائے گا۔ احقر کے خیال میں یہ دوسری روایت ہی قابل اعتماد ہو سکتی ہے کیونکہ جہاں تک آمادگی بلکہ شرکت کا تعلق ہے تو بادشاہ استخلاص ملک و ملت کی اس جنگ میں آج سے کئی ہفتہ پہلے شریک ہو چکے تھے۔ جب ۱۲ مئی کو انقلابی فوجوں کی قیادت کرتے ہوئے شاہانہ جلوس کے ساتھ بادشاہ نے شہر کا دورہ کیا تھا۔ بڑے بڑے بازار کھلوائے تھے اور عوام کو امن و امان کا اطمینان دلایا تھا۔

[2] بہادر شاہ کے مقدمہ کے سلسلہ میں جاٹ مل سابق اخبار نویس لفٹننٹ گورنر آگرہ نے ان کے متعلق یہ بیان دیا تھا کہ حیدر حسین خاں کمانڈر توپ خانہ بادشاہ اور حسن عسکری نے مل کر چند خطوط شیدی قنبر کے ذریعے ایران روانہ کئے (بہادر شاہ کا مقدمہ ص۲۶) عدالت نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ شاہ حسن عسکری ایران سے ساز باز کر کے ہندوستان پر حملہ کرانا چاہتے تھے۔

[3] بادشاہ ان کے معتقد تھے۔ اُن سے تعویذ لیا کرتے تھے۔ خوابوں کی تعبیر پوچھا کرتے تھے۔ اور دعائیں پڑھوایا کرتے تھے۔ شاہی خاندان کی ایک خاتون اُن کی بہت معتقد ہو گئی تھی۔ پھر اُس سے نکاح بھی کر لیا۔ اُس نے شاہ صاحب کی پاک بازی کی بادشاہ سے تعریفیں کیں جن سے بادشاہ، شاہ حسن عسکری سے عقیدت رکھنے لگے۔ (بہادر شاہ کا مقدمہ وغیرہ)۔

[4] شاہ حسن عسکری کا آبائی وطن قصبہ رام پور منہیاراں ضلع سہارن پور تھا یہی امپور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ کا بھی دادھیالی وطن ہے (تذکرۃ الرشید جلد ۱ ص۱۵)

Marfat.com

سے خاندانی[1] روابط بھی رکھتے تھے[2]۔ ان کے ذریعہ سے بھی تحریک کی باگ موڑی جا سکتی تھی۔

حضرت مولانا رحمت اللہ نے دہلی سے واپس آکر تحریک کی جو صورتِ حال بیان کی تھی، اُس کے پیشِ نظر خیر خواہیِ ملک و ملّت کے بلند جذبات کا بھی تقاضا یہی تھا کہ جس طرح ممکن ہو، بادشاہ کو نیک مشورے دیئے جائیں۔ اور ایسی باتوں کی

---

[1] شاہ مجید علی اور شاہ حبیب محمد قصبہ انبیٹھ ضلع سہارن پور کے رہنے والے حقیقی بھائی والد ماجد کا نام شاہ احمد علی صاحب تھا۔ ان دونوں بھائیوں میں سے شاہ مجید علی صاحب حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے داماد تھے اور شاہ حبیب محمد صاحب شاہ حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ کے داماد تھے وُہ دو بزرگ جن کے علمی فیوض سے اس صدی کی پیشانی روشن ہوئی یعنی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب صدر مدرّس مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور اور حضرت مولانا صدیق احمد صاحب صدر مدرس و مفتی ریاست مالیر کوٹلہ ان دونوں بزرگوں کے نواسے تھے یعنی مولانا خلیل احمد صاحب حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے بھانجے اور مولانا صدیق احمد صاحب شاہ حسن عسکری شہید کے نواسہ۔ خود شاہ حسن عسکری کی شادی بھی قصبہ انبیٹھ میں ہوئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ہی آپ نے دہلی میں مغل شاہزادی سے نکاح کیا۔

[2] اسی خاندانی رابطہ کی بناء پر ۱۸۵۷ء کے بعد شاہ حسن عسکری دہلی سے انبیٹھ آکر روپوش ہوئے کہ ان کی بیوی کا اگرچہ انتقال ہو چکا تھا مگر ان کی صاحبزادی امتہ اللہ اور داماد شاہ حبیب محمد صاحب زندہ تھے۔ داماد اور اُن کے پانچوں بھائیوں نے شرافت و مروّت اور وفا پروری کا پورا ثبوت دیا۔ جب پولیس آئی تو خود گرفتار ہو گئے اور پناہ پکڑنے والے پر آنچ نہ آنے دی مگر پناہ لینے شاہ حسن کو خود احساس ہوا کہ میری وجہ سے عزیزوں پر مصیبت آ پڑی ہے تو خفیہ طور پر انبیٹھ سے نکل کر سہارن پور پہنچے اور عدالت میں حاضر ہو گئے۔ داماد اور اُن کے بھائی تو رہا کر دیئے گئے اور شاہ حسن عسکری کو پھانسی دے کر شہید کر دیا گیا (تذکرۃ الخلیل ص ۱۰ و ص ۱۱)

Marfat.com

فہمائش کی جائے جو غلبہ و کامیابی ورنہ کم از کم اُخروی فلاح و بہبود کا ذریعہ بن سکیں۔

بہرحال مقامی یا علاقائی حیثیت میں آئین اور دستور کے مطابق حکومت کا ایک نظام زیرِ قیادت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رمضان شریف کے فوراً بعد مئی کے اواخر یا اوائل جون میں تھانہ بھون میں قائم ہو گیا۔ لیکن کوئی اقدام اس وقت مناسب نہیں سمجھا گیا، جب تک

۱: مرکز میں ایک صالح نظام وجود پذیر نہ ہو، اور

۲: اس علاقائی نظام کا رابطہ اس مرکزی صالح نظام سے منسلک نہ ہو جائے۔

ممکن ہے جلد باز اور تہوّر پسند جوشیلی طبیعتیں اس کو پسند نہ کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ جذبات کی رَو میں بہہ جانے والی طبیعتیں اس کو ٹال مٹول قرار دیں مگر دستور و آئین بالخصوص قوانینِ شریعت کے ماہرین ان دونوں باتوں کو اتنا ضروری اور لازمی سمجھتے ہیں کہ جب تک یہ دونوں عمل میں نہ آجائیں کسی بھی اقدام کو مہذّب اور صالح (اور شریعت کی زبان میں) جہاد نہیں قرار دے سکتے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ وغیرہ پر برطانوی حکومت نے فساد کا الزام لگایا اور ان بزرگوں نے اس سے انکار کیا۔ ان کا انکار بالکل صحیح تھا کیونکہ انہوں نے فساد میں قطعاً حصّہ نہیں لیا۔ البتّہ فساد کی صورت ختم ہونے کے بعد جب منظم جہاد کی شکل پیدا ہوئی تو اس جہاد میں ضرور بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ جہاد فساد نہیں ہوتا بلکہ قاطع فساد ہوتا ہے۔

مئی کا مہینہ ختم ہو کر جون کا مہینہ گذر رہا تھا اور ابھی تک یہ کوشش بارآور نہ ہوئی تھی کہ یہ سرفروشانہ تگ و دو منظّم جد و جہد کی شکل اختیار کر سکے اسی اثنا میں رئیس تھانہ بھون قاضی عنایت علی صاحب کے بھائی[1] کا حادثہ پیش آگیا، کہ وہ

---

[1] آپ کا اسمِ گرامی عبدالرحیم تھا۔ قاضی سعادت علی خاں پسر نجابت علی خاں کے یہ دونوں فرزند (قاضی عنایت علی و قاضی عبدالرحیم صاحبان) بہت سعید، شریف الطبع (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

ہاتھی[1] خریدنے کے لئے سہارن پور تشریف لے گئے کسی نے مخبری کر دی، اور مسٹر سپینکی (SPANKIE) مجسٹریٹ ضلع سہارن پور نے اُن کو گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکوا دیا۔[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پابندِ مذہب تھے۔ دونوں بھائیوں میں غیر معمولی محبّت تھی اور بے حد اعتماد تھا۔ قاضی عبدالرحیم صاحب کے بارے میں "سپینکی" نے جو فیصلہ کیا، ہمارے جذبات اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ الزام جو لگایا گیا تھا وہ صحیح تھا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] زمانہ اگرچہ ترقی کر رہا تھا مگر ہاتھی کی قدر اس وقت تک کم نہیں ہوئی تھی، سامانِ جنگ میں اس وقت تک ہاتھی کو وہی حیثیت حاصل تھی جو ہمارے زمانہ میں ٹینک، بکتر بند گاڑی یا فوجی ٹرک کو حاصل ہے۔ ۱۹۴۲ء میں جب گاندھی جی کی زیر قیادت کانگریس نے "کوئٹ انڈیا"، "ہندوستان خالی کرو" کا نعرہ انگریزوں کے برخلاف لگایا اور کارپردازانِ تحریک نے ایک قدم آگے بڑھا کر بجلی اور ٹیلیفون کے تار کاٹنے اور کھمبے اُکھاڑنے اور ریلوے لائنوں کی توڑ پھوڑ شروع کی تو ایک معمولی اوزار جسکو پلاس کہتے ہیں، جس سے پیچ کھولے جاتے ہیں، اس کی فروخت ممنوع ہو گئی تھی۔ اگر تلاشی میں کسی کے پاس "پلاس" یا "پیچ کش" برآمد ہو جاتا تو وہ توڑ پھوڑ کا مُجرم مان لیا جاتا تھا۔

[2] مولانا عاشق الٰہی صاحب نے قاضی صاحب کو علمبردارِ بغاوت قرار دیا ہے اور حاجی صاحب اور اُن کے رفقاء کرام کا کوئی اقدام تسلیم ہی نہیں کیا۔ اس کی وجہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس زمانہ کے حالات کا بھی کچھ ایسا ہی تقاضا تھا اور خود مولانا عاشق الٰہی صاحب کا فطری ذوق اپنے زمانہ میں انگریزوں کا حامی واقع ہوا تھا۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ بلند پایہ فاضل اور بہت بڑے مصنّف اور اہلِ قلم تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے صدر دینیات کی حیثیت سے زندگی بسر کی۔ تصنیف و تالیف اور وعظ و پند کے سلسلہ میں آپ کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ مگر سیاسیات سے ہمیشہ کنارہ کش اور سیاسی تحریکات سے متنفّر رہے۔ یہ بات غالباً آپ کو بھی اچھی نہیں معلوم ہوئی کہ علماء کرام کی اس مقدّس جماعت کو (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

۲ر جولائی ۱۸۵۷ء کو جنرل بخت خاں اپنی منظم اور باضابطہ فوج لے کر دہلی پہنچ گئے۔ مولانا سرفراز علی صاحب امیر جماعت کی حیثیت سے ان کے ساتھ تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ایک سیاسی انقلابی تحریک کا علمبردار قرار دیں۔ مگر روایات کا جو ذخیرہ آپ کے سامنے جمع ہوگیا تھا اُس کو نظر انداز کرنا بھی آپ کے لئے ممکن نہیں تھا۔ پس آپ نے ایک نئی توجیہ فرمائی کہ ان حضرات نے مظلوم قاضی عنایت علی صاحب کی اعانت و حمایت کیلئے شرکت فرمائی تھی (ملاحظہ ہو سوانح قاسمی جلد دوم ص۱۱۸ و ص۱۱۹ و ص۱۲۲)۔

بیشک اغاثۂ ملہوف، اعانتہ مظلوم اور رحم رسیدہ بھائی کی امداد بھی ایک مقدس فرض ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کو صرف قاضی عنایت علی اور اُن کے شہید بھائی کے واقعہ نے متاثر نہیں کیا تھا بلکہ اس قسم کے ہزاروں واقعات جو انگریز کی آمد کے بعد سے اس وقت تک سرزمینِ ہند میں پیش آچکے تھے، ان سب نے ان بزرگوں کو متاثر کرکے اس بغاوت پر آمادہ کیا تھا، جو سراسر اعلاء کلمۃ اللہ اور اعانتِ حق تھا۔ ان حضرات کی مقدس تاریخ پر اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہوسکتا کہ اس جہادِ عظیم کا محرک صرف قاضی عنایت علی صاحب کے جزوی واقعہ کو قرار دے کر قاضی عنایت علی صاحب کو اصل اور ان بزرگوں کو تابع ظاہر کیا جائے۔ اس بارہ میں ان بزرگوں کی رائے اور تحقیق معتبر ہوگی جنہوں نے اس زمانہ کی تاریخ پر محققانہ نظر ڈالی۔ تحریکات اور ان کے اسباب کو سمجھا اور اُن کے تقاضوں کو پورا کرنے میں پوری پوری زندگیاں صرف کردیں مثلاً مفکرِ مشرق مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصور انصاری رحمۃ اللہ علیہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہ العزیز۔

حضرت مولانا سندھی رحمۃ اللہ کی تحریک کے چند اقتباسات اس سلسلہ میں پہلے پیش کئے جاچکے ہیں۔ یہاں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ کی تحریر مبارک کی چند سطریں ملاحظہ فرمایئے۔ نقشِ حیات میں حضرت شیخ الاسلام نے عنوان قائم کیا ہے "ہمارے اکابر کا ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لینا"۔ اس عنوان کے تحت میں تحریر فرماتے ہیں:

ہمارے تمام اکابر (علماء دیوبند و سہارن پور و مظفر نگر) حضرت شاہ (بقیہ صفحہ آئندہ)

Marfat.com

بلکہ جنرل مذکور کی سرپرستی اور رہنمائی فرما رہے تھے۔

جنرل بخت خاں نے صرف فوجوں کو ہی منظم نہیں کیا بلکہ ضبط و نظم کو اس معیار پر لانے کی کوشش کی جو اسلامی تعلیم کے لحاظ سے ضروری ہے۔ اور ایسے مواقع پر جو شرعی مطالبات ہو سکتے ہیں ان کو پورا کرنے کے لئے جامع مسجد دہلی میں علماء کرام کا اجتماع کیا۔ ہم نے بزرگوں سے سُنا ہے کہ ہمارے یہاں کے (ضلع مظفر نگر، سہارن پور، یعنی علاقہ تھانہ بھون کے) علماء ۱۸۵۷ء کی تحریک کے سلسلہ میں دہلی تشریف لے گئے تھے۔ وہاں جامع مسجد میں بادشاہ سے ملاقات کی اور اس سے عہد و معاہدے کئے۔ ہمیں اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں مل سکا۔ البتہ جو فتوے جامع مسجد کے اس اجتماع میں مرتب کیا گیا تھا، اُس پر ایک دستخط "رحمت اللہ" کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عبدالعزیز صاحب اور ان کے تلامیذ کے شاگرد اور خوشہ چیں رہے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ حضرت شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے مسلک اور حکم کے خلاف چلیں۔ چنانچہ جب سیّد صاحب کی تحریکِ جہاد شروع ہوئی تو حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب شہید ولایتی (دادا پیر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکّی) اور حضرت شاہ نصیرالدین صاحب دہلوی سابق پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور بہت سے حضرات (اطراف سہارن پور و مظفر نگر وغیرہ کے) شریک تحریک ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ سرحد میں جا کر شہید ہوئے۔ حضرت سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اعلیٰ جذباتِ حرّیت و جہاد اور ان کی تعلیماتِ رُوحانیہ سے ان حضرات کو انتہائی شغف اور حُسنِ اعتقاد رہتا تھا۔ سرحد کی ناکامی اور آپس کی غدّاریوں سے ان حضرات کے قلب میں انتہائی قلق اور اضطراب ہمیشہ محسوس ہوتا رہتا تھا۔ جب انقلاب ۱۸۵۷ء کی تحریک اطراف و جوانب ہند خصوصًا اطرافِ دہلی میں چلنی شروع ہوئی تو ان حضرات کے جوشِ حرّیت میں نئی حرکت پیدا ہوئی۔ ان بزرگوں نے محسوس کیا کہ اس انقلاب میں حصّہ لینا فرض اور لازم ہے۔ انگریزوں کے افعالِ ماضیہ اور احوالِ حاضرہ پر بخوبی مطلع تھے۔ اس تمام جماعت میں حضرت حافظ ضامن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز زیادہ پیش پیش تھے الخ (نقش حیات جلد دوم ص۴۱ و ص۴۲)۔

Marfat.com

بھی ہیں۔ بظاہر یہ "رحمت اللہ" وہی مولانا رحمت اللہ ہیں جو پہلے تحقیقِ حال کیلئے آئے تھے اور اب اپنی جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے اس اجتماع میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے اور غور و فکر کے بعد فتوے پر دستخط ثبت فرمائے تھے۔

اس وقت کے حالات کے بموجب "دہلی" میں ایک صالح نظام قائم ہوگیا علماءِ کرام اور رہنمایانِ ملّت نے غور و خوض کے بعد جہاد کا فتویٰ صادر کر دیا۔ تو اب تھانہ بھون والی جماعت کے لئے بھی راستہ صاف ہوگیا، اور یہ ممکن ہوگیا کہ اس علاقہ کے امیر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اقدام کا فیصلہ صادر کر دیں تاہم مکمّل احتیاط کے پیشِ نظر یہ مناسب سمجھا گیا کہ مجلسِ شوریٰ کا اجلاس کر کے ان تازہ حالات پر ایک دفعہ مزید غور کر لیا جائے۔ ارشادِ خداوندی "وشاورھم فی الامر" کا مطالبہ بھی یہی تھا، اور اسی طرح جُملہ اراکین اور اعضاء کی ہم آہنگی اور خوش دلانہ حمایت بھی پُوری سرگرمی کے ساتھ میسّر آسکتی ہے۔

چنانچہ ایک اجتماع کیا گیا۔ اجتماع کا ایجنڈا مسئلۂ اقدام تھا بعنوانِ دیگر "اعلانِ جہاد"۔

اور موضوعِ بحث بعینہٖ وہ تھا جس پر دہلی کے اجتماع میں بحث ہوئی تھی۔ یعنی بحالتِ موجودہ ہم میں انگریز کی منظم فوجوں سے مقابلہ کی طاقت ہے یا نہیں اور اس بناء پر اقدام کے متعلق شرعی فیصلہ کیا ہے۔

اجلاس شوریٰ میں تمام حاضر ارکان نے اقدام کا فیصلہ کیا، یعنی دہلی کے فتویٰ جہاد کی تصدیق و توثیق کی۔ صرف ایک بزرگ مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی کی رائے مخالف رہی۔ اس اجتماع کی ایک دلچسپ بحث ملاحظہ ہو۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے حضرت شیخ محمد صاحب سے خطاب کرتے ہوئے نہایت ادب[1] کے ساتھ عرض کیا:

---

[1] اس لئے کہ وہ چچا پیر تھے کیونکہ حضرت شیخ محمد صاحب محدّث اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دونوں قطب العالم حضرت میاں جی نُور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔

Marfat.com

"حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنانِ دین وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے"۔

حضرت مولانا شیخ محمد صاحب محدث : اس لئے کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلاتِ جہاد نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب : کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوۂ بدر میں تھا؟[1]

حضرت مولانا شیخ محمد صاحب : اگر آپ کی تمام حجتیں اور باتیں مان لی جائیں، تو سب سے بڑی شرط جہاد میں نصبِ امام کی ہے۔ امام کہاں ہے کہ اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے[2]

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب : نصبِ امام میں کیا دیر لگتی ہے۔ مُرشدِ برحق حضرت حاجی صاحب موجود ہیں، انہیں کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی جائے[3]

حضرت حافظ ضامن صاحب : مولانا! بس سمجھ میں آگیا[4]

پھر سب نے حضرت حاجی صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعتِ جہاد کی[5] یعنی پہلے تشکیلِ حکومت کے لئے بیعت ہوئی تھی، اب یہ بیعت جان و مال کی قربانی کے لئے۔

اب سوال یہ تھا کہ اقدام کس طرف ہو۔ ظاہر ہے دہلی کا مرکز ہی قبلہ نما بن سکتا تھا۔ چنانچہ :

"سرفروشانِ دین و وطن سر ہتھیلی پہ لے کر ایک منظم طاقت سے ٹکرانے کے لئے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور تھانہ بھون سے شاملی کی طرف مارچ شروع کر دیا جس کا نصب العین دہلی تھا"[6]

شاملی کی طرف اقدام کا ایک دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ مہار سنگھ رئیس شاملی نے

---

[1] نقشِ حیات ص۴۳ جلد ۲۔ [2] سوانح قاسمی جلد ۲ ص۱۲۳۔ [3] ایضاً ص۱۲۵۔ [4] نقشِ حیات جلد دوم ص۴۳۔ [5] سوانح قاسمی جلد دوم ص۱۲۶۔ [6] ایضاً ص۱۲۹

Marfat.com

جو علمِ آزادی بلند کیا تھا اس کو کمک کی شدید ضرورت تھی۔[1]

اب یہ تفصیل[2] کہ معرکہ کہاں کہاں اور کس کس طرح ہوا، اور اس میں کس کس نے کتنا کتنا حصہ لیا، موضوعِ کتاب سے خارج ہے۔ اس سلسلہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ایک بیان پر کفایت کی جاتی ہے۔

حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحبؒ امیرِ جہاد حضرت حاجی امداد اللہ

---

[1] انگریز مصنّف "میلی سن" اپنی تاریخ کی جلد ششم ص۱۲۴ پر تحریر کرتا ہے:

شاملی میں ایک ہندو زمیندار مہار سنگھ نے ہنگامہ برپا کیا تھا اور خط و کتابت کر کے دربارِ دہلی سے تعلّقات قائم کر لئے تھے۔ انگریز اس کو دبا نہ سکتے تھے۔ البتہ شاملی کو کُھلم کُھلا بغاوت سے محفوظ رکھا۔ شاملی جو آج کل ضلع مظفر نگر کی ایک سب ڈویژن (تحصیل) کا ہیڈ کوارٹر ہے، اُس زمانہ میں سہارن پور سے متعلق تھا۔ حاکمِ سہارنپور اسپنکی (SPANKEE) صاحب نے اس کی پوزیشن مضبوط رکھنے کے لئے گورکھا فوج کا ایک دستہ بھیج دیا۔ ایڈورڈز (اس مقام کے فوجی کمانڈر) نے گورکھوں کی مدد سے شاملی میں مکمّل قبضہ کر لیا۔ ایک وفادار مسلمان "ابراہیم خان" کے ماتحت تھوڑی سی فوج شاملی چھوڑی اور ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو خود آگے روانہ ہو گیا۔ قاضی عنایت علی صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر شاملی پر ہلّہ بول دیا۔ تقریباً ایک سو تیرہ فوجیوں کے نقصان کے بعد "ابراہیم خاں" ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ ایڈورڈز واپس ہوا، تو شاملی کی حالت دیکھ کر کہ جہاں ۱۱۳ فوجی کام آ چکے تھے بہت غصہ آیا مگر اس وقت مظفر نگر کی حالت بہت خراب تھی، وہ وہاں چلا گیا۔ پھر کپتان اسمتھ اور لفٹننٹ کیول روس کی زیرِ کمان سکھوں اور گورکھوں کی فوج تھانہ بھون بھیجی۔ مجاہدین نے اسے مار بھگایا، تو دوبارہ کرنل ڈنلاپ کی سرکردگی میں پوری فوج بھیجی گئی جس نے پہلے تھانہ بھون پھر شاملی پر قبضہ کر کے ان کو تباہ و برباد کیا (۱۸۵۷ء کے مجاہد ص۱۶۷)۔

[2] سوانح قاسمی جلد دوم میں کسی قدر تفصیل دی گئی ہے ضرورت ہو تو مراجعت فرمائی جاوے۔

Marfat.com

صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی زیارت سے مشرف اور فیض یاب ہوئے ہیں[1]۔ مکہ معظمہ میں کچھ عرصہ ان کی خدمت میں بھی رہے ہیں۔ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے (جو اس معرکہ کے رکنِ رکین تھے) خلیفہ مجاز ہیں۔ ایک رازداں خادم کی حیثیت سے عرصہ تک ان کی خدمت میں باریاب رہے ہیں، اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز (جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ کے نہایت محبوب و مقرب شاگرد اور اپنی مجاہدانہ فطرت کی وجہ سے جہادی کاروبار کے امین و معتمد اور واقفِ اسرار تھے)۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کو جس درجہ آپ سے تقرب رہا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ مولانا حسین احمد صاحب نے حضرت شیخ الہند کی آغوشِ شفقت[2] میں تربیت پائی، اور پھر ایک فداکار رفیق کی حیثیت سے سفر و حضر، انتہا یہ کہ قید و بند میں بھی عرصۂ دراز تک ہمدم و ہمراز رہے۔

لہٰذا ۱۸۵۷ء کے اس معرکے کے متعلق حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا بیان چشم دید شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔

مشاورتی اجتماع میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت شیخ محمد صاحب کے درمیان جو گفتگو ہوئی جس کی تفصیل پہلے دی جا چکی ہے، اس کو نقل کرنے کے بعد ——— شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز تحریر فرماتے ہیں:

پھر جہاد کی تیاری شروع ہو گئی اور اعلان کر دیا گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو امام[3] مقرر کیا گیا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کو سپہ سالارِ افواج قرار دیا گیا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو قاضی بنایا گیا اور مولانا محمد منیر[4] صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی میمنہ اور میسرہ

---

[1] ملاحظہ ہو نقشِ حیات جلد اوّل۔ [2] یعنی حضرت شیخ الہندؒ سے۔ [3] امام یعنی امیر یا صدر۔

[4] مولانا محمد طیب صاحب نے مولانا منصور انصاری صاحب کے حوالہ سے یہ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

(داہنے بازو اور بائیں بازو) کے افسر مقرر کئے گئے۔ چونکہ اطراف و جوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے تقویٰ، علم (تصوف اور تشرع) کا بہت زیادہ شہرہ تھا۔ ان حضرات کے اخلاص و للّٰہیت سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے۔ ہمیشہ سے اُن کی دین داری اور خدا ترسی دیکھتے رہے تھے، اس لئے ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ علاوہ مریدین اور تلامذہ کے عام مسلمان بھی بے حد معتقد تھے۔ اس لئے بہت تھوڑی مدت میں جوق جوق لوگوں کا اجتماع ہونے لگا۔ اس وقت تک ہتھیاروں پر پابندی نہیں تھی۔ عموماً لوگوں کے پاس ہتھیار تھے جس کو رکھنا اور سیکھنا مسلمان ضروری سمجھتے تھے۔ مگر ہتھیار پرانی قسم کے تھے۔ بندوقیں توڑے دار تھیں، کارتوسی رائفلیں نہ تھیں۔ یہ صرف انگریزی فوجوں کے پاس تھیں۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے اور تھانہ بھون اور اطراف میں حکومت قائم کر لی گئی اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیئے گئے۔

خبر آئی کہ توپ خانہ سہارن پور سے شاملی کو بھیجا گیا ہے، ایک پلٹن لا رہی ہے، رات کو یہاں سے گذرے گی۔ اس خبر سے لوگوں میں تشویش ہوئی۔ کیونکہ جو ہتھیار ان مجاہدین کے پاس تھے وہ تلوار، توڑے دار بندوقیں اور برچھے وغیرہ تھے، مگر توپ کسی کے پاس نہ تھی۔ توپ خانہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا۔ حضرت گنگوہیؒ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہ روایت کی ہے کہ مولانا محمد منیر صاحب کو حضرت نانوتویؒ کی حفاظت کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی اور حضرت حاجی صاحب نے مولانا محمد منیر صاحب کو خطاب کرتے ہوئے خاص طور پر فرمایا تھا کہ مولانا محمد قاسم بالکل آزاد اور جری ہیں، ہر صف میں بے محابہ گھس جاتے ہیں، آپ کسی وقت ان کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو مولانا محمد منیر صاحب، حضرت نانوتوی کے اے ڈی سی ہوئے۔ البتہ یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ معرکہ کے وقت کے لئے مولانا محمد منیر کو میسرہ کی کمان سپرد کی گئی اور عام حالات میں مولانا محمد قاسم کے ساتھ رہنے اور ان کی نگرانی کی ہدایت کی گئی کیونکہ مولانا محمد منیر صاحب حضرت نانویؒ کے قریبی عزیز اور اُن کے فدائی تھے اور مولانا نانوتوی کے بغیر خود اُن کو بھی قرار نہیں آتا تھا۔ (سوانح قاسمی ص۱۴۱ و ص۱۳۷ وغیرہ)۔

Marfat.com

نے فرمایا۔ فکر مت کرو۔

سڑک ایک باغ کے کنارے گذرتی تھی۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو تیس یا چالیس مجاہدین پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے افسر مقرر کر دیا تھا۔ آپ اپنے ماتحتوں کو لے کر باغ میں چھپ گئے، اور سب کو حکم کیا کہ پہلے سے تیار رہو۔ جب میں حکم کروں، سب ایک دم فیر کرنا۔ چنانچہ جب پلٹن معہ توپ خانہ باغ کے سامنے پہنچی تو سب نے یک دم فیر کر دیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی یہاں چھپے ہوئے ہیں، توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہیؒ نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کی مسجد کے سامنے لاکر ڈال دیا۔ اس سے لوگوں میں ان حضرات کی فراست، ذکاوت، فنونِ حربیہ کی مہارت، معاملہ فہمی اور ہر قسم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔

شاملی اس زمانہ میں مرکزی مقام تھا۔ ضلع سہارن پور سے متعلق تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی۔ کچھ فوجی طاقت وہاں بھی رہتی تھی۔ قرار پایا[1] کہ اس پر حملہ کیا جائے چنانچہ چڑھائی[2] ہوئی

---

[1] اس قرارداد کا پس منظر چند صفحات پہلے گذر چکا ہے۔ [2] مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مولانا محمد میاں صاحب منصور انصاری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کر کے اس کی تفصیل یہ بیان کی ہے۔ انگریزی فوج جو شاملی میں موجود تھی، وہ مجاہدین کے ہجوم کو دیکھ کر تحصیل کی چہار دیواری میں محصور ہو گئی اور اندر سے فائر شروع کر دیئے۔ مجاہدین کا ہجوم باہر میدان میں تھا، جہاں کوئی آڑ نہیں تھی۔ اس طرح مجاہدین کا جانی نقصان کافی ہوا۔ اتفاق سے تحصیل کے قریب ایک چھپر تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی نظر چھپر پر پڑی۔ چھپر اٹھوا کر تحصیل کے صدر دروازہ پر ڈالا گیا اور اس میں آگ لگا دی گئی۔ جس سے پھاٹک جل گیا اور اندر گھسنے کا راستہ کھل گیا۔ اب فوج میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی۔ اس کے کچھ سپاہی کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ کچھ مقتول ہوئے اور باقی گرفتار ہو گئے اور شاملی پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔ (سوانح قاسمی جلد دوم)۔

Marfat.com

اور قبضہ کر لیا گیا[1]۔ جو طاقت پولیس اور فوج کی وہاں تھی، وہ مغلوب ہو گئی۔ حضرت حافظ ضامن صاحب اسی ہنگامہ میں شہید ہو گئے[2]۔ حضرت حافظ ضامن صاحب کا

---

[1] سر سید احمد خاں صاحب مرحوم نے وفادار مسلمانانِ ہند (لائل محمڈنس آف انڈیا) میں محمد ابراہیم خاں کا نام بھی شمار کرایا ہے، جو اس ہنگامہ کے وقت شاملی کے تحصیل دار تھے، اور نہ صرف یہ کہ خود مقابلہ کیا بلکہ حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اپنے بھائی اکبر خاں اور خاندان کے دوسرے افراد کو بھی اپنے وطن رام پور منیاراں ضلع سہارنپور سے بلا لیا جن کی تعداد پچاس تھی۔ جب مقابلہ ہوا تو اس وقت تحصیل شاملی میں تقریباً دس سوار پنجابی رسالہ کے اٹھائیس سپاہی جیلخانہ کے اور پچاس سے زائد سپاہی متعینہ تھانہ و تحصیل اور پچاس سے زائد آدمی خود تحصیل دار کے خاندان کے تھے۔ سر سید صاحب فرماتے ہیں یہ افسر (تحصیلدار) معہ اکثر آدمیوں اپنے خاندان کے کام آیا اور شرط نمک حلالی کو پورا کر دیا۔ (لائل محمڈنس آف انڈیا بحوالہ العلم کراچی بابت اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۸ء)۔

[2] اس معرکہ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے متعلق آپ کے استاذ زادہ، سبق کے ساتھی اور نہایت مخلص عزیز مولانا محمد یعقوب صاحب ابن حضرت مولانا مملوک العلی صاحبؒ کی عینی شہادت ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب اپنی لکھی ہوئی سوانح عمری میں تحریر فرماتے ہیں :-

چند بار مفسدوں سے نوبت مقابلہ کی آئی۔ اللہ رے مولوی صاحب ایسے ثابت قدم، تلوار ہاتھ میں اور بندوقچیوں کا مقابلہ۔ ایک بار گولی چل رہی تھی، یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے جس نے دیکھا، جانا گولی لگی۔ ایک بھائی دوڑے۔ پوچھا، کیا ہوا۔ فرمایا کہ سر میں گولی لگی۔ عمامہ اُتار کر دیکھا تو کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا، اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔ انہیں دنوں ایک نے منہ در منہ بندوق ماری جس کے سنبھے سے ایک مونچھ اور کچھ داڑھی جل گئی اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا، اور خدا جانے گولی کہاں گئی، اور اگر گولی نہ تھی، تو اتنے پاس سے سنبھ بھی بس تھا۔ مگر حفاظتِ الٰہی بہ سر تھی، کچھ اثر نہ ہوا۔ (ص ۱۱۳ سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب از مولانا محمد یعقوب)۔

Marfat.com

شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ ان کی شہادت سے پہلے روزانہ خبر آتی تھی کہ آج فلاں مقام انگریزوں سے چھین لیا گیا۔ آج فلاں مقام پر ہندوستانیوں کا قبضہ ہوا۔ مگر حافظ صاحب کی شہادت کے بعد پہلے پہل خبر آئی کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، اور یہی حال ہر جگہ کی خبروں کا تھا۔ اس سے پہلے گورے فوجی چھپتے پھرتے تھے۔ ایک ایک سپاہی گوروں کی جماعت کو بھگائے پھرتا تھا۔ مگر بعد میں معاملہ برعکس ہو گیا۔ پہلے کسی کھیت میں گورا چھپا ہوا تھا تو کاشتکار عورت نے اُسے کھرپے سے قتل کر ڈالا مگر بعد میں معاملات اُلٹ ہو گئے۔

حضرت شیخ الہند[1] رحمۃ اللہ فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام معاملہ جوش و خروش، جنگ و جدال کا حضرت حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت

---

[1] شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز جس طرح ایک مردِ مجاہد، میدانِ سیاست کے شاہسوار تھے۔ ایسے ہی حلقۂ طریقت کے مرشدِ کامل اور اربابِ باطن کے امام و مقتدا بھی تھے۔ آپ کے اس ارشاد میں اسی باطنی ذوق کی شان نمایاں ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں اربابِ ظاہر کو سپر ڈال دینی پڑتی ہے اور ماننا پڑتا ہے ؎

غیب را ابرے و بادے دیگر است
آفتابے ماہتابے دیگر است

اس سے عجیب واقعہ وہ ہے جس کو مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی صدر الصدور سرکار آصفیہ قدس اللہ سرہٗ العزیز سے نقل کیا ہے۔ نواب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ انگریزوں کے مقابلہ میں جو لوگ لڑ رہے تھے، ان میں شمالی ہند کے مشہور شیخِ طریقت حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی بھی تھے۔ اچانک ایک روز مولانا کو دیکھا کہ خود بھاگے جا رہے ہیں اور باغیوں کے افسر کا نام لے کر کہہ رہے رہے ہیں کہ "لڑنے سے کیا فائدہ، خضر کو تو میں انگریزوں کی صف میں پا رہا ہوں"۔ نواب صاحب ایک دوسرا واقعہ بھی بیان کرتے تھے کہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب اس (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

کے لئے کیا گیا تھا[1]۔ بہرحال حافظ صاحب کی شہادت اور دہلی کے سقوط کی خبر سے لوگوں کی ہمتیں بالکل پست ہوگئیں اور سب اپنے اپنے اوطان کو واپس آگئے۔

ناکامیِ تحریک کے بعد

تھانہ بھون کی تباہی ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ گرفتار ہوئے۔ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ مکمل ہوا تو پھر فتح مند فوجوں نے اطرافِ دہلی پر بھی قبضہ شروع کر دیا۔ چند روز بعد ہی تھانہ بھون کا نمبر آگیا[2]۔ ایک شب کی تاریکی میں انگریزی فوج کی آمد کی خبر نے سنسنی پھیلا دی۔ اب تو شکست یقینی تھی۔ مگر بہادری یہ ہے کہ اس یقین کے باوجود مقابلہ کی ہمت کی گئی۔ قصبہ کے گرد فصیل تھی، اس کے دروازے بند کر دیئے گئے اور وہی ایک توپ جو آغازِ جنگ میں حضرت گنگوہیؒ نے انگریزوں سے چھینی تھی، اس کو ایک بلند مقام پر نصب کر دیا گیا، اور عجیب اتفاق یہ ہوا کہ اس توپ کا پہلا فائر ایسا کامیاب رہا کہ اس کا گولہ ٹھیک غنیم کی توپ کے دہانہ پر جا کر پڑا۔ انگریزی فوج کی یہ توپ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہنگامہ کے بعد ایک ویران مسجد میں جا کر مقیم ہوگئے ایک روز ایک انگریزی فوج ادھر سے گذر رہی تھی۔ مولانا مسجد میں بیٹھے ہوئے اس فوج کو دیکھ رہے تھے کہ پھر دفعۃً اُٹھے مسجد کی سیڑھیوں سے اُتر کر فوج کے پاس گئے اور ایک شکستہ حال شخص جو بظاہر سائیس معلوم ہوتا تھا، اس سے کچھ باتیں کیں اور واپس آگئے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ یہ کون تھے جن سے آپ نے باتیں کیں، تو فرمایا۔ خضر تھے۔ (سوانح قاسمی ص۱۰۳ حاشیہ)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] سر سید احمد صاحب مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ قتل و خونریزی شاملی میں ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ہوئی جو دن فتح دہلی کا تھا۔ (لائل محمڈنس آف انڈیا)۔ [2] میلی سن سے پہلے حاشیہ میں نقل کیا جا چکا ہے کہ پہلی بار کپتان اسمتھ اور لفٹننٹ کیولر اس کی زیر کمان سکھوں اور گورکھوں کی فوج بھیجی گئی تھی، مجاہدین تھانہ بھون نے اس کو مار کر بھگا دیا تھا۔ اس کے بعد جنرل ڈنلاپ ایک بڑی بھاری فوج اور توپخانہ کے ساتھ تھانہ بھون پہنچا۔ مجاہدین کو شکست دے کر تھانہ بھون کو تباہ کر دیا۔ یہاں اسی فوج کی تباہ کاری کا تذکرہ ہے۔

Marfat.com

ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ یہاں ایک توپ تھی، اور غنیم کے پاس بہت سی۔ یہاں توڑے دار بندوقیں تھیں اور وہ بھی بہت کم، اور دوسری طرف نئی قسم کی رائفلوں کی بہتات تھی۔ دو گھنٹہ سے زیادہ مقابلہ جاری نہ رہ سکا۔ صبحِ صادق کے وقت مشرق کی جانب سے تھانہ بھون پر گولہ باری شروع ہوئی تھی۔

فصیل توڑ دی گئی، دروازے اُڑا دیئے گئے، مٹی کا تیل ڈال کر مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ جو ملا، اس کو تہ تیغ کیا گیا۔ قیمتی مال و اسباب سے فوج نے اپنی جیبیں بھریں جو باقی تھا، وہ آس پاس کے گاؤں والوں نے لوٹ لیا۔ تھانہ بھون ایک اُجڑا دیار بن گیا۔

یہ چاروں بزرگ جن کا تذکرہ شروع سے چل رہا ہے، باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ کسی قدر تفصیل آگے آئے گی۔ قاضی عنایت علی صاحب بہت سے ساتھیوں کو لے کر نواب محمود علی خاں صاحب کے پاس نجیب آباد پہنچ گئے اور سر سید صاحب کی روایت ہے کہ وہاں نواب صاحب کو کافی کمک پہنچائی اور جب کامیابی نہ ہوئی تو ایسے غائب ہوئے کہ پھر کبھی پتہ ہی نہ چل سکا کہ کہاں گئے[1] رحمہ اللہ۔ مزید تفصیل صـ پر ضمیمہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

---

[1] سرکار کو پتہ بے شک نہیں چلا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نجیب آباد سے نکل کر دیوبند پہنچے چند روز یہاں قیام کر کے بھوپال تشریف لے گئے، اور جب وہاں اپنے تعارف کا خطرہ ہوا، تو جودھ پور، پھر الور تشریف لے گئے، اور ریاست الور کے ایک قصبہ "تجارہ" کے قریب ایک گاؤں میں قیام کیا۔ پھر یہیں وفات پائی (از قاضی احسان اللہ صاحب تھانوی) مشہور و معروف شاعر انقلاب علامہ انور صابری سینہ بسینہ سند کے ذریعہ یہ روایت بھی بیان فرماتے ہیں کہ قیامِ دیوبند کے زمانہ میں خاکسار مؤلف (محمد میاں) کے کسی بزرگ کی رفاقت میں بھوپال تشریف لے گئے۔ مگر کسی اور ذریعہ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

Marfat.com

وارنٹ گرفتاری، پولیس کی ناکام دوڑ دھوپ

عزم و ہمت اور حوصلۂ بلند کی فتح

دنیا کے وہ انسان جن کو تاریخ کا ہیرو مانا جاتا ہے، جس طرح اُن کے کارنامے حیرت انگیز ہوتے ہیں، اسی طرح بسا اوقات اُن کی حفاظت و عصمت کے وہ وسائل اور ذرائع بھی حیرت انگیز و تعجب خیز ہوتے ہیں جو قدرت اُن کے لئے وقت پر مہیا کر دیتی ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت اسمٰعیل، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے مرتبے تو بہت بلند ہیں۔ اکبر، نور جہاں، نپولین بونا پارٹ جیسے ناموروں کی سوانح حیات بھی ہمیں بہت سے ایسے حیرت انگیز واقعات سے آگاہ کرتی ہے کہ عقلِ نارسا جب ان کی کوئی معقول وجہ پیش نہیں کر سکتی تو تسکین کے لئے اُن کو کرشمۂ قدرت قرار دیتی ہے یا تاریخ کا معجزہ بتانے لگتی ہے۔

علاقہ تھانہ بھون کے یہ رہنما جنہوں نے انگریزوں کی زبان میں بغاوت اور غدر میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا تھا، تھانہ بھون میں شیر علی کے باغ سے حملہ کر کے فوجی دستہ کو شکست دی، اُس کے افسر قتل کئے، توپ خانہ چھینا۔ پھر شاملی کی تحصیل پر حملہ کر کے فوج کو شکست دی۔ سرکاری عمارت تباہ کی، سرکاری سامان ضبط کیا، سپاہیوں کو مارا، اپنی آزاد حکومت قائم کی۔ باغی بادشاہ سے وفاداری کا اظہار کیا وغیرہ وغیرہ۔ غرض کونسا جرم تھا جو اُن سرمستانِ حریت نے نہیں کیا تھا، اور عبور دریائے شور سے لے کر توپ دم کئے جانے یا ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا ڈالنے تک کی کونسی سزا تھی کہ اس دورِ بے آئین میں یہ اس کے مستحق نہیں تھے لیکن ان تمام حرکتوں کے باوجود ہر قسم کی

Marfat.com

سزا[1] سے بچ جانا، ہماری زبان میں اس کے لئے کرشمۂ قدرت کے علاوہ اور کوئی لفظ موزوں نہیں ہے۔

درست ہے، انگریز کا یہ احسانِ عظیم فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت نے عام معافی کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ مگر اوّل تو یہ اعلان یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہوا جب کہ سقوطِ دہلی کی تاریخ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء سے لے کر ساڑھے تیرہ ماہ تک بقول مرحوم بادشاہ بہادر شاہ ظفر، عام پالیسی یہ رہی تھی کہ:

"جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے"

اور اس طرح لاکھوں ہندوستانی تہ تیغ اور توپ دم کئے جا چکے تھے۔ علاوہ ازیں اس اعلان سے وہ لوگ مستثنیٰ تھے:

۱: جو انگریزی رعایا کے قتل میں بذاتِ خود شریک ہوئے۔

۲: جنہوں نے جان بوجھ کر قاتلوں کو پناہ دی۔

۳: جو لوگ باغیوں کے سردار ہوئے۔

۴: جنہوں نے بغاوت کی ترغیب دی۔

ان کے متعلق ملکہ وکٹوریہ کے اس معافی نامہ میں یہ کہا گیا تھا کہ:

"ان کی نسبت صرف وعدہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی جاں بخشی ہوگی لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں ان سب احوال پر جن کے اعتبار سے وے اپنی طاعت سے پھر گئے، کامل غور کیا جائے گا۔"[2]

اسی بنا پر اس نمائشی معافی نامہ کے بعد بھی عرصۂ دراز تک دار و گیر کا

---

[1] صرف امامِ ربّانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی گرفتار ضرور کئے گئے۔ چھ مہینے حوالات میں بھی رہے، مگر سزا اُن کو بھی نہیں ہوئی۔ مقدمہ میں صاف بَری ہو گئے۔ تفصیل آگے آئے گی۔ انشاء اللہ

[2] ترجمہ از معافی نامہ انگریزی جو اس زمانہ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔

Marfat.com

سلسلہ جاری رہا[1]۔

انتہا یہ کہ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی گرفتاری اس اعلان سے تقریباً سات ماہ بعد عمل میں آئی یعنی جولائی ۱۸۵۹ء میں۔

تحفظ کا حقیقی سبب دُعاء، وظیفہ، تعویذ اور عمل کی تاثیر سے انکار نہیں مگر ہمارے خیال میں سب سے مؤثر وظیفہ عزم و ہمت اور بلند نصب العین ہے جو لامحالہ نصرت اور امدادِ خداوندی کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

ولینصرن اللہ من ینصرہ

ان بزرگوں کو اللہ تعالےٰ نے اس وظیفہ کی توفیق عطا فرمائی، جو نہ صرف ان بزرگوں کے لئے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پوری ملت کے لئے نجات دہندہ ثابت ہوئی۔

ظاہری نظر میں یہ جماعت منتشر ہوگئی، اس کے کچھ افراد ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے اور کچھ نے ہندوستان ہی میں رہ کر زندگی گذاری، مگر حقیقت یہ ہے، کہ یہ انتشار بھی ایک خاص نظم کے ماتحت خاص نصب العین کے مطابق تھا۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر ہم اس کو قدرت کی "تدبیرِ محکم" قرار دیں۔

مکروا و مکر اللہ واللہ خیر الماکرین ○

(وہ بھی تدبیر کرتے ہیں اور اللہ تعالےٰ بھی تدبیر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ

---

[1] حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی تو گرفتار بھی اس معافی نامہ عام کے بعد ۱۸۵۹ء میں ہوئے تھے (ملاحظہ ہو، الثورۃ الہندیہ یا باغی ہندوستان)۔ اور جب کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں ۱۸۵۷ء کے اکتوبر تک چلتا رہا۔ تانتیا ٹوپی ۱۸۵۸ء کے آخر تک مقابلہ کرتے رہے۔ تو انگریز بہادر کو یہ رحم دلی کہاں نصیب ہوئی تھی کہ وہ بلا استثناء ہر ایک کو معاف کر دیتا۔ یہ حوصلہ ایشیا کے سیاہ فاموں ہی کو نصیب ہوا ہے کہ:

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

یورپ کے سفید فام سنگ دل تو سزا و انتقام میں بھی "سود در سود" کے عادی ہیں (معاذ اللہ)۔

Marfat.com

سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے) ـــــ کسی قدر تفصیل ملاحظہ کیجئے:

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے حوالہ سے پہلے گذر چکا ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے تقریباً ۱۶ سال پہلے حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ نے ہندوستانی تحریک کا مرکز مکہ معظمہ منتقل کر دیا تھا، اور دہلی میں ایک نمائندہ بورڈ بنا دیا تھا جس کی صدارت پہلے مولانا مملوک العلی صاحب کے سپرد تھی اور پھر یہی حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ جو ۱۸۵۷ء میں علاقہ تھانہ بھون کے امیر قرار دیئے گئے، اس بورڈ کے صدر بنا دیئے گئے۔

تحریک ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے اسی مرکز کا رُخ فرمایا، اور غیر معمولی مشکلات[1] اور پریشانیاں برداشت کر کے مکہ معظمہ میں بیٹھ کر آخر تک ہندوستانی تحریک کی قیادت فرماتے رہے۔

---

[1] حضرت مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں:۔ مولانا محمد اسحاق اور اُن کے بعد امیر حاجی امداد اللہ کو مکہ معظمہ میں بیٹھ کر اپنی تحریک جاری رکھنے میں جس قدر مشکلات پیش آئی ہیں، ان پر غالب آنا اُن کے جزم اور حلم کی روشن دلیل ہے اور ہم اسے امام عبد العزیز کی تربیتِ مسلسلہ کی برکات میں شمار کرتے ہیں۔ اگر یہ حضرات امام عبد العزیز کے تربیت یافتہ نہ ہوتے، تو کبھی اپنا کام جاری نہ سکتے تھے۔ اگر ہم مکہ معظمہ میں اس قسم کی زندگی کا خود تجربہ نہ کرتے، اور حضرت مولانا شیخ الہندؒ کے واقعات ہمارے سامنے نہ ہوتے، تو ہم ان اکابر کی محنت کی قدر نہ کر سکتے تھے۔

"دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من"۔ سیاسی تحریک ص۲۰۳ و ص۲۰۴

یہ مشکلات اور پریشانیاں خود ان دوستوں کی طرف سے پیش آتی رہیں جو معتقدانہ حاضر باشی کے ساتھ اپنی سادگی یا ہوش مندی سے جاسوسی کی خدمت بھی انجام دیتے رہے۔ اس کی تفصیل طویل بھی ہے اور تلخ بھی، اور اسی بناء پر ان حضرات کو ضرورت پیش آئی کہ سیاسی تربیت کے لئے "ادارہ حربیہ" کی بجائے "دار العلوم" کی بنیاد ڈالیں۔

Marfat.com

حضرت مولانا عبدالغنی صاحب محدّث دہلوی جو دہلی کے حلقۂ درس میں حضرت مولانا شاہ اسحٰق صاحب کے جانشین تھے، اور مولانا رحمت اللہ صاحب جن کا ذکرِ خیر شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب کی تحریر کے سلسلہ میں پہلے گذر چکا ہے، یہ دونوں بزرگ بھی مکّہ معظّمہ ہی تشریف لے گئے اور وہاں جو عظیم الشان خدمات انجام دیں اُن کے نشانات اور باقیات صالحات آج تک مکّہ معظّمہ اور مدینہ منوّرہ میں موجود ہیں۔

حضرت مولانا محمّد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی حضرت مولانا محمّد منیر صاحب اور اُن کے برادرِ محترم مولانا محمّد مظہر صاحب کو ہندوستان چھوڑا گیا، اور ابھی شہیدوں کا خون خشک[1] ہونے نہیں پایا تھا کہ ان بزرگوں نے تحریک کی نشاۃ ثانیہ کے لئے دارالعلوم دیوبند، جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد مظاہر العلوم سہارن پور وغیرہ کے حلقے قائم کر دیئے، جنہوں نے سیاسیات سے علیٰحدگی کا اعلان کیا۔ مگر دین و مذہب (جس کی تعلیم کو نصب العین بنایا تھا) اس کی ہمہ گیر تفسیر میں ان بزرگوں کے عقیدے کے مطابق وطنی سیاست اور جدّ و جُہد آزادی ایک فرض کی حیثیت رکھتی تھی۔

اسی احساسِ فرض کا نتیجہ تھا کہ جیسی ہی ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم

---

[1] یعنی ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے صرف آٹھ سال بعد ۱۸۶۶ء، ۱۲۸۳ھ میں کتاب التمہید میں حضرت مولانا سندھیؒ نے ایک فقرہ لکھا ہے، وہ ہمیشہ حضرات علماء کے پیش نظر رہنا چاہیئے۔ مولانا فرماتے ہیں :۔ دارالعلوم دیوبند اُسِّسَ فی ۱۲۸۳ھ فاقتدی الناس فی تاسیس الفروع فاول فرع تاسس بعد ستۃ اشہر فی سہارن پور حتی وصلت الی اربعین فرعًا لکن نظامہا علی اللامرکزیہ وکنت اوّل زمان تنظیم جمعیۃ الانصار احب ان اُغیر نظام الفروع المذکورۃ الی المرکزیہ ولکن شیخنا شیخ الہند ما کان یلتفت الی ذالک الا قلیلا و بعد ثلاث سنین تبینت لی حکمۃ اللامرکزیہ بالتجارب فان الحکومۃ لا تسہل لہا ان تتحکم و تغلب علیٰ ذالک النظام و حفظ الحریہ مقدم علی تحسین الصورۃ التمہید (ص ۱۵۵ بحوالہ سیاسی تحریک ص ۲۰۵ حاشیہ)۔

Marfat.com

کی گئی، اس جماعت کے سربراہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز اور آپ کے ساتھیوں نے مسلمانوں کے لئے شرکتِ کانگریس کا فتویٰ صادر کیا، اور برطانوی سامراج کے ہاتھوں میں کھیلنے والے سروں[1] اور خان بہادروں کے پھینکے ہوئے تمام تیر پوری جوانمردی سے اپنے سینوں پر لئے۔

پھر بیسوی صدی کے شروع میں موتمر الانصار اور جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک نظام قائم کیا گیا، اس نظام کا اندرونی رُخ یہ تھا کہ بقول شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز :

"۱۹۰۷ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ریشمی خط کی تحریک شروع کی، اور ۱۹۱۴ء تک اُسے اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ اگر کچھ مُلک کے خائن خیانت نہ کرتے تو اُسی وقت ہندوستان آزاد ہو چکا ہوتا[2]۔"

اس وقت اس تحریک کے ذریعہ ہندوستان آزاد نہیں ہو سکا مگر یہی تحریکِ حریت و استقلال افغانستان کے لئے سنگِ بنیاد ثابت ہوئی جس سے مشرق میں ایک نئی بیداری پیدا ہو گئی (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے نقشِ حیات جلد دوم، از شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی سیاسی ڈائری نیز علماءِ حق جلد اوّل وغیرہ)۔

۱۹۱۴ء میں ریشمی رومال کی تحریک ناکام ہوئی۔ اس کے رہنما حضرت مولانا محمود الحسن صاحب، حضرت مولانا حسین صاحب، مولانا عزیر گل صاحب، حکیم نصرت حسین صاحب رحمہم اللہ گرفتار اور مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا برکت اللہ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مسلمانوں کا روشن مستقبل از سیّد طفیل احمد صاحب (علیگ) مرحوم و علماءِ حق جلد اوّل از راقم الحروف محمد میاں عفی عنہ۔ [2] خطبۂ صدارت جمعیۃ علماء کانفرنس ناگپور منعقدہ نومبر ۱۹۴۹ء (الجمعیۃ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۴۹ء)۔

Marfat.com

بھوپالی، مولانا محمد میاں منصور انصاری وغیرہ جلاوطن ہوئے۔ لیکن ابھی پورے پانچ سال بھی گذرنے نہیں پائے تھے کہ انہیں بزرگوں کے ساتھیوں نے جو ہندوستان میں تھے، نئی کروٹ لی، اور ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کی باضابطہ[1] تشکیل کر دی۔ جس نے انڈین نیشنل کانگریس کے دوش بدوش جنگِ آزادی میں حصہ لیتے ہوئے اور کانگریس سے کہیں زیادہ جانی اور مالی قربانیاں پیش کرتے ہوئے ۱۹۴۷ء میں مکمل آزادی حاصل کر لی۔ افسوس آخر میں برطانیہ کا جادو کام کر گیا اور جسمِ ہندوستان کے دو ٹکڑے کر کے اس کی شہ رگ کا خون کھینچ لیا گیا۔ مگر بہرحال آزادی جس عنوان سے بھی آئی اور نجات جس حد تک بھی میسّر ہوئی، وہ نتیجہ ہے انہیں کوششوں کا جن کا سرِورق ان بزرگوں کے مبارک ناموں سے مزیّن ہے۔

اس جملہ معترضہ کے بعد اصل موضوع کی طرف رجوع فرمائیے اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی سرگذشت سُن لیجئے۔

پوری داستان طویل ہے۔ ہم ہر ایک بزرگ کے جستہ جستہ واقعات بیان کرتے ہیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً ڈیڑھ سال انبالہ تگری، پنجلاسہ وغیرہ، ضلع مظفر نگر، سہارن پور اور ضلع انبالہ کے دیہات میں

---

[1] ۱۹۱۹ء میں صرف یہی ہوا کہ اس کی تشکیل باضابطہ کر دی گئی اور اس کے صدر اور سکریٹری منتخب ہوئے۔ دستور اساسی مرتب ہوا۔ باقی اس جماعت کی اصل بنیاد بقول شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ۱۸۰۳ء میں قائم ہو گئی تھی۔ جب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے فتویٰ دیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی ختم ہو چکی ہے، ہم سب کا فرض ہے کہ متحد ہو کر جلد بدیشی حکومت کو ہندوستان سے نکال دیں۔ (خطبۂ صدارت جمعیۃ علماء کانفرنس ناگپور بحوالہ الجمعیۃ مؤرخہ ۳۰ نومبر ۱۹۴۹ء و بحوالہ ارشادات)۔

Marfat.com

گذارا۔ ۱۲۷۶ھ[1] میں، ہجرت کی۔ تبّت سے روانہ ہوئے۔ سندھ کے راستے سے کراچی پہنچے اور بحری جہاز سے مکّہ معظمہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

اس سفر میں چند عجیب و غریب واقعات قابلِ تذکرہ ہیں جن کو حضرت حاجی صاحب کے تمام سوانح نگاروں نے نقل کیا ہے۔ مثلاً

(۱) پنجلاسہ ضلع انبالہ کے رئیس راؤ عبداللہ خاں تھے۔ حکام رس، سرکار کے وفادار، اور حضرت حاجی صاحب کے ارادت مند۔ پنجلاسہ پہنچ کر حضرت حاجی صاحب نے انہیں کے یہاں قیام کیا۔ حاجی صاحب جیسے باغی کو اپنے یہاں ٹھہرانا، تباہی اور بربادی کو دعوت دینا تھا۔ مگر راؤ صاحب کا اخلاص ہر ایک خطرہ سے بے نیاز تھا۔

قدرت کی عجائب نوازی ملاحظہ ہو کہ اس قیام کے دوران میں راؤ صاحب کا اخلاص آزمائش کی کسوٹی پر کسا گیا۔

واقعہ یہ ہوا کہ مخبروں نے مخبری کر دی اور صبح کے وقت جیسے ہی افق مشرق سے آفتاب نے سر نکالا، مجسٹریٹ ضلع دَوش لیکر، راؤ صاحب کے مکان پر پہنچ گیا۔

حاجی صاحب نے بر سبیلِ احتیاط ایک ویران کوٹھڑی میں قیام فرمایا تھا، جو گھوڑوں کے اصطبل کے پاس تھی۔ مخبر نے ایسی صحیح مخبری کی کہ اس کوٹھڑی تک کا پتہ بتا دیا تھا۔ یہ اشراق کا وقت تھا اور حسبِ معمول حاجی صاحب نمازِ اشراق میں مشغول تھے۔ راؤ صاحب کے لئے یہ بہت ہی نازک گھڑی تھی۔ مگر توفیقِ خداوندی نے حوصلہ مند راؤ صاحب کی مدد فرمائی۔ راؤ صاحب آگے بڑھے۔ گرم جوشی سے کلکٹر صاحب کا استقبال کیا۔ بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔

"تشریف لائیے۔ اس وقت صبح صبح کیسے تشریف آوری ہوئی"۔ راؤ صاحب نے فرمایا۔

---

[1] کراماتِ امدادیہ ص۲۸ کرامت ۵۴۔ روانگی کے وقت آپ گنگوہ بھی تشریف لے گئے مگر مولانا رشید احمد صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ آپ حوالات میں بند تھے۔ حضرت کی روانگی سے ایک ماہ بعد رہا ہوئے۔ (امداد المشتاق ص۲۶۹ بحوالہ نقشِ حیات جلد ۲ ص۶۰)۔

Marfat.com

سخن پرور مجسٹریٹ نے کہا۔ سُنا ہے۔ آپ کے اصطبل میں کوئی گھوڑا بہت عمدہ ہے، صاحب اُسے دیکھنے آئے ہیں۔

بہت بہتر ہے۔ تشریف لائیے۔ اصطبل حاضر ہے۔ گھوڑے ملاحظہ فرمائیے۔

راؤ صاحب مجسٹریٹ بہادر کو اصطبل میں لے گئے۔ گھوڑے دکھائے۔ مجسٹریٹ بار بار راؤ صاحب کے چہرہ پر نظر ڈالتا تھا، اور حیران تھا کہ راؤ صاحب پر خوف و ہراس یا گھبراہٹ کا کوئی اثر نہیں۔ وہ دل دل میں خیال کر رہا تھا کہ شاید مخبر نے جھوٹی خبر دی۔

اصطبل میں گھومتے ہوئے اس ویران کوٹھری کے دروازہ پر بھی پہنچ گیا، جہاں حاجی صاحب قیام فرماتے اور یہ کہتے ہوئے کہ کیا اس میں گھوڑوں کی گھاس بھری جاتی ہے، کواڑ کھلوا دیئے۔

کوٹھری میں چوکی پر جانماز بچھی ہوئی ہے۔ لوٹا چوکی کے کنارہ پر اور وضو کے پانی سے نیچے کی زمین تر ہے مگر نماز پڑھنے والا کوئی نہیں۔

کلکٹر صاحب نے کوٹھری کے کونہ کونہ پر نظر ڈالی۔ کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ تو پھر راؤ صاحب سے ہی دریافت کیا کہ یہ چوکی کیسی ہے؟

راؤ صاحب: مَیں یہاں نماز پڑھا کرتا ہوں۔

کلکٹر صاحب: اصطبل کے کنارہ، ویران اور بوسیدہ کوٹھری میں نماز پڑھنے کا کیا مطلب؟ نماز کے لئے تو مسجد ہوتی ہے۔

راؤ صاحب: ہمارے مذہب کی یہ تعلیم ہے کہ فرض نماز تو مسجد میں جماعت کے ساتھ کُھلم کُھلا سب کے سامنے ادا کریں لیکن نفلیں چھپا کر کسی پوشیدہ جگہ میں پڑھیں اس لئے اشراق وغیرہ کی نفلیں مَیں یہاں پڑھا کرتا ہوں۔

اب کلکٹر صاحب خاموش تھے۔ رخصت ہوئے اور راؤ صاحب سے معذرت کی کہ کوئی گھوڑا ہماری مرضی کا نہیں نکلا۔ افسوس آپ کو تکلیف بھی دی اور ہمارا

Marfat.com

کام بھی نہیں ہوا۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

راؤ صاحب اس بلا کو رخصت کر کے سب سے پہلے اسی کوٹھری میں پہنچے دیکھا، حاجی صاحب چوکی پر تشریف فرما ہیں[1]۔

(۲) گڑھی پختہ جو اب ضلع مظفر نگر میں ہے اور اس زمانہ میں غالباً سہارن پور کے ضلع میں تھی، حضرت حاجی صاحب یہاں تشریف لے گئے اور موضع کے رئیس کے یہاں قیام فرمایا۔ مخبروں نے خبر کر دی۔ مجسٹریٹ نے پولیس کپتان کو فوراً حکم لکھ دیا۔ اس علاقہ کے تھانہ دار خواجہ احمد حسین[2] صاحب سہارن پوری تھے۔ ایس۔ پی، تھانہ میں پہنچا۔ کلکٹر کے حکم کا صرف اُوپر کا حصہ جس میں تلاشی کا آرڈر تھا، دکھا دیا۔ مگر باقی حصہ جس میں ملزم اور موضع وغیرہ کا نام تھا، نہیں دکھایا کہ شاید مسلمان ہونے کی وجہ سے کسی صورت سے اس دوش کو ناکام کر دیں، اور پہلے ہی خبر بھیج کر حاجی صاحب کو اپنی جگہ سے غائب کرا دیں۔ بہرحال کپتان صاحب تھانیدار کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ جب گڑھی پختہ کے قریب پہنچے تب خواجہ صاحب کو اندازہ ہوا کہ حاجی صاحب کی گرفتاری کے لئے یہ دوڑ جا رہی ہے۔ خواجہ صاحب کو معلوم تھا کہ حاجی صاحب کس کے یہاں قیام فرما ہیں۔ خواجہ صاحب نے گاؤں کے باہر سے ہی چلانا شروع کر دیا، اور اس زمیندار کا نام لے لے کر دھونس جمانے لگے۔ نمک حرام تو کہاں ہے، باہر آ، آج تجھے سمجھنا ہے، تو سرکار کے باغیوں کو اپنے یہاں ٹھہراتا ہے (وغیرہ وغیرہ)۔ خواجہ صاحب کی آواز بہت بلند تھی۔ رات کے سناٹے میں خواجہ صاحب کی آواز پورے گاؤں میں گونج گئی۔ زمیندار نے خواجہ صاحب کی آواز پہچان لی۔ اُس نے فوراً حاجی صاحب کو ایسی جگہ پہنچا دیا کہ حاجی صاحب ہاتھ نہ لگ سکے، اور دوش ناکام

---

[1] تذکرۃ الرشید جلد ۱ ص ۷۷-۷۸۔ [2] خواجہ اطہر حسن صاحب سہارن پور کے مشہور قومی کارکن، اُن کے پوتے ہیں۔

Marfat.com

واپس ہوئی۔

بہرحال جہاں جہاں حاجی صاحب پہنچتے رہے پولیس آپ کا تعاقب کرتی رہی۔ مگر "جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے"۔

اسی طرح ایک اور گاؤں کا واقعہ ہے۔ رات کے وقت پولیس فورس بالکل بے خبری میں اس مکان پر پہنچ گئی، جہاں حضرت قیام فرماتے۔ اسی کھلے ہوئے مردانہ مکان میں جہاں حضرت حاجی صاحب تشریف فرماتے، آپ کو لٹا کر آپ پر رضائی ڈال دی گئی۔

پولیس کو اس کا وہم بھی نہ ہوا کہ حاجی صاحب اس کھلے ہوئے مردانہ مکان میں ہوں گے۔ وہ پہلے زنانہ مکان کی طرف بڑھی۔ زمیندار بھی اس کے ساتھ مکان کے اندر گئے اور یہاں چیختے چلاتے اور باہر کے آدمیوں کو ڈانٹتے ہوئے کہہ گئے کہ اس بڈھے کو کھیت پر ڈال آؤ، اس نے کھانس کھانس کر بلغم سے سارا مکان گندا کر دیا ہے۔

پولیس اپنے دھیان میں مست تھی۔ چودھری صاحب کی اس زبان کو نہ سمجھ سکی، اور باہر کے آدمیوں نے حاجی صاحب کی چارپائی ایسی جگہ پہنچا دی جہاں پولیس نہ پہنچ سکی

دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست

مکہ معظمہ میں قیام اور وفات | مختصر یہ کہ غیبی امداد اور خداوندی تحفظات کے زیر سایہ آپ حجازِ مقدس پہنچے۔ وہاں پہنچ کر زہد و تقویٰ، ریاضت و مجاہدہ اور توکل علی اللہ کی وہ مثال قائم کی جس نے عہدِ صحابہؓ کی یاد تازہ کر دی۔ نہ صرف عجم بلکہ عرب نے بھی آپ کے سامنے گردنِ عقیدت خم کی۔ آج دنیائے اسلام کا ہر ذی علم آپ کو شیخ العرب والعجم کے خطاب سے یاد کرتا ہے۔ ان عزائم اور بلند حوصلوں کے مقابلہ پر آپ تذکرہ نویسوں کے اس بیان سے سبق لیجئے کہ آپ خِلْقَۃً ضعیف و نحیف اور نحیف اللحم (دُبلے پتلے) تھے۔ سچ ہے اللہ تعالیٰ جس کو روحانی قوت سے نوازے

Marfat.com

اس کو جسمانی قوّت کی کیا ضرورت۔

۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۹ ۱۸۹۹ء بروز چہار شنبہ بوقت صبح واصلِ بحق ہوئے، اور مکّہ معظمہ میں دفن کئے گئے۔ رحمہ اللہ و رضی عنہ۔

حجۃ الاسلام مولانا محمّد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو جماعتی پروگرام کے مطابق ہندوستان میں ہی رہنا تھا اور جب تک حاجی صاحب اس علاقہ سے بخیریت روانہ نہ ہو جائیں اُن کی خدمت میں حاضری اور جماعتی ضروریات کی تکمیل بھی آپ کے فرائض میں داخل تھی۔

اس سرکار کی طرف سے وارنٹ گرفتاری کے ساتھ انعام کا بھی اعلان ہو گیا تھا۔ وارنٹ کی خبر سُن کر دوست، احباب اور متعلقین نے روپوش ہو جانے پر مجبور کیا اور ایک علیحدہ جگہ آپ کو پہنچا دیا۔ تین روز تک آپ اُس جگہ روپوش رہے۔ چوتھا دن ہوا تو گوشۂ تنہائی کو خیرباد کہہ کر باہر تشریف لے آئے۔ مخلصین نے اصرار کیا۔ تو فرمایا:

"آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم غارِ ثور میں تین دن مخفی رہے تھے۔ سُنّت سے اتنی ہی مُدّت ثابت ہے۔ یہ مُدّت ختم ہو گئی۔ لہٰذا روپوشی بھی ختم"[1]

یہ اتباعِ سُنّت کے شوق کا ایک نمونہ تھا۔

اب ان خدا رسیدہ، پابندِ سنّت، برگزیدہ بزرگوں کی حاضر حواسی اور ذکاوت ملاحظہ ہو:۔

ایک روز آپ مسجد[2] میں تشریف فرما تھے۔ پولیس پہنچ گئی۔ آپ اطمینان سے اُٹھے، جوتیاں سنبھالیں اور مسجد سے باہر نکلنے لگے۔ کپتان پولیس نے خود آپ سے پوچھا۔ مولانا محمّد قاسم کہاں ہیں"۔

---

[1] نقشِ حیات جلد دوم ص۵۸۔ [2] یہ اسی مسجد کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو چھتے کی مسجد کے نام سے مشہور ہے جو اس وقت کے اربابِ باطن اہل اللہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

Marfat.com

آپ ایک قدم اور آگے بڑھے اور پیچھے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ ابھی یہاں تھے۔ اب کپتان پولیس مولانا کی تلاش میں مسجد کے اندر پہنچا، اور مولانا مسجد سے باہر نکل کر جہاں آپ[1] نے مناسب سمجھا، تشریف لے گئے۔

پولیس نئی تھی۔ اُس نے مولانا کا نام نہیں سُنا تھا۔ اُس کا تصوّر یہی ہوگا کہ اتنے بڑے مولانا جن کی اتنی شہرت ہے، بڑے جبڑے کلّے کے شاندار آدمی ہوں گے۔ وضع قطع بھی ایسی ہی شاندار ہوگی۔ اور مولانا کی سادگی کا یہ عالم کہ "بڑے مولانا" تو درکنار آپ کی شکل وشباہت[2] اور وضع قطع[3] سے آپ کو معمولی ذی علم[4] سمجھنا بھی مشکل ہوتا تھا۔ یہ ضرور

---

[1] سوانح قاسمی میں ہے کہ شاہ رمزالدین کی مسجد میں تشریف لے گئے (ص۱۷۷ جلد دوم) سوانح قاسمی میں یہ بھی ہے کہ کپتان پولیس مسجد سے باہر نکلا اور حضرت کو جاتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ مولانا تو یہی معلوم ہوتے ہیں جو جا رہے ہیں۔ پولیس ادھر چلی اور مسجد شاہ رمزالدین کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت وہاں (مسجد شاہ رمزالدین) سے نکلے اور پولیس کے جتھے میں گذرتے ہوئے کسی اور مسجد میں پہنچ گئے (ص۱۷۷) مگر ہم نے متعدد بزرگوں سے وہی سُنا ہے جو سطور بالا میں درج کر دیا۔ ہم کرامات اولیاء کے معترف ہیں مگر شرط یہ ہے کہ اس کا ثبوت بھی اتنا ہی قوی اور مضبوط ہو۔ یہاں قطع نظر ثبوت کے اس روایت میں ایک قسم کا تضاد بھی ہے کیونکہ اگر پولیس کپتان نے مولانا کو جاتے ہوئے راستہ ہی میں دیکھ لیا تھا تو پھر فوراً ہی گرفتار کیوں نہیں کر لیا۔ اتنا موقع کیوں دیا کہ آپ مسجد میں پہنچے، اور پولیس کو محاصرہ کرنا پڑا۔ [2] سُنا گیا ہے، سیاہی مائل گندمی رنگ تھا اور چہرہ پر چیچک کے نشان تھے۔ (تفصیل سوانح قاسمی جلد اوّل میں ملاحظہ ہو)۔ [3] گاڑھے کا معمولی کرتا پاجامہ یا لنگی آپ کی عام پوشاک تھی۔ [4] ایک لطیفہ اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ آپ کسی گاؤں کی مسجد میں تشریف لے گئے۔ نماز کا وقت آگیا۔ آپ کو کسی طرح یہ معلوم تھا کہ امام صاحب قرآن شریف صحیح نہیں پڑھتے تو آپ نے نمازیوں سے فرمایا کہ "آپ کہیں تو میں نماز پڑھا دوں"۔ گاؤں کے نمازیوں نے آپ پر نظر ڈالی اور کہنے لگے۔ واہ تجھ سے تو ہمارا امام ہی اچھا ہے۔ ہم تیرے پیچھے کیوں نماز پڑھیں؟

Marfat.com

ہوا کہ آپ ایک عرصہ تک مستقل طور سے کہیں نہیں رہے۔ آپ کے برادر نسبتی شیخ نہال احمد صاحب نے اصرار کر کے کچھ دنوں کے لئے اپنے گاؤں چکوالی میں بھیج دیا جو دیوبند اور نانوتہ کے درمیان لبِ سڑک تھا۔

دیوبند سے چند میل کے فاصلہ پر موضع "املیا" ہے۔ کچھ دنوں وہاں بھی قیام رہا۔ اس کے علاوہ آپ کے لئے دلچسپ مشغلہ ایک اور تھا یعنی اپنے شیخ طریقت اور امیرِ جہاد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری۔ اُن کے حالات کی خبر گیری، مستقبل کے متعلق ان سے ہدایات حاصل کرنا، مشورہ سے راہِ عمل طے کرنا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں دن کو چھپتے چھپاتے اور رات کو سفر کرتے ہوئے گنگوہ[1]، انبیٹھہ[2]، بوڑیہ، گمتھلہ، تگری[3]، لاوڑہ، پنجلاسہ[4] وغیرہ ضلع سہارنپور اور ضلع انبالہ کے مواضعات میں تشریف لے گئے جہاں حضرت حاجی صاحبؒ پہنچتے رہے تھے۔

سفرِ حج الزام غدر یا اس الزام کے شبہ میں لاکھوں ہندوستانی موت کے گھاٹ اُتارے جا چکے ہیں ظلم و ستم اور وحشت و بربریت کی جتنی بھی صورتیں ہو سکتی ہیں، ہندوستانیوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے کام میں لائی جا چکی ہیں مگر جو قدرت فرعون کے گھر میں موسیٰ کی پرورش کیا کرتی ہے وہ عجیب و غریب انداز سے ان کی حفاظت کر رہی ہے جو فرعونِ برطانیہ کے مقابلہ میں موسیٰ بن کر سامنے آنے والے ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بھی انہیں منتخب افراد میں ہیں جن کو قدرتِ خداوندی برطانوی سامراج کے مقابلہ میں نہ صرف موسیٰ بلکہ موسیٰ گر بنا کر کھڑا کرنے والی تھی۔

آپ صحیح معنیٰ میں صرف تین روز روپوش رہے۔ پھر خداوندِ عالم کی حفاظت کے بھروسہ پر خاص خاص مقاصد کے ماتحت متعدد مواضعات و قصبات اور شہروں میں گھومتے ہوئے تقریباً دو سال گذار دیئے۔

---

[1] کراماتِ امدادیہ ص۴۸۔ [2] ایضاً۔ [3] سوانح قاسمی ص۱۸۲ جلد ۲۔ [4] تذکرۃ الرشید امداد المشتاق نقشِ حیات و کراماتِ امدادیہ وغیرہ

Marfat.com

اس عرصہ میں حاجی امداد اللہ صاحب مکہ معظمہ بخیریت پہنچ چکے ہیں۔ بظاہر تارک الدنیا مگر دنیائے سیاست کے نہایت سنجیدہ امیر کی حیثیت سے مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کا قائم کیا ہوا مرکز سنبھال چکے ہیں۔

اب ضرورت تھی کہ جن کو اس مرکز کے ماتحت ہندوستان میں مرکزی کردار انجام دینا ہے پھر ایک مرتبہ مل کر بیٹھیں، اور اب تازہ حالات میں مستقبل کا تفصیلی لائحہ عمل طے کریں۔

اس مصلحت کے علاوہ ایک دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ انگریز کی متجسس نگاہوں سے جو یکم نومبر ۱۸۵۸ء کے نمائشی اعلان کے بعد بھی رہنمایانِ تحریک کی تلاش میں ہندوستان کے چپہ چپہ پر تیزی سے پڑ رہی ہیں، کچھ عرصہ تک آڑ لے لیں۔

یہی مصلحتیں سامنے تھیں جن کی بنا پر جمادی الثانیہ ۱۲۷۷ھ (دسمبر ۱۸۶۰ء) میں حج بیت اللہ کا قصد فرمایا۔ بظاہر اس سفر کے محرک حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں (حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے قابلِ فخر فرزند ارجمند دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر المدرسین اور تحریک دار العلوم دیوبند کے رکن رکین) مگر عجیب بات یہ ہے کہ ضروریاتِ سفر کا تکفل فرمانے والے یہی متوکل علی اللہ مولانا محمد قاسم صاحب ہیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے بیان[1] کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے،

---

[1] حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کی سوانح حیات لکھی تھی جو مختصر ہے مگر نہایت جامع۔ اس کا نام جس سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی تاریخِ وفات بھی معلوم ہوئی۔ یہ ہے:

حالات جناب طیب	مولوی محمد قاسم صاحب	مرحوم
۸۱۷	۴۸۶	۲۹۴

۴ رجمادی الاوّل - ۱۲۹۷ھ

یہ رسالہ اسی سال مطبع صادق الانوار میں باہتمام حافظ عبد القدوس صاحب طبع ہوا (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

اور اس کی بین السطور غور سے پڑھیئے۔

"آخر حضرت حاجی صاحب عرب کو روانہ ہو گئے۔ احقر کو بعد اُن کے یہی سُوجھی کہ تُو بھی چل۔ مولانا کی روپوشی محض عزیز و اقارب کے کہنے سے تھی، ورنہ اُن کو اپنی جان کا کچھ خیال نہ تھا۔ مولانا نے بھی ارادہ کیا۔ اس روپوشی کی بلا کے سبب والدین نے بخوشی اجازت دے دی۔ احقر بے سروسامان تھا قلیل سا زادِ راہ بہم پہنچایا تھا مگر مولوی صاحب کی بدولت وہ سب راہ بخیر و خوبی طے ہوئی۔ ہرچند مولوی صاحب بھی بے سامان تھے مگر بدولت توکّل سب راہ بخیر و خُوبی پوری ہوئی، اور سب کام انجام ہو گئے۔ کشتیوں کی راہ پنجاب ہو کر سندھ کی طرف کو گئے۔ کراچی سے جہاز میں بیٹھے۔ جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں روانہ ہوئے[1]۔ ایک سال بعد جمادی الثانیہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) چکا تھا۔ تاریخِ طباعت ۷ شوال ۱۲۹۷ھ۔ پھر مولوی سیّد احمد صاحب مالک کتب خانہ اعزازیہ نے اس رسالہ کو اپنے رسالہ ماہنامہ خالدین میں قسط وار شائع کیا اور اس کا نیا نام "سوانح عمری" رکھا۔ یہ اقتباس اسی سوانح عمری مطبوعہ انوری پریس دیوبند سے ماخوذ ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس سفر کی ڈائری لکھتے رہے ہیں۔ جو حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حُسنِ توجہ سے بیاضِ یعقوبی کے نام سے ۱۹۲۹ء میں شائع کی گئی۔ اس ڈائری میں سہارنپور سے تاریخ روانگی ۱۸ جمادی الاوّل ۱۲۷۷ھ مطابق ۲ دسمبر ۱۸۶۰ء یکشنبہ ہے۔ اس ڈائری میں ان تمام مقامات کا تذکرہ ہے جہاں قیام ہوا۔ مقامات وہی ہیں جہاں حضرت حاجی صاحب نے سفرِ ہجرت کے وقت قیام فرمایا تھا۔ اس ڈائری سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حاجی حافظ عابد حسین صاحب بھی رفیقِ سفر ہیں، اور یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے دیوبند میں ایک مدرسہ کے قیام کی تجویز پیش کی اور اپنے چند رفقاء کے ساتھ اس کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسہ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی حُسنِ توجّہ سے دارالعلوم کی عظمت اختیار کی۔

Marfat.com

میں وطن واپس پہنچے۔"

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات لکھنی مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وارنٹ گرفتاری کا قصہ اعلانِ معافی پر ختم نہیں ہوگیا، بلکہ ڈھائی سال مزید گذر گئے، تب بھی وارنٹ گرفتاری اور اس کے مقابلہ میں اپنے تحفظ کا سلسلہ جاری تھا۔ نیز حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا یہ فقرہ کہ سب کام انجام ہوگئے، اپنے اندر وسیع معنی رکھتا ہے۔ سطور بالا میں اس کا مفہوم پیش کیا جا چکا ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ

تقریباً نو ماہ گذرے، معافی عام کا اعلان ہو چکا ہے۔ ۱۸۵۹ء کا جون جولائی گذر رہا ہے۔ اگست آنے والا ہے مگر دار و گیر کا بازار اب بھی گرم ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خسر مولانا محمد نقی[1] صاحب جھجر میں شہید کئے جا چکے

---

[1] مولانا محمد نقی صاحب حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں بھی تھے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ کی عمر ابھی سات سال کی تھی کہ والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ نے اپنے دادا قاضی پیر بخش صاحب اور اپنے ماموں صاحبان کی زیر سرپرستی پرورش پائی۔ مولانا محمد نقی صاحب کے علاوہ تین ماموں اور تھے مولانا محمد تقی صاحب[1]، مولانا عبدالغنی صاحب[2]، مولانا محمد شفیع صاحب[3]۔ مولانا ابو نصر صاحب جن کا تذکرہ سطور بالا میں آئے گا مولانا عبدالغنی صاحب کے فرزند ارجمند تھے۔ عمر میں صرف دو سال چھوٹے۔ تعلیم و تربیت میں ہمیشہ ساتھ رہے۔ مولانا محمد نقی صاحب عالم و فاضل صاحب نسبت بزرگ تھے۔ سلسلۂ قادریہ میں حضرت شاہ سیف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت اور مجاز تھے۔ اتباعِ سنت کا عشق یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ رفتار و گفتار اور خورد و نوش میں بھی اتباعِ سنت معمول تھا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ آپ کا مزار دہلی میں قلعہ کے میدان میں پرانی سنہری مسجد کے شمالی جانب بیلوں میں ہے (ص۳۸ تذکرۃ الرشید حصہ اول) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جھجر میں نہیں بلکہ دہلی کے کسی معرکہ میں شہید ہوئے۔

Marfat.com

ہیں اور تھانہ بھون کے واقعات کے سلسلہ میں آپ کی گرفتاری کی افواہیں گرم ہیں حضرت مولانا گنگوہی اس عرصہ میں گنگوہ میں رہے۔ صرف ایک دو مرتبہ بقول مصنف "تذکرۃ الرشید" :-

"راتوں چلتے، دنوں چھپتے، خاردار جنگل پیدل قطع کرتے"

تگری[1] اور پنجلاسہ وغیرہ پہنچے، جہاں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سفر ہجرت کی منزلیں طے کرتے ہوئے قیام پذیر تھے۔

حضرت گنگوہیؒ نے اس موقعہ پر بھی یہ اصرار کیا کہ حضرت حاجی صاحب کے ساتھ مکہ معظمہ چلیں۔ مگر حاجی صاحب کا حکم یہی ہوا کہ ہندوستان میں رہو، تم سے حق تعالےٰ کو ابھی بہت سے کام لینے ہیں[2]۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب حضرت حاجی صاحب کو رخصت کر کے واپس ہوئے۔ پھر گنگوہ ہی کچھ عرصہ قیام فرمایا۔ اس کے بعد آپ رامپور منہیاران تشریف لے گئے اور وہاں حکیم ضیاء الدین صاحب مرحوم کے مکان پر قیام فرمایا۔ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ

---

[1] تگری کے خوش حال زمیندار راؤ اشرف علی خاں صاحب تھے جن کے خلف رشید اپنے زمانہ کے بلند پایہ مشہور عالم اور شیخ طریقت حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب تھے جنہوں نے رائے پور ضلع سہارنپور کو تلقین و ارشاد کا مرکز بنایا اور آج اسی مرکز سے مرشدِ وقت حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کا آفتابِ ارشاد، ضیا پاشیاں کر رہا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ تگری میں راؤ اشرف علی خاں صاحب کے یہاں ہی مقیم ہوئے تھے۔ اس وقت حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب کی عمر تقریباً تین سال تھی۔ راؤ اشرف علی خاں صاحب حضرت گنگوہیؒ سے اتنے متاثر ہوئے کہ آپ سے بیعت ہونے کی درخواست کی۔ مگر حضرت گنگوہی نے مشورہ دیا کہ قطبِ وقت حضرت حاجی صاحب ہندوستان میں موجود ہیں، اُن سے بیعت ہو جیئے۔ چنانچہ اسی سفر میں راؤ اشرف علی خاں صاحب کو اپنے ساتھ پنجلاسہ لے گئے اور وہاں حضرت حاجی صاحب سے بیعت کرا دی۔ (تذکرۃ الرشید جلد ۱ ص۸۱) [2] ایضاً۔

Marfat.com

کی آخری تاریخیں یا محرم ۱۲۷۶ھ کی ابتدائی تاریخیں یعنی ۱۸۵۹ء کی جولائی کا مہینہ ہے۔ پولیس کپتان گارڈن کرنیل فرانسس پولیر، فورس کے ساتھ گنگوہ پہنچتا ہے مسجد کے ایک گوشہ میں ایک صاحب گردن جھکائے مراقبہ میں مشغول ہیں۔ ایک سپاہی آپ کے پاس پہنچتا ہے اور گردن پر زور سے ہاتھ مار کر کہتا ہے "چل کھڑا ہو، کیا گردن جھکائے بیٹھا ہے" اور پھر دھکا دے کر مار پیٹ کرتے ہوئے مسجد سے باہر لے آتا ہے۔ یہ صاحب گرفتار کرلئے جاتے ہیں۔ پھر مکان پر پہنچ کر کونہ کونہ کی تلاشی لی جاتی ہے۔

یہ صاحب خاموش ہیں۔ جانتے ہیں کہ میں بے قصور ہوں اور جو کچھ میرے ساتھ کیا جا رہا ہے وہ محض مشابہت کے دھوکہ میں، مگر ایک لفظ زبان سے نہیں نکلتے۔ کیونکہ اُن کی آرزو یہ تھی کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب محفوظ رہ جائیں، خواہ اُن پر کچھ بھی گذرے۔ سب کچھ کر گذرنے کے بعد فتح کے نشہ میں، بدمست کرنیل اور اُس کے موذی سپاہیوں کی آنکھیں کھلتی ہیں کہ یہ جن کو گرفتار کیا گیا ہے، ملزم کے ماموں زاد بھائی مولانا ابو نصر صاحب ہیں۔ اصل ملزم (مولانا رشید احمد صاحب) اس وقت یہاں گنگوہ میں موجود ہی نہیں ہیں۔ وہ کچھ دنوں سے چند میل کے فاصلہ پر قصبہ رام پور منہیاراں میں مقیم ہیں۔ اس تحقیق کے بعد پولیس رام پور منہیاراں پہنچی، جہاں حضرت مولانا رشید احمد صاحب بلا مزاحمت گرفتار ہو گئے، اور چونکہ تمام غصہ ناکردہ گناہ مولانا ابو نصر صاحب پر نکالا جا چکا تھا، اس لئے حضرت مولانا گنگوہیؒ کو گرفتار کرتے ہوئے کوئی توہین آمیز حرکت بھی سرزد نہیں ہوئی۔ حضرت گنگوہیؒ کو بند بہلی میں بٹھا کر مسلح پولیس کی حفاظت میں سہارن پور پہنچایا۔ چند روز وہاں حوالات میں رکھے گئے۔ پھر مظفر نگر منتقل کر دیئے گئے کیونکہ یہیں[1] کے وارنٹ پر گرفتار ہوئے تھے۔ مولانا ابو نصر صاحب خود تو رہائی پا گئے مگر اپنے پھوپھی زاد بھائی مولانا رشید احمد صاحب کی گرفتاری اپنی مصیبت سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ لہذا جیسے ہی پولیس گنگوہ سے روانہ ہوئی، مولانا ابو نصر صاحب

---

[1] کیونکہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں ہے۔

Marfat.com

اور اُن کے والد (حضرت مولانا گنگوہیؒ کے ماموں) مولانا عبدالغنی صاحب پولیس کے پیچھے پیچھے پا پیادہ سہارن پور پہنچے۔

اب اس قصہ کا باقی حصہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے حوالہ سے ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ تحریر فرماتے ہیں:

آپ پر علاوہ شرکتِ جہاد شاملی یہ بھی الزام تھا کہ سپاہیوں کی رائفل آپ کے پاس ہے۔ آپ نے دونوں سے بالفاظ توریہ انکار کیا۔ حاکم نے پوچھا تم نے گورنمنٹ کے خلاف ہتھیار اُٹھایا۔ آپ نے فوراً جیب سے تسبیح نکالی اور فرمایا "یہ میرا ہتھیار ہے"۔ اُس نے کہا۔ وہ بندوق کہاں ہے۔ آپ نے فرمایا۔ مجھے بندوق سے کیا سروکار؟ غرضکہ اس کے تمام سوالات کا جواب اسی طرح دیتے رہے۔ جب اس کی مقصد براری نہ ہوئی تو اُس نے سپاہیوں کو حکم کیا کہ ننگی تلواریں لے کر اس کے سر پر کھڑے ہو جاؤ۔

آپ کے ماموں مولانا محمد شفیع صاحب گنگوہی جو کہ پنجاب میں عرصۂ دراز تک ملازم گورنمنٹ رہ چکے تھے۔ ہتھکڑیاں اور انگریز حاکم کی سختیاں اور دھمکیاں دیکھ کر پہلے سے سراسیمہ ہو رہے تھے، اس حکم کو سُن کر سخت پریشان ہو گئے۔ آپ کو علیحدہ لے جا کر کہنے لگے۔ بیٹا بتلا دے وہ بندوق کہاں ہے، بندوق کے مل جانے پر حاکم تجھ کو چھوڑ دے گا۔ وہ بندوق آپ کے کیا کام آئے گی۔ دیکھ ننگی تلواروں کا تجھ پر پہرہ بٹھا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ماموں جان آپ گھبرائیے نہیں۔ ایک تلوار نہیں، سینکڑوں تلواروں کا بھی اگر پہرہ قائم کر دیا جائے تو کیا خوف ہے۔ بندوق کا بتانا الزام کا سر پر لینا ہے۔ اس پر وہ بھی چپکے ہو گئے الغرض جب آپ ان تمام تخویفات اور دھمکیوں سے متاثر نہیں

Marfat.com

ہوئے اور نہایت استقلال سے جوابات دیتے رہے۔ سپاہی ننگی تلواروں سے آپ پر پہرہ دیتے رہے، تو آپ کو مظفر نگر جیل میں بھیج دیا گیا، اور شہادتوں کے حصول کے لئے پولیس اور حکومت کوشش کرتی رہی تاکہ ثبوت بہم پہنچا کر مقدمہ چلایا جائے۔ ماموں صاحب مرحوم جو کہ گنگوہ سے اسی اعلان اور ارادہ پر نکلے تھے اور ساتھ ساتھ تھے کہ مولوی رشید احمد جب تک رہا نہ ہو جائیں گے میں گنگوہ واپس نہ آؤں گا۔ انہوں نے ضمانت پر رہائی کی درخواست کی۔ حاکم نے تین ہزار کی تین سال کے لئے ضمانت طلب کی (یعنی ایک ایک ہزار کی تین ضمانتیں تین سال تک کیلئے) تین شخص ضمانت مطلوبہ کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر حاکم نے قبول کرنے سے اس حیلہ سے انکار کر دیا کہ یہ سب گنگوہ کے باشندے نہیں ہیں اس لئے ان کی ضمانت قانوناً درست نہیں۔

صاحب امداد المشتاق ص۱۵۳ پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی نقل کرتے ہیں:

جب میں قید خانہ میں تھا تو میری تین سال کے لئے تین ہزار کی ضمانت طلب ہوئی تھی۔ چنانچہ تین شخص ضامن ہوئے لیکن انگریز سخت مزاج تھا، اُس نے یہ کہہ کر کہ تینوں گنگوہ کے باشندے نہیں ہیں ضمانت نامنظور کر دی۔ ماموں صاحب نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اس کو نہ چھڑا لوں گا، گنگوہ نہ آؤں گا۔ چنانچہ وہ سائی تھے۔ اسی اثناء میں ہمارے حضرت (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب) گنگوہ تشریف لائے اور یہاں خبر تھی کہ میں اب رہا ہوا، اب رہا ہوا۔ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے فرمایا۔ چھوٹنے میں ابھی دیر ہے، ہم اس سے مل آتے ہیں۔ انہیں ایام میں کہ میں قید خانہ میں تھا، خواب میں تشریف

Marfat.com

لائے، گویا میرے پاس تشریف رکھتے ہیں، اور تسلی فرماتے ہیں۔ پھر حضرت یہاں سے تشریف لے گئے اور میں ایک ماہ بعد چھوٹا۔ (امداد المشتاق ص۱۸۳)۔

جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی گرفتاری آخر ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ یا ابتداء محرم ۱۲۷۶ھ (جولائی ۱۸۵۹ء) میں ہوئی۔ تقریباً ۶ ماہ حوالات کی زندگی میں صرف ہوئے۔ پس آپ کی رہائی جمادی الثانی ۱۲۷۶ھ (جنوری ۱۸۶۰ء) میں ہوئی اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب جمادی الاوّل ۱۲۷۶ھ (دسمبر ۱۸۵۹ء) میں ہندوستان سے تشریف لے گئے۔ رحمہم اللہ وقدس اسرارہم۔

مولانا محمد مظہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ

خلف حافظ لُطف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ساکن نانوتہ اپنے والد ماجد سے قرآن شریف حفظ کیا۔ مولانا مملوک علی صاحب، مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری، مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجدّدی خلف الرشید حضرت شاہ ابوسعید صاحب وغیرہم سے عُلُومِ متداولہ کی تکمیل کی۔ بخاری شریف حضرت شاہ مولانا اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی۔ اوّل اجمیر کالج میں پھر آگرہ میں ملازم رہے۔ پھر ملازمت ترک کر دی۔ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ حریّت میں شریک ہوئے۔ بڑی جرأت و ہمّت سے جہادِ شاملی میں حصّہ لیا۔ پیر میں گولی لگی۔ علاج معالجہ کے بعد بھی اس کا نشان باقی رہا۔ تحریک ختم

لہ حافظ لُطف علی صاحب حضرت مولانا محمّد قاسم صاحب رحمۃ اللہ کے ہم جد ہیں۔ ایک بزرگ شیخ ابوالفتح تک حافظ لُطف علی صاحب کا یہ سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔ حافظ لُطف علی صاحب خلف حافظ محمد حسن صاحب خلف حکیم غلام اشرف صاحب خلف حکیم عبداللہ صاحب خلف شیخ ابوالفتح صاحب۔ اور مولانا محمد قاسم صاحب کا سلسلہ اس طرح ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحب خلف شیخ اسد علی صاحب خلف شیخ غلام شاہ صاحب خلف شیخ محمد بخش صاحب خلف شیخ علاء الدین صاحب خلف ابوالفتح صاحب (العلم کراچی بابتہ ماہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۸ء)۔

Marfat.com

ہوئی تو کسی آنے والی تحریک کے لئے عرصہ تک اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔ روپوشی کی زندگی بسر کی۔ دار و گیر کا دَور ختم ہوا تو دارالعلوم کے نمونہ پر سہارن پور میں مدرسہ "مظاہر العلوم کی بنیاد رکھی۔ ان دونوں اداروں کے قیام میں صرف چھ ماہ کا فصل[1] ہے۔ آپ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پانچ سال بڑے تھے۔ ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۶ء) کی شب میں آٹھ بجے آپ نے انتقال فرمایا۔

دوسری عظیم الشان خدمت شاندار ماضی جلد دوم اور سوم میں وضاحت کی گئی ہے کہ تصانیف کے ذریعہ علمی پیرایہ میں اپنے نظریات کی اشاعت بھی اس جماعت کے پروگرام کا اہم جزو تھی۔ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی مولانا محمد احسن[2]

---

[1] تذکرۃ الخلیل ص۱۵۔ دارالعلوم دیوبند کی ابتداء ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ اور مظاہر العلوم سہارن پور کی ابتداء ماہ رجب ۱۲۸۳ھ میں ہوئی۔ تذکرۃ الخلیل ص۱۰ و ص۱۳۔ [2] مولانا محمد احسن صاحب نے دہلی پہنچ کر حضرت مولانا مملوک علی صاحب سے تکمیل کی۔ مولوی محمد حسین صاحب مراد آبادی اپنی تصنیف انوار العارفین میں تحریر فرماتے ہیں:۔ مولوی محمد احسن حافظِ قرآن و واعظ خوش بیان عالم فروع و اصول، دانندہ براہین و دلائل معقول و مدرس علمِ معانی و کلام و درس کنندہ بفصاحت و بلاغت تام، مفسر کلام اللہ و محدث حدیث رسول اللہ و جامع جمیع علوم منزجم احیاء العلوم و متصف باخلاق حسن ہستند۔ دہلی کالج سے عربی کی تکمیل کے بعد آپ ۱۸۴۷ء، ۱۲۶۲ھ میں بنارس کالج میں فارسی کے مدرسِ اوّل مقرر ہوئے۔ وہاں آپ نے ایک بیوہ خاتون مسماۃ زینب سے نکاح کرکے غدرِ بیوگان کی سُنّت زندہ کی۔ اس بیوہ کے ساتھ ایک شیر خوار بچہ بھی آپ کی تولیت میں آیا۔ جس نے جوان ہوکر دہلی میں "مطبع مجتبائی" قائم کیا جو بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں سب سے زیادہ مشہور مطبع تھا، جس نے بے شمار نادر تصنیفات پوری تصحیح اور خوبی کے ساتھ شائع کرکے علم کے قدردانوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔

مولانا محمد احسن صاحب کا قیام بنارس میں تقریباً چار سال رہا۔ پھر آپ بریلی تشریف لے آئے اور بریلی کالج میں شعبۂ فارسی و عربی کے ہیڈ مقرر کر دیئے گئے۔ آپ نے مستقل قیام (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

صاحب کے تعاون سے پروگرام کے اس جزو میں بھی حصہ لیا۔

مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی

حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں ۱۲۴۷ھ میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے انہیں اساتذہ کے سامنے جن کا ذکرِ خیر بار بار آچکا ہے زانوئے تلمذ طے کیا۔ تحریک میں سرگرم شرکت کے بعد جہادِ شاملی میں مردانہ وار حصہ لیا۔ آپ کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے بہت زیادہ تعلق خاطر تھا کسی وقت بھی اُن سے جُدائی گوارا نہیں تھی۔ امیر جہاد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس یگانگت اور تعلقِ قلبی کا لحاظ فرمایا۔ چنانچہ جو خدمت حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے سُپرد فرمائی، اُس میں آپ کو بھی شریک فرما دیا۔ مزید براں تاکید فرما دی کہ مولانا محمد قاسم کو کبھی تنہا نہ چھوڑیں کیونکہ انہیں خود اپنی جان کا خیال نہیں تھا۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) کے لئے بریلی ہی منتخب کر لی ۱۸۵۷ء کا انقلاب انگیز طوفان آیا تو آپ نے اپنے بھائیوں اور دوسرے بزرگوں اور ساتھیوں کے خلاف اس انقلابی طوفان کے سامنے سینہ تان لیا۔ ابھی یہ سیلاب بریلی میں داخل نہیں ہوا تھا کہ آپ نے وعظ اور تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں کو شرکت سے روکنے کی کوشش کی لیکن زمانہ کی رو کے مقابلہ پر سینہ تان لینا غلط تھا۔ چنانچہ آپ پر عوام کی یورش یہاں تک بڑھی کہ آپ بریلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ جب یہ سیلاب پایاب ہو گیا تو آپ دوبارہ بریلی واپس آئے یہاں مطبع صدیقی قائم کیا جس کو آپ کے برادرِ محترم مولانا محمد مظہر صاحب اور مولانا محمد منیر صاحب کا تعاون حاصل رہا، اور اسی تعاون کی بنا پر اس مطبع کو سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف شائع کرنے کی سعادت میسر آئی۔ حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفا جیسی اہم ترین تصانیف سب سے پہلے ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں اسی مطبع سے شائع ہوئیں۔ بریلی میں آپ نے عربی مدرسہ بھی قائم کیا۔ جس کا نام مصباح التہذیب رکھا۔ اس کے بعد اس کو مصباح العلوم کہا جانے لگا۔ اب اسی نام سے مشہور ہے۔ تقریباً نوے سال عمر پا کر ۱۳۱۲ھ ۱۸۹۵ء میں آپ نے وفات پائی۔

Marfat.com

تحریک کے خاتمہ پر جب روپوشی کا بادل چھٹا تو آپ نے بریلی پہنچ کر ۱۸۶۱ء میں بریلی کالج کی ملازمت اختیار کر لی، اور وہاں مطبع صدیقی کے کام میں اپنے بھائی مولانا محمد احسن صاحب کے شریک و مددگار رہے۔ آپ دو سال دارالعلوم دیوبند کے مہتمم بھی رہے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب[1] کیرانوی

اس محاذ کے مجاہدین میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا ذکرِ خیر باقی رہ گیا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کو شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب نے "بڑا عالم فاضل اور دانشمند" فرمایا ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ تحریک میں شریک ہونے کے بجائے وطن واپس چلے گئے۔ شمس العلماء کے اس فقرہ پر گذشتہ صفحات میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے یہاں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے شرکتِ جہاد کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا محمد عارف الاسلام صاحب عثمانی الجلالی کا ایک مضمون روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ یہاں یہ مضمون بجنسہٖ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس مضمون سے قصبہ کیرانہ میں مقابلہ کی تفصیلات بھی معلوم ہوں گی۔ نیز دو واجب الاحترام شخصیتوں اور جہاد میں شریک ہونے والی ایک برادری کا بھی تعارف ہوگا (یعنی مولانا عبدالحکیم صاحب تھانوی اور چودھری عظیم الدین صاحب اور

---

[1] مولانا رحمت اللہ صاحب کے والد صاحب کا اسمِ گرامی مولانا نجیب اللہ صاحب تھا۔ جو میرٹھ میں میر منشی رہے تھے۔ اجداد کا اصلی وطن پانی پت تھا (جو جمنا کے دوسری جانب تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر ہے) جدِ اعلیٰ کا نام شیخ عبدالرحمٰن عثمانی گازرونی بتایا گیا ہے۔ آپ ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کیرانہ میں حاصل کر کے دہلی تشریف لے گئے۔ لال قلعہ کے پاس مولانا محمد حیات کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ اس درس گاہ کے مدرسین اور دہلی کے دوسرے اساتذہ سے استفادہ کیا۔"

Marfat.com

گوجر برادری) چند ضروری فوائد حاشیہ میں اضافہ کر دیئے گئے ہیں۔

مولانا عارف الاسلام فرماتے ہیں :

یادگار شہیدانِ غدر ۱۸۵۷ء کے سلسلہ میں، میں اپنے حقیقی پردادا صاحب، کے برادر کلاں مولانا رحمت اللہ مرحوم کیرانوی، بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے مختصر حالات درج کر رہا ہوں۔

ضلع مظفر نگر کے پرگنہ شاملی میں زمین دارہ شیوخ اور گوجروں کے ہاتھ میں تھا جن میں دین داری کے ساتھ جوش بھی تھا۔ چنانچہ تھانہ بھون اور کیرانہ کا ایک محاذ قائم کیا گیا اور مجاہدین کی جماعت مدافعت، اور مقابلہ کرتی رہی۔ شاملی کی تحصیل پر حملہ کیا گیا اور پرگنہ کے چاروں طرف اس مجاہدانہ تحریک کا اثر عام ہو گیا۔

تھانہ بھون میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ اور مولوی عبدالحکیم صاحبؒ تھانوی مع رفقاء (ان رفقاء میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ۔ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ اور جناب حافظ ضامن صاحب شہید کے اسماء گرامی خاص طور پر یاد رکھے جائیں) اور نواح کیرانہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ گورہ فوج کا مقابلہ کر رہے تھے۔ مجاہدینِ کیرانہ میں چونکہ مسلمان گوجر زیادہ تھے اس لئے ان کی قیادت چودہری عظیم الدینؒ، حضرت مولاناؒ کے ساتھ کر رہے تھے (انقلاب کے بعد چودہری صاحب مذکور حضرت مولاناؒ کے پاس مکہ معظمہ چلے گئے تھے، اور وہیں ان کا انتقال ہوا) اس زمانہ میں عصر کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم اور تربیت کے لئے کیرانہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ بجایا جاتا تھا جس کی آواز سن کر لوگ جمع ہو جاتے تھے اور اعلان ہوتا تھا :

"ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا"

اس جملہ کے بعد جو کچھ کہنا ہوتا تھا، عوام کو سنایا جاتا تھا۔ اس پرانی آواز کو سننے والوں میں سے اب کوئی نہیں رہا۔ مگر جنہوں نے اپنے بزرگوں سے اس کی صدائے بازگشت سنی ہے، وہ اب بھی موجود ہیں۔ کیرانہ کے محاذ پر بظاہر شکست کا امکان نہ تھا۔ مگر

Marfat.com

بعض ابنائے وطن کی زمانہ سازی اور مخبروں کی سازش نے حالات کا رُخ بدل دیا۔ کیرانہ میں گورہ فوج اور توپ خانہ داخل ہوا۔ محلہ دربار کے دروازہ کے سامنے توپخانہ نصب کیا گیا اور گورہ فوج نے دربار کا محاصرہ کرلیا۔ ہر گھر کی تلاشی لی گئی۔ عورتوں بچوں اور ہر شخص کو فرداً فرداً دربار سے باہر نکالا گیا۔ اس لئے کہ کسی مخبر نے اطلاع دی تھی کہ مولانا دربار میں روپوش ہیں۔ کیرانہ کے قریب پنجبیٹھ مسلمان گوجروں کا ایک گاؤں ہے، وہاں مولانا اپنی باقی ماندہ جماعت کے ساتھ پہنچے۔ خود پنجبیٹھ کے لوگ بھی مجاہدین میں شریک تھے۔ اسی دوران میں گورہ فوج کے ایک گھوڑا سوار دستہ نے پنجبیٹھ کا رُخ کیا۔ کیرانہ اور تمام قرب و جوار کے حالات کی اطلاع مولانا کو ملتی رہتی تھی۔ چنانچہ پنجبیٹھ کے مکھیا کو جب فوج کی آمد کا حال معلوم ہوا تو اُس نے فوراً جماعت کو منتشر کر دیا اور مولانا سے خواہش کی کہ "کھرپا" لے کر کھیت میں گھاس کاٹنے چلے جائیں، چنانچہ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ گورہ فوج اسی کھیت کی پگڈنڈی سے گذری جہاں میں گھاس کاٹ رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اُڑتی تھیں وہ میرے جسم پر لگ رہی تھیں اور میں فوج کو اپنے پاس سے گذرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ فوج نے گاؤں کا محاصرہ کرلیا۔ مکھیا کو گرفتار کرلیا گیا۔ پورے گاؤں کی تلاشی لی گئی مگر مولانا کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ مجبوراً فوجی دستہ کیرانہ واپس ہوگیا۔ حالات پر قابو پالیا گیا اور حضرت مولانا کے خلاف فوجداری مقدمہ چلایا گیا۔ وارنٹ جاری ہوا۔ آپ کو مفرور باغی قرار دیا گیا اور گرفتاری کے لئے ایک ہزار روپیہ انعام کا اعلان ہوا۔

حضرت مولانا اپنا نام مصلح الدین بدل کر پیدل دہلی روانہ ہوئے۔ آپ کے لئے یہ وقت سخت آزمائش کا تھا۔ ایمانی عزم و ہمت اور استقلال کے ساتھ جے پور اور جودھپور کے مہیب ریگستانی جنگلوں کو پاپیادہ عبور کرتے ہوئے بندرگاہ سورت پہنچے، اس زمانہ میں سورت بندرگاہ سے بھی جہاز کا سفر آسان نہ تھا۔ بادبانی جہاز سال بھر میں صرف ایک مرتبہ ہوا کی موافقت کے زمانہ میں سورت سے روانہ ہوتا، اور

Marfat.com

اسی طرح جدہ سے آتا تھا اور ایک خط کا محصول چار روپے (للعہ) تھا۔ جو لوگ ہجرت کے ارادہ سے ترک وطن کرتے، وہ ساتھ ہی دُنیاوی تعلّقات اور باہمی علائق کو زندگی ہی میں ختم کر دیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا کی روانگی اور فوجداری مقدمہ کے بعد آپ کی اور آپ کے خاندان کی جائداد ضبط ہو کر نیلام ہوئی۔ خاص طور پر پانی پت میں (جو کہ مولانا کا سابقہ وطن اور اُن کے جدِّ امجد حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء کی جاءِ مزار ہے) مخبر کمال الدین کی شناخت پر جو جائداد قرق کر کے نیلام کی گئی، اس کا مختصر بیان درج ذیل ہے۔ جائداد کے نیلام کا فیصلہ ڈپٹی کمشنر کرنال نے ۳۰ جنوری ۱۸۶۴ء میں کیا۔

۱: سرائے کھجور۔ اس کی قیمت سرکاری طور پر ڈپٹی کمشنر کے کاغذات میں پانچ سو روپیہ ہے۔
۲: سرائے چوڑھے " " " " "
۳: سرائے شیخ فضل الٰہی " " " " "
۴: سرائے قصاباں " " " " "
۵: سرائے لوہ آباد " " " " "
۶: سرائے مایاں " " " " "

یہ سب سرائیں اور وسیع قطعات زمین اور مکانات صرف ایک ہزار چار سو بیس روپیہ میں نیلام ہوئے جن کی قیمت لاکھوں روپے تھی۔ مزروعہ علاقے اور سکنائی جائداد اور زراعتی زمینیں اس کے علاوہ ہیں جو بحق سرکار ضبط ہوئیں۔ مذکورہ بالا سرائیں جس قیمت پر نیلام ہوئیں، وہ بھی ملاحظہ ہوں۔

سرائے کھجور : ۴۲ روپیہ سرائے لوہ آباد ۱۵ روپیہ
سرائے چوڑھے : ۵۶ روپیہ اور سرائے قصاباں ۱۲ روپیہ

کاغذات جائداد نیلام شدہ میں انڈکس مشمولہ کا عنوان یہ ہے :

"انڈکس مشمولہ مثل فوجداری مقدمہ عرضی کمال الدّین ساکن کیرانہ حال

Marfat.com

پانی پت مولوی رحمت اللہ باغی ؒ

طویل سفر کے آلام و مصائب برداشت کرتے ہوئے مولانا مکہ معظمہ جا پہنچے۔ اس کے بعد وہاں کس طرح اس مجاہدِ حق نے دینی اور علمی کارنامے انجام دیئے، اور کس طرح عیسائی جماعتوں سے فاتحانہ مقابلہ کیا۔ پھر مدرسہ صولتیہ قائم کر کے غیر فانی کارنامہ انجام دیا سلطان ترکی عبدالحمید خاں صاحب سے شرفِ باریابی حاصل کیا، اور اپنے حقیقی برادر زادہ یعنی میرے دادا مولانا بدرالاسلام (مرحوم) کو وہیں تعلیم و تربیت دے کر سلطان مذکور کا معتمدِ خاص بنوا دیا۔ یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔

بفضلہٖ اب تک ان کے جانشین مدرسہ مذکور سے وابستہ اور مکہ معظمہ میں شاد و آباد ہیں۔ مولانا آخری دنوں میں مدینہ منورہ میں حاضر تھے۔ ۲۴ رمضان ۱۳۰۸ھ (۲ مئی ۱۸۹۱ء) کو وصال ہوا۔ مدینہ منورہ کی خاک پاک ابدی آرام گاہ بنی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

ڈاکٹر وزیر خاں رحمۃ اللہ علیہ

اگرچہ آپ دہلی یا مضافاتِ دہلی کے باشندہ نہیں ہیں۔ آپ کا اصل وطن بہار بتایا گیا ہے۔ مگر چونکہ عیسائیت اور عیسائیت نواز انگریزوں کے خلاف جہاد میں حضرت مولینا رحمت اللہ صاحب کے شریک رہے ہیں اس لئے مولانا رحمت اللہ صاحب کے تذکرہ کے ساتھ آپ کا ذکرِ خیر بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے اسبابِ بغاوت میں اُن کوششوں کا کسی قدر ذکر گذر چکا ہے جو عیسائی مشنریوں کی طرف سے ہندوستان میں جاری تھیں تاکہ مذہبی ہمنوائی حاصل کر کے برطانوی سامراج کو لازوال بنا دیا جائے۔ ان کوششوں کا ایک پہلو یہ بھی تھا، کہ ہندوستان کے مذہب پرستوں کو مناظرہ کا چیلنج دیا جاتا تھا، اور چونکہ اس وقت تک اقتدار کے وارث عام طور پر مسلمان ہی تھے، لہٰذا چیلنج کا نمایاں رُخ مسلمانوں ہی کی طرف رہتا تھا۔ ردِّ عیسائیت کی خدمت حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر وزیر علی خاں صاحب نے اپنے ذمہ لی تھی۔ ڈاکٹر صاحب یورپ جا چکے تھے۔ انگریزی کے ساتھ

Marfat.com

یونانی اور عبرانی زبانوں میں بھی آپ کو کافی درک تھا۔ آپ نے یورپ سے واپس آکر آگرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ تاج محل کے قریب، محلہ کاغذیاں میں آپ کی سکونت تھی۔ یہیں حضرت مولانا رحمت اللہ سے تعارف حاصل ہوا اور علمی رجحانات کی یگانگت نے ایک جان دو قالب کی مثال صادق کر دی۔

اس دور کی مناظرانہ تاریخ میں پادری فنڈر کی شکست خاص اہمیت رکھتی ہے جس نے ترقی پذیر عیسائیت پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ پھر آخر تک وہ پنپ نہ سکی۔

پادری فنڈر کو شکست دینے والے یہی مولانا رحمت اللہ صاحب اور اُن کے رفیق و معاون ڈاکٹر وزیر علی خاں صاحب[1] تھے۔

فنڈر ۱۸۵۴ء میں یورپ سے آیا تھا۔ رجب ۱۲۷۲ھ (مارچ ۱۸۵۶ء) میں مناظرہ ہوا۔ اس شکست فاش کے بعد فنڈر کے لئے ہندوستان میں منہ دکھانا مشکل تھا۔ وہ یہاں سے فرار ہوا۔ چند سال بعد ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں وہ قسطنطنیہ پہنچا اور وہاں بھی اسی طرح چیلنج کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب اور اُن کے دوست، ڈاکٹر وزیر علی خاں صاحب بھی ہجرت کر کے مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے۔ سلطان نے مولانا کو قسطنطنیہ طلب کیا۔ فنڈر کو وہاں بھی شکست فاش نصیب ہوئی۔

ڈاکٹر وزیر خاں صاحب ۱۸۵۷ء کے دورِ انقلاب میں دہلی تشریف لے آئے اور جب تک جنگ جاری رہی، دہلی میں مقیم رہے۔ بہادر شاہ اور جنرل بخت خاں کی طرف سے آپ کو خدمات بھی سپرد کی گئیں۔ جنرل بخت خاں نے آپ کو لارڈ آف آگرہ بھی بنا دیا تھا۔ پھر جنرل بخت خاں کے ساتھ ہی آپ لکھنؤ تشریف لے گئے، اور جب ہر طرح ناکامی ہوئی تو کسی طرح چھپ چھپا کر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ یہاں آپ نے علاج معالجہ شروع کر دیا جس سے خلقِ خدا کو بہت فائدہ پہنچا اور وہی آپ کی حفاظت کا ذریعہ بھی

---

[1] حضرت مولانا فیض احمد صاحب بدایونی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مناظرہ میں معاون تھے۔

Marfat.com

بن گیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی بدوی شیخ کی بیوی بیمار ہوئی۔ مرض لاعلاج تھا۔ اطبّا مایوس ہو چکے تھے۔ بدوی رئیس نے سب سے مایوس ہو کر ڈاکٹر صاحب سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے علاج سے اللہ تعالیٰ نے مریضہ کو شفا بخشی۔ یہ بدوی شیخ ڈاکٹر صاحب کا بہت ممنون ہوا۔ کچھ عرصہ بعد حکومتِ برطانیہ نے حکومتِ ترکیہ سے گفتگو کر کے ڈاکٹر صاحب کی حوالگی کا پروانہ حاصل کر لیا۔ جب بدوی سردار کو علم ہوا تو اُس نے شریفِ مکّہ کے پاس پیغام پہنچایا کہ ڈاکٹر وزیر خاں میری امان میں ہیں جب تک میرے قبیلے کے بیس ہزار افراد کٹ نہ جائیں گے، ڈاکٹر وزیر خاں کو حوالہ نہیں کیا جا سکتا۔ شریفِ مکّہ نے یہ رپورٹ حکومت ترکیہ کو پیش کر دی۔ باب عالی (مرکزی حکومتِ ترکیہ) نے یہ پروانہ منسوخ کر دیا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء)۔

رڑکی[1] (ضلع سہارن پور) ۲۱ مئی ۱۸۵۷ء کو گوجر قوم پرستوں نے رڑکی ضلع اور شہر کو آزاد کرا لیا تھا۔ لیکن ۳۰ مئی کو انگریزی فوجوں نے دوبارہ رڑکی کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور رسد پہنچائی۔

۲ جون کو رڑکی کی فوج کے کچھ سرغنوں نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ ان میں سے کچھ سپاہی نگینہ ہوتے ہوئے بجنور پہنچے۔ جہاں وہ گرفتار کر لئے گئے اور مراد آباد میں ان کو پھانسی دے دی گئی۔ ان میں سے تین سپاہی بھاگ کر رڑکی کے نزدیک ایک گاؤں "گنیش پور" پناہ گزیں ہو گئے۔ انگریزی فوجوں نے اُن کا تعاقب کیا لیکن وہ وہاں سے بھی بچ کر نکل گئے۔ اس پر قرب و جوار کے گاؤں والوں کو دھمکی دی گئی کہ کسی بھی باغی کو چھپانے کی کوشش کی گئی تو اُسے بھی پھانسی دے دی جائے گی۔ اس کے بعد گاؤں والوں پر مظالم ڈھائے گئے۔ ۱۲ جون کو پھر رڑکی فوج کے ایک سوار دستے نے جس کو بجنور جانے کا حکم ہوا تھا، بغاوت کر دی۔ اُن کا کورٹ مارشل کیا گیا۔

---

[1] محمد احمد صاحب نامہ نگار روزنامہ الجمعیۃ کی رپورٹ روزنامہ الجمعیۃ (مئی ۱۹۵۷ء) میں شائع ہوئی تھی۔ یہ مضمون اسی سے ماخوذ ہے۔

Marfat.com

۲۳ رجون کو منگلور[1] میں نہر کے پُل کے دوسری طرف قوم پرستوں کی فوج جمع ہوئی۔ جس کی تعداد دو سو تھی۔ ان کی ٹکر انگریزی فوج سے ہوئی۔ جس میں تین قوم پرست ہلاک ہوئے اور آٹھ کو گرفتار کر لیا گیا۔ جن میں سے چار کو اسی جگہ پھانسی دے دی گئی، اور لاشوں کو رسی میں باندھ کر درختوں پر لٹکا دیا گیا۔ باقی چار کو رڑکی لاکر برگد کے درخت پر لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔

۱۴ رجون کو دہانہ گنگا کے پاس رانی مجرا گاؤں میں قوم پروروں اور انگریزی فوج کے درمیان زبردست جنگ ہوئی جو لگاتار چار دن تک جاری رہی۔ دونوں جانب سے توپوں کا استعمال ہوا۔ قوم پرور انقلابیوں نے کچھ ہٹ کر دوسرے گاؤں "فتوا" میں مورچہ لگایا۔ ڈٹ کر مقابلہ ہوا۔ چار انگریز ہلاک ہوئے۔ چھ قوم پرور شہید اور ۴۱ گرفتار ہوئے۔ ان میں سے گیارہ کو رڑکی لاکر برگد کے درخت پر پھانسی دی گئی۔ باقی ۳۰ کو بنیت مار کر جوالا پور لے جاکر چھوڑ دیا گیا۔

۲۲ رجولائی کو محمود پور اور دیوبند کے درمیان انگریزی فوجوں اور قوم پرستوں کے درمیان مقابلہ زبردست ہوا۔ جس میں ۳۶ قوم پرور شہید ہوئے اور بہت سے زخمی۔ اس کے علاوہ ۳۸ گرفتار ہوئے۔ جن میں سے ۱۴ کو رڑکی میں اسی برگد کے درخت کے نیچے پھانسی دے دی گئی۔

مجاہدین کو شکست ہو گئی تو انگریزی فوجوں نے ان مواضعات پر چڑھائی شروع

---

[1] منگلور، رڑکی سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر مشہور قصبہ ہے۔ حضرت مولانا قاضی اسمٰعیل صاحب جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے معاصر اور بلند پایہ شیخ طریقت تھے۔ اُن کے صاحبزادے قاضی عبدالغنی صاحب اور ہندوستان کے مشہور قوم پرور خاموش رہنما مولوی سید طفیل احمد صاحب (علیگ) مصنف حکومت خود اختیاری اور مسلمانوں کا روشن مستقبل و رسالہ "جوازِ سود" وغیرہ ان کے خلفِ رشید مولوی محمد احمد صاحب کاظمی ایڈووکیٹ، ان سب کا وطن مالوف یہی قصبہ منگلور (ضلع سہارن پور) ہے۔

Marfat.com

کر دی۔ گاؤں والوں نے بھی مقابلہ کیا۔ مگر آخر کب تک؟ بہت سے شہید ہوئے۔ ایک سو تیس کو گرفتار کر کے رڑکی لایا گیا۔ برگد کا درخت جس کے سایہ میں تھکے ماندے مسافر سانس لیا کرتے تھے، ان مسافرانِ شاہراہِ آزادی کا مقتل بنایا گیا۔ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کو ان سب کو اسی جگہ پھانسی دے دی گئی۔ جوالاپور کے ایک گوجر سردار کو یہیں لا کر پھانسی دے دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۹۵۷ء سے پانچ سال پہلے (۱۹۵۲ء) تک اس برگد کے تنے پر لوہے کا ہُک اور زنجیر کا ٹکڑا موجود تھا۔ آندھی میں یہ تنا گر گیا تو یہ ہُک اور زنجیر بھی غائب ہو گئی۔

برگد کا یہ درخت رڑکی سے متصل "سنہرا گاؤں" کے قریب ہے۔ مشہور یہی ہے اور قرینِ قیاس بھی ہے کہ اس درخت کی شاخوں میں رسیوں کے پھندے ڈال کر جن کو پھانسیاں دی گئیں، اُن کی تعداد ڈھائی سو ہے۔ ۱۹۵۷ء میں جب جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی سو سالہ یادگار منائی گئی تو جلسہ کے لئے اسی برگد کا سایہ تجویز کیا گیا جہاں سو سال پیشتر کے شہیدوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

علی گڈھ فضا میں سکون تھا۔ یکایک ایک برہمن گرفتار کیا گیا۔ اُس پر الزام یہ تھا کہ اُس نے سپاہیوں کو ورغلایا اور یہ منصوبہ بنایا کہ ہم باہر سے بارات لائیں گے تم اُس کے ساتھ شامل ہو کر افسران کو مار ڈالنا۔ ۲۰ مئی کو اُسے دیسی سپاہ کے روبرو پھانسی دے دی گئی۔ سپاہی چُپ چاپ یہ منظر دیکھتے رہے۔ یکایک ایک سپاہی آگے بڑھا، اور برہمن کی لٹکتی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کر کے بلند آواز سے کہا:

"بھائیو! اسے دیکھو، جس نے دھرم کی خاطر جان قربان کر دی"۔

اس آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ دلوں کی دنیا میں طوفان برپا ہو گیا۔ انہوں نے افسروں کو تو کوئی آزار نہیں پہنچایا۔ البتہ تمام فرنگیوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ جلد سے جلد علی گڈھ چھوڑ دیں۔ فرنگی رخصت ہوئے تو فوجیوں نے جیل خانہ توڑا۔ قیدی چھڑائے

Marfat.com

خزانہ قبضہ میں لیا اور دہلی روانہ ہوگئے - یہ فوج کا عمل تھا - اب شہر والوں کی کارگذاری ملاحظہ فرمائیے :

مولانا عبدالجلیل شہید

خلف مولانا ریاض الدین صاحب (شارح قصیدہ بردہ) حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب دہلوی کے شاگرد رشید جامع مسجد علی گڈھ کے امام تھے اور وہیں آپکا حلقۂ درس بھی قائم تھا۔ نہایت متقی، پاک باز اور باخدا بزرگ۔ شہر کے آدمی آپ سے گہری عقیدت رکھتے تھے اور عوام کے رجحان سے متاثر ہو کر دنیا ساز انگریز بھی آپ سے ملاقات کرنے آتے تھے۔ مگر آپ ان کو بہت ہی کم ملاقات کی اجازت دیتے تھے، اور اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ انگریز بہادر کے ساتھ اس کی میم بھی ہے، تو دور ہی سے منع کرا دیا کرتے تھے۔

آپ کے پوتے قاضی محمد سفیان صاحب قاضیٔ شہر علی گڈھ کا بیان[1] ہے کہ علی گڈھ انگریزوں سے خالی ہوا تو زمام قیادت آپ کے حوالہ کی گئی۔ تقریباً دو ماہ تک شہر کا نظم و نسق آپ نے سنبھالے رکھا۔ جولائی یا اگست میں انگریز تازہ دم فوجیں لے کر آگرہ کی جانب سے علی گڈھ پر حملہ آور ہوئے تو مولانا اپنے ساتھیوں کے ساتھ مقابلہ کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔

ٹڈراک کی سڑک پر انگریزی فوجوں سے تصادم ہوا۔ مقابل تازہ دم، اور تمام سامان سے مسلح تھا۔ اس کی فوج باضابطہ قواعد داں تھی اور اس طرف جوش آزادی اور ولولہ قربانی تھا جس نے آپ کو میدان جنگ میں ثابت قدم رکھا۔ یہاں تک کہ بہتر ۷۲ ساتھیوں کے ساتھ آپ نے اسی میدان میں جام شہادت نوش کیا۔ ان بہتر ۷۲ شہداء کو جامع مسجد میں لایا گیا اور یہیں دفن کیا گیا۔ مولانا عبدالجلیل شہید کو بھی ان شہداء کے بیچ میں دفن کیا گیا۔ ان تمام شہداء کے مزارات جامع مسجد کے شمالی دروازہ

---

[1] یہ قلمی بیان محفوظ ہے جو الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

Marfat.com

کے بالکل قریب ہیں۔ مولانا کی شہادت کے بعد انگریز خونخوار درندے کی طرح سارے شہر میں گھوم رہا تھا، جہاں کوئی مسلمان صورت ملا شہید کر دیا گیا۔ موتی مسجد کے سامنے پھول چوراہہ پر اور چوراہہ عبدالکریم پر پھانسیاں لٹکا دی گئیں تھیں۔ جہاں کسی دشمنِ آزادی نے چغلی کھائی کہ یہ بھی شریکِ جہاد تھا، اس کو فوراً پھانسی دے دی جاتی تھی۔

مجاہدین کے بیوی بچوں کو تلاش کر کے چُن چُن کر تہ تیغ کیا جا رہا تھا۔ ہماری پردادی صاحبہ اس قیامتِ صغریٰ میں اپنے چار بچّوں کو لے کر اُن کے منہ پر پوتا مٹی مل کر جنگل کی طرف نکل کھڑی ہوئیں اور علی گڈھ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں رسول پور میں ان چاروں بچّوں کو چھپا کر رکھا۔ تقریباً تین سال تک انتہائی تکلیف کے اندر اس گاؤں میں جیسے تیسے ان بچّوں کی پرورش کرتی رہیں۔ تین سال کے بعد جب گرفتاریاں بند ہو گئیں اور پوری طرح اطمینان ہو گیا۔ تب وہ اپنے بچوں کو یہاں لے کر آئیں۔ علی گڈھ آ کر معلوم ہوا کہ مولانا عبدالجلیل شہید کے تمام مکانات اور جائداد کو کھدوا کر پھینک دیا گیا ہے۔ نہ رہنے کے لئے کوئی جگہ تھی اور نہ ٹھیرنے کے لئے کوئی ٹھکانہ۔ پھر اللہ نے رفتہ رفتہ اپنی مدد سے اُن کے ٹھیرنے کا اور گذارے کا انتظام کیا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب مرحوم جو اُن کے خلفِ اکبر تھے۔ آہستہ آہستہ پروان چڑھے، اور انہوں نے وہ علم و کمال حاصل کیا، جس نے مولانا عبدالجلیل شہید کے علم اور نام کو دُنیا میں روشن کر دیا۔ اسی دوران میں مولانا قاسم صاحبؒ نانوتوی کا علی گڈھ آنا اور مولانا اسمٰعیل صاحب کو تعلیم دینا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔

بلند شہر

کالے آم کا میدانِ جنگ۔ عبداللطیف خاں صاحب کا ایثار

بہت کم لوگوں کو یہ تاریخی واقعہ معلوم ہے کہ بلند شہر میں کالے آم (ضلع کی کچہریوں کے متصل) کے قریب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے ہندوستان کے حامیانِ آزادی کی ایک خونریز جنگ ہوئی تھی۔ اگرچہ انگریز اپنی فوجی طاقت اور تنظیم کے بہتر ہونے کے

Marfat.com

باعث اس میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن ہندوستانیوں نے ایسی سختی سے جم کر مقابلہ کیا کہ اس کی مثال یوپی کے دوسرے شہروں میں مشکل سے ملے گی۔ اس لڑائی میں شروع سے ہی انگریزوں کا پلّہ بھاری تھا۔ یعنی ان کی فوج ہندوستانیوں سے زیادہ تھی اور سامانِ جنگ بھی افراط سے تھا۔ اس کے علاوہ دہلی اور میرٹھ سے اُن کو برابر امداد مل رہی تھی۔ اس کے برعکس ہندوستانیوں کی تعداد کم تھی اور اُن کے پاس ہتھیار بھی کم اور پُرانی قسم کے تھے۔ پُرانی توڑے دار بندوقیں، بھالے اور تلواریں، میدانی توپ ایک بھی نہ تھی، اور کمک اور رسد کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لوگ آس پاس کے دیہات سے خود ہی آکر دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ اس معرکہ کا اصل ہیرو مالاگڈھ کا نواب ولی داد خاں تھا۔ جس کا حال بعد میں بیان کیا جائے گا۔ کالے آم کی لڑائی میں خان پور، پنڈرادل، اور ملک پور کے رئیسوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور ولی داد خاں کو نقد و جنس کی صورت میں جس قدر مدد دے سکتے تھے، دی۔ ان مقامات کے سینکڑوں نوجوان آزادی کی لڑائی میں حصّہ لینے کے لئے میدان میں آگئے۔ نواب ولی داد خاں کو مدد دینے والوں میں عبداللطیف خاں رئیس خان پور کا نام اس لئے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ ان کی حیثیت اور مالی حالت دوسرے رئیسوں سے زیادہ تھی۔ وہ اپنی برادری میں ممتاز ترین فرد اور پٹھانوں کی بارہ بستیوں میں سردار سمجھے جاتے تھے۔ اُن کی ریاست تقریباً ڈیڑھ سو دیہات پر مشتمل تھی۔ عبداللطیف خاں ضلع بلند شہر کے قدیم جاگیرداروں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لئے مغل بادشاہ اور اس کے حامیوں کو اُن سے توقعات بھی زیادہ تھیں۔ عبداللطیف خاں سن رسیدہ ہونے کے باعث بذاتِ خود کالے آم کی لڑائی میں شریک نہ ہوسکے۔ لیکن ولی داد خاں کو بیش از بیش مدد دی۔ دہلی کے لال قلعہ سے بادشاہ کے جو حامی نکل آئے تھے اُن میں سے اکثر نے قلعہ خان پور میں پناہ لی۔ عبداللطیف خاں انگریزوں کو زرِ مالگذاری ادا کرنے سے پہلے ہی انکار کرچکے تھے۔ کالے آم کی لڑائی کے بعد اُن کا نام کھلے ہوئے دشمنوں کی فہرست میں درج کرلیا

Marfat.com

گیا۔ بلند شہر کے معرکہ میں شکست کھانے کے بعد ہندوستانی لشکر منتشر ہوگیا انگریزوں کے عتاب کا نزلہ پہلے عبداللطیف خاں رئیس خان پور اور اس کے بعد حرمت خاں ساکن پنڈراول اور فیض احمد خاں رئیسِ ملک پور پرگرا۔ حرمت خاں اور فیض احمد خاں کو وکٹوریہ کے اعلان کے تحت معافی مل گئی۔ لیکن عبداللطیف خاں رئیس خان پور کی تمام جائداد اور قلعہ ضبط کرلیا گیا اور اُن کو عمر بھر کے لئے کالے پانی بھیج دیا گیا[1]۔

نواب ولی داد خاں اور اُن کے دو[2] ساتھی

قلعہ مالاگڈھ کی بربادی اور گوجر قوم کی بے نظیر بہادری پھر تباہی

نواب ولی داد خاں بہادر مالاگڈھ ولد نواب بہادر خاں ولد حق داد خاں، شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں علاقہ برن کے حاکم تھے۔ بلند شہر سے ۵ میل اُتر پچھم کی سمت کالی ندی کے کنارے پر قلعہ مالاگڈھ کے نام سے قلعہ تیار کیا۔ نواب بہادر خاں اور مرہٹوں سے بار بار جنگ ہوئی اور کبھی بھی مرہٹوں کو برن کے علاقہ میں قدم رکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ نواب بہادر خاں صاحب کا انتقال ۱۸۱۴ء میں ہوگیا۔ نواب

---

[1] از عزیز حسن خاں صاحب حسن پوری، بحوالہ سنڈے ایڈیشن "الجمعیۃ" مورخہ ۲۶ شعبان ۱۳۷۲ھ، ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء۔ [2] ماسٹر ریاض الدین صاحب کا یہ مضمون روزنامہ "الجمعیۃ" کے سنڈے ایڈیشن میں شائع کیا جاچکا ہے۔ ماسٹر ریاض الدین صاحب موضع ایچانہ، ضلع بلند شہر کے رہنے والے ہیں۔ نواب ولی داد خاں کے ایک ساتھی حاجی یاد اللہ خاں صاحب جن کا ذکر اسی مضمون کے آخر میں آرہا ہے، وہ ماسٹر ریاض الدین صاحب کے دادا کے بھائی تھے۔ ماسٹر صاحب نے یہ واقعات اپنے خاندان کے ان بزرگوں سے سُنے ہیں جو ۱۸۵۷ء میں جوان تھے۔ ماسٹر ریاض الدین صاحب کے موضع ایچانہ سے قلعہ مالاگڈھ پورب دکھن کی سمت ۸ میل کے فاصلہ پر تھا اور موضع اسا اور صرف ایک میل اُتر پورب میں۔

Marfat.com

ولی داد خاں کو کمپنی ریاست کی آمدنی کے علاوہ ایک ہزار روپیہ ماہوار دیتی تھی۔ نواب ولی داد خاں کی ایک بھانجی بہادر شاہ کے ایک شہزادے سے منسوب تھی۔ میرٹھ کی انقلابی فوجوں نے نام کے بادشاہ کو کام کا بادشاہ بنایا تو نواب ولی داد خاں بہادر شاہ کو مبارک باد دینے کے لئے دہلی تشریف لے گئے۔ ۲۶ مئی ۱۸۵۷ء کو نواب ولی داد خاں، بہادر شاہ سے سندِ صوبہ داری دوآبہ لے کر چند سپاہیوں و تلنگوں وغیرہ کے ساتھ مالاگڈھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ غازی آباد پہنچے تحصیل دار و تھانہ دار نے حاضر ہو کر نذر گذاری اور حکومتِ دوآبہ کی مبارک باد دی۔ نواب صاحب نے غازی آباد کا انتظام مکمل کر کے کچھ سپاہی سڑک اور قصبہ کی حفاظت کیلئے متعین کر دیئے۔ مہربان علی خاں و مظفر علی خاں امروہی کو ساتھ لیا اور قصبہ داوری میں آکر قیام کیا اور کئی ہزار گوجر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ تیسرے دن نواب صاحب اپنے قلعہ مالاگڈھ میں آگئے اور ضروری انتظامات میں لگ گئے۔ دوسرے دن سائل پور کا نمبردار سو سواروں اور دو سو پیادوں کو لے کر خدمت میں حاضر ہوا۔ نمبردار کے صاحبزادے چاند خاں کو بغیر ثبوت کلکٹر بلند شہر نے پھانسی دے دی تھی۔ نمبردار صاحب انگریز کلکٹر سے اپنے بیٹے کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ کلکٹر کو معلوم ہوا کہ سائل پور کا نمبردار نواب ولی داد خاں کے پاس گیا ہوا ہے۔ کلکٹر نے حفاظت کے انتظامات شروع کر دیئے۔ ادھر نواب ولی داد خاں نے اپنی صوبہ داری دوابہ کا اعلان کر دیا اور ہر طرف احکام جاری کر دیئے اور محمد اسمٰعیل خاں کو پچاس سوار اور چالیس تلنگے اور ایک توپ دے کر قصبہ بلند شہر پر قبضہ کے لئے روانہ کر دیا۔ محمد اسمٰعیل خاں نے بلند شہر پر قبضہ کر لیا۔ کلکٹر بلند شہر، شہر چھوڑ کر بابو گڈھ چھاؤنی تحصیل ہاپوڑ ضلع میرٹھ چلا گیا اور بلند شہر کے علاقہ پر نواب ولی داد خاں کی حکومت قائم ہو گئی۔ اُن کے پرچم کے تلے غلام حیدر خاں و مہدی بخش خاں سہارن پوری و قاضی وزیر علی بلند شہری، عبداللطیف خاں رئیس خانپور، اسمٰعیل خاں و اعظم خاں و نواب مصطفٰے خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد و حاجی یاد اللہ خاں اینچانوی

Marfat.com

تھانیدار قصبہ گلاوٹھی و امین پدھان گوجر موضع اساور وغیرہ جمع ہو گئے۔ اکثر ضلع بلند شہر کے جاٹ انگریزوں کے طرف دار تھے اور موضع کورلی و بھٹونہ اور موضع بینونی جاٹوں کے گڈھ بنے ہوئے تھے۔ نواب ولی داد صاحب نے محمد اسمٰعیل خاں صاحب کو بلند شہر سے بُلا کر امین گوجر جس کے ساتھ ایک ہزار گوجر تھے۔ اُس کی ہمراہی میں موضع کورلی اور بھٹونہ کی طرف روانہ کیا۔ یہاں کے لوگوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، جو انگریزی ہتھیاروں سے لیس تھے۔ امین گوجر کے ساتھ ایک توپ بھی تھی۔ نواب صاحب کے ماموں، نواب صاحب کی تمام فوج کے گولہ بارود کے مختارِ کُل تھے جو انگریزوں سے سازباز کر چکے تھے اور نوابی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ آخر نواب صاحب کے ماموں نے غدّاری کی اور اسمٰعیل خاں اور امین گوجر کو شکست ہوئی۔ اسمٰعیل خاں زخمی ہو کر مالاگڈھ واپس لَوٹ آئے۔ امین گوجر اساور چلا گیا اور جاٹوں سے نونک جھونک ہوتی رہی۔ نواب ولی داد خاں کے پاس دس ہزار سوار اور پندرہ ہزار پیادے اور ضرورت کے لائق ہر قسم کا سامان بھی موجود تھا اور ہر جگہ کے رؤسا، سوار اور پیادے لے کر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہو رہے تھے۔ امیر علی خاں، امراؤ بہادر خاں ولد مظفر علی خاں چھ سو سواروں کو لے کر خدمت میں حاضر ہوا۔ نواب ولی داد خاں کی انگریزوں سے کافی عرصہ تک جنگ ہوتی رہی۔ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ مسٹر ترنیل گورے اور دیسی سوار اور پیادہ لے کر بابو گڈھ چھاؤنی ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں جما ہوا تھا۔ نواب صاحب نے محمد اسمٰعیل خاں و حاجی منیر خاں کو تین ساڑھے تین سو سوار اور پانچ سو پیادے دے کر اور مزید فوج بھیجنے کا وعدہ کر کے کرنل ترنیل پر حملہ کرنے کے لئے ہاپوڑ کی طرف روانہ کر دیا۔ قصبہ گلاؤٹھی پہنچ کر محمد اسمٰعیل خاں و حاجی منیر خاں و حاجی یاد اللہ خاں اینچانوی (تھانیدار گلاؤٹھی) نے آپس میں طے کیا کہ صبح چار بجے مسٹر ترنیل کی فوج پر فقط سواروں کے رسالہ سے حملہ کیا جائے اور پیادوں کو قصبہ گلاؤٹھی میں رکھا جائے اور وقتِ ضرورت طلب کیا جائے۔

Marfat.com

یہ سوار نواب صاحب کی فوج کے جانباز سوار تھے اور اس رسالہ کا نام لانڈے سواروں کا رسالہ تھا کیونکہ اس رسالہ کے تمام گھوڑوں کی دُم کے کچھ بال کٹے ہوئے رہتے تھے۔ رسالہ شام کے وقت قصبہ گلاؤٹھی سے روانہ ہو کر موضع مرشدپور کے پاس کالی ندی کے نالے (عرف چھوئیے) کے میدان میں ٹھہر گیا اور سوار آرام کرنے کے لئے گھوڑوں کی باگوں کے ہاتھ اور پیروں میں پھندے لگا کر سو گئے۔ کیونکہ صبح چار بجے مسٹر کرنل ترنیل کی فوج پر حملہ کرنا تھا۔ یہاں سے چار میل کے فاصلہ پر مسٹر ترنیل فوج لئے پڑا ہوا تھا۔ کسی غدّار نے ترنیل کو خبر کر دی کہ نواب ولی داد خاں کا رسالہ آرام سے سویا ہوا ہے۔ کرنل ترنیل نے جو گھات میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ایک بجے رات کو رسالہ پر حملہ کر دیا۔ نواب صاحب کا رسالہ غفلت میں سویا ہوا تھا اور گھوڑوں کی باگیں ہاتھ اور پیروں میں پڑی ہوئی تھیں۔ فائرنگ ہوتے ہی گھوڑے بدک کر بھاگنے لگے اور تمام سوار سموں سے کچلے گئے۔ جو اُٹھ کھڑے ہوئے وہ گولیوں کا نشانہ بنا دیئے گئے۔ چند سوار جان بچا کر بھاگ سکے۔ اس شکست کے بعد نواب صاحب کی ہمّت نہیں ٹوٹی مگر دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ دہلی فتح ہونے کے چند دن بعد ہی انگریزی فوجوں نے مالاگڈھ پر چاروں طرف سے دھاوا بول دیا۔ مقابلہ سخت رہا۔ آخر نواب صاحب کے ماموں کی غدّاری رنگ لائی اور شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مالاگڈھ کا علاقہ انگریزوں نے ضبط کر کے مالاگڈھ کے قلعہ کو کھود کر مٹی کا ڈھیر کر دیا اور بلند شہر داوری ونکور خورجہ خان پور کے اکثر لوگوں کو گرفتار کر کے دار پر چڑھایا۔ ہر روز بلند شہر میں کالے آم پر لوگوں کو پھانسی دی جاتی تھی اور لاشیں لٹکی رہنے دی جاتی تھیں۔ نواب ولی داد خاں و رئیس کھلیسا وغیرہ شکست کے بعد بریلی پہنچ گئے اور نواب خان بہادر خاں وغیرہ کے ساتھ مل کر روہیل کھنڈ میں انگریزوں سے اپریل ۱۸۵۸ء تک جنگ کرتے رہے۔ نواب خان بہادر خاں گرفتار ہو گئے، اور نواب ولی داد خاں کہاں روپوش ہوئے، کچھ پتہ نہیں چلا۔ سُنا گیا ہے کہ تقریباً دس برس بعد نواب ولی داد خاں نے بنجاروں کا بھیس بدل کر قلعہ

Marfat.com

مالاگڈھ کے ڈھیر کے قریب قیام کیا اور قلعہ کا خزانہ کھود کر لے گئے۔ پھر پتہ نہیں چلتا، کہاں روپوش ہو گئے۔ نواب صاحب کی نسل سے بھی کوئی شخص مالاگڈھ میں نہیں رہا اور نہ بعد میں گرفتار ہوا۔

نوٹ: یہ کالا آم جس پر پھانسیاں دی گئیں، چوراہے کے بیچ میں اب تک کھڑا ہے۔

ایمن پدھان گوجر رئیس اسادر ضلع بلند شہر

ایمن پدھان، نواب ولی داد خاں رئیس مالاگڈھ ضلع بلند شہر کی فوج میں افسر تھا۔ کئی ہزار گوجر سوار اور پیادے توپ خانے کے ساتھ اس کے ہمرکاب رہتے تھے۔ بڑی شان کا آدمی تھا اور بڑا بہادر آدمی تھا۔ جدوجہدِ آزادی ۱۸۵۷ء میں نواب ولی داد خاں (مالاگڈھ) کی ہمدردی اور وطن کی آزادی کے لئے اپنی تمام قوم کو جنگِ آزادی میں جھونک دیا۔

اسادر سدھارن پور، قصبہ دادری و قصبہ ونکور جمنا کے کھادر کے آس پاس کے تمام گوجر اُس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے تھے۔ نواب ولی داد خان کو گوجر فوج پر بڑا بھروسہ تھا۔ ہر حملہ میں گوجر فوج پیش پیش رہتی تھی اور آخر وقت تک بڑی بہادری سے لڑتی رہی۔ سکندر آباد پر تین دفعہ حملہ کیا۔ کورلی، بھٹونہ پر حملہ کیا جہاں کئی ہزار انگریزوں کے طرف دار موجود تھے اور مالاگڈھ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے سدھارن پور کے راودت قبیلہ کے چار گوجر لُٹّس، ہردیال، گُردیال وغیرہ نے بہادری کی مثال قائم کر دی۔ موضع بینوئی میں کئی ہزار جاٹ جمع تھے اور نواب صاحب کے نومفتوحہ علاقہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ چاروں بھائیوں نے موضع بینوئی پر حملہ کر کے ہجومِ کثیر کو منتشر کیا۔ لُٹّس کی پیٹھ میں بلّم لگا۔ مارنے والا کھینچ نہ سکا۔ دو میل دُور آ کر لُٹّس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بلّم کو پکڑ کر کھینچ لیا۔ سُنا گیا ہے کہ چاروں بھائیوں کے ہتھیار کام نہیں دے رہے تھے۔ چاروں بھائی ہتھیار پھینک کر آدمیوں کو آدمیوں سے ٹکرا کر مار دیتے تھے اور تہلکہ مچائے ہوئے تھے۔ اسی مناسبت سے یہ مثال قائم

Marfat.com

ہوگئی کہ اگر کسی سے کوئی کام نہیں ہو سکتا تو کہا جاتا ہے کہ راوتوں کا سا لوہا ٹوٹ گیا۔ مگر ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ گوجر فوج میں نظم و نسق کی کمی تھی لوٹ مار پر جلد راغب ہو جاتے تھے۔ آخر کار نواب ولی داد خاں کو شکست ہوئی۔ ایمن پدھان و تمام گوجر قوم پر انگریزوں کا عتاب نازل ہوا۔ گوجر قوم کے گاؤں کے گاؤں جلا دیئے گئے۔ جائدادیں نیلام کر دی گئیں اور کوشش کی گئی کہ اس پوری قوم کو من حیث القوم نیست و نابود کر دیا جائے۔ باقی رہے نام اللہ کا۔ انگریز ہندوستان سے نکل گیا۔ یہ قوم اب بھی باقی ہے مگر حالت آج تک بہتر نہیں ہو سکی۔

حاجی یاد اللہ خاں موضع اینچانہ ضلع بلند شہر حاجی یاد اللہ خاں اینچانوی قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر میں کمپنی سرکار کی طرف سے علاقہ قصبہ گلاؤٹھی کے تھانیدار تھے۔ بڑے رعب داب کے آدمی تھے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں نواب ولی داد خاں نے اپنی صوبیداری دوآبہ کا اعلان کر دیا۔

ایمن پدھان گوجر حاجی یاد اللہ خاں کا دوست تھا۔ دونوں میں بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ ایمن پدھان کے اشارہ سے حاجی یاد اللہ خاں نے قصبہ گلاؤٹھی کا تمام علاقہ نواب ولی داد خاں کے سپرد کر دیا۔ نواب صاحب نے انعام و اکرام دے کر عزت افزائی کی اور اختیارات میں ترقی کر دی۔ حاجی صاحب نے بڑی خوبی کے ساتھ آخر وقت تک علاقہ کا نظم و نسق قائم رکھا اور کئی معرکوں میں پیش پیش رہے قلعہ مالاگڈھ کی شکست کے گرفتار ہوئے۔ زمین جائداد سب ضبط ہوئی اور نیلام کر دی گئی۔ بڑی کوشش سفارشوں سے جان بخشی ہو گئی۔

Marfat.com

روہیلکھنڈ

بریلی - بدایوں - مرادآباد - بجنور - شاہجہانپور

گورنر روہیلکھنڈ نواب[1] خان بہادر خاں شہید (بریلی) | نواب خان بہادر خاں حافظ الملک حافظ رحمت خاں والیٔ روہیل کھنڈ کے پوتے تھے۔ اُن کے والد کا نام نواب ذوالفقار خاں تھا جو بریلی کے گورنر رہ چکے تھے۔ جن کے نام پر بازار ذوالفقار گنج شہادت گنج کے پاس اب تک بریلی میں موجود ہے۔ شعر و سخن میں کمال رکھتے تھے۔ مصروف تخلص، جرأت کے شاگرد تھے۔ آپ کا ایک دیوان بھی تھا۔ مقاصد الصالحین آپ کی تصنیف ہے۔ دورِ انگریزی میں نواب خان بہادر خاں صدر امین کے عہدے پر تعینات تھے۔ تاریخ گلزاری لال قلمی کے مصنف نے ۱۸۴۷ء میں خان بہادر خاں کی تنخواہ ۲۵۵ روپیہ تحریر کی ہے۔ ہندوستانیوں کو اتنا بڑا عہدہ شاد و نادر ہی دیا جاتا تھا۔ ذاتی اعزاز و اکرام خاندانی پنشن اور آرام و سکون کی زندگی حاصل ہونے کے باوجود خان بہادر خاں انگریزوں کی جابرانہ پالیسی، اُن کے ظلم و ستم اور ناانصافی سے سخت نالاں تھے۔ اتفاقاً بریلی چھاونی میں ایک اور انقلابی شخصیت جنرل بخت خاں روہیلہ کی موجودگی تھی جو انگریزی توپ خانہ کا ایک نہایت قابل اور محبِ وطن افسر تھا۔ جنرل بخت خاں نے بغاوت کی تنظیم[2] اپنے دوست مدار علی خاں وغیرہ کے مشورہ

---

[1] سید مصطفیٰ علی صاحب بریلوی کا مضمون جو روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کا ماخذ ہے۔ [2] روہیلکھنڈ میں بغاوت کی ابتدائی تنظیم جن کے ہاتھوں ہوئی، ان میں جنرل بخت خاں اور مدار علی خاں کے علاوہ محمد شفیع رسالدار (سواروں کی رجمنٹ ۸ء) جنرل نیاز محمد خاں، ظفر یار خاں اور ساداتِ نو محلہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے تنظیم اس ہوشیاری اور قابلیت سے کی کہ انگریز افسروں کو وقت کے وقت تک حقیقت حال کا پورا اندازہ نہ ہو سکا (العلم جنگِ آزادی نمبر۔ کراچی)۔

Marfat.com

اور اعانت سے کی، اور ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء بروز اتوار یہ لاوا پھوٹ نکلا جس کی توقع کی جا رہی تھی۔ چنانچہ بعض ہوشیار انگریزوں نے اپنے اہل و عیال کو احتیاطاً نینی تال روانہ بھی کر دیا تھا۔ تاریخ سلیمانی قلمی میں مرقوم ہے کہ بلوہ ہونے سے قبل مسٹر ایگزینڈر کمشنر روہیل کھنڈ نے نواب بہادر خاں سے کہا کہ امروز فردا میں بلوہ ہونے والا ہے، چونکہ یہ ملک آپ کا موروثی ہے، اس کا بندوبست کیجئے۔ نواب نے تو اس وقت انکار کر دیا لیکن بعد کو جب جنرل بخت خاں روہیلہ معززین شہر اور فوج کے سربراہوں کے ہمراہ نواب کی خدمت میں تخت نشینی کا معروضہ پیش کرنے گئے تو کچھ پس و پیش کے بعد عنانِ حکومت سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا۔ مسند نشینی کی رسم پرانی کوتوالی کے سامنے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ انجام دی گئی۔ مسند نشینی کے واسطے خان بہادر خان اپنی قیام گاہ واقع محلّہ بھوڑ سے (آج کل یہ کوٹھی کھیڑہ خان بہادر کہلاتی ہے) موجودہ نینی تال روڈ سے گذرتے ہوئے پرانی کوتوالی آئے تھے۔ ایک چشم دید گواہ نے میرے عم بزرگوار اور مولوی سید الطاف علی صاحب بریلوی سے بیان کیا کہ چونکہ اتنے بڑے مجمع کو اعلیٰ درجہ کی سواریوں میں لے جانا ممکن نہیں تھا، اس لئے نواب نے پیدل چلنا پسند کیا۔ نواب آگے آگے چل رہے تھے۔ سُرخ و سپید چہرہ بڑی بڑی آنکھیں، بلند و بالا قد، سفید لمبی داڑھی، دائیں بائیں جنرل بخت خاں روہیلہ، دیوان سوبھا رام، مدار علی خاں، اور دیگر معزّزین صف بہ صف مسلّح چل رہے تھے۔ خان بہادر خاں نے حکومت سنبھالتے ہی ایک وار کونسل قائم کی۔ اندرونی معاملات دیوان سوبھا رام کے سپرد کئے۔ سوبھا رام بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ سادات نو محلّہ (جن کے محلّات موجودہ مسجد نو محلہ سے لے کر ڈاک خانہ موجودہ تک پھیلے ہوئے تھے)۔ اور سیّد معصوم پیرزادہ (جو حافظ رحمت خاں والئے روہیل کھنڈ کے پیر کی اولاد میں سے تھے) کسی بات پر دیوان سوبھا رام سے ناراض ہو گئے لیکن خان بہادر خاں نے اپنے بزرگوں کے پیر کے گھرانے تک کی رائے کو رد کر کے دیوان کو بحال رکھا۔ مالیہ وصول کرنے کے واسطے خان بہادر خان نے

Marfat.com

باقاعدہ تحصیل دار مقرر کئے اور شدید مشکلات کے باوجود چند روز کی جدّ و جہد میں پورے روہیل کھنڈ میں نمونہ کا امن و انتظام قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت جب کہ ہر طرف آگ برس رہی تھی، روہیل کھنڈ دارالامن بنا ہوا تھا[1]۔ خان بہادر خان کو خوش قسمتی سے اپنے ابتدائی ایّام میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کا بھی کامل اعتماد حاصل ہو گیا تھا۔ ٹھاکر جیمل سنگھ، رگناتھ سنگھ آف بدھیلی اور ٹھاکران شیو گڈھ و نگریا سادات نے کامل اتحادِ عمل سے کام لیا۔ رگھناتھ سنگھ کو خان بہادر خاں نے راجہ کا خطاب دیا، اور پرگنہ فرید پور کا انچارج بنا دیا۔ ٹھاکر جیمل سنگھ کو کلکٹر کا عہدہ دیا گیا اور ایک ہزار روپیہ ان کی تنخواہ مقرر کر دی گئی۔ نواب نے تقریباً ۳۰ ہزار فوج جمع کی۔ ۴۰ توپیں مہیا کیں۔

---

[1] محترمہ سیّد انیس فاطمہ بریلوی جنہوں نے اپنی مشہور کتاب "۱۸۵۷ء کے چند ہیرو" لکھ کر جنرل بخت خاں جیسے جانبازانِ حریّت کا سب سے پہلے تعارف کرایا ہے، انہوں نے دو روایتیں بھی قلمبند کی ہیں جو اپنے بزرگوں سے سُنی تھیں۔ اس زمانہ کے امن و امان کے سلسلہ میں اِنہیں محترمہ کی روایت ہے کہ "ہمارے دادا صاحب کو سیّد صاحب (سیّد وزیر علی صاحب) نے بتایا کہ خان بہادر خاں کے زمانۂ حکومت میں پورا شہر ساری رات جاگتا رہتا تھا۔ بازار کھلے رہتے، سڑکوں اور گلی کوچوں میں بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔ مکمّل امن و امان تھا۔ لوگ نواب کی انتظامی قابلیت اور رعایا پروری کے بڑے مدّاح تھے۔ مسجدیں، مسافر خانے اور سڑکیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ امن و امان کی ڈونگی پیٹتے ہی ہر چیز ارزاں ہو گئی تھی۔ تیل روپے کا پانچ سیر، گھی ڈھائی سیر اور گیہوں بیس سیر کے حساب سے فروخت ہو رہا تھا۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں کوئی تقریب نہ ہوتی ہو۔ لوگ خوش ہو ہو کر ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے اور کہتے کہ خدا نے اپنی رحمت سے نصاریٰ کی حکومت سے ایسی نجات دلا دی ہے کہ ہر چیز میں برکت ہو گئی ہے۔ اسلحہ سازوں کی دکانوں پر بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ تلواروں پر دستے چڑھوائے جا رہے تھے۔ مجاہدوں کے غول کے غول زرہ بکتر سے لیس پورے شہر میں گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے۔ "اسلام کا بول بالا، فرنگی کا منہ کالا" کے نعروں سے زمین و آسمان ہل جاتے تھے۔ (العلم کراچی جنگِ آزادی نمبر اپریل تا جون ۱۸۵۷ء)۔"

Marfat.com

اس فوج پر تقریباً ۲ لاکھ ۶۵ ہزار روپیہ ماہوار خرچ کیا جاتا تھا۔ نواب نے ٹکسال قائم کی۔ خان بہادر خاں کی مہر پر یہ الفاظ کندہ تھے۔ الحکم للہ و الملک للہ۔

فرمانِ شاہی نواب نے جنرل بخت خاں روہیلہ کو دہلی روانہ کیا۔ وہاں جنرل کا بڑا اعزاز کیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر نے جنرل کو "لارڈ گورنر" کا خطاب دیا اور کُل افواجِ شاہی کی کمان سپرد کر دی۔ یہ بہادر جنرل آخر وقت تک دادِ شجاعت دیتا ہوا مفقود الخبر ہو گیا۔

۲۱ جون ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر شاہِ دہلی نے نواب خان بہادر خاں کو اپنا نائب مقرر کیا اور خلعتِ سرفرازی و خطاب نواب انتظام الدولہ محافظ الملک خان بہادر خاں تنویر جنگ رئیسِ اعظم روہیل کھنڈ عطا کیا گیا۔ مراد آباد، بدایوں، شاہ جہان پور اور بجنور میں خان بہادر خاں کی حکومت تسلیم کر لی گئی۔ نواب مجو خاں مراد آباد میں، نواب کلن نبیرہ بخشی سردار خاں آنولہ میں، نواب غلام قادر خاں شاہ جہان پور میں اور نواب محمود علی خاں بجنور میں نیابت کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ مراد آباد میں عباس علی خاں (نبیرہ نواب دوندے خاں والیِ مراد آباد) بھی امیدوارِ نظامت تھے۔ اس لئے آپس میں سخت رسہ کشی شروع ہو گئی۔ خان بہادر خاں نے انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی غرض سے جنگِ آزادی کے بیشتر رہنماؤں مثلاً نانا راؤ، سید احمد اللہ شاہ دلاور جنگ، فیروز شاہ، نواب تفضل حسین خاں والیِ فرخ آباد وغیرہم سے برابر خط و کتابت رکھی، اور دامے، درمے، قدمے معاون رہے۔

نینی تال پر چڑھائی دہلی سے باضابطہ اجازت ملنے و نیز ابتدائی ملکی و مالی انتظام کرنے کے بعد خان بہادر خاں کی توجہ اصل دشمن کی طرف ہوئی جو نینی تال میں موقع کی تاک میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ذرا سا سکون پاتے ہی انگریز روہیل کھنڈ پر حملہ آور ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے بنے میر خاں اپنے پوتے کی سرکردگی میں ایک زبردست فوج روانہ کی۔ لیکن یہ فوج بھیڑی سے آگے نہ بڑھی۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۷ء میں علی خاں میواتی کے تحت ایک تازہ دم فوج بریلی سے روانہ ہوئی۔ یہ فوج یلغار کرتی اور ترائی کے جنگلات سے

Marfat.com

گزرتی ہوئی دامن کوہ میں کاٹھ گودام تک پہنچ گئی لیکن اس دوران میں ملکی غداروں کی مدد سے دیسی فوج کی نقل و حرکت کی مکمل اطلاع انگریزوں کو پہنچ گئی۔ چنانچہ اعلےٰ درجہ کی خبر رسانی، عمدہ توپ خانہ اور پہاڑی پوزیشن کی وجہ سے انگریزوں کو عارضی فتح حاصل ہوگئی۔ بریلی گزیٹر کے مصنف نے اس واقعہ کے سلسلہ میں حقیقی غداری کا اقبال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس جنگ کا نتیجہ دیکھ کر خان بہادر خاں انگریزی لکھنے اور پڑھنے والوں کو گرفتار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ کیونکہ ان کو بجا طور پر شبہ تھا کہ کچھ لوگ نینی تال سے نامہ و پیام رکھتے ہیں۔ پانچویں کالم کی روک تھام کرنے کے بعد ایک نئی فوج چیدہ چیدہ نوجوانوں پر مشتمل حیدر خاں و فضل حق خاں کی کمان میں کاٹھ گودام گئی اور کمال دلیری اور بہادری کے ساتھ رات کی تاریکی میں نینی تال پہنچنے کے واسطے پہاڑی علاقہ طے کرنے لگی۔ ایک خطرناک موڑ پر انگریز سپاہ سے بڑے گھمسان کی جنگ ہوئی۔ ایک بہادر افسر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ لال ڈانگی پہنچ گیا لیکن شیرازہ منتشر ہو جانے کی وجہ سے یہ مہم بھی ناکام رہی۔ فروری ۱۸۵۸ء میں خان بہادر خاں نے آخری زبردست کوشش نینی تال فتح کرنے کی کی اور فضل الحق وکالے خاں اور محمود خاں کو مستقلاً اس مورچہ پر تعینات کر دیا۔ ان لوگوں نے اس قدر جانبازی سے کام کیا کہ انگریز میدان میں اُترنے کی ہمت نہ کر سکے، باوجودیکہ گورکھوں کی پوری پوری مدد ان کو حاصل ہو چکی تھی۔ اگست ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو نینی تال غیر محفوظ مقام معلوم ہونے لگا، اور انہوں نے اپنے بال بچوں کو الموڑہ بھیج دیا۔ (بریلی گزیٹر)۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی نے اس وقت کی روہیل کھنڈ کی بغاوت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جن ضلعوں میں بغاوت ہوئی وہ روہیل کھنڈ کی بغاوت کے آگے خفیف تھی۔ اس وقت بریلی شہر میں غضب کا جوش و خروش تھا۔ ظہیر دہلوی داستانِ غدر میں تحریر فرماتے ہیں، "بریلی میں ہر طرف کے مفروروں کا اجتماع ہے اور سب سردار مثلاً نانا راؤ، فیروز شاہ وغیرہم جمع ہیں۔ رام پور کے تیس ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں اور مردانِ رام پور کا یہ حال ہے کہ

Marfat.com

ایک ایک تھان دوپٹہ کا سر سے بندھا ہوا اور آدھا آدھا گھوڑے کے رکاب سے لٹکتا ہوا ہے۔ چار چار طمنچے کمر میں لگے ہوئے ہیں، دوہری تلواروں میں ڈاب رکھی ہوئی ہے، گھوڑوں پر سوار ہیں اور شہر میں گھوڑے کداتے پھرتے ہیں، پچاس ہزار کا اجتماع بریلی میں موجود ہے۔ یہ وقت خان بہادر خاں کے عروج کا تھا۔

ریاست رام پور کی مخالفت نواب یوسف علی خاں والئے ریاست رام پور انگریزوں کے بڑے خیر خواہ تھے اور ایجنٹ تھے، مراد آباد پر زبردست فوج لے کر چڑھ دوڑے۔ نواب رام پور کے خاندان کو حافظ رحمت خاں کے خاندان سے پرانی کاوش تھی۔ وہ جانتے تھے کہ حافظ رحمت خاں کے خاندان کے معزز فرد "خان بہادر خان" کے سامنے اُن کا چراغ جل نہیں سکے گا۔ علاوہ ازیں انگریزوں کی غلامی رگ رگ میں سما چکی تھی۔ جب انگریز نینی تال بھاگ گئے تو نواب یوسف علی خاں نے اُن سے روہیل کھنڈ پر قبضہ کرنے کی اجازت طلب کی ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مصنف اخبار الصنادید اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ نواب نے نینی تال لکھا "یہ موقع بہت مناسب ہے اگر آپ منظور کریں تو ہم روہیل کھنڈ میں حکومت قائم رکھیں" (انگریزوں کی طرف سے) کیونکہ جب تقویت کامل ہو جائے گی، (خان بہادر خان کی) تو پھر اجرائے حکومت میں مدتوں مشکلیں ہوں گی اور ریاست (رام پور) کو خطروں میں مبتلا ہونا پڑے گا۔

انگریز پورے یہودی ٹھہرے، ایسے نازک وقت میں اپنے یار وفادار پر بھی پورا بھروسہ نہ کر سکے اور ۴ جون ۱۸۵۷ء کو پیغام دیا کہ آپ صرف ضلع مراد آباد پر حکومت کر سکتے ہیں۔ نواب یوسف علی خاں کا مراد آباد پر عارضی قبضہ ہو گیا تھا لیکن نواب مجو نے نوابی فوج کو شکست دے کر دوبارہ حکومت قائم کر لی (اخبار الصنادید میں بڑی تفصیل کے ساتھ نواب یوسف علی خاں کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے) خود رام پور

Marfat.com

کے عام ریاستی فوجیوں کی یہ حالت تھی کہ وہ علی الاعلان کہتے تھے کہ "ہم اب خان بہادر خاں کی نوکری کریں گے"۔

نواب کی طرف سے نینی تال کو بہت بڑی مقدار میں سامانِ رسد اور نقد روپیہ علی بخش خاں کی معرفت بھیجا جاتا تھا۔ خدا کی عجیب قدرت نظر آتی ہے کہ انہی علی بخش خاں کے پوتوں (مولانا محمد علی و شوکت علی مرحوم) نے آزادیِ ہند کے واسطے عظیم الشان جدّ و جہد کی۔

جنرل بخت خاں کا رام پور پر دھاوا دربار رام پور کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے باخبر ہو کر جنرل بخت خاں ایک مضبوط فوجی دستہ لے کر رام پور حملہ آور ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ خان بہادر خان نے اعلان کیا کہ شمسہ تاج دار بیگم بنت سیّد احمد علی خاں ریاست کی جائز حکمران ہیں، ان کو ریاست کا حکمران بنایا جائے گا۔

رام پور کے خاندانی جھگڑوں میں حکومت ایک ہی خاندان کے دوسرے فریق کو منتقل ہو گئی تھی اور جائز حکمران محروم تھے۔ نواب یوسف علی خاں نے جنرل بخت خاں کا مقابلہ نہیں کیا۔ جنرل نے شہر و قلعہ کی مضبوط ناکہ بندی کرنے کے بعد نواب کے سامنے بہت سخت شرائط رکھیں:

۱: ولی عہد ریاست جنرل کے ساتھ بمعہ فوج دہلی انگریزوں کے خلاف لڑنے چلیں گے۔

۲: ریاست رام پور حکومت روہیل کھنڈ کو وافر مالی امداد دے گی۔

حافظ احمد علی خاں شوق (مولانا محمد علی مرحوم کے چچا زاد بھائی) جنرل بخت خاں کے حملہ کا حال لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ "۹ جون ۱۸۵۷ء کو بخت خاں کئی ہزار فوج کے ساتھ رام پور آیا۔ مولوی سرفراز علی اس کی طرف سے سفیر تھے۔ تمام شہر کو مورچہ بند کیا۔ شہر کے مفسد خود جا کر بخت خاں کو بھڑکاتے تھے۔ ان کا منشا تھا کہ روپیہ دیا جائے اور ولی عہد بہادر ریاست مع فوج کے دہلی کو ساتھ چلیں۔ یہ مرحلہ سب سے زیادہ سخت تھا۔ علی بخش خاں نے اس مرحلہ کو بلطائف الحیل طے کیا اور ۱۲ جون کو بخت خاں رامپور

Marfat.com

سے چلا گیا۔ نواب نے از راہِ چاپلوسی جان بچانے کی خاطر جنرل بخت خاں کو خُوب رسد بھجوائی، اور مبالغہ کی حد تک مولوی سرفراز علی کی عزّت افزائی کی اور اس طرح اپنے آپ کو بچا لیا"۔

لیکن جنرل بخت خاں نے رام پور کی ریاست کو ختم کرنے کی بجائے صلح کر لی۔ یہ اُن کی سیاسی غلطی تھی جس کے نتائج بعد کو ظاہر ہوئے۔

نواب یوسف علی خاں اپنی جُملہ کارروائیوں کی اطّلاع علی بخش کے ذریعہ انگریزوں کو بھیجتے تھے اور اُن کے جاسوس روہیل کھنڈی مجاہدوں کی فوج میں افراتفری پھیلاتے و نیز نقل و حرکت کی اطّلاعات بہم پہنچانے کا کام کرتے تھے۔ اخبار الصنادید کے مصنّف نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے دیسی فوج کی چابکدستی کا اندازہ ہوتا ہے:

"ایک بار علی بخش خاں دس بارہ گاڑیاں رسد کی لے کر گئے۔ شفاخانہ (بازپور) میں صاحب کمشنر کے گارد کے سپُرد کر کے چلے گئے۔ جب گارڈ اسباب لے کر شفاخانہ سے بڑھا تو ناگہاں خان بہادر خان کی فوج نے آلیا اور تمام اسباب لُوٹ کر لے گئی"۔

حالات کی تبدیلی، خان بہادر خاں کی شکست خان بہادر خاں کو رامپور کی غدّاری، روپیہ کی کمی، اور آپس کے نفاق کی وجہ سے ہر فوجی مہم میں ناکامی ہو رہی تھی۔ مگر وہ ہمّت ہارنے والے آدمی نہیں تھے۔ لیکن جب دہلی اور لکھنؤ کے زبردست مورچے انگریزوں کے قبضہ میں پہنچ گئے اور روہیل کھنڈ انگریزوں کی اُبھرتی ہوئی قوّت کے مقابلہ میں واحد علاقہ رہ گیا تو نینی تال کے انگریز بھی امدادی فوجیں آجانے پر دلیرانہ ٹُوٹ پڑے۔ یہاں حوصلے پست ہو چکے تھے، تاہم خان بہادر خاں نے شاہزادہ فیروز شاہ، بنڈے میر خاں، ولی داد خاں وغیرہم کی سرکردگی میں شہر سے ۵ میل باہر نکٹیا ندی کے کنارے مورچہ قائم کیا اور بذاتِ خود مورچہ سنبھالا۔ صبح صادق سے بہت بڑے علاقہ میں دست بدست اور توپ تفنگ کی جنگ ہوتی رہی۔ کُشتوں کے

Marfat.com

پُشتے لگ گئے۔ شہزادہ فیروز شاہ، ولی داد خاں، بنڈے میر خاں، اسمٰعیل خاں وغیرہم نے حقِ مردانگی ادا کر دیا۔ خان بہادر خاں کی فوج میں ۱۳۳ مجاہد بھی تھے جو بلا مبالغہ سر سے کفن باندھ کر نکلے تھے۔ ان مجاہدین کی ایک تصویر ایک انگریز کے قلم سے جو گورا پلٹن ۹۳ میں سارجنٹ میجر تھا، قابلِ ملاحظہ ہے۔ کتاب کا نام ۱۸۵۷ء کے معرکوں کی یادداشت ہے۔ سارجنٹ میجر لکھتا ہے:

"خان بہادر خاں کی فوج میں غازیوں کی ایک جماعت بھی تھی جو بلاشبہ سر سے کفن باندھ کر جان دینے اور جان لینے کے ارادہ سے آئی تھی۔ یہ مسلمان شوقِ شہادت کے نشے میں چُور تھے۔ ان کی داڑھیاں سفید تھیں۔ اُنگلی میں چاندی کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھے جس کے نگینہ پر اللہ کندہ تھا۔ ہر غازی کی کمر میں سبز رنگ کا پٹکا بندھا ہوا تھا۔ وہ رُوئی کی صدری پہنے ہوئے اور سر پر سفید پگڑیاں باندھے ہوئے تھے جن پر سُرخی کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں تلوار تھی اور پُشت پر ڈھال۔ دین کا نعرہ لگا کر ہمارے سامنے آئے اور حملہ آور ہونے سے پہلے اُن کا سردار جو ایک بیس سال کا بے ریش و بروت نوجوان تھا جس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا، صف سے آگے بڑھ کر ہم سے یوں مخاطب ہوا۔ کیا تم کافروں میں کوئی حوصلہ مند ہے جو میرا مقابلہ کر سکے؟ اگر ہے تو سامنے آئے۔ اُس کی آواز پر ہماری صفوں میں سناٹا چھا گیا۔ کوئی نوجوان آگے نہیں بڑھا۔ ایک منٹ بعد پھر یہی چیلنج دیا اور کہا میں پانچ آدمیوں سے تنہا مقابلہ کر سکتا ہوں لیکن پھر بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔ آخر جھنجھلا کر اُس نے تلوار میان سے نکالی اور ہماری صفوں پر حملہ آور ہوا۔ اس نے اس شدّت سے حملہ کیا کہ چشمِ زدن میں اٹھارہ سپاہیوں کو زخمی کر کے ڈال دیا۔ اسکی بے نظیر

Marfat.com

شجاعت سے کمانڈنگ آفیسر اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے حکم دیا کہ اس نوجوان کو زندہ گرفتار کیا جائے لیکن اُس نے کہا کہ تم زندہ شیر کو گرفتار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ زخمی ہو جانے کے باوجود جبکہ اُس کے جسم کے ہر عضو سے خون کے فوارے اُبل رہے تھے، اُس نے دوبارہ اسی شدّت کے ساتھ حملہ کیا۔ جب کمانڈنگ آفیسر نے یہ دیکھا کہ اگر اس کو قتل نہ کیا گیا تو شاید ساری کمپنی (سو آدمیوں کی ایک کمپنی) کا صفایا کر دے۔ تو مجبوراً اُس نے حکم دیا کہ سنگینوں سے خاتمہ کر دو۔ یہ سُن کر سپاہیوں نے اُسے نرغہ میں لے کر اپنی سنگینیں بیک وقت اُس کے سینہ میں پیوست کر دیں لیکن جب تک اُس کی رُوح جسم میں باقی رہی، وہ برابر تلوار کے جوہر دکھاتا رہا۔ اُس کا ہاتھ اُس وقت ساکن ہوا جب اُس کی رُوح پرواز کر گئی"۔ [1]

خود انگریزی فوج کا کمانڈر "سرکولن" بھی ایک غازی کے ہاتھوں واصلِ جہنّم ہوتے ہوتے رہ گیا۔ سرکولن گھوڑے پر سوار ایک کمپنی سے دوسری کمپنی میں جا رہا تھا کہ ایک غازی پر اُس کی نظر پڑی۔ زخموں سے چُور، مُردہ شکل گھوڑے کی ٹانگوں کے پاس تھا کہ دفعۃً کُودا اور سرکولن پر تلوار سے حملہ کرنے لگا۔ اگر سرکولن کا محافظ سکھ فوراً تلوار سے غازی کی گردن نہ اُڑا دیتا تو نیم بسمل غازی نے سرکولن کا کام تمام کر دیا تھا۔

آخری لڑائی شہر سے متصل موجودہ کنٹونمنٹ کے قریب ہوئی۔ اس مرحلے پر مسلسل لڑتے لڑتے تھک جانے والے فوجیوں کو امداد پہنچانے کی غرض سے کچھ نئے بھرتی شدہ فوجی بھیجے گئے۔ وہ جنگ کی گرما گرمی برداشت نہ کر سکے اور بھاگ نکلے۔ خان بہادر خاں نے ان کا کورٹ مارشل کیا اور سزائیں دے کر دوبارہ میدانِ جنگ

---

[1] بدایوں کا جہادِ حریّت از مولوی محمد سلیمان صاحب بدایوں مطبوعہ العلم بابت جولائی ستمبر ۱۹۵۵ء۔ ایضاً میلی سن جلد چہارم ص۳۶۸۔

Marfat.com

میں بھیجا لیکن بزدلوں نے بہادروں کو بھی ڈرپوک بنا کر سارا کھیل بگاڑ دیا اور نواب کی فوجوں کو شکست ہوگئی۔ ۵ مئی ۱۸۵۷ء کی شب باشندگانِ بریلی کے واسطے بڑی قیامت کی رات تھی۔ سارا شہر بھاگ رہا تھا۔ افراتفری کا عالم تھا۔ جان، مال، آبرو غرض کوئی چیز محفوظ نہیں تھی۔ خان بہادر خاں نے سخت پریشانی کے عالم میں گوریلا جنگ جاری رکھنے کا پروگرام بنایا اور راتوں رات ترائی کے جنگلات میں نکل گئے۔ ادھر انگریزی فوج اس وجہ سے شہر میں داخل نہیں ہوئی کہ اس کو گلی گلی لڑائی ہونے و اتلافِ جان کا خطرہ تھا۔ جب دوسرے دن انگریزی فوج شہر میں داخل ہوئی تو اکثر محلے کے محلے ویران تھے۔ جو مرد و زن باقی رہ گئے تھے وہ موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ مکانات کو آگ لگا دی گئی۔

انجام[1] ۱۸۵۹ء تک نواب خان بہادر خاں انگریزوں سے گوریلا جنگ لڑتے رہے۔ ایک دفعہ دست بدست جنگ کرتے ہوئے گھوڑے سے گر پڑے۔ ابھی اُٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار کر لئے گئے اور لکھنؤ لے جا کر انگریزوں کے سپرد کر دیئے گئے۔ وہاں سے بریلی لائے گئے۔ جب چیف کمشنر کی عدالت میں پیش کئے گئے تو زمین پر بیٹھ گئے، اور کہا۔ مدتوں کرسیوں پر بیٹھے، اب قیدیوں کی جگہ بیٹھنا ہے لیکن چیف کمشنر نہیں مانا اور بغلوں میں ہاتھ ڈلوا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ جب مقدمہ شروع ہوا

---

[1] **پوائیں میں ظہور** محترم غلام رسول مہر صاحب میلی سن جلد پنجم ص۱۹۱ و ص۱۹۲ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں :۔ مولانا احمد اللہ کی شہادت کے بعد مجاہدوں اور آس پاس کے زمینداروں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ راجہ پوائیں کو اس غداری کی کہ اُس نے مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کو دھوکے سے شہید کرا دیا، عبرت ناک سزا دیں گے۔ اس موقع پر جہاں نظام علی خاں نواب تفضل حسین خاں، ولایت شاہ، علی خاں میواتی اور بعض دوسرے مجاہد فوج لے کر جمع ہوئے، وہاں خان بہادر خاں بھی چار ہزار جانبازوں کے ساتھ اُن کے ہمراہ تھا نظام علی خاں اور علی خاں میواتی نے اس سلسلے میں پیلی بھیت پر بھی حملہ کیا۔

Marfat.com

تو خان بہادر خاں نے بڑی دلیری اور مردانگی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک برجستہ تقریر کی اور کہا۔" چونکہ کل روہیل کھنڈ ہمارا ملک موروثی تھا، اس وجہ سے بخت خاں اور جملہ رعایا نے مجتمع ہو کر مجھ کو مسند نشین کیا۔ جس وقت آپ صاحبان نے فوج کے ظلم سے مجبور ہو کر ملک چھوڑ دیا، تب میں نے اپنا قبضہ کیا۔ باقی رہی بلوائیوں کی روک تھام، تو یہ میرے اختیار میں نہ تھی۔ انہوں نے جو چاہا، کیا۔ بعد ازاں جا بجا سرِ میدان لڑائیاں میری اور آپ کی فوج سے البتہ ہوئیں۔ ان میں طرفین کا کشت و خون ہوا۔ اس میں میری کیا خطا ؎

عروسِ ملک کسے در کنار گیرد تنگ
کہ بوسہ بر لبِ شمشیر آب دار زند

اب آپ کے بس میں ہے جو چاہے حکم دیجئے۔ چنانچہ اوائل ۱۸۶۰ء میں پرانی کوتوالی کے سامنے نواب خان بہادر خاں کو پھانسی دے دی گئی[1]۔

حیاتِ حافظ رحمت خاں میں سید الطاف علی بریلوی لکھتے ہیں :

"پھانسی کے بعد لاش بریلی ڈسٹرکٹ جیل میں دفن کر دی گئی۔ ایک خاندانی بزرگ جو دفن کے وقت موجود تھے۔ خان بہادر خاں کی لاش کو بغیر کفن قبر میں رکھتے ہوئے دیکھ کر اُن کے چہرہ پر اپنا رومال ڈال دیا۔ قیصر التواریخ میں ص۳۹۶ پر درج ہے کہ ورثاءِ نواب نے نعش طلب کی۔ جواب دیا گیا۔ تم اسے شہید بنا کر قبر پر میلہ کرو گے کہ ہماری تکلیف کا باعث ہوگا۔ بعد اس کے قلعہ میں گڑوا دیا۔ بعض تشنہ روایتیں یہ ہیں کہ خان

---

[1] آخری وقت میں اُن سے کہا گیا کہ کچھ نصیحت وصیت کرنی ہو تو کیجئے۔ آپ نے فرمایا۔ مجھے کچھ نہیں کہنا۔ پھر آبدیدہ ہو کر یہ شعر پڑھا ؎

بہ جرم کلمۂ حق مے کشند و غوغائیست
ز مرگِ زندگیم مے شود غوغائیست

(غلام رسول مہر)

Marfat.com

بہادر خاں کی لاش وسٹرکٹ جیل بریلی کے دوسرے اور تیسرے پھاٹک کے درمیانی حصّہ میں از راہِ تحقیر دفن ہے۔ چونکہ شورش کا سخت اندیشہ تھا، اس لئے انگریزی فوج اور توپ خانہ سے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔

بدایوں[1]

اور اس کی تاریخی عظمت

شمالی ہند کے دورِ اوّل کی فتوحات میں بدایوں[2] ہے۔ یہ دور قطبی و شمسی میں قُبّۃُ الاسلام کے نام سے مشہور رہا۔ اسلامی عہد کا پہلا ناظم بدایوں کا قطب الدّین ایبک[3] تھا۔ دوسرا شمس الدّین التمش (۶۰۰ھ لغایت ۶۰۷ھ)۔ سیّد علاء الدّین (۸۴۷ھ لغایت ۸۷۹ھ) شاہ دہلی نے ۸۵۲ھ (۱۴۴۸ء) میں دہلی کو خیرباد کہہ کر بدایوں کو پایۂ تخت بنایا اور وہیں دفن ہوا۔ سلطان محمود غزنوی نے ۴۰۸ھ (۱۰۱۷ء) میں جب قنوج پر حملہ کیا اور دریائے گنگا کے کنارے خیمہ زن ہوا، وہ جگہ ریاست[4] بدایوں کی تھی۔ اس وقت دھرم پال وہاں کا راجہ تھا، اور کان سین[5] وزیر تھا جو نہایت فرزانہ اور ہوشیار تھا از راہِ دُور اندیشی وہ سلطان کی خدمت میں گراں بہا تحائف و ہدایا لے کر حاضر ہوا[6]۔

---

[1] یہ پورا مضمون جو ص پر ختم ہوتا ہے، محترم ایّوب صاحب بی۔ اے کا مرتب فرمودہ ہے۔

[2] بدایوں کی فتح منتخب التواریخ ۵۹۱ھ فرشتہ ۵۹۹ھ۔ [3] قطب الدّین خود ایک سال بدایوں رہا پھر اپنا نائب سپہ سالار عزیز الدّین حسن ارنب کو کیا۔ (کنز التاریخ)۔ [4] عمدہ التاریخ جغرافیہ بدایوں بدایوں کے جنوب مشرق سرحد پر قنوج کا ضلع فرخ آباد ہے۔ دریائے گنگا ہر دو اضلاع کے درمیان ہے اس وقت فرخ آباد نہ تھا، قنوج تھا۔ سورج پور کا گھاٹ برسوں سے مشہور چلا آرہا ہے۔ [5] کان سین کا محلّہ اس وقت تک بدایوں میں ہے اور قصبہ اوسہت ضلع بدایوں میں کان سین کی چھتری ہے۔

[6] عمدۃ التاریخ مؤلفہ مولوی عبدالحی مرحوم۔

Marfat.com

سلطان نے نذر قبول کرکے وزیر مذکور کو خلعت سے سرفراز کیا، اور راجہ کے لئے تحائف دیئے۔

ہندوؤں کے عہدِ حکومت میں شہر بدایوں کی آبادی سات[1] لاکھ اکیاسی ہزار تھی۔ سلطان محمد تغلق کے زمانۂ حکومت[2] ۷۲۹ھ میں ہند کی خانہ شماری اور مردم شماری ہوئی۔ اس وقت شہر میں ستائیس ہزار پانچ سو نوے مکانات پختہ۔ تین سو اکیاسی مساجد و تین مندر[3]، چار لاکھ اناسی ہزار سات سو ایک اشخاص کی آبادی تھی۔

عہدِ اکبری[4] میں شہر کی آبادی ایک لاکھ اکتیس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ بدایوں حکومتِ اسلامی کی ابتداء سے دہلی کا صوبہ رہا۔ انحطاطِ سلطنتِ مغلیہ سے روہیلوں کا مرکز رہا۔ اپنی طاقت و عظمت کی بربادی[5] پر نواب وزیر اودھ کا ماتحت ہوا۔ ۱۲ر نومبر ۱۸۰۱ء سے بدایوں انگریزی حکومت کا حصہ قرار پایا۔ اودھ کی عنانِ حکومت اس وقت نواب سعادت علی خاں کے ہاتھ میں تھی۔

انگریزوں نے اپنے مقبوضہ روہیل کھنڈ کے دو ضلعے یا صدر مقام بنائے۔ ایک مراد آباد دوسرا بریلی۔ بدایوں کو بریلی میں شامل کیا۔ ۳۱ر اکتوبر ۱۸۲۳ء کو جدید رد و بدل کرکے ایک ضلع سہسوان[6] بنایا اور بدایوں کو سہسوان میں رکھا مئی ۱۸۳۸ء میں سہسوان سے

---

[1] عمدۃ التاریخ۔ [2] ایضاً۔ [3] کنز التاریخ مطبوعہ ۱۹۰۷ء۔ اب بدایوں میں اٹھائیس مندر اور اٹھانوے مساجد ہیں۔ [4] آئین اکبری۔ اس وقت آبادی ۵۲۹۶۶ (۱۹۵۱ء) [5] ۱۷۷۴ء میں نواب شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں میں لڑائی کٹرہ میراں پور میں ہوئی۔ روہیلوں کو شکست ہوئی۔ حافظ اس لڑائی میں کام آئے۔ [6] سہسوان بدایوں سے غرب میں ۲۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔ سہسراباد نام کے راجہ نے آباد کیا تھا اور قلعہ بھی بنایا تھا۔ ڈھنڈ نام کی بہت بڑی جھیل اس میں ہے۔ قصبہ گنجان آباد نہیں ہے۔ کیوڑہ کی کاشت خصوصی چیز ہے۔ محمد شاہ تغلق کے زمانہ کی ایک مسجد آثار الصنادید میں ہے۔ یہ خطہ بہت مردم خیز ہے۔ بڑے بڑے علماء فضلاء کا مسکن رہا ہے۔ چند حضرات کے نام درج ذیل ہیں۔ شمس العلماء مولوی امیر احمد جو غالباً دورِ انگریزی کی پہلی کمیٹی کے شمس العلماء ہیں یہ خطاب (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

صدر مقام کو منتقل کر کے بدایوں ضلع کا صدر کیا گیا اور سہسوان تحصیل رہی۔ اُس وقت سے اِس وقت تک دونوں اسی حال پر چل رہے ہیں۔

مجسٹریٹ ضلع ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت بدایوں کا مجسٹریٹ ضلع مسٹر ایڈورڈس تھا۔ اُس نے مصائب غدر کے نام سے ایک روزنامچہ مرتب کیا ہے۔ جس کا ترجمہ اردو میں مولوی نذیر احمد نے کیا ہے جو منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ہے مسٹر ایڈورڈس کے پاس ضلع کا چارج ۵ مئی ۱۸۵۵ء سے تھا۔ یہ ایک امر مسلّمہ ہے کہ جب کسی حکومت میں انقلاب رونما ہوتا ہے تو امن و امان، سکون و اطمینان مفقود ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ بدامنی، انتشار، لُوٹ مار اور خونریزی مسلّط ہوتی ہے۔ انقلاب کے بعد جو حکومت برسرِ اقتدار ہوتی ہے، اگر اُس کے عمّال ہوشیار اور فرض شناس ہوتے ہیں تو جلد حالات پر قابو پا لیتے ہیں، اور اگر برعکس اس کے راشی، عیاش، جاہ پرست اور باہمی رقابت و سازش کا شکار ہوتے ہیں تب دوسرے انقلاب کا انتظار ہوتا ہے۔

ابتدا بدایوں ضلع میں سب سے پہلا ہنگامہ ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ اگرچہ مُلک میں سیاسی بے چینی کی ابتدا ۱۰ مئی سنہ مذکور کو شروع ہو گئی تھی۔ موضع بھٹہ گوشائیں میں خربوزوں کی گاڑی کو روز روشن میں لُوٹ لیا۔ جب پولیس تفتیشِ حالات کو گاؤں گئی، تب اس کو زد و کوب کیا۔ پولیس ڈر گئی اور موقع پر سے بھاگ آئی۔ اسی دوران میں موضع نیورا بیورا تھانہ رجپورہ کے ابروں نے بشمول موضع عزیزپورہ وغیرہ کے موضع جناوی میں آگ لگا دی۔ موضع کنور پور کے ٹھاکروں نے ایک سرکاری سوار کو

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) ان کو ۱۳۰۵ھ میں ان کی ادبیت کی بنا پر ملا تھا۔ اگلے سال ۱۳۰۶ھ میں آپ کی وفات ہو گئی۔ شمس العلماء مولوی محمد امین جج جبل پور المتوفی ۱۹۲۹ء۔ علامہ مولوی امیر حسن مولوی عبدالباری مشہور مناظر جن سے پادری لوگ مقابل آتے گھبراتے تھے المتوفی ۱۳۰۳ھ۔ مولوی محمد بشیر کی بابت صرف اس قدر بتا دینا کافی ہے کہ اسحاق بن عبدالرحمٰن بن حسن بن محمد النجدی کو مولوی صاحب سے شرف تلمذ تھا۔ المتوفی ۱۳۲۶ھ۔ آبادی میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ کُل آبادی ۲۲ ۲۱۴۔

Marfat.com

قتل کر دیا۔ موضع پتریا کے اہیروں نے دو ٹھاکر زمینداروں کو جو موضع اسد پور کے باشندہ تھے، قتل کر دیا اور موضع نبادر کے ٹھاکروں نے یوسف علی خاں کو قتل کر دیا۔ ان حالات کا اثر عام طور سے سارے ضلع پر ہوا۔

اسبابِ بغاوت مسٹر ایڈورڈس مجسٹریٹ ضلع نے اپنے روزنامچہ میں اسبابِ بغاوت ان الفاظ میں دکھائے ہیں :

"بلوے سے ایک برس بلکہ آگے میں نے حکامِ اعلیٰ سے صاف صاف بیان کر دیا تھا کہ دیوانی کی عدالتیں اپنے اختیارات بہت بُری طرح سے عمل میں لاتی ہیں، ان کا یہ طریقہ بے ٹھور ٹھکانہ ہے، کہ تھوڑے تھوڑے قرضوں کے لئے منافع و مرافق اراضی نیلام کروا ڈالتے ہیں۔ اور اس سبب سے نظامِ مدن میں ردّ و بدل پیدا ہوتا ہے۔ پچھلے بارہ یا پندرہ برسوں میں ایسے نیلام بڑی کثرت سے ہوئے اور تحصیلِ مالگذاری کے ایسے طریقے جاری ہوئے کہ ملک کے رئیس لوگ برباد ہو گئے اور دیہات کے جتھے ٹوٹ گئے۔"

جنگِ آزادی ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء سے بدایوں کے مفصلات میں لُوٹ مار شروع ہوئی۔ مگر شہر میں سکون تھا، دوسری جگہوں سے خبریں آ رہی تھیں۔ ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء کو عید الفطر تھی۔ کسی نے مجسٹریٹ ضلع کو خبر دی کہ اہلِ اسلام نماز عید پر پڑھ کر بلوہ کریں گے وہ اس خبر سے متاثر ہوا۔ شہر کے سربرآوردہ مسلمانوں کو اپنے بنگلہ پر بُلا کر بٹھا لیا۔ یہاں تک کہ نماز کا وقت گذر گیا۔ اس کے ذہنِ نارسا میں بلوے کا انحصار نماز عید پر تھا۔ اُس نے تصویر کے دُوسرے رُخ کو اپنی نخوت و تکبّر میں دیکھا ہی نہیں کہ اس مداخلت فی الدین سے نفرت و غصّہ زیادہ ہوگا۔ غیور مسلمانوں پر اس کی احمقانہ حرکت کا وہی اثر ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ انگریز سے تنفّر اور کینہ میں اضافہ ہوا۔ اگرچہ فوری انتقام کا جذبہ بربنا مصلحت رُک گیا مگر عوام میں کافی ہیجان پیدا ہو گیا۔

Marfat.com

۲۷ مئی تک ضلع مجسٹریٹ کو انتہائی وحشت رہی۔ جس قدر انگریز شہر و مفصلات میں تھے، سب خوف و ہراس سے مجسٹریٹ ضلع کے بنگلہ میں جمع ہو گئے۔ ۲ جون کو بریلی سے ایک جماعت جو انگریزوں کے خلاف تھی، آئی۔ نمبر ۶۸ جو خزانہ بدایوں پر متعین تھا، اُس نے خزانہ لُوٹ لیا۔ جیل خانہ ٹُوٹ گیا۔ پولیس والے وردیاں پھینک کر بھاگ گئے۔ جلندھری سرائے، میران سرائے، نئی سرائے، ناہر خاں سرائے، محلہ براہم پور، نگلہ شرقی، موضع رسول پور کے لوگ بریلی سے آنے والی فوج کے ساتھ ہو گئے۔ مرزا منصور بیگ کی قیادت میں نگلہ شرقی، محلہ براہم پور، محلہ پٹھانی سرائے، نئی سرائے والوں نے منصفی اور کوتوالی کے دفتر جلا دیئے۔ مرزا منصور بیگ رسالدار تھے۔ مسٹر ایڈورڈس معہ اپنے چھ سات مہمانوں اور دو اردلیوں کے شیخوپور[1] پہنچے۔

شیخ شرف الدین[2] نے ایک رات ان لوگوں کو اپنی حفاظت میں رکھ کر

---

[1] شیخوپور تین میل کے بُعد پر بدایوں سے سوت ندی کے کنارے پر آباد ہے۔ نواب فرید خاں نے عہدِ عالمگیر میں آباد کیا اور ایک قلعہ تعمیر کیا اور معہ اپنے اہلِ خاندان کے بدایوں سے سکونت ترک کر کے توطن اختیار کیا۔ آبادی قصبہ کی ۳۸۲۴۔ [2] شیخ شرف الدین نسباً فاروقی ہیں۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی اولاد میں اُن کے مورثِ اعلیٰ شیخ اعظم شہید (۹۱۰ھ) بعہد اکبر موضع منور میں شہید ہوئے، داماد حضرت خواجہ سلیم چشتی المتوفی ۹۷۰ھ کے تھے۔ اُن کا بیٹا نواب قطب الدین خاں تھا جو جہانگیر کا رضاعی بھائی تھا (المقتول ۱۶۰۷ء) گورنر بنگال کا رہا۔ اُس کے تین لڑکے شیخ ابراہیم الملقب بہ نواب کشور خاں (المتوفی ۱۰۲۱ھ، ۱۶۱۲ء) نواب فرید خاں (المتوفی ۱۰۷۵ھ، ۱۶۶۶ء)۔ اوّل الذکر اور آخر الذکر یکے بعد دیگرے بدایوں کے گورنر رہے۔ ثانی الذکر کا لڑکا نواب اخلاق خاں گورنر دکن رہا۔ شیخ شرف الدین بڑے زمیندار تھے۔ انگریزوں کی وفاداری کے صلہ میں بڑی زمینداری ملی، اور سی آئی ای کا خطاب۔ اس خاندان کے ایک رکن نواب عبدالغفار (المتوفی ۱۹۳۰ء)، اس طرح سے پانچ مغلئی نواب اور ایک انگریزی خاندان شیخوپور کے نواب ہوئے۔

Marfat.com

موضع ککوڑہ[1] جو اُن کی زمینداری کا گاؤں تھا، پہنچایا۔ ککوڑہ میں غلام نبی خان اور نیچے سنگھ انگریزوں کے پناہ دہندہ تھے۔ وہاں سے وہ لوگ ایٹہ، فرخ آباد ہوتے ہوئے ہردوئی پہنچے۔

بریلی سے آنے والی فوج نے انگریزوں کو تلاش کیا۔ خالی بنگلوں کو نذرِ آتش کیا۔ شیخوپور میں انگریزوں کی موجودگی کی خبر پاکر وہاں پہنچے۔ گوہر مقصود کو وہاں نہ پاکر بغیر کسی مزاحمت یا نقصان کے لوٹ آئے۔

۳۱ مئی سے ایک دن قبل مسٹر الیگزینڈر کمشنر نے بریلی میں خان بہادر خان سے جو خاندانِ حافظ الملک کے ایک معزز رکن تھے، کہا کہ:

"امروز و فردا میں یہاں بلوہ ہونے والا ہے۔ چونکہ یہ ملک آپ لوگوں کا موروثی ہے، آپ اس کا بندوبست[2] کیجئے۔"

خان بہادر خاں نے اس وقت تو انکار کیا لیکن جب واقعی بلوہ ہوگیا، اور انگریز بریلی چھوڑ کر بھاگ گئے تب عنانِ حکومت روہیلکھنڈ اپنے ہاتھ میں لی۔

۱۷ جون ۱۸۵۷ء کو خان بہادر خاں نے عبدالرحمٰن خاں کو بدایوں کا ناظم مقرر کیا۔ اور شیخ فصاحت اللہ[3] بدایونی کو نائب ناظم مقرر کیا۔

جن دن عبدالرحمٰن خاں بدایوں آئے، اُسی دن گنواروں کے ایک جمِ غفیر نے

---

[1] موضع ککوڑہ پرگنہ اوجھانی میں بدایوں سے چودہ میل جنوب مغرب میں گنگا کے کنارے آباد ہے۔ یہاں پر کاتکتی اشنان پر میلہ جمع ہوتا ہے۔ تقریباً تین لاکھ کا مجمع ہوجاتا ہے۔ یہ میلہ نواب عبداللہ خاں خلف نواب علی محمد خاں (المتوفی ۱۱۸۰ھ) نے اپنے ایک بریلی کے ہندو دوست کی وجہ سے لگایا تھا۔ ایک عرصہ تک رؤسا شیخوپور اس میلہ کی آمدنی وصول کرتے رہے پھر کسی مصلحت سے وہ آمدنی ڈسٹرکٹ بورڈ بدایوں کو منتقل کردی۔ اب میلہ پر مستقل اقتدار و قبضہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا ہے۔ آبادی ۲۸۰۴۔ [2] حیات حافظ رحمت خاں ص ۳۶۲۔ [3] شیخ فصاحت اللہ بدایوں کے صدیقی شیخ بریلی میں وکالت کرتے تھے۔

Marfat.com

شیخوپوری پر حملہ کیا۔ شیخ زادوں نے قلعہ شیخوپور کے دروازے بند کر لئے۔ محلّہ جلندھری[1] سرائے (بدایوں) اور موضع گورامی[2] کے لوگوں نے بروقت پہنچ کر لٹیروں کا زبردست مقابلہ کیا۔ کوئی سو اشخاص کو قتل کیا، بقیۃ السیف نے راہِ فرار اختیار کی۔

عبدالرحمٰن خاں نے بدایوں آکر ملازمانِ سابقہ کو اُن کی جگہوں پر بحال رکھا۔ بیشتر ملازمین اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔ کچھ لوگ ملازمتیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

مولوی تفضّل حسین[3] اور مولوی اشرف علی نفیس[4] پنشنر تحصیلداران کو ڈپٹی کلکٹر مقرّر کیا۔ منشی ذوالفقار الدین[5] سرشتہ دار فوجداری کو ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر کیا۔ مولوی رضی اللہ

---

[1] جلندھری سرائے بدایوں کا جنوبی محلّہ ہے۔ شیخوپور سے ایک میل سے کچھ زائد فاصلہ پر ہے۔ مغزّز اور بہادر پٹھانوں کی بستی ہے۔ مرفہ الحال لوگ ہیں۔ [2] موضع گورامی شیخوپور سے تین میل پر ہے۔ سربرآوردہ لوگ تعلیم یافتہ پٹھان ہیں۔ آبادی ۵۷۸ افراد پر مشتمل ہے۔ [3] مولوی تفضّل حسین بدایوں کے صدیقی شیخ، اُن کے نام کا اس وقت تک بدایوں میں مولوی گنج بازار ہے جو ان کی ملکیت تھا، ضبط ہو کر نیلام ہو گیا۔ نام باقی ہے۔ زیادہ تر بسولی اور آنولہ میں تحصیلدار رہے۔ [4] مولوی اشرف علی نفیس ولد مولوی نجف علی ممتاز (المتوفی ۱۸۵۴ء) باپ اور بیٹے دونوں تحصیلدار تھے۔ نسباً بدایوں کے صدیقی شیخ۔ اوّل الذکر نواب گنج ضلع بریلی میں تحصیلدار رہے۔ [5] منشی ذوالفقار الدّین ولد وہاب الدّین موجد بدایوں کے متولیوں کے خاندان سے تھے۔ آپ کی شہادت کا تذکرہ آگے آئے گا۔ آپ کے والد مولوی وہاب الدّین موجد تخلّص کرتے تھے۔ سلیم پور ضلع بدایوں میں تحصیلدار نواب وزیر آف اودھ کے زمانہ میں تھے۔ جب انگریزوں کے پاس ۱۸۰۱ء میں بدایوں آیا تو انگریزوں نے موجد کو بدستور اُن کے عہدہ اور جائے تعیناتی پر رکھا۔ "نظامی بدایونی" (مولوی نظام الدّین حسین ایڈیٹر ذوالقرنین کی سوانح عمری مرتبہ مولوی محمد احمد کاظمی مطبوعہ ۱۹۴۹ء) کے صفحہ ۶ پر لکھا ہے۔ "اس وقت روہیلوں کی عملداری تھی اور وہ (موجد) داتا گنج ضلع بدایوں میں تحصیلدار تھے۔ انہیں کے وقت میں سلطنت کی کایا پلٹ ہوئی۔ انگریزی سکہ جاری ہوا۔ برٹش حکّام نے بھی اس عزت کو قائم رکھا اور بدستور اپنے عہدہ پر مامور رہے۔"

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

تحصیلدار بدایوں کو تحصیلدار بسولی۔ محمود حسین پنشنر تحصیلدار ڈپٹی مقرر ہوئے۔ محمود حسین کے بھائی احمد حسین کو جو نائب سررشتہ دار تھے، سررشتہ داری پر ترقی دی گئی۔ سیف اللہ خاں تحصیلدار کو فوجی افسر مقرر کیا۔ یاد اللہ خاں کو توال شہر مقرر ہوئے۔ گنور کے تحصیلدار مولوی ماجد علی نے ناظم کی اطاعت قبول کی۔ ولی داد خاں رسالدار مقرر ہوئے۔ چودھری تفضل حسین رئیس محلہ چودھری سرائے وصفت علی کمیدان مقرر ہوئے۔ کچھ اور لوگوں کا بھی تقرر کمیدانی پر ہوا۔ لچھمن سنگھ کو اوجھیانی کا تحصیلدار مقرر کیا۔ بدایوں کے سپہ سالار فوج جنرل نیاز محمد خاں مقرر ہوئے، اور عظمت اللہ خاں کو بخشی مقرر کیا گیا۔

جولائی میں وصول مالگذاری کا کام شروع ہوا۔ موضع کٹھنک[1] اور موضع رفیع آباد[2] کے ٹھاکروں نے ادائے مال گذاری میں تمرد کیا جس کی پاداش میں اُن کو قرار واقعی سزا دی گئی۔ خان بہادر خاں نے موضع بھٹولی[3] کے امرائے سنگھ ٹھاکر کو داتاگنج[4] کا تحصیل دار مقرر کیا مگر

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) موجد کے زمانہ میں تحصیل داتاگنج میں نہ تھی، سلیم پور میں تھی ۱۸۳۳ء میں انگریز نے سلیم پور سے تحصیل داتاگنج کو منتقل کی۔ اس وقت موجد کا انتقال ہو چکا تھا۔ روہیلوں کی عملداری بدایوں سے ۱۷۷۴ء میں ختم ہو کر نواب وزیر کو پہنچی۔ موجد کے دوسرے دو بیٹوں کا ذکر کاظمی صاحب نے کیا۔ مگر منشی ذوالفقار الدین کا عمداً ذکر کرنے سے گریز کیا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] موضع کٹھنک بدایوں سے جانب شمال ۵ میل کے فاصلہ پر ہے ۱۹۰۷ء سے شب تیرس کا میلہ لگتا ہے۔ آبادی ۹۰۷ ہے۔ [2] موضع رفیع آباد موضع بناور کے ملحق ہے۔ ۵۹۲ اشخاص آباد ہیں۔ [3] موضع بھٹولی دو میل سے کم داتاگنج سے ہے۔ ٹھاکروں کی آبادی ہے زائد تعلیمیافتہ لوگ ہیں۔ ٹھاکر دلتھمن سنگھ ڈپٹی کلکٹر (المتوفی ۱۹۱۲ء) مؤلف "کل تھمن" تاریخ ٹھاکران یہاں کے رہنے والے تھے۔ آبادی چودہ سو باون ہے۔ [4] داتاگنج ۱۹ میل پر بدایوں سے مشرق میں ہے ۱۸۳۳ء میں تحصیل کا صدر مقام ہوا ہے۔ ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ مہاجن اور ویش زائد ہیں پٹھانوں کی آبادی اگرچہ مختصر ہے مگر با اثر ہیں۔ آبادی ۲۸۷۴ ہنگامہ کے زمانہ میں منشی چیت سنگھ داتاگنج میں تحصیل دار تھے۔

Marfat.com

تحصیل کے ٹھاکروں نے خاندانی رقابت سے اُس کی حکومت تسلیم نہیں کی اور متوازی حکومت قائم کرکے ہرلال سنگھ عرف بلی سنگھ ٹھاکر ساکن موضع بکسینہ[1] کو اپنا سردار بنایا۔ اُس نے اپنا لقب دھپو دھام[2] اختیار کرکے مُہر پر یہ مسجع کندہ کرایا۔ نیچے دھرتی اُوپر رام، مہر کچہری دھپو دھام۔

بلی سنگھ نے ایک بڑا جتھا ٹھاکروں کا بناکر بدایوں پر حملہ کی تیاری کرکے چڑھائی کی۔ شہر کی سرحد پر لڑائی ہوئی اور وہ شکست کھاکر بھاگ گیا۔

دوبارہ اگست کے مہینہ میں پھر ان ٹھاکروں نے بدایوں پر حملہ کا قصد کیا۔ اب نواب کی فوج اور توپوں سے بدایوں لیس تھا۔ یہ معلوم ہوکر اُن کی ہمتیں پست ہوگئیں۔ موضع کنہک کے بھائی سنگھ ٹھاکر نے بھی شہر پر حملہ کیا۔ مگر بُری طرح پسپا ہوکر بھاگے۔

اکتوبر کے مہینہ میں بالاراؤ برادر زادہ نانا راؤ جو انگریزوں سے برسرِ پیکار تھا کچھ سوار و پیادہ فوج کے ساتھ مالاگڈھ سے انوپ شہر کا گھاٹ اُتر کر بدایوں کے ضلع میں ہوتا ہوا شاہجہان پور کے ضلع چلا گیا۔

جنرل نیاز محمد خاں نے فتح گڈھ پر حملہ کی تیاریاں کیں اور اس کام کیلئے چالیس ہزار روپیہ چندہ ضلع سے کیا۔ جنرل نیاز محمد خاں تیاری مکمل کرکے فتح گڈھ کو روانہ ہوئے۔ قصبہ ککرالہ[3] جو راستہ میں

---

[1] موضع بکسینہ جانب جنوب داتا گنج سے چار میل کے فاصلہ پر سوت ندی آباد ہے۔ موضع کی آبادی ۱۷۹۹۔ [2] دھپو دھام نام کا راجہ چند صدی قبل گذرا ہے۔ [3] ککرالہ، بدایوں سے گیارہ میل مشرق میں ہے۔ نواب وزیر اودھ (۱۷۷۴ء لغایت ۱۸۰۱ء) نے یوسف علی خاں کو جاگیر میں دیا تھا ۱۸۰۵ء میں نواب جنگی خاں روہیلہ کی جاگیر میں ککرالہ آیا۔ اُس نے جنگِ مرہٹہ ۱۸۰۳ء میں خاصی شہرت پائی تھی۔ اس کا انتقال ۱۸۱۹ء میں ہوا۔ کمپنی نے اُن کے ورثاء بجائے جاگیر کے پنشن کر دی۔ جنگی خاں کے والد عمر خاں تھے جن کو آصف الدولہ (۱۷۷۵ء لغایت ۱۷۹۷ء) اپنے ساتھ لکھنؤ لے گیا۔ عمر خاں کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔ نوٹیفائیڈ ایریا ہے۔ مسلم آبادی کی اکثریت ہے۔ قصبہ کی آبادی ۹۹۶۱ ہے۔ تعلیم پر مسلمانوں کو بہت توجہ ہے۔ قصبہ ہذا کے مسلم مدرس بخرت ہیں۔

Marfat.com

پڑتا تھا، وہاں سے کثرت سے بھٹی پٹھان مجاہد بن کر لڑنے کو ساتھ ہوئے۔ سورج پور کے مشہور گھاٹ پر گنگا کو عبور کر کے ضلع فرخ آباد میں داخل ہوئے۔ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو اچانک بالکل بے خبری میں سرگرانٹ نے حملہ کر کے جنرل کو شکست دے دی۔

فروری اور مارچ کا زائد وقت انگریزوں کے مخبروں کی تلاش اور سزا دہی میں صرف ہوا۔ مخبروں اور دشمنوں کی پناہ دہی کے سلسلے میں قادر گنج کے اس حصہ میں آگ دینا پڑی جہاں ایسے لوگ چھپے ہوئے تھے۔

شروع اپریل میں محسن علی خاں[1] سرگرانٹ سے شکست کھا کر بریلی کو جاتے ہوئے بدایوں سے گذرے۔ قریب قریب یہ وہی زمانہ تھا جب جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد بدایونی وغیرہ بریلی سے لکھنؤ جاتے ہوئے بدایوں سے گذرے، اور اپنے مشہور فتوائے جہاد کو جو مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدرالصدور دہلوی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد رسوا بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رام پوری کے دستخطوں سے شائع ہوا تھا۔ بدایوں میں اشاعت کی گئی۔ جس کے نتیجہ میں ککرالہ مجاہدین کا مرکز بن گیا۔

۱۸ اپریل ۱۸۵۸ء کو نواب نے بریلی سے تین سو فوجی ناظم بدایوں کو بھیجے۔

۲۷ اپریل کو جنرل پینی اور مسٹر والسن نے نولی تاتارپور[2] کے گھاٹ، پر گنگا عبور کر کے قیام کیا۔ اس کے ساتھ دو سو جوان، ڈھائی سو ملتانی سوار، ۳۵۳ جوان رجمنٹ ۶۴ کے ۳۲۰ جوان سیکنڈ پنجابی، ۳۶۰ بلوچ بٹالین اور ڈھائی سو گیارھویں دیسی پلٹن کے چھ بھاری چھ ہلکی توپیں تھیں۔ اُس نے کیپٹن گون کو حکم دیا کہ فوراً پہنچ کر ککرالہ سے چار میل پر

---

[1] محسن علی خاں فرخ آباد کے پٹھان نواب بنگش کے ساتھ انگریزوں سے لڑے۔ ان کے ایک بھانجے منو خاں قائم گنج کے رئیس اور بڑے بہادر تھے ۱۹۲۸ء کی ایک مقامی لڑائی میں نہایت بہادری سے جان دی۔ مولوی فضل الرحمٰن بدایونی وکیل قائم گنج نے اس سانحہ کی ایک درد انگیز مثنوی لکھی ہے [2] موضع نولی تاتارپور تحصیل داتاگنج پرگنہ اوسیت کا شاداب موضع ہے۔ آبادی ۴۲۵ اشخاص کی ہے۔

Marfat.com

نواب کی فوج جو وہاں پر ہے، اس کو منتشر کر دے یا گرفتار کرے۔

اوہست میں ایک اور انگریزی فوج معہ ایک توپ اور ہزار آدمی کے پڑی تھی۔ ۲۹ اپریل کو جنرل پینی راتوں رات چاندنی میں اوسیت کے قریب پہنچ گیا۔ جاسوسوں نے خبر دی کہ ناظم کی فوج کا رُخ داتاگنج کی طرف ہے اوسیت خالی ہے۔ انگریزوں کا ایک جاسوس کمانڈر انچیف کے پاس شاہجہاں پور جا رہا تھا، پکڑا گیا، اس کو سزائے موت دی گئی۔

انگریزی فوج کے گکرالہ پہنچنے سے ایک دن قبل پچھم کے ایک باغ میں جہاں قصبہ کا کھلیان تھا، ایک سوار آیا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی پڑ رہی تھی۔ چھوٹے خاں اس وقت کھلیان میں حفاظت کو موجود تھے اور کچھ لوگ بھی تھے۔ یہ سب معمر تھے۔ اس لئے ان کی امتیازی حیثیت تھی۔ چھوٹے خاں نے سوار کی بہت ہی خاطر تواضع کی اور دورانِ گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ قصبہ کے لوگ انگریز کے مخالف ہیں اور سب آمادۂ جہاد ہیں۔ وہ سوار بہت خوش ہوا اور بہت کچھ لوگوں کی ہمت افزائی کی۔ اہلِ قصبہ کثرت سے جمع ہو گئے۔ سوار کے رفقاء اِدھر اُدھر سے آ گئے۔ اب قصبہ والوں کو معلوم ہوا کہ وہ سوار شہزادہ فیروز[1] ہے۔ لوگوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ شہزادہ نے قصبہ کے حالات کا مطالعہ کر کے لوگوں سے کہا کہ اگر خداوندِ عالم نے ہم کو کامیاب کر دیا تو تم سب کو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ انگریزی فوج نے آدھی رات کو گکرالہ کی طرف کوچ کیا۔ نصف مسافت طے کر کے دم لیا تاکہ پیدل فوج بھی آ کر اُن سے مل جائے۔ جب پیدل فوج آ گئی تو اس کو حکم دیا کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر چلے۔ جلدی کی

---

[1] شہزادہ فیروز خلف بہادر شاہ۔ شاہِ دہلی نے ۱۸ فروری ۱۸۵۸ء کو ایک اعلان ہندوستان کے ہندو مسلم کے نام انگریزوں کے خلاف جاری کیا تھا جو بہادر پریس بریلی سے شائع ہوا تھا۔ مولوی قطب شاہ ناشر تھے۔ شاہزادہ فیروز کا انتقال نہایت غربت و عسرت میں مکہ معظمہ میں ۱۸۷۸ء میں ہوا۔ (ٹائمز آف کراچی ۱۴ مارچ ۱۹۵۴ء)

Marfat.com

ضرورت نہیں اور اپنا کوچ توپ خانہ اور سواروں کے ساتھ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ ککرالہ ایک میل رہ گیا۔ یہ صبح صادق کا وقت تھا کہ مجاہدین کا ایک گروہ آتا نظر پڑا۔ جنہوں نے چار توپیں گراپ کی سرکیں مگر کوئی انگریز زخمی نہیں ہوا۔ انگریزوں نے جوابی توپوں کے فائر کئے۔ مجاہدین نے موقع پاکر انگریزی فوج کو تلواروں پر رکھ لیا اور کلا بکلا لڑنا شروع کر دیا۔ انگریزی فوج نے مجاہدین کی شمشیر زنی کی تاب نہ لاکر پسپائی شروع کر دی اور درختوں کی آڑ لے کر توپیں چلانے لگے۔ اس سے مجاہدین کا اتلاف جان کافی ہوا۔ اس بے ترتیبی اور بدنظمی میں بہت دیر میں معلوم ہوا کہ جنرل پینی غائب ہے۔ مقامی روایت ثقہ اشخاص کی یہ ہے کہ انگریزی فوج کی آمد پر گولہ انداز نے ایسا گولہ نشانہ پر مارا کہ جنرل پینی کا سر اُڑ گیا۔ بڑی تلاش سے اُس کی نعش ملی۔ دیکھا بازو پر ایک زخم گولی کا تھا اور کسی مجاہد کی تلوار اُس کا خون پی چکی تھی۔ توپوں کی آواز سُن کر سورج نکلنے پر کرنل جانسن معہ پیادہ فوج کے موقعہ پر آیا۔ مقامی روایت یہ ہے کہ اس فوج کے آنے سے ککرالہ کے مجاہدین انگریزی فوج کے بیچ میں پھنس گئے۔ اور ایک ہزار غازی شہید ہوئے۔ شہزادہ نے کچھ سامان اور آدمی لے کر ککرالہ سے پچھم اور موضع گبھوائی سے پورب ایک جھاڑی دار ٹیلہ کی آڑ سے مورچہ لگایا۔ پھر بھی ناکامی رہی۔ مجاہدین بدایوں کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ توپ خانہ نے دُور تک اُن کا تعاقب کیا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر بدایوں کا کہنا ہے کہ یہ امر تحقیق شدہ ہو گیا کہ یہ سرفروش جماعت ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی کے رفقاء کار کی تھی۔

۲۹ اپریل ۱۸۵۸ء کو جب ککرالہ میں معرکہ کارزار گرم تھا میجر گارڈن نے مراد آباد کے ایک دستہ فوج سے نواب کے آدمیوں کو بسولی پر شکست دی۔

اب بدایوں دو طرف سے انگریزی فوج کی زد میں آگیا۔ تب نواب کی سپاہ نے دفتر کو نذرِ آتش کر دیا اور بریلی کو روانہ ہو گئی۔ قریب قریب تمام وہ لوگ جو

Marfat.com

انگریز کے خلاف تھے وہ بدایوں چھوڑ کر چلے گئے۔ رحم علی خاں ٹھیکیدار بسولی و سہسوان ایک مختصر جماعت کے ساتھ گنگا عبور کر کے گوالیار کی طرف چلا گیا۔

قصبہ اسلام نگر[1] کے باشندہ بابو رام نرائن وکیل اور مخدوم بخش قریشی کی قیادت میں معہ اپنے رفقاء کار شہامت علی، ناصر علی، منیر خاں، ہنسا سنگھ، دہن سنگھ، کے مجتمع ہوئے۔ اس سے زیادہ اور کیا اتحاد کی مثال ہوگی۔ بابو رام نرائن ہندو ظاہر اور قریشی ایک قصاب جو گائیں ذبح کر کے گوشت فروخت کرے یہ اس کا پیشہ۔ ان لوگوں کا وقت انگریزوں کے کاسہ لیسوں سے مقابلہ میں زائد صرف ہوا۔ جن کا سرکردہ دارا سنگھ ٹھاکر ساکن پپرول[2] تھا۔ ان لوگوں نے متعدد حملے رام نرائن پر کئے مگر سب میں ناکام رہے۔ ریاست رام پور کی فوج نے بسرکردگی حکیم سعادت علی[3] اسلام نگر

---

[1] اسلام نگر، اس کا پہلا نام نیودھنا تھا۔ التمش کے زمانہ میں رستم خاں نے اسلام نگر نام رکھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ رستم خاں دکھنی سنبھل کا گورنر عہدِ شاہجہاں میں تھا۔ اُس نے اپنے لڑکے اسلام خاں کے نام سے اسلام نگر نام رکھا۔ یہ قصبہ تابع سرکار سنبھل مغل عہد میں تھا۔ بدایوں سے ۲۴ میل پر ہے۔ تحصیل بسولی کا تھانہ ہے۔ مسلم آبادی نصف سے کم ہے قصبہ کی آبادی ۶۷۰۶۔ [2] موضع پپرول پرگنہ اوجھانی میں گنگا کے کنارے آباد ہے۔ ایک ہزار ایک سو انتیس مردم شماری ہے۔ [3] حکیم سعادت علی خاں قصبہ آنولہ (جو نواب علی محمد خاں کا دارالحکومت تھا) ضلع بریلی کے بڑے رؤسا سے تھے۔ ۱۸۴۰ء میں بدایوں کے تحصیل دار تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ نواب محمد سعید خاں بھی بدایوں میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ نواب صاحب بدایوں سے ہی سریر آرائے مسندِ ریاست رام پور ہوئے تھے۔ اس وقت نواب صاحب حکیم سعادت علی خاں کو اپنے ساتھ رام پور لے گئے۔ اپنی فوج کا افسرِ اعلیٰ اور مشیرِ ریاست مقرر کیا۔ نواب علی محمد خاں کا قلعہ اور محلات جب نیلام ہوئے حکیم سعادت علی خاں نے خرید لئے جو اس وقت تک اُن کی اولاد کے قبضہ میں ہیں حکیم صاحب نے قصبہ آنولہ میں انگریزی شفاخانہ بے نظیر رفاہِ عام کھولا۔ جو اس وقت تک جاری ہے۔ حکیم صاحب ایک غیر معمولی قابلیت کے حامل تھے۔ انہوں نے زمینداری میں بہت (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

پر حملہ کیا۔ لڑائی ہوئی۔ رام نرائن کے پاس توپیں تھیں۔ فریقین میں خوب گولہ باری ہوئی۔ وکیل میدانِ جنگ میں کام آیا۔ علاوہ اور سامان کے حکیم صاحب کے ہاتھ دو برنجی توپیں بھی آئیں۔ یہ واقعہ ۱۳ جون ۱۸۵۸ء کا ہے۔

۲۷ مئی کو دو ہزار سرفروشوں کا گروہ جھانسی سے جائی[1] کے میلہ میں ہوتا ہوا اوسیت سے شاہ جہان پور ہو کر لکھنؤ پہنچا۔

اب انگریز ضلع پر چھا گیا اور اُس نے اپنے انتظامات شروع کئے۔ مسٹر ولسن نے ضلع چھوڑنے سے پہلے ٹھاکر لال سنگھ بکسینہ والے کو داتا گنج کا بھیکم سنگھ کو اوسیت کا تحصیل دار، شیخ شرف الدین کو بدایوں کا تحصیلدار ۱۸ مئی ۱۸۵۸ء کو ہیت سنگھ اور ڈال سنگھ ساکنان کوٹ کو سہسوان کا تحصیل دار مقرر کیا۔

دارا سنگھ ٹھاکر پپرول کو اوجھانی، قندھاری سنگھ ٹھاکر بیلا ڈانڈی کو بدایوں اور ضلع بریلی کے چار ٹھاکروں کو بلسی، کوٹ، بسولی کے پولیس افسر مقرر کئے گئے۔ بلسی کا تھانے دار بھائی سنگھ کو مقرر کیا۔ چندن سنگھ ٹھاکر بھان پور کو بسولی اور کوٹ کی مال گذاری وصول کرنے پر مقرر کیا۔ مسٹر کارمیکل کو بدایوں کا مجسٹریٹ ضلع مقرر کیا گیا تھا۔ مگر وہ ابھی تک بریلی سے بیٹھے بیٹھے ضلع کا انتظام افسران متذکرہ صدر کی وساطت سے چلا رہا تھا جس کے ہاتھ میں ضلع کی ظاہری باگ تھی۔

۳ جون کو بریگیڈیئر کک معہ ایک دستہ فوج کے شاہجہان پور سے اوسیت آیا۔ اور لبِ سڑک ان تین گاؤں کو جن کے متعلق مخالفت کا خیال تھا، ان کو آگ لگا دی۔ اسی

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اصلاح کے کام کئے۔ موضع بگڑ بن تحصیل بسولی تھانہ وزیر گنج میں ان کا یہ موضع ہے۔ اس گاؤں میں جو سڑکیں آبادی میں نکالی ہیں، اس قدر چوڑی ہیں جس کی مثال مشکل سے بہت سے شہروں میں نہ ہوگی۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] موضع جائی پرگنہ اوسیت تحصیل داتا گنج میں لبِ گنگا آباد ہے۔ ۷۶۵ نفوس کی آبادی ہے۔

Marfat.com

دن ککرالہ میں آگ لگائی۔ اس آگ میں عورتیں بچے بہت جلے اور چاروں طرف گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ ایشری پرشاد مخبر ساتھ تھا۔ تقریباً پانچ سو اشخاص گرفتار کر لئے گئے۔ روزانہ سو آدمیوں کو سزائے موت اس طرح سے دی جاتی کہ سفید چونہ سے حوالات میں سو آدمیوں کی پشت پر نشان لگایا جاتا۔ دو گھنٹہ کے بعد نشان والے لوگوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے ایک طرف سے کان پر گولی کا فائر کیا جاتا۔ اس فائر سے جو لوگ بچ جاتے، اُن کو اسی طرح لائن میں کھڑا کر کے باڑ ماری جاتی اور جب تک یہ مظلوم ایک ایک کر کے ختم نہ ہو جاتے، یہ تماشا جاری رہتا تھا۔

ککرالہ کے لوگ جو گھبراہٹ اور پریشانی میں فرار ہو گئے تھے، اُن کی تلاش کر کے گرفتار کیا جاتا اور پناہ دہندوں کو گرفتار کر کے طریقہ بالا پر سزائے موت دی جاتی۔ ککرالہ بالکل ویران ہو گیا۔ تمام سامان اور اناج وغیرہ جلا دیا گیا۔ وہ بُرا وقت ہو گیا تھا کہ دوست آشنا اہلِ ککرالہ سے بات کرتے گھبراتے۔ کسی اعانت و امداد کو تیار نہ ہوتے۔ تین مہینے دھکے در بدر کھا کر لوگ پھر بچے کھچے جمع ہوئے ایشری پرشاد مخبر کی اطلاع دہی پر پھر فوج ککرالہ دوبارہ آئی اور دار و گیر شروع ہوئی۔ کچھ لوگ اس مرتبہ ایشری کے کہنے سے چھوڑے گئے۔ کچھ مار پیٹ کر کے اور کچھ کو جان لے کر چھوڑا کچھ عرصہ کے بعد پھر یہ عمل کیا۔ چوتھی مرتبہ جنرل پینی کی مہم آئی۔ اس نے ککرالہ کا نکڑہ باد کہہ کر فرمائش کی کہ پورے قصبہ کو کھودوا کر جھیل بنا دیا جائے۔ یہ فرمائش تو پوری نہیں ہوئی۔ البتہ پورا قصبہ کھنڈر ضرور کر دیا گیا۔ ۱۹۱۴ء تک ککرالہ کے آدمی کو ملازمت نہیں دی جاتی تھی۔ جنگِ عظیم میں ککرالہ سے بھرتی فوج کی بکثرت ہوئی۔

قصبہ کے سربرآوردہ اشخاص جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں نمایاں حصہ لیا پہلوان منگل خاں، رستم خاں، غلامی خاں، سردار خاں، محمد خاں، مان خاں، چھادم خاں، دلاور خاں، واصل خاں، فوجدار خاں وغیرہ تھے۔

یہ حرکتِ بہیمانہ صرف رعب بٹھانے کو تھی کیونکہ اس زمانہ میں رحم، عفو، انصاف

Marfat.com

عنقا تھا۔ بریگیڈیئر ۶ جون کو بدایوں پہنچا۔ اہم اور نمایاں گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ دو دن کے بعد مسٹر کارمیکل مجسٹریٹ ضلع بمعیت کرنل ولکنسن ایک دستہ فوج لئے ہوئے بریلی سے بدایوں آئے۔ اب گرفتاریاں اندھا دھند شروع ہوگئیں۔ بقول ظفر:

جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے

شہر کے تین مسلمانوں اور ایک ہندو سُنار ترو نامی نے حکومت کا ہاتھ گرفتاریوں میں غیر معمولی انہماک سے بٹایا۔

دوسرے دن دو فوجی دستے مراد آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ کرنل ولکنسن نے سیدھا راستہ مراد آباد کا براہ بسولی اختیار کیا۔ راستہ میں دو گاؤں تباہ و برباد کئے گئے جنرل کک اور کارمیکل سہسوان پہنچے اور وہاں پر بہت سی گرفتاریاں کی گئیں۔ مولانا سیّد نیاز احمد ولد سیّد آل احمد مودودی جو ایک عالم و فاضل بزرگ تھے، علاوہ علم و فضل کے فنِ سپاہ گری کے ماہر تھے۔ مولانا سیّد احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کئے ہوئے تھے اور اُن کے ساتھ شریکِ جہاد رہے تھے۔ سہسوان کے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں شریک ہوئے۔ نشانہ گولی بنے۔ اس وقت ہاتھ میں تسبیح اور لب پر کلمۂ شہادت تھا۔ عمر ۳۹ کے قریب تھی۔ اسلام نگر پہنچ کر دار و گیر بہت سختی سے شروع ہوئی۔ جس پر بھی بابو رام نرائن وکیل کے ساتھی ہونے کا شُبہ دلایا گیا، اس کو انتہائی سخت سزائیں دی گئیں۔ اسلام نگر میں چند گھر سادات اور کنبو ہوں کے ہیں۔ اوّل الذکر معافیدار تھے۔ ان سادات کا ایک امام باڑہ قصبہ میں تھا۔ کسی نے مخبری کر دی، کہ سیّد محب علی متولی امام باڑہ نے مشہور فتویٰ جہاد امام باڑہ میں دفن کر دیا ہے۔ امام باڑہ بیخ و بن سے کھود ڈالا۔ سیّد صاحب کو گولی مار دی اور معافیات ضبط کر لیں۔

مجسٹریٹ ضلع نے فوج کا ساتھ چھوڑ دیا کیونکہ اب فوج کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ضلع پر رُعب بیٹھ گیا۔ سینکڑوں فرضی خیر خواہ بلا معاوضہ لوگوں کو پھانسیاں دلانے کو موجود تھے۔ اکثر و بیشتر فاسق محروم رہے۔ یہ مہینہ سہسوان اور گنور میں صرف

Marfat.com

کیا۔ اگست میں احکامات کی تعمیل باقاعدہ ہونے لگی اور مالگذاری تیزی سے داخل خزانہ ہونے لگی۔ جس کی تعداد چار لاکھ سینتالیس ہزار دو سو اکیانوے روپیہ آٹھ آنہ گیارہ پائی تھی۔ اب یہ وہ وقت ہے کہ انگریز نے جذبۂ انتقام میں جو جو اور جس جس طرح سے سزائیں دیں، چنگیز خاں اور ہلاکو کی روحیں چیخ اٹھیں اور اس پر ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اپنے مظالم پر ایسا پردہ ڈالا جس کا پتہ و نشان نہیں اور دوسروں کے واقعات کو کس رنگ آمیزی سے دوہرایا جاتا ہے۔

بدایوں کے چار اشخاص کو عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ وہ چاروں ایک ہی گھر کے تھے شیخ فصاحت اللہ نائب ناظم اور شیخ سلیم اللہ وکیل، شیخ آیت اللہ وکیل تینوں بھائی، چوتھے شیخ فضل احمد بھتیجہ۔ کسی عام معافی کی بناء پر یہ لوگ واپس ہوئے۔ مگر اوّل الذکر کو خاکِ وطن نصیب نہ ہوئی، راستہ میں انتقال ہوگیا۔ آخر الذکر نے واپس آکر وکالت پاس کرکے کام شروع کیا اور ضلع کے چوٹی کے وکیل بنے۔ اکیس اشخاص کو گولیاں ماری گئیں۔ اُن میں مولوی تفضل حسین تحصیلدار، مولوی اشرف علی تحصیلدار، مولوی ماجد علی تحصیلدار، مولوی رضی اللہ[1] تحصیلدار، منشی ذوالفقار الدین سررشتہ دار، بدرالاسلام[2] عباسی المتخلص مشہور، سید محمد شاہ[3] معہ اپنے داماد کے، شیخ بچا پنجابی سوداگر ساکن محلہ چاہ میر۔ ایک سو سترہ اشخاص کو پھانسیاں دی گئیں۔ ایک سو پچیس اشخاص کو میعادی قید اور دو سو ستر اشخاص کو بید[4] کی سزا دی گئی۔ چوبیس مسلم مواضعات اور چار سو قطعات اراضی بحق حکومت ضبط کئے گئے۔ پانسو چھتیس مکانات اور دس ہزار پانسو روپے کا زیور ضبط کیا گیا۔

---

[1] مفصل حالات دوسرے صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔ [2] مفصل حالات دوسرے موقع پر ملاحظہ فرمائیے۔
[3] دوسرے موقع پر حالات ملاحظہ فرمائیے۔ [4] بید کی سزا میں صرف ایک نام شیخ مسیح الدین ولد شیخ غلام محمد کا معلوم ہوا ہے۔ ہنگامہ سے قبل مختاری کرتے تھے۔ الزامِ بغاوت میں گرفتار ہوئے۔ ساٹھ بید لگے۔ آخری ضربِ بید پر الّا اللہ کہا۔ اس پر بدبخت نے دس بید اور لگوائے۔ بے ہوش ہوگئے۔ ۱۹۲۲ء میں انتقال کیا۔

Marfat.com

انگریزی حکومت کے قیام پر دو طرح کے اشخاص کو انعامات سے نوازا گیا۔ نمبر ایک وہ لوگ رہے جنہوں نے انگریزوں کو پناہ دے کر اُن کی حفاظت کی۔ نمبر دوم وہ لوگ تھے جنہوں نے نظم و نسق اور ضبط و امن کی بحالی میں اعانت و امداد کی۔

نمبر ایک میں کپٹن گون اور اُن کے ہمراہیوں کے پناہ دہندے بیتم سنگھ اور پنجاب سنگھ ٹھاکران اوسانواں، پرتاپ برہمن موضع میاؤ[1]۔ اندر سنگھ ٹھاکر موضع سلیم پور اور بختاور سنگھ ٹھاکر موضع بیلا ڈنڈی[2]، ان کو زرِ نقد اور زمینداری دی گئی۔ مسٹر ایریتہ کے پناہ دہندے ہمّت سنگھ ٹھاکر موضع گدھول، جگناتھ کورمی موضع نگلہ شرقی اور ہیرا سنگھ ٹھاکر موضع گڑگاؤں۔

مسٹر پیٹرس اور اُن کے خاندان کی نگہبانی اور حفاظت کا انعام اجیت برہمن موضع نظام آباد کو ملا۔ علاوہ بریں تریسٹھ اشخاص کو صرف زرِ نقد دیا گیا۔

نمبر دوم کے سلسلہ میں شیخ شرف الدین رئیس شیخوپور، ہرلال سنگھ ٹھاکر موضع بکسینہ، ہیت سنگھ اور ڈال سنگھ ٹھاکران موضع کوٹ، دارا سنگھ ٹھاکر موضع پپرول، پرس رام موضع آسنپور (تحصیل گنور)۔ ان سب کو ان کی خدمات کے صلہ میں زمینداریاں دی گئیں۔ وزیر سنگھ تھانے دار گنور، پربھو لال پیش کار، شیخ ارشاد علی اور پانچ کس دیگر شیوخِ گنور کو سرکاری دفتر کی حفاظت کی جلد میں زمینداریاں دی گئیں۔ بیالیس دیگر اشخاص کو صرف زرِ نقد انعام میں دیا گیا۔ ان میں زائد تعداد گنور کے اہل کاروں

---

[1] موضع میاؤ۔ اوسیت سے داتا گنج جانے والی سڑک پر ہے۔ آبادی ۳۰۳۰ ہے۔ مسلم آبادی کافی ہے۔ موضع کا رقبہ ۲۹۱۲، ایکڑ ہے۔ بڑا حصہ بدایوں کے مسلمانوں کی زمینداریوں کا تھا۔ غالب حصہ کے مالک بدایوں کے محلہ جلندھری سرائے کے لودھی پٹھان تھے۔ [2] موضع بیلا ڈانڈی، تقریباً تین میل پر داتا گنج سے گنگا کے کنارے پر آباد تھا۔ آبادی دریا سے کٹ گئی۔ لوگ باغات میں رہ رہے ہیں۔ اس وقت تین سو اشخاص کی آبادی ہوگی۔ بختاور سنگھ و قندھاری پسران اجیت سنگھ میں اس وقت اونکار سنگھ پسر نرائن سنگھ صوبہ کی اسمبلی کا ممبر ہے۔

Marfat.com

کی تھی۔

انگریزوں نے ابتدائی دور میں ہر ایک قاضی کو جو جس جگہ تھا، وہاں کا منصف یا صدر الصدور مقرر کر دیا تھا۔ اس طرح سے ایک عرصہ تک صرف مسلمان علماء و فضلاء یکہ و تنہا بلا شرکت غیرے صوبہ متحدہ میں خصوصی طور سے ان عہدوں پر قابض رہے۔ اس سلسلہ میں ایک مشہور لطیفہ ہے۔ پہلے غیر مسلم منصف غازی پور میں منشی بنواری لال مقرر ہوئے تھے۔ اُن کے اجلاس کا پیش کار نے کاغذ کے سرنامہ پر لکھا۔ اجلاس مولوی بنواری لال صاحب۔ منصف نے یہ دیکھ کر پیش کار سے کہا کہ میرے نام سے قبل منشی لکھا کرو، مولوی نہیں۔ پیش کار نے کہا کہ منصف اور صدر الصدور کے نام کے ساتھ مولوی ہی لکھا جاتا ہے۔ تب منصف نے پیش کار سے کہا کہ اب تک ان عہدوں پر مسلمان مقرر ہوتے تھے۔ وہ فقہ اسلامی کے ماہر ہوتے تھے اس وجہ سے لفظ مولوی ان حضرات کے نام کے ساتھ لکھنا مناسب اور درست تھا۔ اب ذرا انگریز کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو، اُس کے نقطۂ نظر سے مولوی مُلّا کا اطلاق چھاؤنی کے پیش نماز پر رہا اور قاضی صرف نکاح رہ گیا جس کی توثیق قاضی ایکٹ ۱۸۶۴ء بنا کر کر دی۔

جب تک انگریزی داں منصف صدر الصدور ہونا لازمی نہیں کیا گیا تھا، بدایوں کے منصف اور صدر الصدور بیک وقت اس قدر تعداد میں تھے کہ کوئی دو ضلعے بھی مل کر اہل بدایوں کے برابر نہ تھے۔ ایگزیکٹو میں برابر سلسلہ رہا۔ جوڈیشل سروس کا انحطاط دیکھ کر انگریزی تعلیم پر توجہ شروع ہوئی۔ بدایوں میں پہلا گریجوایٹ[1] ۱۸۸۵ء میں کوئنس

---

[1] مولوی وزیر احمد ولد مولوی محمد حسین (المتوفی ۱۹۳۴ء) ٹونک والے۔ مولوی صاحب کے والد اور چچا حافظ احمد حسین ریاست ٹونک میں بہت ممتاز عہدوں پر متمکن تھے۔ نواب محمد علی خاں رئیس ٹونک ایک ہنگامہ کے سلسلہ میں معزول ہوئے، اور بنارس رہنے کا حکم ہوا۔ یہ دونوں بھائی بھی نواب کے ساتھ بنارس آئے۔ حافظ صاحب نے نواب کے معاملہ کا مرافعہ لندن جا کر پیش کیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب سر سید احمد خاں (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

کالج بنارس سے ہوا۔ اور وہ کلکتہ یونیورسٹی میں نمبر دوم پر آیا۔

اس کے بعد کافی انہماک اور سرعت سے بدایوں کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا رواج ہوا۔ جس قدر مسلم گریجوایٹ بدایوں کے ہوئے، اس قدر روہیل کھنڈ کے کسی ایک ضلع کے نہ تھے۔ بدایوں کے ہندو گریجوایٹ مسلم گریجوایٹ سے کم تھے اور ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں ترقی کر رہے تھے۔ اب مشرقی علوم کے ماہر خال خال رہ گئے ہیں۔

سینکڑوں مجاہدین میں سے چند

① حضرت[1] مولانا فیض احمد بدایونی

پیدائش | مولانا فیض احمد ابن حکیم غلام احمد۔ مولوی محلہ شہر بدایوں میں ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں پیدا ہوئے۔ خدا کی قدرت کہ آپ کی عمر قریب تین سال کے ہوگی کہ والد ماجد کا انتقال ہوگیا اور یتیمی کا داغ لگا۔ مگر آفریں آپ کی والدہ کو جنہوں نے آپ کی تربیت باحسن وجوہ فرمائی۔ کیوں نہ ہو، آخر ایک عالم و شیخ کی بیٹی تھیں۔

تعلیم و تربیت | مولانا کو قدرت نے شروع ہی سے وہ دل و دماغ بخشا تھا کہ جس پر آپ کے ہم درس طلبا کو رشک آتا تھا۔ جو چیز ایک بار پڑھ لی، یاد

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) (اپریل ۱۸۶۹ء تا اکتوبر ۱۸۷۰ء) معہ اپنے دونوں لڑکوں کے لندن گئے ہوئے تھے۔ حافظ صاحب اور سید صاحب کی وہاں ملاقاتیں رہیں۔ حافظ صاحب نے اپنے بھتیجے کو جو دونوں بھائیوں میں اس وقت اولادِ اکبر تھے اور عربی اور فارسی کے منتہی تھے، انگریزی پڑھا کر بدایوں کا پہلا گریجوایٹ کرایا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) یہ تمام مضمون جناب محمد ایوب صاحب قادری بی اے بدایونی کا مرتب فرمودہ ہے۔ جو الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہو چکا ہے۔

Marfat.com

ہوگئی، اور ایک دفعہ نظر سے گذر گئی، دل پر نقش ہوگئی۔ تحقیق و تدقیق آپ کا حصّہ تھا۔ اہلِ خاندان خیال کرتے تھے کہ مستقبل قریب میں یہ بچّہ فخرِ خاندان ہوگا۔

بالائے سرش ز ہوش مندی می تافت ستارۂ بلندی

والدہ نے اس ہونہار بچّہ کو اپنے بھائی مولانا فضل رسول کے سپرد کر دیا۔ آپ نے نہایت محبّت اور ناز و نعم سے پرورش فرمائی۔ مولانا فیض احمد نے تمام عُلومِ منقول و معقول صرف چودہ سال کی عمر میں حاصل فرمائے اور پندرھویں سالگرہ سے قبل آپ کو اجازتِ درس مل گئی۔ دوسرے فنون مروّجہ خطاطی و شعر و شاعری وغیرہ میں بھی آپ نے کمال حاصل کیا۔ ایک قلیل عرصہ میں آپ کا شہرہ ہوگیا اور تشنگانِ علم نے اس منبعِ علم و فضل کی طرف رُخ کیا۔

بیعت | جب مولانا نے عُلومِ ظاہری سے فراغت پالی تو علومِ باطنی کا خیال آیا۔ حضرت اچھے میاں ارہروی کے خلیفۂ اجل آپ کے نانا حضرت مولانا شاہ عبدالحمید مسند رشد و ہدایت پر جلوہ افروز تھے۔ آپ نے سلسلۂ قادریہ برکاتیہ میں اپنے نانا صاحب سے بیعت فرما کر عُلوم باطنی کی تکمیل کی۔

درس و تدریس | آپ نے جب مسندِ درس کو سنبھالا تو ایک عالم مستفید ہوا۔ طلبا سے ایک خاص تعلق ہوتا تھا۔ اُن کی خبرگیری اور بسا اوقات اُن کی مدد کرنا آپ کے معمولات سے تھا۔ دورانِ ملازمت میں بھی آپ طلباء کو درس دیتے تھے اور یہ اُس دَور کی خصوصیات سے تھا۔ آپ کے تلامذہ کا شمار دشوار ہے۔

ملازمت | آغازِ ملازمت کی صحیح تاریخ کا تعین مشکل ہے۔ البتہ اتنی بات ظاہر ہے کہ ایک عرصہ تک بدایوں میں درس و تدریس کے بعد آپ اس طرف متوجہ ہوئے اور چونکہ آپ کے ماموں صاحب سررشتہ دار رہ چکے تھے۔ لہٰذا اسی تعلق کی بنا پر آپ نے بھی انگریزی ملازمت اختیار کی۔

آگرہ اس وقت صوبہ کا صدر مقام تھا۔ صدر نظامت آگرہ میں اوّل آپ

Marfat.com

مسل خواں پھر پیش کار ہوئے اور آخر میں بورڈ آف ریونیو میں سررشتہ دار ہو گئے۔ فرائض منصبی نہایت دیانت، محنت اور راست بازی سے انجام دیتے تھے۔ حکام بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں ولیم میور نے جو کہ وہاں مجسٹریٹ علاقہ فوج تھا، اور بعد کو لفٹنٹ گورنر صوبہ یوپی (۱۸۶۸ء تا ۱۸۷۲ء) ہوا۔ اُس نے آپ سے عربی پڑھی۔

اخلاق | مولانا فیض احمد نے اخلاق بڑے وسیع پائے تھے۔ اہالیانِ وطن کی آپ بڑی مدد کرتے تھے۔ بدایوں کا جو شخص پہنچا اور جس کام میں مدد کا خواستگار ہوا اُس کی حتی الوسع امداد کی۔ قیام وطعام کی کفالت کرتے۔ بعض اوقات ان مصارف کے لئے قرض کی ضرورت پڑتی۔ صاحبِ اکمل التاریخ لکھتے ہیں:

"باوجود ثروت ووقار کے دل فقیرانہ، مزاج شاہانہ تھا۔ فقراء سے محبّت اور غرباء سے اُلفت، طلبہ کے شائق اور علم کے شیدائی تھے شاگردوں کی تمام ضروریات کے خود متکفل ہوتے تھے۔ سلسلۂ درس و تدریس اقامت آگرہ میں برابر جاری رہا۔"

مناظرہ مابین مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر | ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ہمدوش مذہب عیسوی نے بھی فروغ حاصل کیا، اور ہر ممکن صورت سے اس مغلوب ملک کو مذہبی حیثیت سے بھی فتح کرنے کی کوشش کی گئی۔ کمپنی کی تائید واعانت سے مذہب مسیحی کی تنظیم اور ترقی عمل میں آئی۔ مُلک کے طُول وعرض میں ہر جگہ اس تنظیم کے آثار قائم کئے گئے۔ چرچ مشن سوسائٹی، بائبل سوسائٹی مشن فنڈ، مشن ہسپتال، مشن کالج اور مدارس جابجا قائم ہوئے۔ مذہبی کتابوں اور رسائل کی اشاعت کے ذریعہ ہندوستانیوں کے رجحانات وعقائد سلب کرنے کی کوشش کی گئی غرض یہ وہ زمانہ تھا کہ عیسائیوں نے ہندوستان میں اسلام کے خلاف زبردست مہم جاری کر رکھی تھی۔ ۱۸۵۴ء میں پادری فنڈر (REVD. C.C.D. FONDER) یوروپ سے

Marfat.com

ہندوستان آیا۔ یہاں اُس نے اور اُس کی جماعت نے دل شکن تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس کی کتاب "میزان الحق" نے خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا۔ پادری فنڈر نے آگرہ کو مناظرہ کا گڑھ ٹھہرایا۔ کیونکہ آگرہ ہی اس وقت علماء کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر یہاں کسی طرح فتح ہو گئی تو عیسائیت کی تبلیغ میں بڑی مدد ملے گی۔ اُس نے مشاہیر علماء کو چیلنج دیا۔ مجلس علماء میں مشورہ ہوا۔ مولانا فیض احمد کے دوست ڈاکٹر وزیر خاں نے چیلنج قبول کر لیا اور مذہبِ عیسوی کے مشہور ماہر و مناظر مولوی رحمت اللہ کیرانوی جو کہ عرصہ سے پادری مذکور سے خط و کتابت کر رہے تھے، بُلائے گئے۔ انہوں نے چھل اینٹ آگرہ میں قیام کیا۔ ضروری انتظامات کے بعد ۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء بروز پیر کٹرہ عبدالمسیح آگرہ میں مناظرہ کا پہلا اجلاس ہوا۔ اہلِ اسلام کی جانب سے مناظرِ اوّل مولوی رحمت اللہ عثمانی کیرانوی اور مناظرِ دوم ڈاکٹر وزیر خاں تھے۔ جن کے معین و مددگار مولانا فیض احمد بدایونی تھے۔ عیسائیوں کی طرف سے مناظرِ اوّل پادری فنڈر اور مناظرِ دوم پادری فرنچ تھے۔ مجلسِ مناظرہ میں مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی، مسٹر کرسچین سیکنڈ صوبہ بورڈ، مسٹر ولیم میور مجسٹریٹ علاقہ فوج، مسٹر لیڈل ترجمانِ حکومت، پادری ولیم گلبن، مفتی ریاض الدین، مولوی حضور احمد سہسوانی، مولوی امیر اللہ مختار راجہ بنارس، مولوی ضمیر الاسلام امام جامع مسجد آگرہ، مفتی خادم علی مہتمم مطلع الاخبار، مفتی سراج الحق، مولوی کریم اللہ خان بچھرایونی، پنڈت جگل کشور، راجہ بلوان سنگھ (بنارس) قاضی حکیم فرزند علی گوپاموی، مولوی سراج الاسلام نیز اور بہت سے علماء عمائدین اور رؤسائے شہر موجود تھے۔ شرائط مناظرہ میں یہ خاص شرط تھی کہ مغلوب کو غالب کا مذہب اختیار کرنا ہوگا۔ تین روز تک مناظرہ ہوا پادری فنڈر کو انجیل کی تحریف کا اقرار کرنا پڑا اور اُس نے شکست فاش کھائی اور آگرہ سے راہِ فرار اختیار کر کے سیدھا یورپ پہنچا۔ اس مناظرہ کی پوری کیفیت (البحث الشریف فی اثبات التنسیخ والتحریف) کے نام سے وزیر الدین نے مرتب کر کے حافظ عبداللہ کے اہتمام سے ۱۲۷۰ھ میں فخر المطابع شاہ جہاں آباد میں ولی عہد مرزا فخرو کے صرفہ و حکم سے

Marfat.com

چھپوا کر اکناف و اطراف ہند میں تقسیم کرادی تھی اور اسی مناظرہ اکبر آباد کو چھوٹی تقطیع پر حصہ اوّل "مباحثہ مذہبی" اور دوسرا "مراسلاتِ مذہبی" کے نام سے سیّد عبداللہ اکبر آبادی نے منشی محمد امیر کے اہتمام سے مطبع منعمیہ اکبر آباد سے ۱۲۷۰ھ میں چھپوایا۔ پہلا حصہ فارسی میں تقریری مناظرہ کی روداد ہے اور دوسرے حصہ میں ڈاکٹر وزیر خاں اور پادری فنڈر کا تحریری مناظرہ اردو میں ہے۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ مولوی رحمت اللہ کی کتاب اظہار الحق کے حاشیہ پر مطبوعہ ہے جو کہ مطبع محمودیہ قاہرہ مصر سے ۱۳۱۷ھ میں طبع ہوا ہے۔ غرض اس تاریخی مناظرہ میں مولانا فیض احمد بدایونی نے ڈاکٹر وزیر خاں کو ہر طرح مدد دی اور انکی کامیابی کے لئے ممد ہوئے اور یہ دورانِ ملازمت میں بڑا کام تھا۔

جامع مسجد آگرہ یہ ہندوستان کی قابلِ فخر تاریخی جامع مسجد اس زمانہ میں عجیب حالت میں تھی۔ صرف بیچ کا حصہ خالی تھا جس میں ستّر اسّی نمازی نماز پڑھ سکتے تھے۔ باقی حصہ پر کبوتر بازوں کا قبضہ تھا یا رسیاں بٹنے والے رسیاں بٹتے تھے۔ مسجد کی دکانیں بنیوں کے پاس رہن تھیں۔ مولانا نے یہ صورت دیکھی تو بے چین ہو گئے اور طویل جدو جہد کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جس کا اندازہ مقدمات کی مسلوں کے معائنہ سے ہو سکتا ہے۔ بالآخر مولانا کو کامیابی ہوئی۔ دو دکانیں خالی کرائی گئیں۔ مسجد کا انتظام درست کیا گیا کبوتر بازوں کو نکالا گیا۔ رسّی بٹنے کی لعنت ختم کر کے مسجد کی درستی کرائی گئی اور مسجد کے انتظام کے لئے لوکل ایجنسی آگرہ کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے تحت آج تک جامع مسجد آگرہ کا انتظام ہے۔

آگرہ میں شاہ احمد اللہ کی آمد مولانا سیّد احمد اللہ شاہ ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے جذبۂ انقلاب لے کر دہلی پہنچے۔ بقول مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ وہاں انگریز ریزیڈنٹ کی نگاہیں بہت تیز تھیں۔ ایسی کسی کارروائی کا ہونا اور پروان چڑھنا ناممکن تھا۔ اسی بنا پر حضرت مولانا صدر الدین صاحب آزردہ نے شاہ صاحب کو آگرہ جانے کا مشورہ دیا اور وہاں کے بزرگوں کے نام تعارفی خط بھی لکھ دیا حضرت شاہ صاحب

Marfat.com

وہ تعارفی خط لے کر مفتی انعام اللہ خاں بہادر وکیل سرکار کے پاس پہنچے۔ اُنہوں نے بڑی قدر و منزلت کی۔ یہاں علماء و فضلاء کا اجتماع تھا۔ اس پورے حلقہ میں شاہ صاحب کی بڑی عزت ہوئی۔ محفلِ سماع اور وعظ کا دَور شروع ہوا۔ یہاں تک کہ شاہ صاحب کو یہاں اپنے خواب کی تعبیر نظر آنے لگی۔ بہت لوگ معتقد ہوگئے۔ عام گرویدگی دیکھ کر حکومت کو بھی فکر ہوئی۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب سے تعلق رکھنے والے علماء پر جو صدرِ نظامت میں عہدہ دار بھی تھے، مقدمہ چلایا۔ مقصد یہ تھا کہ جماعت منتشر ہو جائے مگر حکومت کو اس میں ناکامی ہوئی۔ کیونکہ تمام ملزمین بے داغ بَری کر دیئے گئے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء میرٹھ اور دہلی میں علمِ انقلاب بلند ہوا تو اُس کا فوری اثر آگرہ پڑا جو صوبائی حکومت کا مرکز تھا۔ کالون صاحب لفٹننٹ گورنر نے سب فوج ہندوستانی اور انگریزی کو جمع کر کے فہمائش کی۔ جس کا اثر چند روز رہا مگر ماہ جون میں یہاں بھی واقعات شروع ہوئے۔ جولائی میں تیزی آئی۔ مجاہدینِ فوج کی سرپرستی ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی نے کی۔ مگر جب حالات کا جائزہ لیا اور دہلی سے پیام و سلام کے ذریعہ طلبی ہوئی تو کچھ مسلح سپاہ کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی دہلی روانہ ہوگئے۔

مولانا فیض احمد صاحب دہلی میں دہلی میں ایسے ذی علم، سنجیدہ اور باخلاص اصحابِ فکر کی ضرورت تھی۔ ان دونوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ڈاکٹر وزیر خان، جنرل بخت خاں کے مشیرِ خاص کی حیثیت سے کام کرنے لگے اور مولانا فیض احمد صاحب مرزا مغل کے پیش کار مقرر ہوئے۔ مختلف معرکوں میں آپ نے شرکت فرمائی۔

۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب جنرل بخت خاں نے دہلی سے کوچ کیا تو مولانا فیض احمد صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں جنرل بخت خاں کے ساتھ تھے۔ اُس وقت لکھنؤ میں معرکۂ کارزار گرم تھا۔ مولانا شاہ احمد اللہ صاحب دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ یہ مولانا فیض احمد صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں لکھنؤ پہنچے اور تمام اہم معرکوں میں شاہ صاحب

Marfat.com

کے ساتھ رہے۔

سقوطِ لکھنؤ کے بعد سب کا اجتماع شاہ جہان پور میں ہوا۔ اور یہاں چند ماہ تک انگریزوں سے سخت معرکے ہوتے رہے۔ اسی اثنار میں مولانا فیض احمد صاحب بدایوں پہنچے۔ ڈاکٹر وزیر خاں آپ کے ساتھ تھے اور شاہزادہ فیروز بھی بدایوں پہنچ چکے تھے۔ بدایوں کے معرکوں میں ان مجاہدین نے حصّہ لیا۔ ککرالہ کے معرکہ میں قیادت کا فرض انجام دیا۔ پھر جب یہاں بھی ناکامی ہوئی تو قصبہ محمّدی پہنچے۔ جہاں مولانا احمد اللہ شاہ صاحب نے حکومت قائم کی تھی۔ یہ دونوں بزرگ مولانا کی وزارت میں داخل ہوئے۔ مولانا شاہ احمد اللہ کی شہادت کے بعد ایسے روپوش ہوئے کہ آپ کے ماموں مولانا فضلِ رسول نے آپ کی تلاش میں قسطنطنیہ تک سفر کیا مگر کہیں سراغ نہ لگ سکا۔ رحمۃ اللہ۔

(۲) منشی ذوالفقار الدّین[1]

صاف گوئی اور صداقت پسندی کی ناقابلِ فراموش مثال

منشی ذوالفقار الدّین ولد وہاب الدّین بدایوں کے متولیوں کے خاندان سے تھے۔ جب انگریزی تسلط کے بعد گرفتار ہو کر مسٹر کارمیکل کے سامنے بغرض جواب دہی پیش ہوئے۔ تب منشی جی نے اپنی قوّتِ ایمانی کی بنا پر صاف الفاظ میں کہا۔ تمہاری حکومت جا چکی تھی، مجھ کو ملازمت کی ضرورت تھی، مَیں نے نوکری کر لی منشی جی کبھی اس انگریز کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ منشی جی جُرم سے انکار کر دیں۔ انہوں نے صاف جواب دیا کہ مَیں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ حق گوئی اور صداقت پسندی کی حد ہو گئی کہ آپ نے جان دے دی، مگر جھوٹی بات سے زبان کو ملوّث

---

[1] از ۲ تا ۸ ماخوذ از مضمون محترم سلیمان صاحب شائع شدہ الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن۔

Marfat.com

کرنا پسند نہیں کیا۔ سچ ہے:

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

آپ کی تاریخِ شہادت حسبِ ذیل کہی گئی ہے:

کی بغاوت ہوئے قتل آہ — شہادت کا رُتبہ ملا بالیقیں
مجھے فکر تھی ان کی تاریخ کی — کہا ہاتف نے مجھ سے کہ اے ذہیں
یہ مظلوم بے کس کی تاریخ ہے
ہوا مسند آرائے خُلدِ بریں
۱۲ ھ ۷۴

③ مولوی رضی اللہ

ایمان نہیں کھو سکتا، جان دینا آسان ہے

مولوی رضی اللہ بدایوں کے صدیقی شیخ تھے۔ مولوی صاحب سے کارمیکل نے پڑھا تھا۔ جب وہ گرفتار ہو کر اُس کے سامنے پیش ہوئے، اُس کے استفسار پر مولوی صاحب نے شرکتِ ہنگامہ کا اقبال کیا۔ اُس نے مقدمہ ملتوی کر کے دوسرے دن پر رکھا، اور چاہا کہ مولوی صاحب انکارِ جُرم کریں۔ مگر دوسرے دن پھر پیشی کے وقت مولوی صاحب نے پچھلے بیان سے سرِ مو فرق نہیں کیا۔ سزائے موت کا حکم ہوا۔ جس وقت گولی کے نشانہ کے لئے پیش ہوئے۔ اُس وقت کارمیکل نے کہا کہ اگر آپ اس وقت بھی انکار کر دیں تو آپ کی جان بچا دوں۔ مولوی صاحب نے جواب دیا۔ کیا مَیں تمہاری وجہ سے اپنا ایمان و عاقبت خراب کر لوں؟ نہایت خندہ پیشانی سے جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

Marfat.com

④ چودہری تفضّل حسین

چودہری تفضل حسین صاحب ولد چودہری محمد عظیم فاروقی شیخ محلہ چودہری سرائے بدایوں۔ چودہری صاحب انگریزی تسلط ہونے پر روپوش ہوگئے۔ ایک گھوڑے پر سوار جنگلوں میں گھومتے پھرتے۔ سائیس آبادی میں جاکر کھانے کا انتظام کرلاتا۔ گھر جائداد وغیرہ سب نیلام ہوگئی۔ عام معافی میں ظاہر ہوئے۔ ۱۸۹۲ء میں انتقال ہوا۔ اس خاندان کی بڑی ریاست تھی جو ختم ہوگئی۔

عجیب اتفاق ہے، تفضّل حسین نام کے تین بزرگ، تینوں جُرمِ بغاوت میں ماخوذ۔ مگر نتیجے مختلف رہے۔

مولوی تفضّل حسین صاحب (قاضی ٹولہ) تحصیل دار۔ جُرمِ بغاوت میں گولی کی ضرب سے شہید کئے گئے۔

حکیم تفضّل حسین صاحب (مولوی ٹولہ)۔ مقدمہ چلا اور رہائی پائی۔

چودہری تفضّل حسین۔ عام معافی کی وجہ سے بچے۔

⑤ خسر داماد دونوں شہید

ایک دن کی بیاہی صاحبزادی بیوہ

سیّد محمد شاہ ولد سیّد حیدر علی سرائے کے سادات میں سے تھے۔ یہ محلّہ بدایوں کا ایک محلّہ ہے مگر حدودِ میونسپلٹی سے باہر ہے۔ اس کی آبادی ۱۳۱۷ ہے۔ سادات کے دو گروہ ہیں۔ ایک زیدی سیّد، دوسرے خضر خانی۔ سیّد محمد شاہ کا تعلق آخر الذکر سادات سے ہے۔ یہ لوگ سیّد علاؤ الدین، آخری سیّد بادشاہ جو بدایوں میں سکونت پذیر ہوگیا تھا، اُس کی نسل سے ہیں۔ مشہور مفتی محمد عوض بریلوی (روہیل کھنڈ) کے نواسے تھے۔ مفتی صاحب کی شہرت علاوہ ان کے علم و فضل کے اپریل ۱۸۱۶ء کے ہنگامہ کی وجہ سے

Marfat.com

تھی جو ۱۸۱۲ء کے ریگولیشن ہاؤس ٹیکس پر حکومت سے ہوا تھا۔ سید صاحب کے صرف ایک لڑکی حسینہ نامی تھی۔ شام کو اس کا نکاح ہوا۔ صبح کو سید محمد شاہ معہ داماد کے گرفتار ہو کر گولی سے اُڑا دیئے گئے۔ سید صاحب نے عین نماز میں جان دی۔

⑥ شیخ مسیح الدین

سزائے بید اور اِلاّ اللہ پر مزید سزا

بید کی سزا میں صرف ایک نام شیخ مسیح الدین ولد شیخ غلام محمد کا معلوم ہوا ہے ہنگامہ سے قبل مختاری کرتے تھے۔ الزامِ بغاوت میں گرفتار ہوئے۔ ساٹھ بید لگے۔ آخری ضربِ بید پر اِلاّ اللہ کہا۔ اس پر بدبخت نے دس بید اور لگوائے۔ بے ہوش ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں انتقال کیا۔

⑦ جنرل نیاز محمد خاں

جنرل نیاز محمد خاں نہایت بہادر اور دلیر بات کے پکے اور غیور تھے۔ ۱۹ اپریل کی شکست کے بعد بدایوں چھوڑ کر بریلی چلے گئے۔ جنرل نے اپنے زمانۂ قیام بدایوں میں ایک مقامی شخص سے ایک گھوڑا خریدا تھا۔ بیچنے والے کو خیال ہوا کہ اب انگریز آگیا۔ خدا جانے میں دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے مصیبت میں مبتلا ہوں۔ اپنے چند اعزہ کو لے کر نکاسِ شہر پر سدِ راہ ہوا۔ جنرل کے ہمراہیوں نے چاہا کہ دار و گیر کریں۔ جنرل نے فوراً ہمراہیوں کو مزاحمت سے روک کر گھوڑا مالکِ سابق کو دے دیا اور قیمت کی بابت ایک لفظ بھی زبان پر نہ لائے۔

جنرل فرار ہو کر مکہ معظمہ گئے۔ ۱۸۷۲ء میں نواب جوناگڈھ کی ملازمت کی۔ بمبئی کسی ضرورت سے آئے تھے، انگریز کے پنجہ میں آگئے۔ مقدمہ بدایوں میں چلا۔ اس وقت مسٹر ایم ڈبلیو سندس کلکٹر بدایوں (۱۸۷۳ء لغایت ۱۸۸۱ء) تھا منجانب حکومت پیروی

Marfat.com

مقدمہ مسٹر کارمیکل نے کی (جو اُس وقت بورڈ آف ریونیو کے ممبر تھے) جنرل کی طرف سے مولوی طفیل احمد صاحب وکیل پیش ہوئے (مولوی طفیل احمد صاحب انہیں مولوی رضی اللہ تحصیل دار کے فرزند ارجمند تھے جن کو بغاوت کے الزام میں گولی ماری گئی تھی) جنرل نیاز محمد خاں کو سزائے موت کا حکم ہوا۔ عدالت اپیل سے سزائے موت کا حکم حبسِ دوام بعبور دریائے شور سے مبدل کر دیا گیا۔

⑧ بدرالاسلام عباسی

بدرالاسلام عباسی بدایوں کے عباسی خاندان سے تھے۔ دورِ حاضر کے اس خاندان کے ممتاز رکن قاضی عبدالسلام (المتوفی ۱۲۸۹ھ) جنہوں نے قرآن کریم کی نظم تفسیر زاد الآخرہ لکھی۔ ریاست رام پور کے قاضی رہے۔ ان کے خلف الرشید قاضی شمس الاسلام (المتوفی ۱۳۱۷ھ) بے حد مخیر قاضی ریاست رام پور تھے۔ عباسی صاحب نے ایک نظم دورانِ ہنگامہ میں لکھی جس کا ایک مصرعہ تھا ع

سر کمپنی کا کٹ کے بکا پاؤ آنہ میں

یہ جُرم تھا جس کی سزا موت تجویز ہوئی۔

Marfat.com

مُرادآباد[1]

اس زمانہ میں مسٹر سی۔ بی سانڈرس مجسٹریٹ، مسٹر جے جے کمبل جوائنٹ مجسٹریٹ، اور مسٹر جے کراکرافٹ ولسن جج تھے۔ آخر الذکر چونکہ اس ضلع میں سترہ برس سے تعینات تھے۔ لہٰذا وہ ضلع اور باشندگانِ ضلع کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے اور جب صورتِ حال زیادہ تشویش ناک ہوگئی تو تمام ضلع کا انتظام اُنہیں کے سپُرد کر دیا گیا۔

مرادآباد میں قاضی عصمت اللہ صاحب فاروقی کی اولاد میں نواب مجد الدین خاں عرف نواب مجو خاں، نواب شبیر علی خاں صاحب دلاور الملک نواب دوندے خاں کے پوتے نواب عباس علی خاں اور اسد خاں وغیرہ مولانا کفایت علی صاحب کافی اور مولانا وہاج الدین صاحب عرف مولوی منو، سرکردہ لوگوں میں سے تھے۔

دہلی کے انقلاب کی خبریں اگرچہ ۱۲ مئی ہی سے پہنچنی شروع ہوگئی تھیں مگر یہاں ایک ہفتہ بعد ۱۹ مئی کو حرکت شروع ہوئی۔

نواب رام پور بہت سختی سے انگریزوں کے حامی تھے مگر باشندگانِ رام پور کی ایک بہت بڑی جماعت انگریزوں سے متنفر اور انقلاب کے لئے بے چین تھی۔ وُہ رام پور میں کوئی اقدام نہ کر سکی تو اُس کے تقریباً دو سو افراد مرادآباد پہنچے اور علمِ انقلاب بلند کر دیا۔ ۱۹ مئی کو مرادآباد کا جیل خانہ توڑا گیا۔ مولوی وہاج الدین صاحب عرف

---

[1] جناب محترم محمد ایوب صاحب قادری بی اے بدایونی کا ایک بہت ہی قابلِ قدر مقالہ روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اسی سے ماخوذ ہے

[2] سر سید احمد خاں مرحوم نے اپنی کتاب سرکشی اہلِ بجنور میں تحریر فرمایا ہے کہ مرادآباد جیل ۱۹ مئی کو توڑی گئی تھی۔ بظاہر یہی صحیح ہے۔

Marfat.com

مولوی منو صاحب اُن کے قائد تھے۔ ۳ر جون کو پلٹن ۱۱۹ نے بھی بغاوت کر دی۔

قیامِ حکومت جب انگریز مراد آباد سے بھاگ کر نینی تال اور میرٹھ چلے گئے، تو نواب مجدالدین عرف مجو خاں حاکمِ مراد آباد مقرر ہوئے۔ نواب شبیر علی خاں فوج کے جرنیل مقرر ہوئے۔ اسد علی خاں ہندی توپ خانہ کے افسر مقرر ہوئے۔ مولوی کفایت علی کافی صدر شریعت بنائے گئے۔ انہوں نے اور مولانا منہاج الدین صاحب عرف مولوی منو نے مسلمانوں میں جہاد کی رُوح پھونکی۔ شہر میں ہر جمعہ کو بعد نماز انگریز کے خلاف وعظ ہوتا تھا۔ جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر مراد آباد میں کہا گیا ہے

"مسلمانوں نے من حیث القوم ضلع بھر میں برٹش گورنمنٹ سے اپنی مخالفت کو نہایت صاف اور صریح طور پر ظاہر کیا ہے۔ روہیلکھنڈ کے دوسرے اضلاع کی طرح مراد آباد کے ضلع میں بھی غیرتِ مذہبی اور انگریزوں کی ہر بات سے نفرت کے جذبات نے مسلمانوں کو عام بغاوت پر آمادہ کر دیا تھا۔"

غرض مراد آباد پوری طرح بیدار تھا۔ مولانا کفایت علی نے نشر و اشاعت کے سلسلہ میں کافی کام کیا۔ فتویٰ جہاد کی نقول دوسرے مقامات پر بھجوائیں بلکہ بعض مقامات پر خود تشریف لے گئے۔ آنولہ ضلع بریلی میں خاص اسی مقصد کے لئے ہفتہ عشرہ قیام کیا تھا۔ حکیم سعید اللہ ابن عظیم اللہ کے یہاں ٹھہرے۔ مولانا کافی آنولہ سے بریلی پہنچے۔ خان بہادر خاں سے مشورہ کیا۔

نواب رام پور کا دخل نواب رام پور یوسف علی خاں صاحب نے انگریزوں سے پورا روہیل کھنڈ فتح کر لینے کی اجازت چاہی تھی۔ مگر جُز رس اور محتاط انگریز اس وقت بھی اس سخاوت پر آمادہ نہ ہوا۔ اُس نے صرف ضلع مراد آباد فتح کر لینے کی اجازت دی۔ چنانچہ نواب صاحب نے اپنے چچا عبدالعلی خاں اور حکیم سعادت علی خاں کو بھیج کر مراد آباد والوں کو اپنے حق میں ہموار کرنا چاہا۔ کچھ کامیابی نہ ہوئی تو ۲ر جون کو

Marfat.com

خود نواب یوسف علی صاحب مراد آباد پہنچے۔ وہاں نواب مجو خاں کے اقتدار کو ناقابلِ تسخیر دیکھ کر خود اُن کے اقتدار سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی یعنی اپنی طرف سے بھی نواب مجو خاں ہی کو ناظمِ ضلع تسلیم کر لیا۔ ان کے علاوہ چند افسر اپنی طرف سے مقرر کئے۔ حکیم سعادت علی خاں صاحب کو جج، نیاز علی خاں کو ڈپٹی کلکٹر، موسیٰ رضا کو کوتوال اور غلام بشیر پسر موسیٰ رضا کو جیلر مقرر کیا۔

جنرل بخت خاں کا مراد آباد سے گذرنا نواب رام پور کی مداخلت حاکمِ روہیلکھنڈ خان بہادر خاں کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ اُن کو مولانا کافی کے ذریعہ حالات کا علم ہوا تو نواب مجو خاں کی امداد کے لئے جنرل بخت خاں کو روانہ کیا۔ یعنی یہ طے کر دیا، کہ جنرل بخت خاں دہلی جاتے ہوئے مراد آباد قیام کریں۔ چنانچہ ۹ رجون کو جنرل بخت خاں اپنی فوج کے ساتھ مراد آباد پہنچے۔ نواب رام پور میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی، انہوں نے اپنا انتظام اُٹھا لیا، اپنے افسر واپس بُلا لئے۔ اب نواب مجو خاں کو آزادانہ انتظام کا موقع ملا۔ مجاہدین کی سرگرمیاں بھی تیز ہو گئیں۔ نواب مجو خاں نے جنرل بخت خاں کی فوجوں کے لئے بار برداری کا انتظام کیا۔ ۱۷ رجون ۱۸۵۷ء کو یہ فوج دہلی روانہ ہو گئی۔ اب نواب رام پور نے نواب مجو خاں اور عباس علی خاں نبیرہ نواب دوندے خاں میں تفرقہ ڈلوا دیا۔ عباس علی خاں نے خود حاکم بننے کا ارادہ کیا۔ مگر خان بہادر خاں نے فوراً تمام حالات سے باخبر ہو کر بریلی سے مصالحت کے لئے خاص آدمی بھیجے اور تمام نشیب و فراز سمجھائے۔ موضع بیجنا کے باشندوں نے بھی مصالحت کے لئے زور دیا۔ آخر دونوں کا اختلاف ختم ہو گیا۔

ریاست رام پور کی دوبارہ مداخلت جنرل بخت خاں کی فوج کی روانگی کے بعد ۲۴ رجون کو دوبارہ نواب رام پور نے عبد العلی خاں اور حکیم سعادت علی خاں کو مع فوج مراد آباد بھیجا۔ ان لوگوں نے نواب مجو خاں سے پھر مصالحت کر لی اور اُن کو سنبھل کی نظامت سپرد کر دی۔ نواب مجو خاں کے حاکم سنبھل مقرر ہوتے ہی صاحب سنگھ

Marfat.com

اور چھدولکھوری کے جاٹوں نے سنبھل اور اس کے گرد و نواح میں تحریک کو قوت دی۔ حسن پور، ٹھاکر دوارہ میں جنگی خاں و مردان خاں اور بیلوں رودرپور میں تگا سنگھ اہیر نے تحریک کو مدد دی۔

واقعہ کدو خانی ۳ راگست ۱۸۵۷ء کو مراد آباد میں ایک واقعہ پیش آیا۔ جس کو واقعہ کدو خانی کہا جاتا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ رام پوری فوج کا ایک ملازم کدو خرید رہا تھا۔ ایک مراد آبادی مسمی محمد عثمان سے تکرار ہو گئی جھگڑا بڑھا۔ عثمان خاں زخمی ہوا۔ بدلے میں اُس کے اقربا نے فوجی کو مار ڈالا۔ حکیم سعادت علی خاں نے فساد کو روکنے کی کوشش کی اور عثمان خاں کے علاج کا حکم ہوا۔ ہنوز وہ کوتوالی نہ پہنچا تھا کہ راستہ میں فوجیوں نے حملہ کر کے اُسے قتل کر دیا۔ اب تو اہالیانِ مراد آباد (مجاہدین) اور رام پوری فوج کی چل گئی۔ بہت سے رام پوری مارے گئے۔ آخر بمشکل امن قائم ہوا۔

شہزادہ فیروز شاہ کی آمد نواب رام پور کا مراد آباد میں دخل تھا۔ عبد العلی خاں انتظام سنبھالے ہوئے تھے۔ شہزادہ فیروز شاہ ۷ رمضان ۱۲۷۴ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۸۵۷ء کو براہ سنبھل مراد آباد میں داخل ہوا، اور قریب عیدگاہ جنگل میں قیام کیا۔ مجاہدین کی ہمتیں بلند ہو گئیں۔ تدبیریں اور منصوبے تیار ہونے لگے۔ غلام ناصر خاں، موسیٰ رضا خاں اور مولوی شاہ علی، فیروز شاہ کے پاس پہنچے۔ شہزادہ نے کہہ دیا کہ راستہ بھول کر آگیا ہوں، روزہ دار ہوں، بعد افطار روانہ ہو جاؤں گا۔ اسی دوران میں شہزادہ کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ شہزادہ کی فوج اصول و قواعدِ جنگ سے واقف اور ماہر تھی۔ نواب رام پور کی فوج نے شہزادہ سے شکست فاش کھائی۔ سب سے پہلے غالب علی رسالدار بھاگا۔ فوج کے سربراہ موسیٰ رضا اور غلام ناصر بُری طرح زخمی ہو گئے۔ راستہ میں مولوی شاہ علی نے شیوخ قصاباں کے چودھری سے امداد چاہی۔ اُس نے دین سے روگردانی اور فرنگی کی مدد کا طعنہ دیا۔ شاہ علی خفیف ہوئے۔ شہزادہ کی فوج مراد آباد میں پھیل گئی، انگریز کے ہمدردوں کی مرمت کی گئی۔ مجاہدین میں بڑی قوت پیدا ہو گئی۔ سولہ ہزار اشخاص نے

Marfat.com

بہ قسم شرعی محضر نامہ پر شرکت کے لئے دستخط کئے۔

شہزادہ فیروز سے جنگ نواب رام پور نے ۲۴ اپریل ۱۸۵۸ء کو دوبارہ شہزادہ کے مقابلہ پر فوج روانہ کی۔ مگر رجھیڑے کے پل تک پہنچتے پہنچتے فوج میں نصف آدمی رہ گئے حکیم نجم الغنی رام پوری مؤلف اخبار الصنادید نے دیکھنے والوں کی زبانی یہ روایت قلم بند کی ہے کہ سپاہی بندوق کا کندھا درخت کے تنے پر زور سے مارتے، وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ پھر بندوق پھینک کر رام پور کی طرف لوٹ جاتے۔ غرض طلوع صبح کاذب سے قبل ریاست رام پور کی فوج نے رام گنگا کے اس طرف کنارا کر لیا۔ شہزادہ فیروز شاہ ہوشیار تھا۔ اس کا انتظام خبر رسانی نہایت درست تھا۔ فوج کو ٹھیک کیا۔ اس کو مطلق خوف وہراس نہ تھا۔ پانچ ہزار قواعد داں فوج اس کے ہمراہ اور تمام شہر مرادآباد مدد کو تیار۔ اس نے تین مورچے قائم کئے۔ ایک شاہ بلاقی شاہ کے مزار کے پاس، ایک قلعہ پر اور تیسرا ان دونوں کے درمیان۔ ریاست کی فوج نے بھی تین حصے کر کے تینوں متذکرہ بالا مورچوں کے مقابل مدافعت کی تیاری کی۔ قلعہ کے مقابل کاظم خاں، مزار کے پاس حکیم سعادت علی خاں اور درمیانی مورچے عبدالعلی خاں متعین تھے۔ ۲۴ اپریل ۱۸۵۸ء کو کاظم علی خاں کی فوج نے حملہ کیا۔ فیروز شاہ کی فوج نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ہنگامۂ جدال وقتال گرم ہوا۔ حکیم سعادت علی خاں کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ حکیم سعادت علی خاں، حسین بخش، یعقوب خاں نے شہزادہ پر دوسری جانب سے حملہ کر دیا۔ اوّل ابتری ہوئی۔ پھر فوج سنبھل گئی۔ شہزادہ کی فوج نے مصنوعی طور سے راہِ فرار اختیار کی۔ رام پور کی فوج نے مژدہ فتح سمجھ کر تعاقب کیا۔ کچھ دور جانے کے بعد فیروز شاہ کی فوج نے پلٹ کر حملہ کر دیا۔ نوابی فوج کو شکست فاش ہوئی۔ بڑے بڑے سردار کام آئے۔ آخر میں شہزادہ نے ایک پُر اثر تقریر کی اور جہاد کی ضرورت اور انگریزوں کی کرتوتوں پر روشنی ڈالی۔ مگر نوابی فوج پر کچھ اثر نہ ہوا۔ نواب کی فوج نے مجتمع ہو کر پھر حملہ کیا۔ قریب بارہ بجے فیروز شاہ نے میدان چھوڑ دیا کیونکہ اس کو اطلاع ملی کہ جنرل

Marfat.com

جانسن تازہ دم فوج سے آپہنچا ہے۔ حکیم سعادت علی خاں وحسین بخش رسالدار وغیرہ مراد آباد میں فاتحانہ طور سے داخل ہوئے۔ جنرل جانسن گورا فوج کی بھاری جمعیۃ کے ساتھ نجیب آباد سے مراد آباد پہنچا۔ ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو مراد آباد پر انگریزی عمل دخل پورے طور پر ہوگیا۔ رام پوری فوج واپس چلی گئی۔ اس کے بعد مسٹر انگلس مراد آباد پہنچا۔ اور مجاہدین کی دار وگیر شروع ہوئی۔ کرنل کک نے شہر کی ناکہ بندی کرکے خانہ تلاشی اور گرفتاری شروع کی۔

انجام انگریزی حکومت کی بحالی کے بعد ضلع مراد آباد میں سخت مظالم ہوئے۔ مجاہدین کو پھانسیاں دی گئیں، توپ سے اُڑایا گیا، گولیاں ماری گئیں۔ نواب مجو خاں کے متعلق تحریر ہے کہ آخر وقت میں بھی ایک مکان کی چھت پر بندوق چلاتے ہوئے معلوم ہوئے۔ سپاہی ہتھیار بند اُن کو پکڑنے گئے۔ انہوں نے بڑی دلیری سے چند کو تمنچے سے مارا، اور باقیوں کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار مزید اضافی امداد پہنچی اور وہ گولی سے مارے گئے تھے۔ مولانا کفایت علی کافی کو پھانسی دی گئی۔ جائدادیں ضبط کی گئیں مکانوں کو آگ لگائی گئی۔ بقول سر سید احمد مراد آباد ایک بڑا غمکدہ قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا۔ چنانچہ مولانا حالی حیاتِ جاوید میں ارقام فرماتے ہیں۔ جائدادیں ادنیٰ ادنیٰ شُبہ پر ضبط ہوتی تھیں اور انگریزی حکام نیچرل طور پر ہندوستانیوں کی طرف سے بدگمان اور نہایت غیظ وغضب میں بھرے ہوتے تھے۔ خصوصاً ضلع مراد آباد پر گورنمنٹ کا سخت عتاب تھا۔ اور انگریزی افسران کا یہاں اعتدال پر رہنا سخت دشوار تھا۔

واقعاتِ امروہہ امروہہ میں میرٹھ اور دہلی کی خبریں پہنچنے کے بعد ۱۷ مئی ۱۸۵۷ء کو خاندان دیوان محمود اور خاندان درویش علی خاں منصب پنج ہزاری کے سربرآوردہ حضرات نے درگاہ شریف ولایت شرف الدین میں مجلسِ مشاورت طلب کی جس میں عمائد و اکابرینِ شہر، علماء اور اہل الرائے حضرات شریک تھے۔ انقلاب میں

Marfat.com

حصہ لینا طے ہوا۔ ۱۹ مئی کو جیل خانہ مراد آباد کے لوٹنے کے بعد جب سید گلزار علی[1] ابنِ اکبر علی ایک جتھہ کے ساتھ راتوں رات مراد آباد پہنچے۔ تو اُن کے پہنچنے کے بعد پھر مشورہ ہوا۔ ۲۰ مئی کو تھانہ و تحصیل پر قبضہ کر لیا۔ اوّل انگریزوں کی طرف سے گورکھا فوج بھیجی گئی۔ بعض امروہہ کے لوگوں نے انگریزوں کی مدد کی۔ پھر ولسن خود مراد آباد سے امروہہ پہنچا۔ اُس نے سید گلزار علی کے مکانات منہدم و مسمار کرا دیئے۔ ولسن کے لئے اس وقت امروہہ میں ٹھہرنا ناممکن تھا۔ اس کو مجبوراً بھاگنا تو اس کی روانگی کے بعد تحریکِ آزادی نے بڑھنا شروع کیا۔ اب باشندگانِ امروہہ نے بادشاہِ دہلی کے حضور میں عرضداشت بھیجی۔ جواب میں کچھ دیر ہوئی تو شبیر علی خاں ولد نذیر علی خاں، شیخ بشارت علی خاں ولد مہر علی خاں نبیرگان درویش علی خاں، گلزار علی ولد اکبر علی، شیخ الٰہی بخش، محمد سبحان علی معافیدار۔ شیخ بشارت علی خاں نے (دوبارہ برائے یاد دہانی) عرضیاں بھیجیں۔ اُن کے جواب میں شاہی شقے موصول ہوئے۔ جن میں ان لوگوں کی ہمّت افزائی کی گئی، اور تحریک کو کامیاب بنانے کا مشورہ دیا گیا۔ چنانچہ امروہہ میں حکومتِ خود اختیاری کا نفاذ ہوا۔ شبیر علی خاں و گلزار علی خاں سرکردہ مجاہدین تھے۔ حریت پسندوں نے اپنا رابطہ خان بہادر خاں (والی روہیل کھنڈ) سے قائم کیا۔ خان بہادر خاں نے اپنی طرف سے ایک صاحب قران خاں کو امروہہ کا نگران مقرر کیا۔ ادھر نواب رام پور اپنی کوششوں میں

---

[1] سید گلزار علی صاحب درویش علی خاں کے اخلاف میں سے تھے۔ درویش علی خاں صاحب کسی زمانہ میں مغل بادشاہ کی طرف سے پنج ہزاری منصب دار رہے تھے۔ اس موروثی نمک خواری نے اس وقت مغل بادشاہ سے وفاداری پر آمادہ کیا۔ آپ نے بادشاہ کے نام درخواست بھیجی سنبھل، امروہہ اور مراد آباد سے انگریزوں اور اُن کی حکومت ختم کر دینے کی بشارت دیتے ہوئے خاندانی منصب کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ درخواست میں یہ بھی ظاہر کیا کہ امروہہ کا نظم و نسق بڑے بھائی شیخ بشارت علی کے سپرد ہے جن کے ماتحت پانچ سو نوجوان کام کر رہے ہیں اور میں غازی آباد پہنچ کر نواب ولی داد خاں کی مدد کر رہا ہوں۔ (تاریخِ سادات امروہہ اور باغی علماء ص۷۸)

Marfat.com

مصروف تھے۔ انہوں نے اپنے آدمیوں کے ذریعہ سازشوں کا جال بچھا دیا ؎

من از بیگانگاں ہرگز ننالم
کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد

نواب رام پور کی طرف سے سید ظہور حسین (ناظمِ عارضی) اصغر علی خاں (ناظم مستقل) محب علی خاں تحصیل دار، یعسوب الدین تھانے دار، اور کریم بخش عباسی (کوٹ گشت) مقرر ہوئے اور اس کے علاوہ بہت سے اشخاص نے انگریز کی مخبری کے فرائض انجام دیئے جس کے صلہ میں ان کو اعزاز و اکرام و زمینداریاں ملیں۔

گلزار علی خاں کے سپرد فوج کا انتظام کیا۔ اس لائق اور جانباز مجاہد نے فوج کی بڑی اچھی تنظیم کی۔ مانڈے خاں اُن کے شریک تھے۔ ۱۹ر نومبر ۱۸۵۸ء کو رام پور کی فوج سے (جو حکیم سعادت علی خاں کی زیر سرکردگی تھی) گلزار علی خاں کا مقابلہ ہوا۔ بڑے زور کا معرکہ ہوا۔ مجاہدین کے جذبہ و جوش سے مقابل گھبرا گئے۔ لیکن سعادت علی خاں کی فوج کامیاب ہوئی اور مراد آباد کے ساتھ ساتھ امروہہ پر پھر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہوگیا۔ پھر تو پھانسیاں دی گئیں، توپوں سے اُڑائے گئے، مکانات کو آگ لگائی گئی اور بہت سے لوگوں کو عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ شبیر علی خاں کالے پانی پہنچے۔ گلزار علی روپوش ہوئے اور ضلع بریلی کے گھنے جنگلوں میں عمر گذار دی۔

Marfat.com

سینکڑوں میں سے چند

نواب مجّو خاں (مرادآباد) اور چودہری عبدالقادر عرب

اصل نام مجدالدین احمد عرف مجّو۔ والد کا نام محمدالدّین احمد خاں ۔ نبیرہ قاضی عصمت اللہ صاحب فاروقی۔ قاضی عصمت اللہ عہدِ عالمگیری کے ایک امیر تھے۔ مختلف صوبوں کے حاکم رہے۔ نواب مجدالدین خاں جاگیردار وسیع حوصلہ رئیس تھے۔ عمائدینِ مرادآباد کا آپ کے یہاں اجتماع رہتا۔ خصوصیت سے ہر ہفتہ اعلیٰ پیمانے پر دعوت ہوتی جس میں عمائدینِ شہر اور علماء و فضلاء خاص طور پر مدعو ہوتے تھے۔ ان کے بھائی نواب سعیدالدین خاں تھے۔ مرزا غالب مرادآباد گئے تو انہیں کے یہاں قیام فرمایا۔

نواب مجو خاں کے مخلص دوست چودہری عبدالقادر عرب تھے۔ جن کی کُشتی کی شُہرت دُور دُور تھی۔ جنگِ آزادی میں نواب مجو خاں کے ساتھ رہے۔ جب انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا تو نواب مجو خاں تہ خانوں میں چھپ گئے۔ مگر چودہری صاحب کھلے بندوں محلہ اصالت پورہ میں مقیم رہے۔ انگریزی افسر پہنچے تو خود زنان خانہ سے نکل کر اپنے آپ کو سپرد کر دیا۔ اور نواب مجو خاں کو بھی کہلا بھیجا کہ روپوش رہنا بہادری نہیں ہے۔ چنانچہ نواب صاحب بھی باہر نکلے اور خود کو گرفتار کرا دیا۔ مقدمہ چلا۔ سزائے موت تجویز ہوئی۔ تمام جائداد و املاک ضبط ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو چونے کی بھٹی میں جلا دیا گیا، اور مرادآباد میں یہ بھی مشہور ہے کہ نواب مجو خاں کو ہاتھی کے پاؤں سے باندھ دیا گیا۔[1]

---

[1] ایک روایت یہ بھی ہے کہ نواب مجو خاں گرفتار کرنے والوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے مگر زیادہ مشہور آخری روایت ہے۔

Marfat.com

رؤسائے مراد آباد کی حویلیوں کے نشانات اب تک موجود ہیں۔ باوجودیکہ ایک ایک حویلی میں پورا پورا محلہ آباد ہو گیا ہے، پھر بھی کچھ حصّے باقی ہیں تو اتنے وسیع کہ عظیم الشان دیوان خانوں کے سامنے بلند چبوترے اور نیچے کے حصّے میں پائیں باغ اب تک باقی ہیں[1]۔

مولانا کفایت علی صاحب[2] کافی شہید رحمۃ اللہ علیہ

عامل و فاضل طبیب[3] اور قادر الکلام شاعر[4] تھے۔ خانوادۂ سادات کے ایک رکن تھے۔ مراد آباد اصل وطن تھا۔ حضرت شاہ ابو سعید[5] صاحب مجددی رام پور سے علمِ حدیث کی

---

[1] ماخوذ از مشاہیرِ جنگِ آزادی مصنفہ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی ص۲۶۲ و ص۲۶۳۔ [2] حضرت مولانا کفایت علی صاحب کافی شہید کے متعلق معلومات کا یہ تمام ذخیرہ جس سے یہ باب مرتب کیا گیا ہے محترم محمد ایوب صاحب قادری بی اے کے مضمون سے ماخوذ ہے جو "العلم" جنگِ آزادی نمبر (اپریل تا جون ۱۹۵۷ء) کراچی میں شائع ہوا تھا۔ [3] مولانا کافی نے علمِ طب حکیم شیر علی صاحب سے حاصل کیا۔ حکیم شیر علی صاحب مولانا رحمان علی صاحب مؤلف "تذکرہ علماء ہند" کے والد ماجد تھے۔ [4] شیخ مہدی علی خاں ذکی مراد آبادی شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ اور رام پور کے درباروں سے متعلق رہے۔ لکھنؤ سے ملک الشعراء کا خطاب تھا۔ اپنے دور کے نامور شعراء میں سے تھے۔ مراد آباد میں آپ کے چار شاگرد مولانا کفایت علی کافی، مولوی محمد حسین تمنّا، مولوی معین الدین زہت اور مولوی شبیر علی خاں تنہا۔ چار یار باصفا مشہور تھے۔ ۷۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ سالِ وفات ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء۔ [5] شاہ ابو سعید بن شاہ صفی القدر ۲ ذیقعدہ ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۱ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ قرآن شریف حفظ کیا۔ علومِ عقلی و نقلی مفتی شرف الدین صاحب رام پوری و شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی سے حاصل کئے۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی سے سندِ حدیث حاصل کی۔ اپنے والد سے مرید ہوئے۔ پھر شاہ درگاہی رامپوری (المتوفی ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء) سے اجازتِ بیعت و ارشاد حاصل کی۔ شاہ غلام علی صاحب دہلوی سے نقشبندی سلسلہ میں اجازت حاصل کی۔ دہلی میں آپ سے بڑا فیض جاری ہوا۔ بروز عید الفطر ۱۲۴۹ھ/۱۸۱۱ء ٹونک میں انتقال ہوا۔ جنازہ دہلی لایا گیا۔

Marfat.com

تکمیل کی۔ اسی علمِ شریف سے بے حد شغف تھا۔ خاص طور پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ سے عشق تھا۔ سچ یہ ہے کہ عشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انہیں جذبات نے صورتِ شعر اختیار کر لی تھی۔ یہی آپ کی شاعری تھی۔ آپ خود فرماتے ہیں:

بس آرزو یہی دلِ حسرت زدہ کی ہے سُنتا رہے شمائلِ احوالِ مصطفےٰ

ہے سعیدِ دو جہاں وہ جو کوئی لیل و نہار
نعتِ اوصافِ رسول اللہ کا شاغل ہوا

آپ صاحبِ تصانیف ہیں۔ مگر موضوعِ تصانیف احادیث مقدسہ ہیں آپ کی مشہور (مگر آج کل نایاب تصانیف یہ ہیں:

بہارِ خلد، ترجمہ شمائل ترمذی شریف منظوم نسیمِ جنت۔ مجموعہ چہل حدیث مع تشریح منظوم۔ خیابانِ فردوس ترجمہ منظوم ترغیبِ اہلِ سعادت مصنفہ حضرت مولانا عبدالحق صاحب محدث دہلوی متعلق بہ فضائل درود شریف۔

حج بیت اللہ اور زیارتِ حرمِ مدینہ منورہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا بے حد شوق تھا۔ آپ کے دیوان "دیوان کافی" کی متعدد نظموں میں اس شوق کا اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ تمنا پوری کی۔ تو ایک مثنوی اس سفر کے متعلق بھی لکھ دی جو "تجملِ دربارِ رحمتِ بار" کے عنوان سے منشی عبدالرحمٰن صاحب شاکر مالک مطبع نظامی کانپور کی کوشش سے طبع ہوئی۔

ان کے علاوہ مولودِ بہاریہ۔ جذبۂ عشق[1]۔ اوقاتِ نحو و صرف، بھی آپ کی تصانیف ہیں۔

مولانا کافی کا کچھ عرصہ آگرہ میں بھی قیام رہا ہے۔ جب ۱۸۵۷ء کی تحریکِ حریت مراد آباد میں نمودار ہوئی تو آپ صفِ اوّل کے مجاہدین میں پیش پیش تھے۔

---

[1] اس میں ستونِ حنانہ کا واقعہ نظم کیا ہے۔ حلیہ شریف اور وفات نامہ بھی آپ کے منظوم رسالے ہیں مگر یہ دونوں بہارِ خلد سے ماخوذ ہیں۔

Marfat.com

انگریزی حکومت ختم ہو جانے کے بعد جب نواب مجد الدین عرف نواب مجو خاں کی زیر سرکردگی آزاد حکومت قائم کی گئی تو آپ صدر الشریعت قرار دیئے گئے۔ آپ کے یہاں مقدمات کا فیصلہ شرعی احکام کے مطابق ہوتا تھا۔

اسی اثناء میں جب مراد آباد میں نواب رام پور کو بالادستی قائم ہوئی تو آپ نے انگریزوں کے خلاف ایک فتویٰ جہاد مرتب کیا۔ اس کی نقلیں آپ نے دوسرے مقامات پر بھجوائیں بلکہ بعض مقامات پر آپ خود تشریف لے گئے۔ آنولہ[1] ضلع بریلی میں خاص اسی مقصد کے لئے ایک ہفتہ سے زیادہ قیام فرمایا۔ حکیم سعد اللہ ولد حکیم عظیم اللہ صاحب آپ کے ہم سبق ساتھی تھے۔ انہیں کے یہاں آپ کا قیام رہا۔ حکیم صاحب آنولہ میں تحریکِ آزادی کے خاص رُکن تھے۔ مولانا کافی آنولہ سے بریلی پہنچے۔ وہاں نواب خان بہادر خاں اور امام المجاہدین مولانا سرفراز علی صاحب سے مشورے ہوئے۔ جنرل بخت خاں کی ماتحتی میں جو فوج بریلی سے دہلی جا رہی تھی، اُسی فوج کے ساتھ آپ مراد آباد واپس ہوئے۔

گرفتاری اور پھانسی ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو مراد آباد پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا۔ مولانا کافی کچھ دنوں محفوظ رہے۔ ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء ۱۶ رمضان المبارک ۱۲۷۴ھ کو مولانا گرفتار ہوئے۔ مولانا پر مختلف الزامات عائد کئے گئے اور ضابطہ کی کارروائی کے بعد پھانسی کا حکم صادر کر دیا گیا۔ مولانا کافی نے جیسے ہی حکم سُنا، نہایت خوشی کا اظہار کیا اور جب مولانا کو پھانسی کے لئے لے جایا گیا تو آپ کی زبان پر ایک تازہ نظم تھی جو بڑے ترنّم سے بلند آواز سے پڑھ رہے تھے۔ نظم یہ ہے۔

---

[1] آگرہ میں نواب کلن خاں (بیرہ بخشی سردار خاں) نواب خان بہادر خاں کی طرف سے حاکم مقرر تھے۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب (شاگرد حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی) نواب جان محمد، نواب حسن، شیخ خیر اللہ اور حکیم سعد اللہ اُن کے خاص رفقاء اور مشیر تھے۔

Marfat.com

کوئی گُل باقی رہے گا، نَے چمن رہ جائے گا
پر رسولؐ اللہ کا دینِ حَسَن رہ جائے گا
ہم صفیرو باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بُلبلیں اُڑ جائیں گی، سونا چمن رہ جائے گا
اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اِس تنِ بے جان پر خاکی کفن رہ جائے گا
نام شاہانِ جہاں مٹ جائیں گے لیکن یہاں
حشر تک نام و نشانِ پنجتن[1] رہ جائے گا
جو پڑھے گا صاحبِ لولاک کے اُوپر دُرود
آگ سے محفوظ اُس کا تن بدن رہ جائے گا
سب فنا ہو جائیں گے کافی ولیکن حشر تک
نعتِ حضرتؐ کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

حضرت مولانا کافی رحمۃ اللہ علیہ کو جیل مراد آباد کے پاس مجمعِ عام کے سامنے پھانسی دی گئی اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ رحمۃ اللہ رضی عنہ

مولانا وہاج الدّین صاحب مُرادآبادی

مولانا حمید الدین صاحب عرف چھوٹے مولوی معافیدار، حضرت مولانا وہاج الدّین

---

[1] پنجتن کی تفسیر کے لئے مولانا کافی کے دیوان کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

السلام اے چار یارِ باصفا، ارکانِ دین — مجمعِ جود و حیا، صدق و عدالت السلام
ثنا خوانِ نبی ہوں اور اصحابِ نبی کافی — ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ علیؓ سے مجھ کو اُلفت ہے
مجھے اُلفت ہے یارانِ نبی سے — ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ سے
محبّت اُن کی ہے ایمان میرا — مَیں اُن کا مدح خواں ہوں جان و جی سے

Marfat.com

صاحب کے ہمشیر زاد تھے۔ مولانا حمید الدین صاحب کے نواسے عزیز احمد صاحب قادری چشتی نے اپنے نانا صاحب کی زبانی ۱۸۵۷ء کے قصے سُنے تھے۔ اُن میں حضرت مولانا وہاج الدین صاحب کے مجاہدانہ کارنامے خاص اہمیت رکھتے تھے۔ عزیز احمد صاحب نے اُن کو قلمبند فرمایا جو روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن مورخہ ۲ مئی ۱۹۵۷ء میں شائع کئے گئے۔ ان صفحات میں عزیز احمد صاحب کا یہی مضمون پیش کیا جا رہا ہے اس میں مولانا وہاج الدین صاحب کے حالات کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں جو ایک مورخ کے لئے قابلِ قدر ہیں۔

شہید ملت فدائے قوم مولوی وہاج الدین عرف مولوی منور رحمۃ اللہ علیہ خلف مولوی جمیل الدین ابن مولوی وجیہ الدین ابن مفتی شیر محمد مراد آباد کے ممتاز، با اثر، قوم پرور اور جلیل القدر رئیس تھے۔ نہایت ہی فیاض، سیر چشم اور مہمان نواز تھے۔ اُن کا دسترخوان فراخ تھا۔ مذہب کے معاملے میں آہنی ستون، عبادت گذار، بے مثل شجاع۔ اخلاق کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ ہر اعلےٰ و ادنےٰ کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ سب سے یکساں ملتے جُلتے۔ ہر ایک کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہتے تھے اور ضرورت مندوں اور غربا کی دل کھول کر امداد کرتے اور اُن کی تقریبوں اور محفلوں میں بغیر کسی بلندی و پستی کا خیال کرتے ہوئے شریک ہوتے۔ مختصر یہ کہ بہت بڑے جتھے بند اور مقتدر رئیس ابن رئیس تھے۔ لندنی سرکار سے خصوصی اعزاز بھی ملا ہوا تھا۔ شہر کے حکّام نہایت عزّت و احترام کرتے تھے، اور اُن سے ملنا باعثِ فخر و ناز سمجھتے تھے۔

مولوی صاحب کو عربی، فارسی اور اردو عُلوم کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی پُوری قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے انگریزی زبان اپنے حقیقی چچا مولانا محمد اسمٰعیل کی لندنی بیوی سے جو ایک یورپین مہذب خاندان سے تعلق رکھنے والی تھیں، پڑھی تھی۔

مولانا محمد اسمٰعیل لندنی کے کوئی نواسہ اور پوتہ نہ تھا۔ صرف ایک لڑکی تھی، اور

Marfat.com

ایک ہی نواسی تھی۔ نواسی کا نام شہر بانو تھا۔ چونکہ مولانا کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی، اس لئے اُن کی وفات کے بعد اُن کے بڑے بھتیجے مولوی وہاج الدّین عرف مولوی منّو کو دولتِ انگلیشیہ سے خلعت کے ساتھ ساتھ وہ اعزازی نشان بھی عطا کیا گیا تھا جو لندن سرکار سے اُن کے چچا مولانا محمد اسمٰعیل لندنی کو ملا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کوئی انگریز مولوی منو صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے اُن کے دولت کدہ پر حاضری دینے آتا تو سلام کے بعد بھی مؤدب کھڑا رہتا۔ جب مولوی صاحب مذکور اعزازی نشان کو تن سے جُدا کر کے الگ رکھ دیتے تو وہ بیٹھ کر گفتگو کرتا۔ غرض مولوی صاحب شہر کی ناک تھے۔

مولوی صاحب مذکور کے تین بھائی اور ایک بہن تھی جو آزادی کی جنگ میں اُن کے دوش بدوش رہے، اُن کے نام یہ ہیں: مولوی سراج الدین، مولوی منہاج الدّین، مولوی عبداللہ اور فضیلت النساء۔

فضیلت النساء کی شادی مولوی افضل الدّین کے ساتھ ہوئی تھی جو مفتی بہاء الدین کے پوتے تھے۔ آپس کے اتحاد اور اتّفاق کی بناء پر صحرائی اور سکنائی جائداد مشترک تھی اور سب بھائی اور بہن یک جا طور پر محلّہ رفعت پورہ میں رہتے تھے جائے سکونت گھیر منو کے نام سے مشہور تھی۔ مقامِ سکونت کے قریب ایک مسجد بھی ہے، جو عہدِ حاضر میں مولوی مختصر صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ اس وقت ان مقامات پر مولوی منو کے خاندان کا کوئی فرد آباد نہیں۔ عرصہ سے چونا پز اور دندان ساز وغیرہ مقام مذکور کو خریدنے کے بعد آباد ہو گئے ہیں۔ مولوی وہاج الدّین صاحب کے یہاں روزانہ شہر کے شرفاء اور اہلِ علم جمع ہوا کرتے تھے۔ اُن کا حلقۂ احباب ذی علم لوگوں سے رہتا۔ جن میں سے چند کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مولانا کافی صاحب، مولوی سرفراز علی صاحب، سید اکبر علی صاحب، سیّد گلزار علی صاحب اور مولوی وزیر علی صاحب۔

Marfat.com

مولوی وجیہ الدین بھی کئی بھائی تھے۔ اُن کے ایک بھائی کے بیٹے قاضی محمد بخش صاحب شہر کے قاضی تھے۔ قاضی صاحب بھی شہر کے عمائدین میں سے تھے۔ قاضی صاحب کی اولاد میں قاضی محمد عبّاس، قاضی تجمّل حسین، قاضی امراؤ حسین وغیرہ وغیرہ ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مولوی وہاج الدین عرف منّو نے ایک قائد کی حیثیت سے انتہائی سرگرمی سے کام کیا اور متعلقہ اسکیم کے تحت پارٹیاں قائم کرنے کے لئے پوشیدہ طور پر بذاتِ خود اور نمائندوں کے ذریعہ سربرآوردہ لوگوں کو حصولِ آزادی کی اس تحریک میں شرکت کی دعوت دیتے رہے۔ چند رؤساء اُن کو اس کارِ نیک میں پیش پیش دیکھ کر ساتھ ہو گئے اور اس طرح ایک بڑی جماعت وجود میں آگئی۔

۱۹ مئی کو مولوی وہاج الدین عرف مولوی منّو کی قیادت میں ضبط و نظم کے ساتھ حریت نوازوں کا ایک جمِ غفیر جیل خانہ کی طرف گیا۔ ہجوم نے مولوی منو صاحب کا اشارہ پاتے ہی جیل خانہ پاش پاش کر دیا۔ قائد نے سب سے پہلے پرچم لہرایا اور تمام قیدیوں کو آزاد کر کے اُن کے خورد و نوش اور دیگر ضروریات کا انتظام کیا۔ بعد ازاں ان کے حسبِ خواہش جس نے اس جماعت میں شامل ہونا چاہا، شامل کیا، اور باقی لوگوں کو زادِ راہ دے کر خدا حافظ کہہ دیا۔ قائد نے شامل ہونے والے لوگوں کا ایک جتھہ بنا کر سیّد اکبر علی صاحب اور سیّد گلزار علی صاحب کی سپردگی میں اودھ کی سمت روانہ کر دیا۔ اس دوران میں جان کرافٹ ولسن حریت نوازوں کے مارچ کی خبر پاتے ہی روپوش ہو گیا۔

مراد آباد جیل خانہ ٹوٹنے کی خبر روہیل کھنڈ میں پہنچتے ہی عہدیداران کا سارا رعب و دبدبہ تہ بستہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کی جس قدر بھی دہشت عوام کے دلوں پر تھی، یکسر غائب ہو گئی۔ مراد آباد سے ایک وفد قصبہ آنولہ بریلی بھیجا گیا۔ وفد کے صدر مولوی کفایت علی صاحب کافی تھے جنہوں نے اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی، جوانمردی، شجاعت اور دانشمندی سے سرانجام دیئے۔ پھر مراد آباد تشریف لے آئے۔ ریاست

Marfat.com

رام پور کی منجمد فضا میں حرکت پیدا کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ مگر قدائے قوم مولوی وہاج الدین عرف مولوی منّو ہی کی یہ قوم پروری، حُبّ الوطنی اور شجاعت تھی کہ سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ خطرات کی اس وادی میں کُود پڑے۔ وہ بے خوف ہو کر رام پور خاص اور گرد و نواح کے قصبوں اور دیہاتوں میں جلسے کرتے پمفلٹ پڑھ کر سُناتے اور اس طرح اپنے سپوتوں کو بیدار کر کے جنگِ آزادی کی تحریک میں شمولیت کی دعوت دیتے۔

مرزا ناظم بخت کے بیٹے اور فرخ سیّر بادشاہ کے نواسہ فیروز شاہ کا جب مرادآباد میں ورود ہوا تو شہر کے خواص اور عوام سب ہی نے شاندار طریقے پر استقبال کیا۔ مولوی وہاج الدین عرف مولوی منّو فیروز شاہ کے دستِ راست تھے۔ مولوی صاحب اور سیّد صاحب مذکور اور دیگر رؤسائے شہر ان کی ہر قسم کی معاونت کرتے رہے۔ شاہزادہ فیروز شاہ نے شہر کا گشت کیا اور فرداً فرداً اُن رؤسا کے یہاں بھی گیا جو جنگِ آزادی میں شریک نہ تھے، اور اپنے دروازے مقفّل کر چکے تھے۔

مرادآباد میں فیروز شاہ اور اس کی ہمراہ فوج کا پڑاؤ اس باغ میں ہوا تھا جس باغ کی کوٹھی میں کبھی آنتوں والا صاحب رہتا تھا۔ مقام مذکور اس سڑک پر واقع ہے جو سڑک گل شہید کے برف خانہ کے چوراہے سے بڑے اسٹیشن کو جاتی ہے۔

ریاست رام پور کے نواب حریت پسندوں سے الگ تھے۔ انگریزوں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ انگریزوں نے نواب رام پور کی کثیر فوج لے کر مرادآباد پر چڑھائی کر دی۔ شاہزادہ فیروز شاہ کی سرپرستی میں مولوی وہاج الدین عرف مولوی منّو کے علمِ جہاد کے زیرِ سایہ مجاہدینِ جنگِ آزادی نے نواب کی فوج اور انگریزوں سے خُوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ حتیٰ کہ بعض خواتین مردانہ لباس زیبِ تن کر کے میدان میں آئیں اور مخالفین کے دانت کھٹے کر دیئے لیکن ساز و سامان میں انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ بالآخر شکست ہوئی۔ انگریز شہر پر قابض ہو گئے۔ شاہزادہ فیروز شاہ

Marfat.com

سنبھل والی سڑک سے روانہ ہو کر کندرکی ہوتا ہوا قصبہ آنولہ سے گذر کر بریلی پہنچا۔ اگرچہ انگریزوں نے اس کا تعاقب کیا مگر فیروز شاہ کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔

انگریزوں نے برسرِ اقتدار آتے ہی شمعِ حریت کے پروانوں ایک طویل فہرست بنائی۔ فہرست میں اضافہ ہوتا رہا۔ گرفتاریاں شروع کر دی گئیں۔ محبّانِ وطن کے لئے سزائے موت کا حکم جاری ہونے لگا۔ شہر کی مختلف سمتوں میں پھانسی گھر قائم کئے گئے۔ پھانسیوں کا مرکز سرائے پختہ کے سنبھلی گیٹ کے متصل رکھا گیا۔ جہاں جان نثاروں کو آزادی سے پھانسیاں دی جانے لگیں۔ حرّیت کے پروانوں کے لئے کوئی قانون اور کوئی انصاف نہ تھا۔ جو شخص جس کا بھی نام لے دیتا، اس کو انتہائی بے رحمی سے پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا جاتا اور پھانسی کے بعد انہیں وہیں دفنا دیا جاتا تھا۔ شہدائے ملّت کی یادگار میں اب بھی ایک محلّہ آباد ہے جو گُل شہید کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ ایک شخص نے جو مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو کے دسترخوان کا نمک خوار تھا، مخبری کی خدمت انجام دی۔

رمضان المبارک کا مہینہ اور عصر و مغرب کے درمیان کا وقت تھا کہ فوجی دستہ نے مولانا کی قیام گاہ کا محاصرہ کر لیا۔ پہلے ہی نمک خوار مخبر آگے بڑھا۔ مولانا تنہا مکان میں تشریف فرما تھے۔ ان کو اپنی آمد کی خبر کرائی۔ مولانا وہاج الدّین صاحب ان دنوں انتہائی محتاط تھے مگر آنے والے کا نام سُنتے ہی اُن کی احتیاط اور وقت کی نزاکت، نرم دلی اور خلوص و ہمدردی کے نیچے دب گئی اور اُنہوں نے فوراً ہی صدر دروازہ کھول دینے کا حکم صادر فرما دیا۔ دروازہ کُھلتے ہی ساتھ ساتھ فوجی رسالہ بھی دیوان خانہ میں داخل ہوا، اور آزادی سے آگے بڑھا۔ اس پر ایک نمک حلال ملازم نے تیوری بدل کر مداخلت کی۔ جسے اسی وقت شہید کر دیا گیا۔ مولوی صاحب نے اپنی بندوق جو قریب ہی رکھی تھی، اُٹھائی۔ لیکن معاً اُن پر گولیاں برس پڑیں اور اُن کی رُوح کلمہ پڑھتی ہوئی قفسِ عنصری سے عالمِ بقا کو پرواز کر گئی۔

Marfat.com

آقا اور ملازم کی نعش فوجی رسالہ اپنے ساتھ لے گیا، اور اُن کی تمام آبائی جائداد ضبط کر لی گئی۔

مولانا وہاج الدّین صاحب اور اُن کے ملازم دونوں کی پختہ قبریں محلہ کنجری سرائے میں کچہری روڈ پر نعل بندوں کی مسجد کے قریب ایک خطیرہ میں ہیں۔ نیم کے چند درخت اُن پر سایہ فگن ہیں۔

بجنور

فدائے قوم نواب محمود خاںؒ

یہ باب زیادہ تر سر سید احمد خاں صاحب کی مشہور کتاب "سرکشی ضلع بجنور" سے ماخوذ ہے۔ سر سید مرحوم ۱۸۵۷ء میں ضلع بجنور میں صدر امین تھے ہنگامہ کے اس تمام دور میں انگریزوں کے نہایت مخلص وفادار رہے۔ یہ کتاب اُن کے چشم دید واقعات کا مجموعہ ہے اور اس بناء پر بہت زیادہ قابل اعتماد ہے یہ کتاب قطعاً نایاب ہے۔ ہم شکر گذار ہیں کہ محترم مولانا عبداللہ صاحب کی نوازش و عنایت سے اس نایاب کتاب کا ایک قلمی نسخہ میسر آیا۔ جس سے یہ باب مرتب کیا گیا۔ (مصنّف)

○

اٹھارہویں صدی کے وہ نامور جنہوں نے غیرت و خودداری اور حریت پروری کی روایات زندہ رکھیں، اُن میں نجیب خاں کا نام خاص طور پر عزّت و احترام کا مستحق ہے۔ نجیب خاں روہیلہ پٹھانوں کے ایک معمولی[1] خاندان کا ہونہار فرد تھا۔ جس نے

---

[1] نجیب خاں، احمد شاہ کے وقت میں یعنی ۱۷۴۸ء میں دوندے خاں کا ملازم تھا اور اس کی طرف سے پرگنہ دارانگر کی تحصیل کرتا تھا۔ اس نے بہت سے لوگ اپنے ساتھ جمع کئے اور (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

قابلیت، صلاحیت، عمدہ کارگذاری اور عزم و ہمت کے سر و سامان کے ساتھ میدانِ ترقی میں تیزی سے قدم بڑھایا۔ یہاں تک کہ عالمگیر ثانی کے عہدِ حکومت میں امیرالامرائی کا منصبِ جلیل اور نجیب الدولہ کا خطاب حاصل کیا۔

اس کا نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ بیرونی حملوں اور اندرونی کشمکش اور طوائف الملوکی کے اس نازک دَور میں سلطنتِ مغلیہ کی گرتی ہوئی دیوار کو ایسا سہارا دیا کہ اس کی عمر میں کئی سال کی طویل مدّت کا اضافہ ہوگیا۔ اس کی تعمیری صلاحیتیں دامنِ کوہ کے ایک ویران علاقہ کی طرف متوجّہ ہوئیں جو اپنی تمام شادابیوں اور زرخیزیوں کو گھنے جنگل کی ہولناکیوں میں گُم کئے ہوئے تھا۔ یہاں شہر "نجیب آباد" بسایا۔ اُس کے قریب ۱۷۷۵ء میں ایک مضبوط قلعہ "پتھر گڈھ" تعمیر کیا۔

نجیب الدولہ نجیب خاں کے جانشین فرزند کا نام "ضابطہ خاں"[1] تھا، جو باپ کی جگہ کچھ عرصہ کے لئے مغل بادشاہ کا امیرالامراء رہا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "شاندار

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) ان پرگنہ جات پر جو اب ضلع بجنور میں ہیں قبضہ کر لیا۔ پھر دوندے خاں کی بیٹی سے اسکی شادی ہوئی۔ اس سبب سے مستقل مالک اس کا ہوگیا اور بادشاہ کے دربار تک بھی رسائی کر لی (تاریخ سرکشی اہلِ بجنور از سرسید احمد مرحوم)۔ نجیب خاں یوسف زئی عمر خیل روہیلہ پٹھان تھے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ضابطہ خاں کے ایک لڑکے کا نام غلام قادر خاں تھا جس نے طوائف الملوکی اور دَورِ کش مکش میں دہلی پر چڑھائی کی۔ قلعہ میں گھسا اور انگریزوں کے کٹھ پتلی بادشاہ (شاہ عالم) کو معزول کر کے اُس کی شان میں وہ گستاخی کی جس نے اس کے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا اور نیک نامی کے بجائے بدنامی اُس کے گلے کا طوق بن گئی یعنی اُس نے بادشاہ کو اندھا کر دیا۔ بادشاہ کی دردمندانہ اپیل پر مرہٹی راجہ مہاراجہ پٹیل نے غلام قادر خاں کا تعاقب کر کے گرفتار کیا۔ لوہے کے پنجرے میں قید کیا۔ پھر ایک ایک عضو جُدا کر کے اُس کو مار ڈالا۔ ضابطہ خاں کے دوسرے بیٹے کا نام معین الدّین خاں عرف بھنبو خاں تھا جو مہاراجہ پٹیل کے حملہ کے وقت جان بچا کر پنجاب بھاگ گیا تھا۔ نواب محمود خاں انہیں معین الدّین خاں کے فرزند ہیں۔

Marfat.com

ماضی" جلد دوم)۔

نواب محمود خاں اسی ضابطہ خاں کے پوتے تھے[1]۔ چونکہ یہ علاقہ اسی خاندان کا آباد کیا ہوا تھا، اور ظاہر ہے آباد ہونے والے بھی وہی ہوں گے جو نجیب الدولہ کے رفیق اور اُس کے معتمد سپاہی یا افسر تھے۔ تو اس بنا پر نہ صرف اس پرگنہ میں بلکہ پورے ضلع بجنور میں اس خاندان کا یہ اثر تھا کہ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا، اور بغاوت کی خبریں یہاں پہنچنے لگیں تو سر سید احمد خاں مرحوم کی شہادت یہ ہے کہ :

مجھے یقین تھا کہ جب لوگوں کو یقین ہو جائے گا کہ فوج آتی ہے اور رستے میں ہے تو جتنے لوگ یہاں ہیں کوئی بھی ہمارا ساتھ نہیں دینے کا۔ اور ہم کو ایک ایسا چوہا تک بھی میسر نہیں آئے گا جو حکّامِ انگریزی کی رفاقت کر کے گنگا پار کسی امن کی جگہ تک اُن کو پہنچا دیوے، اور بلاشبہ میری رائے بہت صحیح اور نہایت پکّی تھی[2]۔

پھر ایک صفحہ بعد ارشاد ہے :

اور ہم کو ہرگز توقع نہ تھی کہ بُرے وقت میں یہ لوگ ہمارا ساتھ دیویں گے بلکہ ہم یقین جانتے تھے کہ یہ سب نا محمود خاں کے ساتھ ہو جائیں گے[3]۔

---

[1] پسر نواب معین الدین خاں عرف بھنبو خاں پسر ضابطہ خاں، عالی شان کوٹھی مبارک محل نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ [2] تاریخ سرکشی اہلِ بجنور قلمی ص۱۸۔ [3] ایضاً ص۱۷۔ خاندانی اثر کے علاوہ خود نواب محمود خاں کے ذاتی اوصاف نے ان کو عزیز بنا دیا تھا۔ محمد ایوب صاحب بی اے نواب کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں تعلیم و تربیت معقول طریقہ سے ہوئی۔ ریاست کا انتظام سنبھالا تو داد و دہش کے باعث قرض سے گراں بار رہے۔ خوش طبع، یار باش اور مہمان نواز تھے۔ شکار کا بہت شوق تھا۔ نشانہ خوب لگاتے تھے (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۵۶ء) نواب کی فراخ حوصلگی اور وسیع القلبی کا نتیجہ تھا کہ باوجودیکہ سر سید کی خفیہ خط و کتابت مراد آباد کے جج جے کر کرافٹ ولسن سے بھی مگر نواب محمود خاں نے اس کو نظر انداز کیا۔ (محمد ایوب صاحب سنڈے ایڈیشن مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۵۶ء)۔

Marfat.com

چند صفحوں کے بعد تحریر ہے :

"اور حقیقت میں یہ ممکن نہ تھا کہ ضلع بجنور کے آدمی نامحمود[1] خاں کو چھوڑ کر کسی اور کی حکومت قبول کریں[2]"۔

نواب محمود خاں کے والد خاندان کے تذکرہ میں سر سید احمد خاں کی اس تصنیف کے دو اقتباس اور ملاحظہ فرمایئے۔ فرماتے ہیں :

مسٹر کولبرک صاحب بہادر ۱۸۱۲ء میں ایک بہت بڑا کانٹوں دار درخت ہو گئے یعنی بسا گئے تھے۔ اُجڑے ہوئے، جلا وطن ہوئے ہوئے نامحمود خاں کے باپ بھنبو خاں کو نجیب آباد میں، جس کے سبب گویا یہ برباد ہوا ہوا خاندان پھر لوگوں کی نظروں میں سما گیا تھا اور اسی سبب سے ہر ایک شخص ضلع کا اپنے تئیں قدیم متوسّل اور پُرانا نمک خوار اور پشتینی تابعدار نامحمود خاں کا سمجھتا تھا، اور ایسے تزلزل کے وقت میں ہر ایک کی نگاہ اسی پر پڑتی تھی[3]۔

دوسرا اقتباس :

(غلام قادر خاں روہیلہ کے مشہور واقعہ کے بعد ضابطہ خاں کا دوسرا لڑکا) معین الدّین خاں عرف بھنبو خاں بھاگ کر پنجاب چلا گیا تھا۔ جب سرکار دولت مدار انگریزی نے اضلاع دہلی کو فتح کیا، تب بھنبو خاں کو بُلا کر بہت خاطر کی اور پانچ ہزار مہینے کی پنشن مقرر کر کے بریلی میں رہنے کا

---

[1] یہ تہذیب الاخلاق کے مصنف سر سید احمد خاں صاحب مرحوم کے اخلاق ہیں کہ نواب محمود خاں کو ہر جگہ نامحمود خاں لکھا ہے اور صرف اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ خاتمہ کتاب میں مسلمانوں کو وفاداری کا سبق دیتے ہوئے اس غریب محمود خاں کو بدذات بھی فرما دیا ہے تاہم غنیمت ہے کہ جس طرح امام بخش عرف ماڑے خاں شیر کوٹی اور عنایت رسول صاحب وغیرہ کو حرامزادہ کہا ہے، نواب محمود خاں صاحب کو اس خطاب سے معاف رکھا۔ [2] سرکشی ضلع بجنور ص۲۱ قلمی۔ [3] ایضاً ص۱۶۔

Marfat.com

حکم دیا، اور پھر مسٹر کولبرک صاحب بہادر کی رپورٹ سے ۱۸۱۲ء میں نجیب آباد میں آباد ہوا۔ اس کے مرنے کے بعد سرکار دولت مدار انگریزی نے بہ نظرِ ترحم محمود خاں اور جلال الدین خاں اور اس کے بیٹے اور بیٹیوں کے لئے ہزار روپیہ مہینے کی پنشن مقرر کی، اور ہر ایک شخص کو اس خاندان میں سے بہت بڑے بڑے معزز عہدے عطا فرمائے کہ تمام خاندان بہ کمال عزت اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔[1]

سر سید صاحب مرحوم، بھنبو خاں کی باز آبادکاری کو انگریزوں کی عنایتِ خسروانہ قرار دیتے ہیں اور اسی کتاب میں ایک جگہ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ:

یہ ضلع (ضلع بجنور بالخصوص پرگنہ نجیب آباد) بالکل ملا ہوا ہے پہاڑ اور بہت بڑے جنگلوں سے، جبکہ سرکار کی بخوبی عملداری تھی (یعنی ۱۸۵۷ء سے پہلے) جب بھی اکثر ڈاکو اس میں رہتے تھے۔

یعنی اس ضلع کا محلِ وقوع اس قسم کا ہے کہ یہاں امن قائم رکھنا بہت مشکل تھا اور پہلے اقتباسات سے واضح ہو چکا ہے کہ:

"ضلع کا ہر شخص اپنے تئیں قدیم متوسل اور پرانا نمک خوار اور پشتینی تابعدار نامحمود خاں کا سمجھتا تھا۔"

اور یہ بھی تاریخ کی ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ۱۸۱۲ء کا دور کمپنی کی حکومت کے لئے بہت سخت تھا۔ ایک طرف پنڈاری گوریلا لڑائیاں لڑ رہے تھے۔ دوسری طرف مرہٹوں کی باضابطہ فوجیں دہلی کے قریب تک پہنچ رہی تھیں۔ مہاراجہ گوالیار انگریزوں کے برخلاف راجہ نیپال سے ساز باز کر رہا تھا۔ ایسی صورت میں عنایتِ خسروانہ نہیں بلکہ سامراجی اغراض کا تقاضا کہ نواب بھنبو خاں جیسے با اثر کو ایسے پُرخطر علاقہ میں بسایا جائے جو فوجی لحاظ سے نہایت اہم تھا۔ جہاں میدانی علاقہ کے باشندے

---

[1] سرکشی ضلع بجنور ص۳ (مطبوعہ)

Marfat.com

پہاڑی قوموں کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف بغاوت کا آتش فشاں جب چاہتے، تیار کر سکتے تھے۔

انہی مصلحتوں کی خاطر بھنبو خاں کو وقتی طور پر آلۂ کار بنایا گیا اور جیسے ہی یہ مصلحتیں ختم ہوئیں اور بھنبو خاں کی عمر کا آفتاب غروب ہوا، وظیفہ کی مقدار پانچ ہزار ماہانہ کے بجائے صرف ایک ہزار ماہانہ پورے خاندان کے لئے کر دی گئی۔

جبکہ یہ پورا ضلع بھنبو خاں کے باپ دادا کا آباد کردہ تھا اور ضلع کے باشندے اپنے تئیں اس خاندان کا قدیم نمک خوار سمجھتے تھے تو حق و انصاف کا تقاضا تو یہ تھا، کہ بھنبو خاں کو پورا ضلع واپس دے دیا جاتا اور اس کی نوابی تسلیم کی جاتی لیکن پورے علاقہ کو بحقِ سرکار کمپنی ضبط کر کے صرف پانچ ہزار ماہانہ کا وظیفہ مقرر کرنا خسروانہ عنایت نہیں بلکہ وہی غاصبانہ پالیسی ہے جو پورے مُلک میں چلائی جا رہی تھی اور جس کے برخلاف بجا طور پر ریاستوں اور جاگیرداروں کے وارث چراغ پا تھے۔

بھنبو خاں کی وفات کے بعد وظیفہ میں تخفیف اسی عام پالیسی کی تکمیل تھی۔

سر سید صاحب فرماتے ہیں:

"ہر ایک شخص کو اُس کے خاندان میں سے بڑے بڑے معزز عہدے عطا فرمائے"۔

ان معزز عہدوں کی تفسیر بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔[1]

---

[1] سید صاحب کی یہ قناعت پسندی قابلِ تعریف ہے کہ نہ عہدِ مغلیہ کے منصب پنج ہزاری، ہفت ہزاری وغیرہ پر نظر ہے اور نہ انگریزی دَور کی گورنری یا کم از کم کلکٹری کا اعزاز و اکرام سامنے ہے۔ خاندان کے سینکڑوں افراد اور خاص اس گھر سے تقریباً ۵۰ افراد میں سے دو ایک کو تحصیلداری کا شرف حاصل ہے۔ چند افراد جمعداری اور رسالداری کے عہدے پر فائز ہیں مگر سید صاحب اسی پر نازاں اور مراحمِ خسروانہ کے شکر کے لئے سجدہ ریز ہیں اور خمیدہ کمر۔

Marfat.com

احمد اللہ خاں بھانجا محمود علی خاں تحصیلدار نجیب آباد ضلع بجنور۔
محمد عمر خاں۔ تحصیلدار ضلع حصار
محمد حسین خاں۔ رسالدار
عطا خاں۔ جمعدار
عنایت اللہ خاں۔ جمع خرچ نویس[1] وغیرہ وغیرہ

۱۸۵۷ء آغاز اور انجام ۱۰ مئی کو میرٹھ میں اور ۱۱ مئی ۵۷ء کو دہلی میں جو کچھ ہوا، اس کی خبریں ۱۲ مئی کو بجنور پہنچیں، تو یہاں بھی حرکت شروع ہوئی۔ ۱۹ مئی کو مراد آباد میں جیل خانہ توڑا گیا۔ رہا شدہ قیدی بجنور پہنچے تو فضا میں تلاطم شروع ہو گیا۔

جیسا کہ سابق اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے، انگریزی حکومت سے برہمی عام تھی اور کسی تزلزل کے وقت اگر کسی کا اقتدار ضلع میں تسلیم کیا جا سکتا تھا، تو وہ نواب محمود خاں صاحب تھے۔

مسٹر الیگزینڈر شیکسپیر کلکٹر، اور مسٹر جارج پامر جوائنٹ مجسٹریٹ تھے۔ ان کے علاوہ ضلع کے اور چند افسر انگریز تھے۔ ان لوگوں نے حالات کا جائزہ لیا اور یقین کر لیا کہ اس سیلاب کے سامنے ان کے وجود نازک کے سفید تنکے ٹھہر نہیں سکتے۔ تو سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ کس طرح بیک بینی و دو گوش ضلع بجنور سے نکل کر رڑکی پہنچ سکیں، جہاں انگریزی طاقت محفوظ تھی۔ سر سید صاحب صدر امین اور اُن کے رفیقِ خاص سید تراب علی تحصیلدار بجنور کے مشورے سے ۷ جون ۵۷ء کو نواب محمود علی خاں صاحب کو ضلع کی حکومت کا پروانہ دے دیا گیا اور اسی شریف الطبع رئیس کی شرافت کی پناہ میں سب انگریز بخیر و عافیت ضلع سے نکل کر رڑکی پہنچ گئے۔

انگریز افسران کے بخیریت نکل جانے کے بعد نواب محمود خاں نے ۸ اور ۹ جون کی درمیانی شب میں اپنی حکومت کا اعلان کیا۔ امیر الدولہ، ضیاء الملک مظفر جنگ

---

[1] سرکشی ضلع بجنور ص ۳۰

Marfat.com

کے خطابات اختیار کئے اور اب پورا نام مع القاب اس طرح لکھا جانے لگا :

امیر الدولہ، ضیاء الملک ذوی القدر نواب محمود خاں بہادر، مظفر جنگ۔

اعلانِ حکومت کے بعد ضلع کا انتظام سنبھالا[1]۔ ہر ایک شعبہ کے افسر مقرر کئے۔ پورے ضلع میں یہاں تک امن ہوگیا کہ بقول سر سید صاحب گنگا پار کے باغیوں نے بھی اپنے لئے بجنور سے زیادہ کوئی مامن نہ دیکھا۔ چنانچہ دلیل سنگھ اور قدم سنگھ گوجر اور رضا حسن عرف چھٹن اور عنایت علی خاں قاضی تھانہ بھون مع اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کے اس ضلع میں آئے۔ اس ضلع کے باغیوں نے ان کو امن دیا۔ ان کے سوا میر الطاف اور مرزا حاجی اور مرزا مبارک شاہ سے شاہزادگان مفرور دہلی اس ضلع میں آئے، اور نا محمود خاں اور مارٹے خاں نے اوّل اوّل بہت عزت اور توقیر کی۔ اس کے علاوہ پیش قدمی کرکے ہردوار تک انگریزی طاقت کو ختم کرکے اپنا قبضہ کر لیا۔

اسی کے ساتھ بقایا مالگذاری حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی گئی[2]۔ احمد اللہ خاں، نواب کے بھانجے نجیب آباد کے تحصیل دار تھے۔ انہوں نے نواب محمود خاں کے مدار المہام اور مختارِ کُل کی حیثیت اختیار کر لی اور پھر مالگذاری وصول کرنے میں کچھ ہندو زمینداروں سے ایسی سختی برتی کہ مقابلہ کی نوبت آگئی، اور اسی تلخی نے رفتہ رفتہ پورے ضلع میں ہندو مسلم جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ اس وقت نتیجہ اگرچہ مسلمانوں کے حق میں رہا اور پورے ضلع میں اُن کا ڈنکا بجنے لگا، مگر اس تسلط و اقتدار نے

---

[1] محمد ایوب صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ ۱۴ رجون کو شاہِ دہلی کی خدمت میں عرضداشت بھیجی گئی۔ جواب سے نوازا گیا۔ انتظام کی درستی کو بہ نظرِ استحسان دیکھا گیا مغل شاہزادے دہلی سے نجیب آباد پہنچے (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن، ۱۹ رنومبر ۱۹۵۶ء) [2] سرکشی ضلع بجنور ص۹۳۔ [3] ایضاً ص۱۲ مطبوعہ۔

Marfat.com

ہندو زمینداروں کو انگریزوں سے نامہ و پیام پر آمادہ کر دیا۔[1]

بہرحال تقریباً ایک سال بعد جب شیکسپیر اور پامر دوبارہ ضلع بجنور میں فاتحانہ[2] داخل

---

[1] انگریز موقع سے کب چوک سکتا تھا، جیسے ہی پامر نے چودھری صاحبان کا رُخ دیکھا، مبلغ دس ہزار کی فرمائش کر دی کہ نینی تال بھیج دیئے جائیں، جہاں صاحب لوگوں کو ضرورت ہے۔ چنانچہ چودھری پرتاپ سنگھ نے دو قسطوں میں اس فرمائش کی تعمیل کر دی۔ (سرکشی اہل بجنور) [2] مولانا عبداللہ خاں صاحب کرتپوری کے پردادا اقلندر علی خاں اور اُن کے خلف رشید حسن رضا خاں، ساکنان بستی کوٹلہ نواب محمود خاں کے رشتہ دار بھی تھے اور شریک جہاد بھی۔ مولانا عبداللہ خاں صاحب اس معرکہ کی (جس میں نواب محمود خاں کو وہ شکست ہوئی جو تمام شکستوں کی بنیاد تھی۔ جس کی تلافی وہ آخر تک نہیں کر سکے، اس معرکہ کی) تفصیل جو اپنے والد الحاج محمد ہدایت اللہ خاں صاحب سے سُنی تھی، اس طرح بیان کرتے ہیں:

جنوری ۱۸۵۸ء میں نواب نے ایک بڑی جمعیت کے ساتھ ضلع سہارن پور پر حملہ کی تیاری کی۔ وہ چیدہ نوجوان جو اس معرکہ کے لئے منتخب کئے گئے، ان میں مولانا عبداللہ صاحب کے دادا حسن رضا خاں صاحب بھی تھے۔ مولانا عبداللہ صاحب فرماتے ہیں کہ ضلع بجنور کی شمالی حد پر کوہ ہمالیہ کا بن (وسیع جنگل) واقع ہے اور مغربی حد پر دریائے گنگا۔ نواب کے لشکر نے ضلع سہارنپور پر چڑھائی کا جو راستہ اختیار کیا وہ بہت مناسب تھا۔ نواب نے بن (جنگل) اور پہاڑ کا لحاظ رکھتے ہوئے شمال مغربی حد سے حملہ کی تجویز کی۔ چنانچہ لشکر کا کُوچ ہُوا۔ بن طے کرنے کے بعد قصبہ کن کھل کا رُخ کیا۔ سرما کا موسم جنوری کا مہینہ تھا۔ ان ایام میں دریا پایاب ہوتا ہے، اس لئے دریا کو پار کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ ابھی یہ پروگرام صیغۂ راز میں تھا کہ شاطر انگریز نے اس کو ناکام بنانے کا بہت گہرا منصوبہ تیار کر لیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جیسے ہی لشکر گنگا کے وسط میں پہنچا، گنگا کا وہ بند جہاں سے پانی نہر گنگ میں پہنچتا ہے، توڑ دیا گیا۔ فوراً ایک سیلاب موجزن ہُوا اور تقریباً آدھے لشکر کو بہا لے گیا۔ بقول سرسید نواب کے لشکر کا آب شمشیر کے بجائے موج آب سے کام تمام ہُوا انگریز کی چاق چوبند فوج نے اس تباہ شدہ لشکر کا تعاقب کر کے ایک ایک کو (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

ہوئے تو :

(۱) نواب محمود خاں، اُن کے بھائی جلال الدّین خاں، عظمت اللہ خاں، احمد اللہ خاں اور شفیع اللہ خاں (خواہر زادگان نواب محمود خاں) اور مارڑے خاں[1] باغی قرار

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) ختم کر دینے کی کوشش کی۔

دادا حسن رضا ہاتھی پر سوار تھے۔ زخمی ہو کر گرے اور ایک درخت سے سہارا لگا کر بیٹھ گئے۔ آدمی شکیل اور وجیہ تھے۔ دشمن کے سپاہیوں نے آپ کو نواب محمود خاں سمجھا اور سر قلم کر لیا۔ (آزادی نمبر روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۱۵ر اگست ۱۹۵۸ء)۔ محمد ایوب صاحب بی اے تحریر فرماتے ہیں کہ نوابی فوج کو غیر متوقع شکست ہوئی۔ انگریزی فوج نے مختلف علاقوں پر قبضہ شروع کر دیا۔ محمود خاں نے حالات کا جائزہ لیا۔ مجلسِ مشاورت منعقد ہوئی۔ سربرآوردہ حضرات میں سعد اللہ خاں منصف اور احمد اللہ خاں موجود تھے۔ اس کے مارڑے خاں، شفیع اللہ خاں، نتھو خاں، اور مولوی عنایت علی وغیرہ نے نگینہ کے باغوں میں مورچے قائم کئے۔ مقابلے ہوئے، مگر انگریز کامیاب ہوا۔ (سنڈے ایڈیشن الجمعیۃ مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۹۵۷ء)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] مارڑے خاں اصل نام امام بخش۔ شیر کوٹ کے رہنے والے تھے۔ ایک معمولی خاندان سے اُن کا تعلق تھا۔ مگر ہمّت و جرأت خداداد تھی۔ جماعتی نظم و نسق کا بھی اچھا سلیقہ تھا۔ جب نظامِ حکومت ختم ہو گیا تو قصبہ کے سربرآوردہ صاحبان نے قصبہ کی حفاظت ان کے ذمّہ کی۔ امام بخش صاحب نے رضا کاروں کا دستہ تیار کیا۔ جس نے چند ہی روز میں ایک باضابطہ فوج کی شکل اختیار کر لی اور نہ صرف قصبہ شیر کوٹ میں بلکہ پورے ضلع میں ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ جب نواب محمود خاں کی حکومت قائم ہوئی اور اُن کی طرف سے ان کے بھانجے احمد اللہ خاں مالگذاری وغیرہ کے لئے یہاں پہنچے تو مارڑے خاں نے اپنے ہتھیار کھول کر محمود خاں صاحب کے سامنے رکھ دیئے۔ احمد اللہ خاں صاحب نے اسلحہ ان کو واپس کئے اور ضلع کی فوجوں کا کمانڈر بنا دیا۔ یہ آخر تک پوری ہمّت و جرأت اور نہایت پامردی سے فرائض متعلقہ انجام دیتے رہے (حالات قلمی مارڑے خاںؒ جو مولانا وحید الدین صاحب قاسمی شیر کوٹی انچارج دفتر جمعیۃ علماء ہند کے پاس محفوظ ہیں)۔

Marfat.com

دیئے گئے۔

(۲) اور ضلع کے تمام رؤسار کے نام اعلان نامہ جاری کیا گیا۔

"جو کوئی منجملہ تمہارے یا رشتہ داران جو ملازمان یا باشندگانِ شہر تمہارے کے باغیان مذکور کو پناہ یا مدد دے گا، یا اس کی نوکری کرے گا، تو مجرم سرکار متصوّر ہو کر کُل جائداد منقولہ وغیر منقولہ و زمینداری وغیرہ تمہاری ضبط سرکار ہو کر تم کو تدارک سنگین ہوگا، اور مسکن تمہارا مثل باغیانِ مالاگڈھ اور تھانہ بھون وغیرہ کے گرایا جائے گا۔ چاہیئے کہ یہ آفت اُوپر اپنے مت لاؤ..... الخ [۱]

(۳) انگریزی فوج کی مزاحمت جگہ جگہ کی گئی۔ اس میں جو بہادر کام آئے اُن کا شمار بہت مشکل ہے۔ البتہ کامیابی کے بعد دوبارہ نظم قائم کرنے اور امن بحال کرنے کے بہانے جس تہذیب اور شرافت کا مظاہرہ کیا گیا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیجئے۔

بہ مجرد فتح ہونے نگینہ کے جناب صاحب مجسٹریٹ بہادر اور جناب اندرسین بریگیڈ میجر مع سپاہیان پلٹن خاکی کے شہر نگینہ میں تشریف لے گئے اور سید تراب علی تحصیلدار کو واسطے انتظامِ شہر کے اپنے ساتھ لیا اور شہر کی ناکہ بندی کر کے جیسا کہ چاہیئے تھا، انتظامِ شہر فرمایا اور تین سو آدمی شہر میں سے گرفتار کئے۔ ان میں سے ۴۵ آدمی اسی وقت مارے گئے [۲]... الخ

ایک باغ میں عنایت رسول خاں اور ان کے ساتھ کچھ آدمی چھپے ہوئے تھے۔ فوج نے اُن کا محاصرہ کیا۔ عنایت رسول صاحب، ان کے ملازم جان محمد اور اُن کے ساتھ پچاس ساٹھ آدمی وہیں قتل کر دیئے اور ساٹھ ستر آدمیوں کو زندہ پکڑ کر لے گئے اور گولیوں سے مار دیا اور اکثر آدمی قاضی محلہ کے جو اس باغ میں چھپے ہوئے تھے، وہ بھی مارے گئے [۲]

---

[۱] سرکشی اہلِ بجنور ص۱۰۸ قلمی۔ [۲] ایضاً ص۱۰۶

Marfat.com

نجیب آباد فوج پہنچی تو شہر خالی پڑا تھا۔ قلعہ پتھر گڈھ میں کچھ سپاہی تھے، وہ فرار ہونے لگے تو اُن کا تعاقب کیا گیا اور تیس سواروں کو مار دیا گیا شہر نجیب آباد لُٹ گیا اور تمام شہر میں آگ لگ گئی۔ جلال الدّین خاں اور سعد اللہ خاں گرفتار کئے گئے۔ ۲۳ اپریل ۱۸۵۸ء کو اُن کے گولی ماری گئی[1]

بیسویں اپریل ۱۸۵۸ء کو یہ تجویز ہوئی کہ مکانات تا محمود خاں جلال الدین خاں جو اُن کی سرداری اور حکومت کے نشان ہیں، اُڑا دیئے جاویں تاکہ سرکار کی کمال ناراضی ان پنشن خوار نمک حراموں سے (نقلِ کُفر، کفر نباشد) ظاہر ہو، اور لوگوں کو بخوبی عبرت ہو۔ چنانچہ اسی تاریخ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور دیوان خانہ جو بہت بڑا مکان اور حکومت کی نشانی تھی، اُڑا دیئے گئے[2]

یہ درد انگیز قصّہ طولانی ہے۔ چند واقعات بیان کر دیئے گئے کہ:

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

---

[1] سرکشی اہلِ بجنور ص۱۰۶ - [2] ایضاً

Marfat.com

دُوسرا رُخ

وفاداری کا معیار

یہ ۱۸۵۷ء کا ایک رُخ تھا۔ خونِ شہادت کی رنگینیاں اس کا غازہ ہیں۔ اب وفاشعاری اور نیازمندی کے رُخ پر ایک ہلکی سی نظر ڈال لیجئے۔

سرسیّد احمد خاں صاحب نے تن من کی بازی لگا کر جس طرح حقِ وفا ادا کیا، وہ شاید ناکافی تھا۔ اس لئے اُن کو اپنی کمال نیازمندی اور برأت کے اظہار کے لئے وہ اندازِ تحریر بھی اختیار کرنا پڑا جس کی تعبیر کے لئے وفاداری، نیازمندی جیسے الفاظ بھی ناکافی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے، نواب محمود خاں کا نام تو اُنہوں نے نامحمود خاں رکھا، اور پھر اُس کو اس طرح نبھایا کہ کسی جگہ بھی اس مصنوعی نام کے نقل کرنے میں فروگذاشت نہیں ہوئی۔ اس کتاب میں سینکڑوں جگہ نام آیا ہے اور ہر جگہ نامحمود خاں ہی لکھا گیا ہے۔

اس عام اصطلاح کے علاوہ جگہ جگہ ان واجب الاحترام شخصیّتوں کو جن کی تعظیم کے لئے پورے ضلع بجنور کی گردنیں خم ہوتی تھیں، بدذات، نمک حرام، حرام زادہ وغیرہ کے مہذّب الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔

وہی سرسیّد جو چند سال بعد "تہذیب الاخلاق" کے مصنّف بنے، کیا اُن کے اخلاق ایسے ہی ہونے چاہئیں؟ ایک طرف اپنے بھائیوں کے ساتھ یہ سلوک، یہ زبان اور یہ ادبِ تہذیب۔ دوسری جانب انگریز کی ایک ادنیٰ ترین توجّہ پر جن الفاظ میں اور جس طرح شُکریہ ادا کیا، اُس کو پڑھیئے اور سبق لیجئے کہ انگریز کے دربار میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے کس درجہ فدائیت اور نیازمندی کی ضرورت تھی۔

سرسیّد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"میں نہایت متامل ہوتا ہوں اس اگلی بات بیان کرنے سے کہ میں

Marfat.com

اپنی نسبت آپ لکھتا ہوں۔ پھر مجھ کو اس کے لکھنے پر اس لئے دلیری ہوتی ہے کہ درحقیقت مَیں خود نہیں لکھتا بلکہ اپنے آقا کی بات بیان کرتا ہوں اور پھر مجھ کو نہایت خوشی ہوتی ہے کہ اگر میرے آقا نے میری نسبت بات کہی ہو، مَیں کیوں نہ اس کو کہوں اور کس لئے نہ کہوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہونا اور اس کو بیان کر کر اپنا فخر کرنا، نوکر کا کام ہے۔

یعنی جب مَیں میرٹھ آیا اور بیماری نے مجھ کو کمال ستایا تو میرے آقا مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر دام اقبالہٗ صاحب جج اور اسپیشل کمشنر میری عزّت بڑھانے کو مجھے دیکھنے آئے اور مجھ سے یہ بات کہی کہ تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ تم نے اس نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا، اور باوجودیکہ ضلع بجنور میں ہندو اور مسلمان میں کمال عداوت تھی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کو مقابلہ کر کے اُٹھایا تھا اور جب ہم نے تم کو اور محمد رحمت خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کو ضلع سپُرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور نہایت طرفداریِ سرکار کے سبب تمام ہندو اور مسلمان تمہارے حاکم بنانے پر خوش ہوئے۔ سرکار نے بھی تم کو اپنا خیراہ خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد سے سارے ضلع کی حکومت تم کو سپُرد کی اور تم اسی طرح وفادار نمک حلال سرکار کے رہے، اس کے صلہ میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر بطور یادگار رکھی جائے تو یہ بھی کم ہے۔

مَیں اپنے آقا کا کمال شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُنہوں نے مجھ پر ایسی

لہ ضلع کا نظم و نسق انہیں دو مسلمان افسروں کے سپُرد ہوا تھا۔ مگر انتظام تو کیا کر سکتے، جان کے لالے پڑ گئے۔ بمشکل جان بچا کر نکل سکے۔

Marfat.com

مہربانی کی اور میری قدردانی کی، خدا اُن کو سلامت رکھے[1]

عیبے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو
نفی حکمت مکن از بہرِ دل عامے چند

سرسیّد کی جب یہ تحریر سامنے آئی ہے جو آزادی اور جمہوریت کے موجودہ دَور میں حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ شرمناک بھی ہے، تو ناانصافی ہوگی اگر اس موقع پر ایک دوسرا اقتباس بھی پیش نہ کیا جائے۔ مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے سرسیّد نے فرمایا:

غدر کے بعد مجھے اپنا گھر لُٹنے کا رنج نہ تھا، نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گذرا، اُس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم شیکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے۔ بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد[2] جو سادات کے ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیّت تھا اور لاکھ روپیہ سے زیادہ کی مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں اُن کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے

---

[1] سرکشی اہلِ بجنور ص۶۷۔ [2] میر صادق اور میر رستم علی چاند پور ضلع بجنور کے رئیس تھے انہوں نے ایک عرضداشت بہادر شاہ کے پاس بھیجی تھی۔ بعد فتح دہلی وہ عرضداشت کاغذات دفتر شاہی میں مل گئی۔ بس صرف اس بناء پر اُن کا تعلقہ ضبط کرلیا گیا۔ یہی تعلقہ تھا جسے دوسری جائداد کے علاوہ بجنور کے ڈپٹی کمشنر نے سرسیّد کو دینا چاہا تھا۔ حیات جاوید ص۷۹ تا ص۸۱ بحوالہ غلام رسول مہر ص۲۰۵۔

Marfat.com

لینے سے انکار[1] کر دیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور درحقیقت یہ بالکل سچی بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی۔ اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے، اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔

---

[1] اختلاف رائے کے باوجود یہ حقیقت پسندی اور مظلوموں کے ساتھ یہ ہمدردی قابلِ قدر ہے، اور خدا کا شکر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تاریخ میں ایسے حقیقت پسندوں کی کمی نہیں ہے۔ مولانا میر محبوب علی صاحب کا ذکرِ خیر آگے آئے گا کہ آپ نے سرکاری انعامات واپس کر دیئے۔ کاتبِ حروف کے ایک خاندانی بزرگ سید محمد انور صاحب اس زمانہ میں جھانسی کی طرف اور سیر تھے۔ آپ بھی وفادار رہے اور جب آپ کا انگریز افسر فرار ہوا تو آپ نے اسکی کوٹھی اور تمام املاک کی پوری حفاظت کی۔ اس کے صلہ میں سرکار نے آپ کے نام کئی مواضعات کا پروانہ بھیجا مگر آپ نے اس پروانہ کو نذرِ آتش کر دیا اور جب تحقیق ہوئی تو جواب دیا کہ میں نے جو کچھ کیا اپنی دیانت اور احساسِ فرض کے تقاضے سے کیا۔ میں اس کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کر سکتا۔ آپ کے متعلق ایک لطیفہ بھی احقر نے اپنے والد ماجدؒ سے سنا ہے کہ عرصہ تک سلسلۂ مراسلت بند رہنے کے بعد جب ڈاک خانوں کا نظام بحال ہوا تو آپ نے خانگی مصارف کے لئے رقم بھیجی۔ مگر منی آرڈر سے رقم بھیجنا اس وقت بھی خلافِ احتیاط تھا تو ایک کتاب میں اشرفیاں رکھ کر کتاب کا پارسل والد صاحب کے نام کر دیا۔ والد صاحب کو روپیہ کی ضرورت تھی، روپیہ کی بجائے کتاب کا پارسل پہنچا تو خفا ہو کر ٹپک دیا کہ "بوڑھے طوطے کو پڑھانے کے لئے کتاب بھیجی ہے"۔ جب غصہ فرو ہوا تو پارسل کھولا تو اشرفیاں دیکھ کر دعائیں دیں۔ اسی بناء پر ارشادِ ربانی ہے "**خلق الانسان من عجل**"۔ یہ سید محمد انور صاحب خدا ترس، پاک باز، صاحبِ تقوی و طہارت تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے رفیقِ خاص حضرت حاجی محمد عابد صاحب سے بیعت تھے۔ آپ نے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا تھا۔ رحمہم اللہ

Marfat.com

پھر یہ خیال ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروّتی کی بات ہے کہ میں اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں! اس کی ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیئے اور جو مصیبت پڑی ہے، اس کے دُور کرنے میں ہمّت باندھنی قومی فرض ہے، میں نے ارادۂ ہجرت موقوف[1] اور قومی حمدردی کو پسند کیا[2]۔

سرسیّد کی اس تحریر کی تصدیق کے لئے رسالہ "اسبابِ بغاوتِ ہند" پیش کیا جا سکتا ہے۔

وہی سرسیّد جو اس پر نازاں ہے کہ اُس کے "آقا" انگریز نے اس کو "نمک حلال نوکر" کہا، جب وہ دیکھتا ہے کہ بغاوت کا تمام الزام مسلمانوں کے سر تھوپ کر پوری قوم کے کچلنے اور اس کی نسلیں ختم کر ڈالنے کا تہیّہ کیا جا رہا ہے —— اور بقول سرسیّد:

کوئی آفت ایسی نہیں جو اس زمانہ میں ہوئی ہو، گو وہ رام دین اور رامادین نے کی ہو، اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی۔ کوئی بلا آسمان سے نہیں چلی جو اُس نے پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔ ان دنوں جو میری نگاہ سے انگریزی اخبارات کثرت سے گذرے اور جو کتابیں اس ہنگامہ کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں اور ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بدذات کوئی نہیں —— مگر مسلمان! مسلمان! مسلمان۔ کوئی کانٹوں دار درخت اس زمین میں

---

[1] یہ صرف سرسیّد صاحب مرحوم کی تخصیص نہیں ہے۔ پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء نے بھی یہی کیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ علماء کرام کے پیش نظر تحفظِ دین تھا اور یہ کہ آزاد فکر صاحبِ دیانت اہلِ علم پیدا ہوں۔ اور سیّد صاحب کے پیش نظر مسلمانوں کی وجاہت دنیاوی عزّت اور وفاداری حکومت متسلّط۔ ابھی آدھی صدی بھی نہ گذری تھی کہ دونوں کے نتائج سامنے آگئے۔ [2] العلم کراچی جنگِ آزادی نمبر ص۲۹ و حیاتِ جاوید از ص۷۹ تا ص۸۱ جلد اوّل۔

Marfat.com

نہیں اُگا، جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی
آتشیں ببولا نہیں اُٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اُٹھایا تھا[1]۔

تو یہی سرسید "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھ کر بغاوت کی ذمہ داری حکمران طبقہ کے سر تھوپ دیتا ہے اور ساتھ ہی ایک ایسا مطالبہ کر دیتا ہے جس کے لئے اس وقت تک نہ کسی کے قلم نے جنبش کی تھی، اور نہ کسی کی زبان متحرک ہوئی تھی۔

سرسید کہتے ہیں:

بلاشبہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کی رعایا کی مداخلت غیر ممکن اور بے فائدہ محض تھی۔ مگر لیجسلیٹو کونسل میں مداخلت نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بس یہی ایک بات ہے جو جڑ ہے تمام ہندوستان کے فساد کی اور جتنی باتیں جمع ہوتی گئیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں[2]۔

"اسبابِ بغاوتِ ہند" سرسید کا ایسا کارنامہ ہے کہ اس کے متعلق اُس وقت بھی یہی کہا گیا اور پوری ایک صدی کے گرم و سرد حوادث کے بعد بھی یہی کہا جاتا ہے:

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

صرف انگریز کی حقیقت پسندی[3] اور نکتہ رسی تھی جس نے نوائے تلخ کو نوید جاں افزا سمجھا۔ ورنہ سرسید کے مخلص دوستوں کے خیال کے مطابق سرسید یہ کتاب لکھ کر اپنے لئے دار و رسن کا انتظام مکمل کر چکے تھے۔

---

[1] العلم کراچی جنگ آزادی نمبر۔ [2] اسبابِ بغاوتِ ہند ص۱۲۔ [3] اس کے علاوہ خود انگلستان کے سیاسی حالات بھی سرسید کے مساعد ہو گئے کیونکہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم کر کے ہندوستان کو براہِ راست ملکہ وکٹوریہ کے زیر حکومت کیا گیا تو لامحالہ ایسے الزامات کی ضرورت تھی جن سے کمپنی کی اس برطرفی کو جائز اور تقاضاء عدل و انصاف قرار دیا جا سکے۔ (اسبابِ بغاوتِ ہند)۔ ایسے الزامات کی بہت ہی معتدل دستاویز تھی جس کو ارکانِ پارلیمنٹ نے غنیمت سمجھا۔ چنانچہ انگریزی میں اس کا ترجمہ بکثرت تقسیم کیا گیا۔

Marfat.com

بہرحال اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیئے کہ سرسیّد بھی بہی خواہیِ مُلک وملّت کا وہی سوز وگداز قلب وجگر میں رکھتے تھے جو مجاہدینِ حریت کو نصیب ہُوا تھا، البتّہ اختلاف رائے نے راستے جُدا جُدا کر دیئے تھے۔

نقطۂ نظر میں بنیادی فرق یہ تھا کہ مجاہدینِ حریّت انگریز کو غاصب اور ناجائز حکمران تصوّر کرتے تھے جس سے نجات پانا اوّلین فرض تھا اور سرسیّد ان کو جائز حکمران اور ان کی اطاعت کو لازمی اور ضروری مان چکے تھے۔

سچائی اور خلوص کے ساتھ اختلافِ رائے باعثِ ملامت تو کیا ہوتا نص حدیث نے اس کو باعثِ رحمت فرمایا ہے البتّہ یہ انتہا پسندی کہ مخالف کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر کر تہذیب وشائستگی کے لازمی تقاضوں سے بھی اس کو محروم کر دیا جائے اور اُس کے لئے بازاری الفاظ سے بھی گئے گذرے الفاظ استعمال کئے جائیں یقیناً ایسی شکایت ہے جس کا ازالہ آج تک نہیں ہو سکا۔

انگریزی زبان کی تعلیم اور انگریز کی ملازمت ۱۸۵۸ء سے نہیں تقریباً پچاس سال پیشتر سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز جائز قرار دے چکے تھے۔ مگر سرسیّد کی یہی انتہا پسندی تھی جس نے انگریزی زبان کی تعلیم کے ساتھ انگریزی کلچر کو بھی ضروری قرار دیا۔ اور صرف انگریزی تعلیم گاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ انگریزی کلچر کی تربیت گاہ کی حیثیت سے علی گڈھ کالج کی بنیاد رکھی جس کے نتیجہ میں وہ اختلافات برپا ہوئے جس کا شور آج تک کانوں میں گونج رہا ہے۔

سرسیّد کی یہی انتہا پسندی تھی جس سے ڈپلومیٹک انگریزوں کو فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملا۔ اُس نے ایک طرف اپنے پوشیدہ ذرائع سے ان اختلافات کو ہوا دی جس سے خود مسلمان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور دوسری طرف بہت سے سیاسی مسائل میں سرسیّد کو آلۂ کار بنا کر ہندو اور مسلمانوں میں وہ خلیج پیدا کر دی جس کا آخری نتیجہ تقسیم مُلک کی صورت میں نمودار ہُوا۔

Marfat.com

رجوع | اس ضمنی بحث کے بعد ضلع بجنور کے حالات کو ایک بزرگ کے تذکرہ پر ختم کیا جاتا ہے۔

شاہ غلام بہولن سیوہارویؒ[1]

آپ مراد آباد کے مشہور قادری بزرگ حضرت شاہ بلاقی الملقب بہ شاہ بولن (متوفی ۱۱۳۹ھ) کے پر پوتے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت شاہ بلاقی مراد آبادی تک اس طرح ہے۔

شاہ غلام بولن ابنِ شاہ کریم اللہ ابنِ شاہ رحمت اللہ ابنِ حضرت شاہ بُلاقی قادریؒ۔

آپ نے جدامجد کا سلسلۂ طریقت اپنے ماموں شاہ غلام احمد نہٹوری خلف وخلیفہ حافظ محمد امین کاندھلویؒ ثم نہٹوروی سے اخذ کیا اور انہیں سے مجاز ہوئے۔ آپ کا مولد ومسکن سیوہارہ ضلع بجنور تھا۔

آپ بقول صاحب انوار العارفین، صاحبِ اوقات، خوش اخلاق اور قرآن خواں تھے۔ آپ کا دریائے رشد وہدایت برابر جاری رہتا تھا۔ لوگ کثیر تعداد میں آکر آپ کی خدمت میں فیض رُوحانی حاصل کرتے تھے۔ آپ کی سیر چشمی، سخاوت اور مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ اپنی خانقاہ واقع سیوہارہ میں ہر وارد وصادر کو کھانا کھلاتے۔ آپ کا لنگر خانہ سفرۂ عام تھا جس پر سب دوست اور دشمن شکم سیر ہوتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں آپ کا لنگر خانہ تمام غریبوں اور مسافروں اور فقر وفاقہ کے ہاتھوں پریشان لوگوں کے لئے کُھلا ہوا تھا۔ سب آتے تھے اور کھانا کھاتے تھے۔

---

[1] مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی کا ایک مضمون روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ شاہ صاحب کے حالات اسی سے ماخوذ ہیں۔

Marfat.com

سچ جانیئے انگریز نے جہاں اپنے بہت سے کارنامے" دکھائے ہیں وہاں یہ بھی کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں اپنے کئے ہوئے مظالم کی خونچکاں داستانیں صفحۂ دل و دماغ سے فراموش کرا دیں۔ اخلاف نے خود ہی اُن رنج دہ حالات کو مصلحتاً بُھلا دیا جو تاریخ میں جلی حروف میں لکھے جانے کے قابل تھے۔ نہ صرف بُھلایا، بلکہ اُن تاریخی نوشتوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی جن سے آج واقعات کی ترتیب و تدوین میں مدد ملتی۔ امروہہ میں ایک مردِ مجاہد نے انگریز کے خلاف ایک مثنوی بزبان فارسی لکھی تھی۔ اس مجاہد کے خاندان کے ایک فرد نے اس مثنوی کو ایسا پاٹ کر رکھا کہ اُس کو ہوا تک نہ لگنے دی۔ اس کو یہی خوف رہتا تھا کہ کہیں انگریز کو اس مثنوی کا پتہ نہ چل جائے۔ بالآخر وہ مثنوی آج ہماری نظروں سے غائب ہے پتہ نہیں کیا ہوئی۔ اس کے چند اوراق جو کسی نے نقل کر لئے ہوں گے، راقم الحروف کو ملے۔ مگر چونکہ غیر مرتب ہیں اُن سے کوئی تاریخ مرتب نہ ہو سکی۔ شاہ غلام بولن صاحب کے جو حالات یہاں لکھ رہا ہوں، یہ انوار العارفین مؤلفہ حافظ محمد حسین صاحب چشتی مراد آبادی سے ماخوذ ہیں۔

انگریز نے غلبہ پا کر جو دار و گیر شروع کی تو آپ کو اس الزام میں گرفتار کیا گیا کہ آپ انگریز کے دشمنوں کی مدارات کرتے ہیں اور اُن کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اس گرفتاری کا باعث ایک چغل خور بدبخت تھا جو بظاہر آپ کا مرید و معتقد بنا ہوا تھا، لیکن بہ باطن انگریز کا خیر خواہ تھا۔ مؤلف انوار العارفین نے لکھا ہے کہ اس نام نہاد معتقد کی چغلی کا واقعہ مشہور و معروف اور زبان زد خاص و عام ہے۔ کاش کہ وہ اس واقعہ کی وضاحت خود فرما دیتے۔ اب معلوم نہیں کہ یہ واقعہ لوگوں کو یاد بھی ہے یا نہیں؟

آپ کو گرفتار کر کے جزیرہ انڈمان بھیجا گیا اور وہیں ۲ ربیع الاوّل ۱۲۷۶ھ کو آپ رحمتِ حق سے واصل ہو گئے۔ نور اللہ مرقدہٗ۔ حافظ محمد حسین لکھتے ہیں کہ اس قید میں آپ قیودِ تعلقات سے آزاد اور رضاء مولا میں گرفتار رہتے تھے۔ اور یہ دو شعر

Marfat.com

اُن کے حسبِ حال تھے۔

خُونے نکردہ ایم وکسے را نکشتہ ایم
جُرمم ہمیں کہ عاشقِ روئے تو گشتہ ایم
بجرمِ عشق توام میکشند وغوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشائیست

آپ کی تاریخ وفات میں یہ قطعہ بھی انوار العارفین میں ہے :

زیں دار فنا چو رخت بربست — شد خُلد بریں مقام ومسکن
تاریخ وصال او خرد گفت — ماوائے جہاں غلام بولن
۱۲۷۶ھ

صاحب انوار العارفین نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ غلام بولن ہر سال اپنے جدِ امجد کے مزار کی زیارت کے لئے مراد آباد آتے تھے۔ میں اُن کی زیارت سے مشرف ہُوا ہوں۔

آپ کے فرزند حضرت محمّد عاشق کے متعلق انوار العارفین میں لکھا ہے کہ جوان صالح اور صاحبِ ہمّت مثل پدر بزرگوار ہیں اور رام پور میں سکونت رکھتے ہیں اور وہیں اپنے آباد اجداد کے سلسلہ کو جاری کر رہے ہیں اور تعلیم وتلقین میں مشغول ہیں۔ (انوار العارفین بزبان فارسی صفحہ ۵۴۷ مطبوعہ مطبع صدیقی بریلی)۔

شاہ جہان پور

شاہ جہان پور میں میرٹھ کی بغاوت کی خبریں ۱۵ ؍ ۱۸۵۷ء کو پہنچیں۔ انتظام پر پلٹن ۲۸ مقرر ہوئی۔ مولوی سرفراز علی گورکھپوری اس زمانہ میں شاہ جہان پور میں موجود تھے۔ پلٹن کے سپاہی بھی اُن کے وعظ سے متاثر ہوتے۔ ۲۵ مئی کو عید الفطر کے دن افسروں نے خزانہ لُٹنے کی افواہ سُن کر اسپیشل گارڈ اور سنتری ڈبل کرنے کا حُکم دیا۔ سپاہیوں نے اس کو بے اعتقادی وبے عزّتی پر محمول کیا اور بددل ہو گئے۔

Marfat.com

۳۱ مئی کو انگریز گرجا میں جمع تھے کہ انقلابی فوجوں نے اُن پر یورش کر دی۔ کچھ انگریز زخمی ہوئے۔ پھر انہوں نے دروازہ بند کر لیا اور عورتوں کو گرجے کے مینار پر پہنچا دیا۔ یہاں کا شور سُن کر کچھ انگریز جو قریب ہی رہتے تھے اپنے نوکروں کو ساتھ لے کر گرجا پہنچے۔ ان سب کے پاس بندوقیں اور طمنچے تھے اور یورش کرنے والے صرف تلواریں لئے ہوئے تھے۔ اب سپاہی بھی اپنی بندوقیں سنبھالنے کے لئے دوڑے۔ اس اثنا میں گرجا کے انگریزوں کو نکل جانے کا موقع مل گیا۔ ان کی سواریاں جن پر وہ گرجا آئے تھے، موجود تھیں۔ جنہوں نے کم از کم عورتوں اور بچوں کو نکال لینے میں بڑی مدد کی۔ کچھ سکھ سپاہ بھی پہنچ گئی تھی جس نے حفاظت کا فرض انجام دیا۔ لیکن اب یہ ہنگامۂ کارزار گرجا تک محدود نہ رہا، پوری چھاؤنی میں پھیل گیا۔ چند انگریز افسر مارے گئے اور باقی کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ شاہ جہان پور چھوڑ کر کوئی محفوظ مقام تلاش کریں۔ کچھ انگریزوں نے راجہ پوائیں کے یہاں پناہ لی مگر پورے علاقہ میں اتنا اشتعال پھیل چکا تھا کہ راجہ بھی حفاظت کی ذمہ داری نہ لے سکا۔ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد لوگوں نے زمام حکومت نواب غلام قادر خاں کے حوالہ کی۔

نواب غلام قادر خاں نواب غلام قادر خاں ابنِ حاجی میاں نواب بہادر خاں بانی شہر شاہ جہان پور کے خاندان سے تھے۔ یہ اپنے خاندان میں سب سے بڑے اور با اثر تھے۔ سب لوگ ان کا ادب کرتے تھے۔ جب شاہ جہان پور میں یہ ہنگامہ ہوا تو آپ اپنے پیر سعادت علی شاہ نبیرہ غلام علی ہانسوی کے یہاں تشریف لے گئے تھے۔ جب واپس ہوئے تو اہلِ خاندان، باشندگانِ شہر اور مجاہدین نے قیادت آپ کے سپرد کی۔ آپ کے پیرزادگان رؤف میاں و ظہور میاں پسران شاہ سعادت علی نے بھی ہمت بڑھائی۔ نواب خان بہادر خاں نے سند نظامت دی۔ نواب قادر علی اُن کے حق میں درست بردار ہو گئے۔ لیکن شریک و مددگار کی

Marfat.com

حیثیت سے تحریک میں شامل رہے۔ مجاہدین نے خوب زور پکڑا۔ نواب غلام قادر خاں نے بہت اچھی طرح ریاست کا انتظام کیا۔ قریب ایک سال ان کا دور رہا۔ جنرل بخت خاں، نواب تفضل حسین، شہزادہ فیروز شاہ، نواب اسمٰعیل، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد بریلوی، شاہ احمد اللہ اور نانا راؤ وغیرہ شاہجہانپور جمع ہو گئے۔

معرکۂ کارزار ۲۸ اپریل ۱۸۵۸ء کو نواب غلام قادر خاں نے پچپوریا کے گھاٹ پر انگریزی فوج کے چھکے چھڑا دیئے۔ کافی نقصان پہنچایا۔ شہر کے مورچوں کی کمان مولانا شاہ احمد اللہ صاحب کے سپرد تھی۔ شاہ صاحب نے لگاتار ایسے حملے کئے کہ انگریز جیل خانہ کے تھوڑے سے علاقے میں محصور رہنے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۸ء کو انگریز محصورین کی حالت نازک ہو چکی تھی کہ پہلے جنرل جانسن تازہ دم فوج لے کر پہنچ گیا۔ پھر بریلی پر مکمل قبضہ کے بعد ۱۸ مئی کو سر کالن کیمبل فاتحانہ حوصلہ مندیوں کے ساتھ شاہجہان پور پہنچا۔ شاہ صاحب موقع کی نزاکت محسوس کر کے اپنے تمام ہمراہیوں کے ساتھ قصبہ محمدی چلے گئے۔

محمدی میں قیام حکومت محمدی میں ان کی حکومت قائم ہو گئی۔ جنرل بخت خاں مولوی سرفراز علی اور نانا راؤ پیشوا کابینہ میں اور کونسل میں مولوی لیاقت علی الہ آبادی ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا فیض احمد بدایونی تھے۔ فیروز شاہ نے اوّل اختلاف کیا پھر شرکت کر لی۔ شاہ صاحب کا خطبہ سکّہ جاری ہوا۔ آپ کے سکّہ پر یہ شعر کندہ ہوتا تھا ؎

سکّہ زد بر ہفت کشور خادمِ محراب شاہ
حامیٔ دینِ محمّد، احمد اللہ بادشاہ

شاہجہان پور سے بڑھ کر سر کالن کیمبل نے قصبہ محمدی پر حملہ کر دیا۔ انگریزی فوج کی طاقت زیادہ تھی۔ شاہ صاحب کو ناکامی ہوئی۔ محمدی چھوڑنا پڑا۔ کچھ لوگ نیپال کی طرف چلے گئے۔ ۵ جون کو راجہ پوائیں نے شاہ صاحب کو اپنے یہاں بلوایا اور دھوکہ سے آپ کو گولی کا نشانہ بنوا دیا۔ (تفصیل شاہ صاحب کے تذکرہ

Marfat.com

میں ملاحظہ فرمائی جائے)۔

دیگر قصبات کی کیفیت باشندگانِ شہر تلہر نے بھی تحریکِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ نواب بہادر خاں نے غلام محمد خاں کو ناظمِ تلہر اور اُن کے بھائی کفایت اللہ خاں کو تحصیل دار مقرر کیا۔ میراں پور کٹرہ میں فیض محمد خاں اور غلامی خاں نے غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی پوری کوشش کی۔

جلال آباد میں احمد یار خاں تحصیل دار نے تحریک کو قوت دی۔ بعد کو یہ ناظم ہو گئے۔ بہت سرگرمی سے انتظام کیا اور بریلی سے ایک فوج زیر کمان نواب اسمٰعیل خاں (نواب فتح گڈھ) بُلا کر راجپوتانہ کھنڈر کو مطیع کیا۔ جنگِ پچیوریہ میں یہ شریک تھے۔ ۲۸ر اپریل ۱۸۵۸ء کو جب انگریز جلال آباد پر قابض ہو گئے، تو ان کو علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔

انتقامی کارروائی اکتوبر ۱۸۵۸ء میں پورے ضلع شاہ جہان پور پر مکمل طور سے انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ انگریزی حکومت نے تمام سردار اور رؤساء اور علماء کو عبرت ناک سزائیں دیں۔ نواب غلام قادر خاں اودھ چلے گئے۔ وہیں بٹول کی پہاڑیوں میں انتقال ہو گیا۔ نواب قادر علی خاں، عبدالرؤف خاں، قاضی سرفراز علی کو حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ غلام محمد خاں اور کفایت اللہ خاں تلہری بھی کالے پانی بھیجے گئے۔ جائدادیں ضبط ہوئیں۔ احمد یار خاں جلال آبادی گرفتار ہوئے، اور پھانسی دی گئی۔ وسیع مکانات، حویلیاں، محلات، قلعہ ڈھائے گئے۔ غرض کہ کوئی ایسا ظلم نہ تھا جو روا نہ رکھا گیا ہو۔

حرفِ آخر روہیل کھنڈ نے اگرچہ دلی اور میرٹھ سے چند روز بعد جنگِ آزادی میں حصہ لیا لیکن اس قوت سے حصہ لیا اور پھر جتنی دیر تک قربانیاں پیش کرتا رہا کہ پورے ہندوستان کا کوئی خطہ بھی اس کی نظیر نہیں پیش کر سکا۔ (ماخوذ از مضمون محترم محمد ایوب صاحب بی اے و محاربۂ عظیم وغیرہ)

Marfat.com

چند نامور علماء اور جرنیل

مولانا احمد اللہ شاہ شہیدؒ

عزم و ہمّت، حمیّتِ ملّی اور غیرتِ وطن کا وہ شعلہ سوالہ جو "چنیا پٹن"[1] سے اُٹھا، دہلی اور آگرہ میں چمکا، سرزمین اودھ میں چٹخا، روہیل کھنڈ میں شعلہ افشاں ہوا۔ پھر اسی کے ایک گوشہ میں محوِ سکون ہو گیا۔ اس کو ۱۸۵۷ء کی جانِ مضطرب کہا جائے یا شہدار ۱۸۵۷ء کا سرتاج، دونوں درست۔

اپنے تو اپنے غیر بھی[2] اس کے علم و عمل، قوّتِ روحانی اور جرأتِ ایمانی کے معترف ہیں۔

---

[1] واقعات ۱۸۵۷ء کے ممتاز مؤرخ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی جن کی مشہور اور مسلّم تصنیفات سے اس مضمون میں خوشہ چینی کی گئی ہے، چنیا پٹن کی تاریخ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"پامان گھاٹ" کے راجہ رانل کے زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں نے کاسری کے زمیندار اور اُس کے دیوان سے اتحاد و اتفاق کر کے دریائے شور کے کنارے تجارت گاہ تعمیر کرنے کے لئے ایک موضع "مکدراس کویم" حاصل کیا۔ جو تعلقہ "پونا ملی" سے متعلق تھا۔ راجہ نے اس کی سند طلائی لوح پر کندہ کرا کے کارندوں کے حوالہ کی اور ایک ہزار دو سو "ہون" سالانہ اس کا پیش کش مقرر کیا، اور موضع کی مناسبت سے اس کا نام "مدراس" رکھا۔ کچھ دنوں بعد چند مواضع اور حاصل کر لئے گئے۔ چم، نایک، کویم، اروکم اور پیل پنہ۔ یہ بھی تعلقہ پونا ملی سے متعلق تھے۔ چم، نایک، کویم چونکہ مدراس کی آبادی میں شامل کر لئے گئے تھے، اس لئے قدیم نام کی مناسبت سے اس کا نام "چنیا پٹن" رکھا گیا۔

[2] جی، ڈبلیو، فارسٹر کی شہادت ملاحظہ فرمائیے:

وہ عالم باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھا۔ روحانی طاقت کی وجہ سے صوفی تھا اور جنگی مہارت کی وجہ سے وہ سپاہی اور سپہ سالار تھا۔ احمد شاہ نام تھا ظلم طبیعت میں نہیں تھا۔ ہر انگریز اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ (ہسٹری دی انڈین نیوٹی)۔

Marfat.com

اصل نام، ولدیت اور سلسلۂ نسب تاریخِ آزادی کے ہیرو، وطنِ عزیز کے بہادر فرزند، فدائے ملک و ملت، سلطان حیدر علی عرف سلطان ٹیپو (شہید) کے ایک مصاحب، سیّد محمد علی نواب چنیاپٹن تھے۔ انہیں نواب محمد علی کے یہاں ۱۲۰۴ھ میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ باپ کے نام کی مناسبت سے احمد علی نام رکھا گیا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اصل نام سے شہرت بہت کم ہوئی پہلے ضیاء الدین عرف رہا، دلاور جنگ خطاب۔ اور جب یہ لڑکا عمر عزیز کی تقریباً چھ دھائیاں طے کرنے کے بعد جد و جہد آزادی کا علمبردار ہوا تو احمد اللہ شاہ کہلانے لگا۔ رحمۃ اللہ۔

سیّد محمد علی، سیّد جلال الدّین عادل کے فرزند ارجمند تھے۔ سیّد جلال الدّین جو خاندانِ قطب شاہی (فرمانروائے گولکنڈہ) کی یادگار[1] تھے۔ ایک طرف چنیاپٹن کے رئیس اور نواب تھے تو دوسری جانب ایک باخدا بزرگ تھے جو اپنے زمانہ کے ولی اور قطب سمجھے جاتے تھے۔

تعلیم و تربیت اور طبعی رجحانات خاندانی عظمت کے بموجب آپ کی تعلیم و تربیت امیرانہ ہوئی اور اس زمانہ کے رواج کے مطابق علومِ دینی کے ساتھ فنونِ حرب کا بھی ماہر بنایا گیا۔ ہوش سنبھالا تو طبیعت کا میلان اوراد و وظائف کی طرف تھا۔ نماز، روزہ اور احکامِ شریعت کے سخت پابند تھے۔ ہر عمل میں سُنّتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اتّباع ضروری سمجھتے تھے۔ والدین سے ٹیپو سلطان کی شہادت اور سلطنت خداداد کی تباہی کا حال سُنا تو حکومت اور مال و دولت سے

---

[1] ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر نے "گولکنڈہ" پر قبضہ کر کے قطب شاہی خاندان کا خاتمہ کیا۔ آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ تھے جو عبداللہ قطب شاہ کے داماد تھے۔ جب اس خاندان میں حکومت نہ رہی تو ابوالحسن کے پوتے "چنیاپٹن" جا بسے اور وہاں کے نواب کہلائے۔ اس خاندان کے نامور بزرگ سیّد جلال الدین عادل تھے۔ رحمۃ اللہ (مفتی انتظام اللہ شہابی)۔

Marfat.com

دل بیزار ہو گیا۔[1]

سیاحت و بیعت جوانی کا آغاز تھا کہ سیاحت کا شوق ہوا۔ پہلے حیدرآباد گئے۔ پھر یورپ کا سفر کیا۔ انگلستان جا کر ملکہ وکٹوریہ کے مہمان ہوئے۔ وہاں سے واپس ہو کر عربی ممالک کا دورہ کیا۔ حج بیت اللہ شریف سے مشرف ہوئے۔ پھر ایران ہو کر چمن کے راستہ سے ایک عرصہ کے بعد ہندوستان پہنچے۔ یہاں "سانبھر" کے علاقے میں ڈیرے ڈال دیئے۔[2]

پھر مراحلِ سلوک طے کرنے اور رُوحانی کمالات حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی حضرت قربان علی شاہ کی شہرت سُن کر جے پور گئے۔ ریاضت و مجاہدہ اور چلّہ کشی کے انوار پہلے سے موجود تھے۔ بیعت نے فوراً ہی نسبت مشائخ کا کیف پیدا کر دیا۔ حضرت قربان علی شاہ صاحب نے جس طرح رُوحانی فیوض و کمالات سے مالا مال کیا، اصلاحِ صوفیاء اور تنظیمِ مجاہدین کا فرض بھی آپ کے ذمّہ کر دیا، اور ہاں محفلِ سماع کی بھی اجازت دے دی۔[3] بہرحال مولانا احمد اللہ شاہ صاحب جے پور سے ٹونک تشریف لے گئے نواب وزیرالدولہ سے مجلسیں گرم رہیں۔

ٹونک کی آب و ہوا آپ کے ذوقِ سماع کے موافق نہیں تھی۔[4] مگر ذوقِ جہاد کے لئے سب سے موافق آب و ہوا اسی ٹونک کی تھی۔[5] جو حضرت سیّد احمد شہید کے

---

[1] مولوی احمد اللہ شاہ اور پہلی جنگِ آزادی، از مفتی انتظام اللہ شہابی۔ [2] ایضاً ص۱۰۔ [3] ایضاً ص۱۰۔ [4] نواب وزیرالدولہ نے حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیلؒ صاحب شہید سے تربیت پائی تھی۔ یہ بزرگ سماع کے سخت مخالف تھے۔ پھر نواب صاحب مع صوف حضرت مولانا سیّد نصیرالدین صاحب دہلوی سے بیعت ہوئے تھے۔ مولانا نصیرالدین صاحب بھی حضرت سید صاحب شہید سے تربیت یافتہ اور اُن کے خلفاء میں سے تھے۔ جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ [5] منشی ذکاء اللہ خاں صاحب کی شہادت پہلے گذر چکی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے جہاد میں شریک ہونے والے وہابی مجاہدین سب سے زیادہ ٹونک سے آئے تھے جن کی تعداد دو ہزار تھی۔

Marfat.com

پس ماندگان کا مرکز تھا اور ابھی چند سال ہوئے، حضرت مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی کا جہادی قافلہ، وزیر الدولہ کے دماغ کو سرشار کرتا ہوا یہاں سے گذرا تھا۔

حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب ٹونک سے رخصت ہو کر گوالیار پہنچے یہاں ایک بزرگ محراب[1] شاہ قلندر تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن کے مشائخانہ اطوار نے آپ کے دل کو موہ لیا۔ یہ قلندر صاحب بھی عجیب تھے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر، مگر راہ و رسمِ انقلاب سے باخبر۔ ظالم فرنگی کے دشمن اور استخلاصِ وطن کے دلدادہ۔

مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب نے قلندر صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونا چاہا تو داخلہ کی شرط یہ تھی کہ جہاد کی سوکھی رگوں میں تازہ خون دوڑائیں گے۔ اور وطنِ عزیز کو انگریزوں سے نجات دلائیں گے۔ شاہ صاحب نے بسر و چشم یہ شرط منظور کی اور سلسلۂ قادریہ میں آپ سے بیعت ہو کر خرقۂ خلافت حاصل کر لیا[2]۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ کتنے عرصہ آپ نے گوالیار میں قیام کیا۔ البتہ اس موقعہ پر یہ فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ تقریباً تیس سال پہلے جب حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ جہاد کے لئے روانہ ہوئے تھے تو سب سے پہلے تقریباً دو ہفتہ تک آپ کا قیام یہیں رہا تھا۔ پھر راجہ ہندو راؤ اسی ریاست کے مدار المہام تھے جن کے نام سید صاحب نے مرکزِ جہاد سے خط لکھ کر اُن کو جنگِ آزادی کے لئے اُبھارا تھا۔

دہلی مرکزِ سیاست اور اس کی موجودہ حالت جہادی قلندر حضرت محراب علی شاہ کے دستِ مبارک پر عہدِ جہاد کرنے کے بعد عزم و عمل کا وقت آیا تو قدرتی طور پر حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب کی نظر دہلی کی طرف اٹھی کیونکہ:

(۱) اگرچہ انگریزی اقتدار کا مرکز کلکتہ اور اس کا فورٹ ولیم تھا مگر ہندوستانیوں

---

[1] آپ گوالیار کے ایک رئیس کے یہاں پیادوں میں ملازم تھے۔ رئیس کا نام سردار ستولے تھا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص۹)۔ [2] مولوی احمد شاہ اور مفتی انتظام اللہ صاحب۔

Marfat.com

کی سیاست کا مرکز اب بھی دہلی تھا۔

(۲) یہاں مغل سلاطین کا جانشین موجود تھا جو سیاسی لحاظ سے مفلوج و مجبور ہونے کے باوجود اُن بیشمار ہندوستانیوں کے جذبات پر حکمران تھا جو مغلِ اعظم ہی کے کسی وارث کو سلطنت و حکومت کا صحیح مستحق سمجھتے تھے۔

(۳) یہی دلّی تھی جس کی ولی اللّٰہی تربیت گاہ میں "رُوحِ انقلاب" نے جنم لیا تھا۔ جہاں شاہ عبدالعزیز صاحب کی تربیت گاہِ سیاسی میں وطنِ عزیز کو نجات دلانے کی تحریک پروان چڑھی تھی اور اُس نے اپنا دورِ شیرخوارگی پورا کیا تھا۔ جہاں جنگِ حرّیت کے سب سے علمبردار سیّد احمد شہید کو پرچمِ قیادت عطا ہوا تھا۔ جہاں سے چند سال پہلے مولانا نصیرالدّین صاحب دہلوی کی زیرِ سیادت سرفروشانِ حرّیت کا آخری قافلہ روانہ ہوا تھا۔

(۴) یہی دلّی تھی جہاں بقول مولانا عبیداللہ سندھی اب بھی ولی اللّٰہی تحریک کی وہ مرکزی جماعت موجود تھی جس کی رہنمائی حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب اپنی ہجرت گاہ مکّہ معظمہ سے فرما رہے تھے۔

اس قسم کی متعدد وجوہات تھیں جن کی بنا پر مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کا قدم سب سے پہلے دہلی کی سمت اُٹھنا ضروری تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن اس وقت کی صورتِ حال نے جو نزاکتیں پیدا کر دی تھیں، اُن کا احساس مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کو گوالیار میں نہیں ہو سکا یا پوری طرح نہیں ہو سکا۔ مثلاً

(۱) گذشتہ چالیس سال میں جس طرح دہلی حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ، حضرت مولانا نصیرالدّین دہلوی شہیدؒ، حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی تحریکات کا مرکز رہی۔ اس کا تقاضا تھا کہ بقول مولانا عبیداللہ سندھی:

"یہاں ریزیڈنٹ کی نگاہ بہت سخت ہو۔"

Marfat.com

(۲) شاطرانِ انگریز یہ طے کر چکے تھے کہ بہادر شاہ پر بادشاہت کے موجودہ طمطراق کو بھی ختم کر دیا جائے۔ لال قلعہ جو عظمتِ ہندوستان کا آخری نشان سمجھا جاتا تھا، اس کو بہادر شاہ کے جانشین سے خالی کرا لیا جائے۔ اس کے لئے جو تدبیریں عمل میں لائی جا رہی تھیں اور جس طرح شاہزادوں سے ساز باز کا سلسلہ جاری تھا، اس کا یہی تقاضا تھا کہ ریزیڈنٹ کی نگاہیں سخت اور محتاط رہیں۔

(۳) حضرت مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کے دہلی تشریف لانے کا سال معین نہیں ہو سکا۔ قیاس[1] یہ ہے کہ ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء میں آپ دہلی تشریف لائے ہوں گے یعنی تقریباً ۱۲۶۴ھ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پنجاب میں سکھ حکومت کو ختم کیا جا رہا تھا۔ جس سے پورے پنجاب میں بد دلی پھیلی ہوئی تھی۔ علاقہ ملتان کی فوجیں زیرِ قیادت دیوان مول راج انگریزوں سے جنگ کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ پٹھانوں نے زیرِ قیادت سلطان محمّد خاں و دوست محمد خاں علمِ بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ بالاکوٹ کا رئیس سیّد ضامن شاہ انگریزوں کے دوست گلاب سنگھ مہاراجہ کشمیر سے برسرِ پیکار تھا اور اُس کی امداد کے لئے مرکز صادق پور سے مجاہدین کا ایک دستہ مولانا ولایت علی صاحب کی زیرِ قیادت بالاکوٹ پہنچ چکا تھا اور شہادتِ مجاہدانہ کی پُرانی تمنّائیں سرفروشی سے پوری کر رہا تھا۔ اور جیسا کہ اسی سلسلہ کی تیسری جلد میں بیان کیا گیا ہے بقول مسٹر دیبی پرشاد مصنّف گلشنِ پنجاب، پورے ہندوستان بالخصوص شمال مغربی صوبہ (پنجاب و فرنٹیئر و کشمیر) میں غلغلہ مچ رہا تھا۔

---

[1] چند صفحات بعد آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ آگرہ میں مولانا سید احمد اللہ شاہ کے ہم نواؤں پر ایک مقدمہ چلایا گیا تھا۔ مارچ ۱۸۵۰ء میں ابتدائی عدالت سے اس کا فیصلہ سُنایا گیا۔ مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب دہلی سے آگرہ تشریف لے گئے تھے۔ آگرہ پہنچ کر حلقۂ اثر قائم کرنے اور اس درجہ رسوخ حاصل کرنے میں (کہ حکومت اُن کے اُن ہمنواؤں پر جو حکومت کے اعلیٰ منصبوں پر فائز تھے مقدمہ چلانے پر مجبور ہوئی) تین چار سال یقیناً صرف ہوئے ہوں گے۔

Marfat.com

ان نزاکتوں کے علاوہ سیاسی مصلحتوں کا بھی تقاضا یہی تھا کہ جو تحریک موجودہ حالات کے مطابق چلائی جائے، اُس کا مرکز دہلی نہ ہو۔

اسلامی جہاد کی نوعیت سے جو تحریک سید احمد شہیدؒ، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے بعد مولانا نصیر الدّین صاحب دہلویؒ رحمۃ اللہ علیہ نے چلائی تھی، اس کی ناکامی ثابت ہو چکی تھی، اب ایک عوامی تحریک کی ضرورت تھی۔ دہلی اگرچہ مرکزِ سیاست تھی، مگر یہاں تحریکِ حرّیت ایک خاص حلقہ سے مخصوص تھی۔ یہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں اور مریدوں کا حلقہ تھا۔ بے شک اس حلقہ کے اثرات پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے مگر شاطرانِ برطانیہ نے وہابیت کے جس الزام سے حضرت سید احمد صاحب کی تحریک کو سرحد میں ناکام کیا تھا۔ جیسا کہ شاندار ماضی کی جلد دوم میں واضح کیا جا چکا ہے وہ الزام اگرچہ قطعاً بے بنیاد تھا مگر کچھ اپنوں کی ناعاقبت اندیشی اور زیادہ تر کلکتہ کے سرکاری دارالافتا نے مسلسل پراپیگنڈہ کر کے اس بیس سال کے عرصہ میں اس الزام کو اس حد تک حقیقت کا درجہ ضرور دے دیا تھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ یا حضرت سید احمد شہید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق رکھنے والا حلقہ صرف سیاسی نہیں رہا بلکہ مذہبی نقطۂ نظر سے ایک مکتبۂ خیال بن گیا تھا۔

اب تدبّر اور سیاسی دُور اندیشی کا مطالبہ یہ تھا کہ آئندہ تحریک کی دعوت ایسے انداز سے دی جائے کہ جو عناصر اس مکتبۂ خیال سے تعلّق نہیں رکھتے وہ بھی تحریک سے وابستہ ہوں اور مکتبۂ خیال کی حدبندی ان کی شرکت یا قیادت کے راستہ میں حائل نہ ہو سکے۔ اس مصلحت کے پیش نظر حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب بہترین شخص تھے جن کی قدرت کے پوشیدہ اشاروں نے خود بخود دہلی کے سیاسی مدبّرین کے پاس پہنچا دیا تھا۔

دہلی کے بعد آگرہ شاہ جہاں آباد (دہلی) اور اکبر آباد (آگرہ) کا پُرانا رشتہ اگرچہ اب کمزور ہو چکا تھا مگر تعاون اور اعتمادِ باہمی کی رُوح ابھی فنا نہیں ہوئی تھی، اور

Marfat.com

اگرچہ چند سال پہلے آگرہ ملّی رجحانات اور قومی جذبات کے لحاظ سے ایک شہرِ خموشاں[1] بن چکا تھا مگر جب سے وہ برطانوی صوبہ کا دارالحکومت بنا تھا اس میں پھر چہل پہل

---

[1] مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی آگرہ کے قدیم باشندے تھے۔ آپ سے زیادہ آگرہ کے حالات اور ماضی قریب کی تاریخ سے کون واقف ہو سکتا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں :-

جاٹوں اور مرہٹوں کے زمانہ میں آگرہ کی حالت بیحد زبوں ہو چکی تھی۔ مُلّا ولی محمد شاہ کی درس گاہ محلّہ بالوگنج میں تھی۔ مولوی شمس الضحیٰ اور مولوی بدرالدجیٰ اور میر اعظم علی اعظم اسی درس گاہ کے فارغ التحصیل عالم تھے۔ مولوی محمد معظم جن کے مکتب میں مرزا غالب نے پڑھا۔ میاں نظیر کا مکتب محلہ مائی تھان میں تھا۔ یہاں ہندوؤں کے چند بچے تعلیم پاتے تھے۔ حکیم غلام قطب الدین خاں باطن (صاحبِ نغمۂ عندلیب) و خلیفہ گلزار علی اسیر یہ اُن کی درس گاہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ مولوی امجد علی اصغر کا مدرسہ محلہ تاج گنج میں تھا۔ یہ تھی کُل کائنات اکبرآباد کے درس و تدریس کی۔ گنتی کے چند لوگ پڑھے لکھے تھے قاضی سید باسط علی خاں ہمدانی آگرہ کے قاضی القضاۃ تھے۔ مرہٹوں نے اُن کو معزول کر کے للّو بھٹ کو قاضی القضاۃ بنا دیا۔ باسط علی خاں مرافعہ کرنے شاہ عالم ثانی کے پاس دلّی پہنچے۔ البتہ مرہٹوں نے کچھ خانقاہوں کو جاگیریں ضرور دیں۔ بہرحال حکمران طبقہ کا اثر یہ تھا کہ مسلمان شعائرِ اسلامی سے دُور ہٹ گئے تھے۔ نماز روزہ کی طرف سے تغافل برتا جاتا تھا۔ متولیانِ مسجد جامع اکبری نے مسجد کی زیریں دکانیں ہندوؤں کے ہاتھ رہن رکھ دی تھیں۔ جامع مسجد کا مصرف صرف یہ رہ گیا تھا کہ اس کے صحن میں کبوتروں کی قلقلیں کھڑی کی جاتی تھیں اور سوتی رسی بٹنے کے کرگھے لگے ہوئے تھے۔ بیچ کے در میں چند چٹائیاں پڑی رہتی تھیں۔ گنتی کے لوگ نماز پڑھتے تھے۔ جمعہ کی نماز میں بیس پچیس مسلمان شریک ہوتے تھے۔ امیرالامراء ذوالفقارالدولہ نجف خاں کے زمانہ سے البتہ تعزیہ داری کا رواج بڑھ گیا تھا۔ تعزیوں پر عرضیاں چڑھتیں۔ چڑھاوا صدہا روپیہ کا چڑھتا۔ تعزیہ کا ساتویں اور نویں کی شب میں "ناف شہر" کا گشت کرایا جاتا تھا۔ عمائد شہر باندھ کر ساتھ ساتھ تعزیہ کے چلتے اور کاندھا دیتے۔ دسویں کی صبح الوداع پڑھی جاتی۔ ہزارہا مسلمان عورت مرد جمع ہوتے تھے حتیٰ کہ مولانا غلام امام شہید الوداع پڑھتے تھے۔ بچوں کو تعزیہ پر ہن رکھا جاتا وغیرہ وغیرہ۔ مسلمانوں میں

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

ہوگئی تھی اور ذی استعداد صاحبِ فکر علماء و فضلاء کا ایسا مجمع اس کو میسر آگیا تھا جس کی نظیر کوئی دوسرا شہر مشکل سے پیش کر سکتا تھا۔ ان علماء میں اگرچہ زیادہ وُہ تھے جو حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز سے تلمذ اور (بالواسطہ یا بلاواسطہ) شاگردی کا تعلق رکھتے تھے۔ مگر غالباً ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو ایک مکتبۂ خیال کے پابند کی حیثیت سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ یا حضرت سیّد احمدؒ شہید سے وابستہ ہو۔

مختصر یہ کہ مختلف مکاتبِ خیال اور مختلف سلسلۂ تلمذ کے اور فضلاء یہاں رونق افروز تھے اور آگرہ گلہائے رنگا رنگ کا گلدان بنا ہوا تھا۔ ایک عوامی تحریک کا لالہ زار ایسا ہی گلستان بن سکتا تھا۔ دہلی کے اربابِ بصیرت نے اسی مصلحت سے آگرہ کو منتخب کیا اور حضرت مولانا سیّد احمد اللہ صاحب شہید کی عنانِ توجّہ دہلی کے آگرہ کی طرف منعطف کی۔

لیکن آگرہ حضرت مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کے لئے بالکل اجنبی شہر تھا۔ اس کے لئے ایک عرصہ درکار تھا کہ مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب آگرہ پہنچ کر اعتماد حاصل کریں اور وہاں کے سربراہوں اور کلیدی حضرات تک پہنچ سکیں۔

حضرت مولانا مفتی صدرالدّین صاحب جیسا اعلیٰ مدبّر جس نے حضرت سیّد احمد اللہ شاہ صاحب کی سیاسی تگ و دو کے لئے آگرہ کا میدان منتخب فرمایا۔ آپ نے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) عام طور سے ہندوانی رسوم کی گرم بازاری تھی۔ دیوالی اور ہولی میں برابر ہندوؤں کے شریک ہوتے۔ اس کیفیت کا پورا نقشہ میاں نظیر نے اپنی نظمیات میں کھینچا ہے۔ اُن کے پوتے سوانگ بھرتے تھے اور شہر کا گشت لگاتے۔ سیتلا کے مندر کے ہندو اور مسلمان ہر دو مجاور اور مہنت چڑھاوے کے برابر کے حصّہ دار ہوتے تھے۔ یہی حال کمال خاں کے کنویں کا تھا۔ یہ تھی عام حالت مسلمانوں کی صدر نظامت ۱۸۲۵ء میں الہ آباد سے آگرہ آیا تو علماء جو وابستگانِ صدر تھے وہ بھی ساتھ آئے۔ تب یہاں علماء کی صورتیں نظر آنے لگیں۔ پہلے جمعہ میں مولوی سراج الاسلام پیش کار نے نماز جمعہ پڑھائی تو اسّی آدمی اسمیں شریک تھے۔ تمام شہر میں یہ شہرہ تھا کہ عظیم الشان جمعہ ہوا (مولوی احمد اللہ شاہ از مفتی انتظام اللہ شہابی ص ۴۶۲)

Marfat.com

خود ہی اس کی ذمہ داری بھی لی کہ حضرت مولانا شاہ احمد اللہ صاحب جیسے ہی آگرہ پہنچیں، بلا کد و کاوش کلیدی حضرات تک اُن کی رسائی ہو جائے اور یہ اُن کا اعتماد حاصل کرلیں۔ چنانچہ حسب روایت مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی :

مفتی انعام اللہ خان بہادر جو محکمہ شریعت کے مفتی رہ چکے تھے، اب سرکاری وکیل تھے۔ حضرت آزردہ (مفتی صدرالدین صاحب آزردہ) کے خط کے ذریعہ شاہ صاحب (مولانا احمد اللہ شاہ صاحب) اُن کے یہاں آکر مقیم ہوئے۔ اُن کا گھر علماء کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مفتی صاحب کے صاحبزادے مولوی اکرام اللہ صاحب "تصویر الشعراء" مرید ہوئے۔

مجلسِ عُلماء علماء و فضلاء کرام کا یہ گلدستہ جس کی شیرازہ بندی اب تک علمی اور ادبی ذوق نے کر رکھی تھی، مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے پہنچنے کے بعد اُس میں سیاسی رنگ پیدا ہونا شروع ہوا، اور مجلس کی شکل میں اس اجتماع کی تشکیل کی گئی اس کے ارکان کی مختصر فہرست ملاحظہ ہو۔

مولوی شیخ اعتقاد علی بیگ صاحب، مولوی امام بخش صاحب، سیّد باقر علی صاحب ناظم محکمہ دیوانی، مولوی نور الحسن صاحب، سیّد مراتب علی صاحب، مولوی خواجہ تراب علی صاحب، سیّد حسن علی صاحب، رحمت علی صاحب، مفتی ریاض الدین صاحب، مولوی غلام جیلانی صاحب، غلام مرتضیٰ صاحب، شیخ محمد شفیع صاحب، مولوی عبد الصمد صاحب، مولوی منصب علی صاحب، مولوی محمد عظیم الدین حسن صاحب، رسول بخش صاحب، باسط علی صاحب، مومن علی صاحب، محمد قاسم صاحب داناپوری، معین الدین صاحب، مولوی کریم اللہ خاں صاحب صدر الصدور، قاضی محمد کاظم علی صاحب، تاج الدین صاحب، طفیل احمد صاحب خیرآبادی، مولانا غلام امام شہید، مفتی عبد الوہاب صاحب گوپامئوی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب، مولوی فیض احمد صاحب بدایونی، مفتی انعام اللہ صاحب۔

Marfat.com

یہ حضرات صدارت نظامت کے مختلف عہدوں پر فائز تھے، یا وکلاء تھے، جنہوں نے اس مجلس کی رکنیت منظور کی، اور دامے درمے قدمے شاہ صاحب کی تائید و اعانت شروع کر دی۔

حلقۂ ارادت | حضرت سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کے حالات شاندار ماضی جلد دوم میں گذر چکے ہیں۔ انہیں کا نمونہ حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب کے حالات میں بھی نظر آتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ جو گرمی وہاں صرف ذکر اللہ سے پیدا کی جاتی تھی، شاہ احمد اللہ صاحب کے یہاں اس کے لئے "سماع" سے بھی کام لیا جاتا تھا۔[1]

بہر حال حضرت سید احمد اللہ شاہ صاحب کے حلقۂ بیعت و ارادت نے وسعت اختیار کی۔ محفلِ سماع خود ایک کشش رکھتی ہے۔ یہاں علم و فضل کے ساتھ قوتِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ جہاں آپ کے وعظ کا اعلان ہوتا، ہندو مسلمانوں کا بے پناہ ہجوم ہو جاتا۔ اب ایک وقت ذکر و شغل اور مراقبہ کا سلسلہ ہوتا، دوسرے وقت محفلِ سماع کی گرمجوشی[2]۔ کبھی عام جلسے ہوتے جن میں دس دس ہزار کا اجتماع ہوتا۔ سننے والے بے قرار ہو جاتے۔ ہر شخص قربان اور فدا ہونے کا عہد کرتا۔ دوسرے تیسرے روز نمازِ عصر

---

[1] مولوی احمد اللہ شاہ از مفتی انتظام اللہ شہابی ص۱۵۔ [2] مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی راوی ہیں کہ شاہ صاحب کے یہاں محفلِ سماع کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ مریدین پر توجہ ڈالی جاتی۔ ادھر لوہے کے کڑاہوں میں کوئلہ کے انگارے بھرے رہتے تھے۔ وہ مجلس میں پھیلا دیئے جاتے تھے۔ اُن پر مریدین لوٹتے تھے۔ آگ اُن پر بالکل اثر نہ کرتی تھی۔ میری پھوپھی محترمہ عمدۃ النساء زوجہ خواجہ غلام غوث خاں بہادر ذوالقدر بیخبر الہ آبادی فرمایا کرتی تھیں کہ اُن کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر الہام اللہ مرحوم پر شاہ صاحب کی خاص توجہ تھی اور وہ اُن کے مرید تھے۔ وہ بھی شریکِ محفلِ سماع ہوتے اور دہکتے ہوئے کوئلوں پر مثل ماہیِ بے آب تڑپتے، مگر جسم پر نشان تک نہ پڑتا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص۲۳)۔

Marfat.com

کے بعد قلعہ اکبر آباد کے میدان میں فنِ سپہ گری کی مشق کرائی جاتی۔ خود شاہ صاحب بہترین نشانہ باز تھے۔ تلوار کے ہاتھ بھی بہت جچے تُلے ہوتے تھے۔

آپ کہیں تشریف لے جاتے تو مریدین کا ہجوم ساتھ ساتھ رہتا۔ آگے آگے ڈنکا بجتا۔ اس لئے آپ کو ڈنکے والا پیر یا ڈنکا شاہ کہا جاتا۔

وہی آگرہ جس کی جامع مسجد کو جمعہ کے روز بمشکل بیس پچیس نمازی نصیب ہوتے تھے۔ اب اس کی ایک ایک مسجد میں سینکڑوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ جو مسجدیں عرصہ سے ویران تھیں، اب اُن کی آبادی پر لوگ حیرت کرتے تھے۔ آگرہ شہر اس طرح مسخر ہوگیا تو آپ نے مضافات کا قصد کیا۔ جہاں آپ پہنچتے، مریدین کی جماعت ساتھ رہتی اور ایک ہی دورہ میں اس کا رنگ بدل جاتا۔ عوام کو یاد ہو یا نہ یاد ہو، مگر انگریز کو حضرت سید احمد شہیدؒ کا دَور یاد تھا۔ حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ کے اس دَور میں وہی رنگ دیکھا تو تیس سال پہلے کی تمام تاریخ سامنے آگئی۔

حضرت شاہ صاحب سے تعلق رکھنے والوں پر مقدمہ انگریز بہادر نے حضرت شاہ صاحب پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ یا بقول مولوی سید طفیل احمد صاحب مرحوم پولیس نے اُن کو (مجسٹریٹ کے حکم پر) گرفتار کرنے سے انکار کر دیا[1]۔ البتہ وہ جماعت جو انگریزوں سے ملازمت کا تعلق رکھتی تھی اور اب شاہ صاحب سے وابستہ ہوگئی تھی اور انہیں کے ذریعہ حضرت شاہ صاحب آگرہ میں قیام کر کے اپنا اثر جما سکے تھے، اُس پر رشوت کا مقدمہ چلا دیا۔ مراد آباد کے جج مسٹر ولسن مقدمہ کی سماعت کے لئے مقرر کئے گئے۔ حضرت شاہ صاحب اس وقت قصبات و مضافات کے دورہ پر باہر تشریف لے گئے تھے۔ آپ کو سفر ہی میں اس مقدمہ کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا۔ یہ امتحان کی پہلی منزل ہے۔ گھبرائیں نہیں، انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ کسی پر بھی کوئی آنچ نہیں آئے گی۔

بہرحال مقدمہ شروع ہوا۔ پولیس نے گواہ پیش کئے۔ مگر یہ بناوٹی گواہ بیکار ثابت

---

[1] روشن مستقبل ص۸ (بار چہارم)۔

Marfat.com

ہوئے۔ خدا جانے پولیس نے کیا کہہ کر اُن کو تیار کیا ہوگا۔ مگر جب وہ اجلاس میں یہ دیکھتے کہ جس کے برخلاف وہ گواہی دینا چاہتے ہیں، وہ ایک باخدا عالمِ دین ہے تو گھبرا جاتے اور بقول مفتی انتظام اللہ شہابی :

"جھوٹی گواہی دینے کی جرأت نہ ہوتی"۔

بہرحال جوں توں کر کے ابتدائی عدالت میں سخت سخت سزائیں تجویز کی گئیں۔ مولوی غلام جیلانی وکیل صدر، مولوی غلام امام شہید پیش کار اور مفتی سراج الدین پیش کار کو چار چار سال کی قید بامشقت، مفتی محمد قاسم صاحب داناپوری مسل خواں کو تین سال مولوی بدرالحسن صاحب مسل خواں اور مولوی آل حسن منصف کو دو دو سال۔

ایک اخبار "سعدالاخبار"[1] نے اس خبر کو شائع کرتے ہوئے لکھا :

"دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مولانا محمد قاسم داناپوری جن کا شمار اولیاء کرام میں ہے اور اُن کے ہزارہا مرید صاحبِ ریاضت و مجاہدہ ہیں، اُن کو رشوت سے متہم کیا جاتا ہے، تعجب ہے۔ دوسرے صاحب مولانا غلام امام شہید جو عاشقِ رسول کہلاتے ہیں، اُن کے بھی ہزارہا مرید آگرہ حیدرآباد و مرادآباد میں ہیں، اُن پر بھی رشوت کا الزام ہے"۔

بہرحال فوراً ہی اپیل دائر کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب حضرات بری کر دیئے گئے۔ بقول حضرت شاہ صاحب کسی کا بھی بال بیکا نہ ہوا۔

خان بہادر مفتی انعام اللہ صاحب[2] وکیل صدر جن کے نام شاہ صاحب حضرت

---

[1] سعدالاخبار ص۱۴۸ جلد اوّل مورخہ ۱۷ جمادی الاوّل ۱۲۶۶ھ مطابق مارچ ۱۸۵۰ء۔ [2] خان بہادر مفتی انعام اللہ ابنِ مفتی محمد اسحاق سہروردی ابنِ مفتی محمد ولی نبیرہ مُلّا وجیہ الدین (یکے از ترتیب دہندگان فتاویٰ عالمگیری) ۱۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد سے علومِ عربی کی تحصیل کی۔ فراغت کے بعد لکھنؤ گئے۔ عرصہ تک نظامت کی تمنا میں رہے۔ ناکامی پر مرشدآباد گئے۔ پھر کلکتہ پہنچے۔ وہاں سر ایڈورڈ کولبرک سے تعلق ہو گیا۔ ان کا لڑکا مسٹر شیرا اُن سے فارسی پڑھتا تھا۔ کولبرک دلّی کے ریزیڈنٹ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

مولانا مفتی صدرالدین صاحب آزردہ کا خط لائے تھے، جو سب سے پہلے حضرت شاہ صاحب کے میزبان بنے تھے، یہ بھی معطل کئے گئے۔ الزام یہ تھا کہ مشتبہ خطوط اُن کے یہاں سے برآمد ہوئے ہیں[1]۔

آگرہ سے کانپور اور لکھنؤ مولانا احمد اللہ شاہ صاحب آگرہ میں مقیم تھے کہ اودھ میں مولانا امیر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کا ہنگامہ پیش آگیا۔ آپ کو اسکی تفصیلات کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا۔ "اب ہمارے کام کا وقت آگیا"۔ چنانچہ آپ نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ مریدین کا بھی ایک جم غفیر ساتھ ہو لیا۔ اس طرح کہ ہر ایک مرید نے توشہ ساتھ لے لیا تھا اور گھر بار کا معقول انتظام کر دیا تھا۔ ماؤں نے بیٹوں کو اجازت دی تھی، اور بیویاں شوہروں کو رخصت کر رہی تھیں۔ ہر ایک کا دل مگن تھا۔ مرشد ساتھ ہے کوئی خطرہ نہیں ہے[2]۔

شاہ صاحب آگرہ سے روانہ ہو کر پہلے کانپور پہنچے۔ وہاں عظیم اللہ خاں وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔ پھر آپ اُناؤ ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ گھاس منڈی میں قیام کیا۔

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) مقرر ہوئے تو مفتی صاحب اس کے ہمراہ دلی آئے۔ اُس نے اپنے محکمہ کا سررشتہ کر دیا۔ عرصہ تک وہاں رہے۔ محکمہ قضا میں بعہدہ وکالت (مفتی) مقرر ہوئے۔ جس زمانہ میں صدر نظامت الہ آباد میں قائم ہوا، محکمہ قضا شکست ہو گیا۔ آپ الہ آباد آئے اور محکمہ صدر میں وکیل مقرر ہوئے۔ صدر آگرہ آیا تو آپ بھی اس کے ہمراہ آگرہ آگئے۔ ۱۲۶۶ھ عہدہ دارانِ صدر پر رشوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ تو آپ کو بھی اس الزام میں معطل کر دیا گیا کہ آپ کے یہاں سے کچھ خطوط برآمد ہوئے تھے۔ اپیل میں آپ بحال کر دیئے گئے لیکن آپ اس تعلق سے خاطر برداشتہ ہو چکے تھے۔ بحالی کے بعد آپ نے استعفیٰ دیدیا۔ پھر آپ نواب وزیرالدولہ کے پاس ٹونک چلے گئے۔ وہاں آپ کو بندوبست کا مہتمم بنا دیا گیا۔ وہیں سے آپ حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کو امداد پہنچاتے رہے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ ۱۸۵۸ء کو آپ کا انتقال ہوا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۲۷ و ۲۸)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۲۷۔ [2] ایضاً ص ۳۳۔

Marfat.com

وہیں مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی سے ملاقات ہوئی۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی تحریر فرماتے ہیں :

"مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی جو خالص سرکاری آدمی تھے اُن دنوں لکھنؤ میں صدر الصدور تھے۔ کچھ دن گذرے تھے کہ مولوی عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی کی تائید میں مولانا امیر علی شاہ صاحب[1] کے خلاف فتویٰ صادر کر چکے

---

[1] مولانا رحمان علی صاحب مصنف تذکرہ علماء ہند نے آپ کا پورا نام امیرالدین علی لکھا ہے۔ وطن عزیز امیٹھی تھا۔ یہی اجودھیا جہاں ۱۹۵۰ء سے بابری مسجد کا قصہ چل رہا ہے کہ ہندوؤں نے اس بناء پر کہ اس مسجد کے ایک حصہ کو وہ رام چندر جی کا رسوئی گھر کہتے ہیں، اس پر قبضہ کر کے اس میں مورتی رکھ دی ہے، مسلمان اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ مقدمہ چل رہا ہے۔ اسی اجودھیا میں ایک قطعہ کا نام ہنومان گڑھی ہے جہاں عالمگیر کی بنوائی ہوئی ایک قناتی مسجد تھی۔ سو سال پیشتر ۱۸۵۵ء میں بھی یہاں یہی شورش ہوئی تھی۔ چنانچہ اس قناتی مسجد پر اور ساتھ ہی بابری مسجد پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا تھا۔ واجد علی شاہ کا دورِ حکومت تھا۔ وہ بذاتِ خود کمزور ہو یا مضبوط۔ مگر اس کی حکومت کے ساتھ انگریزی ریزیڈنٹ کے غیر معمولی اقتدار اور جا بیجا مداخلت نے جو دوعملی کر رکھی تھی، اُس کا قدرتی اور لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نظامِ حکومت معطل اور مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ اجودھیا اور اس کے قرب وجوار کے ہندوؤں نے بذاتِ خود یا کسی کے ایما سے اس کمزوری کا فائدہ اُٹھایا اور من مانی کارروائی کر لی۔ واجد علی شاہ کے عمال نے اس دست درازی کو ختم کرنا چاہا تو آس پاس کے زمیندار اور بااثر ہندو مقابلہ پر آگئے۔ واجد علی شاہ کے افسروں کے پاس مصالحت کے سوا چارۂ کار نہ تھا۔ لیکن مسلمان ایسی صلح پر راضی نہ تھے جس کے نتیجہ میں اُن کو مسجد سے دستبردار ہونا پڑے۔ چنانچہ غلام حسین شاہ کی زیر قیادت مسلمانوں کی ایک جماعت خانۂ خدا کو دوبارہ اذان و نماز سے آباد کرنے کے لئے وہاں پہنچی۔ اُن کے رفقاء اور معاونین میں مولوی محمد صالح، حسن علی خاں بن احسان علی خاں رسالدار، رستم علی خاں و بہادر علی خاں کسی قدر ذی حیثیت اور نمایاں تھے۔ باقی ساتھی وجاہتِ دُنیا سے بے نیاز، شوقِ شہادت سے سرشار تھے۔ انگریز اور ہندوستانی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

تھے۔ وہ (مولانا خیر آبادی) شاہ صاحب سے ملنے آئے۔ شاہ صاحب سے ایسی گفتگو ہوئی کہ گھر جاتے ہی صدر الصدوری سے استعفیٰ دیدیا اور الور چلے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) افسر بھی پولیس اور فوج کی جمعیت کے ساتھ وہاں پہنچے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان سب کی موجودگی میں ان تمام مسلمانوں کو جو مسجد میں دو تین روز سے بھوکے پیاسے پڑے تھے۔ ذبح کر دیا گیا۔ ان کی تعداد ۲۶۹ بتائی جاتی ہے (قیصر التواریخ جلد دوم ص۱۱۲ و تاریخ اودھ جلد ۵ ص۲۰۶)۔ عذر یہ کیا گیا کہ حملہ آور ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی جس پر پولیس اور فوج کی موجودہ تعداد قابو نہیں پا سکتی تھی۔ یہ حادثہ ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ، ۲۸ جولائی ۱۸۵۵ء کو پیش آیا۔ بلغ العُلیٰ بکمالہٖ (۱۲۷۱ھ) سے اس کی تاریخ نکالی گئی۔ بہر حال اس ہنگامہ سے پورے ہندوستان میں بے چینی پھیل گئی۔ واجد علی شاہ کی حکومت نے کچھ ہندوؤں سے معذرت کرا کر اور کچھ تحقیقات کا سلسلہ شروع کرا کر اس قصہ کو رفع دفع کرانا چاہا۔ مگر دوسری طرف عام اضطراب جو دن بدن بڑھ رہا تھا۔ بقول سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی مصنف قیصر التواریخ، جب فساد و ہنگامۂ ہنود بڑھا اور بظاہر ثابت و متحقق ہوا کہ رعایت و پاسداری ہنود بطمع دنیا اراکین دولت کو منظور ہے۔ مولوی سید امیر علی بندگی میاں کے پوتے ساکن قصبہ امیٹھی نسبتی بھائی شیخ حسین علی کارندہ راجہ نواب علی خاں رئیس محمود آباد، بہ سبب جوشِ حرارت اہلِ اسلام چاہا کہ دفع توہینِ اسلام کریں۔ چنانچہ پہلے سندیلہ میں اہلِ اسلام نے مولویوں کی تحریک سے بعد مشورہ اجماع کر جہاد پر باندھی۔ (قیصر التواریخ ص۱۲۰)۔ بہر حال یہ پس منظر تھا مولوی امیر علی شہید کے جہاد کا۔ مولانا امیر علی رحمۃ اللہ علیہ نے جب علم جہاد بلند کیا تو مولانا رحمان علی کے الفاظ میں، علماء سُنّی و شیعہ بہ پس و پیش افتادند کسے بفقدانِ شرائطِ فرضیتِ جہاد لب کشادہ، دیگرے شرط امامت پیش نہادہ۔ علماء کی یہ پس و پیش اور واجد علی طفل تسلی اور لیت و لعل جاری رہی۔ مگر جو موت کو زندگی پر ترجیح دے چکا تھا۔ جس کو مولانا رحمان علی صاحب امیر المجاہدین فرماتے ہیں وہ "عزم بالجزم بسوئے متسوکردہ روانہ شد"۔ واجد علی شاہ اب بھی پس و پیش ہی میں تھے۔ ریزیڈنٹ نے کپتان بارہ گی کو حکم دیا وہ لشکرِ جرار اور توپ خانہ لے کر پہنچا۔ شجاع گنج میں تمام مجاہدین کا محاصرہ کر کے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

گئے اور انگریزوں کے جتنے خیر خواہ تھے، اُتنے ہی دشمن ہو گئے۔[۲]

لکھنؤ نے تقریباً چالیس سال پیشتر حضرت سید احمد شہید کا استقبال بھی بڑی شان سے کیا تھا۔ وہی روح وہاں بھی کارفرما تھی، اور اہلِ لکھنؤ حضرت سید صاحب کے زمانہ کی بہ نسبت اب زیادہ زخم خوردہ ہو چکے تھے۔ انتہا یہ کہ اُن کا بادشاہ واجد علی شاہ جس کو انگریز خواہ کچھ بھی کہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ لکھنؤ والوں کی آنکھ کا تارا اور باشندگانِ اودھ کی آزادی کا آخری نشان تھا، وہ بھی انتہائی ذلت و خواری کے ساتھ اُن سے جُدا کر دیا گیا تھا، یا جُدا کیا جانے والا تھا۔

بہر حال حضرت سید صاحب شہیدؒ کی طرح حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) توپ دم کر دیا۔ مجاہدین کی تعداد چھ سو تھی۔ سب ہی شہید ہو گئے۔ مگر مقابلہ بھی ایسا کیا کہ توپوں کی زد میں ہونے کے باوجود اپنے سے دو چند (۱۲۵۰) کو مقتول و مجروح کر دیا۔ خاص معرکہ کے وقت کسی ارادت مند نے حضرت شاہ امیر علیؒ سے عرض کیا۔ حالات اچھے نہیں۔ کسی محفوظ مقام پر نکل چلیے۔ شہید کی زبانِ حق ترجمان نے فوراً جواب دیا۔ "سرِ میدان کفن بر دوش دارم"۔ عجیب اتفاق، شہادت کے بعد تاریخ کی جستجو ہوئی تو یہی مصرعہ موزون ہوا منشی ظہیر الدین خلف منشی مسعود بلگرامی نے اس کی تظمین کر کے یہ قطعہ بنا دیا۔

بتاریخِ شہیدانِ کفن پوش — چہ حاجت تا سنش من بر نگارم
کہ خود فرمود آں میرِ شہیداں — سرِ میداں کفن بر دوش دارم

۱۲۷۱ھ (تذکرہ علماء ہند ص۳۰)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] بے شک یہ حضرت شاہ صاحب کی گفتگو اور اُن کی قوتِ ارادی کا اثر ہے کہ حضرت مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کی زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا۔ لیکن یہاں حضرت مولانا صدر الدین صاحب آزردہ کی فرزانگی اور دُور اندیشی کی بھی داد دینی چاہیئے کیونکہ اگر زمامِ قیادت حضرت مولانا اسمٰعیل شہید کے کسی جانشین کے ہاتھ میں ہوتی، اور مرکز دہلی ہوتا تو شاید مولانا خیر آبادی میں یہ انقلاب اب بھی برپا نہ ہوتا۔ [۲] باغی علماء ص۳۸۔

Marfat.com

بھی مقبول اور محبوب ہونے لگے اور باشندگانِ لکھنؤ کی وابستگی آپ سے دن بدن بڑھنے لگی۔ مگر اس انتہائی نازک دور میں کہ بارک پور والی فوج برخواست کی گئی تھی جس کے سپاہی زیادہ تر اودھ کے رہنے والے تھے۔ ادھر واجد علی شاہ کو معزول کر کے گرفتار کر لیا گیا تھا یا گرفتار کرنے کا منصوبہ تیار کیا جا رہا تھا۔ حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب جیسے انقلابی امام کا لکھنؤ میں قیام کرنا خود شاہ صاحب کے لئے خطرناک تھا۔ اور تحریک کے لئے بھی تشویش ناک۔ اس لئے شاہ صاحب نے لکھنؤ کا قیام مختصر کر کے فیض آباد کا رُخ کیا۔ اب شاہ صاحب نے تمام تکلفات برطرف کر دیئے تھے اور بقول مولانا فتح محمد تائب لکھنوی:

نصاریٰ سے جو حکم پیکار تھا ہر ایک شخص سے اس کا اظہار تھا

اس عریانی کا نتیجہ ظاہر تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمال نے آپ کو گرفتار کرنا چاہا۔ مگر عوام کے ہجوم اور اُن کی بے پناہ عقیدت کے باعث پولیس یہ جرأت نہ کر سکی، تو فوج سامنے آئی۔ حضرت شاہ صاحب اور آپ کے ساتھیوں نے مقابلہ شروع کر دیا۔ مگر چونکہ فوج کا یہ اقدام دفعۃً تھا، شاہ صاحب اور آپ کے ساتھی پہلے سے تیار نہ تھے اس لئے یہ مقابلہ بھی ناکام ہی رہا۔ حضرت شاہ صاحب کسی فوجی کی تلوار کی ضرب سے بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ آپ کو فوراً گرفتار کر کے جیل خانہ بھیج دیا گیا۔ آپ کے ساتھی بھی گرفتار کر لئے گئے۔

تحریک انقلاب ۱۸۵۷ء کا آغاز یہ ۱۸۵۶ء کے اواخر یا ۱۸۵۷ء کے شروع کا واقعہ ہے چند ماہ بعد ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کی طوفان انگیز تاریخ آئی جس نے پورے شمالی ہند کی زمین ہلا دی۔ حضرت شاہ صاحب اس وقت جیل میں تھے۔ فیض آباد میں عنانِ قیادت ایک اور صاحب نے سنبھالی۔ اُن کا اسمِ گرامی مولانا سکندر شاہ صاحب فیض آبادی تھا۔ آپ نے جیل خانہ پر دھاوا بول کر حضرت شاہ صاحب کو تو چھڑا لیا لیکن خود انگریزی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ مگر مولانا احمد اللہ شاہ صاحب نے جھنڈے کو گرنے نہیں دیا۔ اپنی رہائی کے بعد پورے ہندوستان کی رہائی کے لئے پرچم لہرایا، اور جو فدایان وطن جمع ہوئے تھے، اُن کو ساتھ لے کر لکھنؤ کا رُخ کیا۔[1]

[1] حاشیہ بر صفحہ آئندہ

Marfat.com

بقول مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم :

جس طرح میرٹھ وغیرہ کے باغی سمٹ کر دہلی میں جمع ہوئے تھے اور ظفر کو ہندوستان کا شہنشاہ بنایا تھا، ویسے ہی الہ آباد اور فیض آباد کے باغی بھی ۱۸۵۷ء میں جوش و خروش کے ساتھ لکھنؤ پہنچے۔ اُن کے آتے ہی یہاں کے بہت سے بے فکرے اُٹھ کھڑے ہوئے اور برجیس قدر کی بادشاہی قائم کر دی۔ تھوڑی سی انگریزی فوج اور یہاں کے تمام یورپین عہدہ دارانِ مملکت جو باغیوں کے ہاتھ سے جاں بر ہو سکے "بیلی گارڈ" میں قلعہ بند ہو گئے۔ (گذشتہ لکھنؤ)

بہر حال مولانا شرر کے الفاظ استعمال کیجئے یا ان کو انقلاب پسند محبانِ وطن کہیئے، تاریخی حقیقت یہ ہے کہ برجیس قدر جن کی عمر صرف دس سال تھی، بادشاہ[1] بنائے گئے۔ اُن کی والدہ حضرت محل جو ایک بہادر خاتون تھیں، اُن کی ولی اور سرپرست مقرر ہوئیں۔ ناصر الدولہ علی محمد خاں عرف ممو خاں وزیر اعظم یا مدار المہام مقرر ہوئے لیکن اس قیامت خیز دور میں جس کے بل بوتے پر یہ سب کچھ ہوا، وہ مولانا احمد اللہ شاہ صاحب تھے جن پر

(حاشیہ از صفحہ گذشتہ) [1] لکھنؤ میں مولانا احمد سعید سبط شاہ غلام علی نے عَلَمِ محمدی اُٹھا رکھا تھا اور عوام میں عام بے چینی پیدا ہو گئی تھی مگر کرتا دھرتا کوئی نہیں تھا۔ حضرت احمد اللہ شاہ کے پہنچتے ہی ہر ایک ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا اور تمام منتشر مجاہدین آپ کے پاس آ جمع ہوئے۔ سر ہنری لارنس چیف کمشنر لکھنؤ نے حتی الوسع بغاوت کو فرو کرنا چاہا مگر سعی بے نتیجہ رہی (باغی علما، ص ۳۸)۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] جولائی ۱۸۵۷ء کو رسالدار سید برکات احمد اور راجہ لال سنگھ اور شہاب الدین وغیرہ نے شہزادہ مرزا برجیس قدر خلف واجد علی شاہ کو اودھ کا بادشاہ بنا کر تخت پر بٹھا دیا۔ مسند نشینی کے وقت جہانگیر بخش صوبہ دار توپ خانہ فیض آباد نے ۲۱ ضرب توپ کی سلامی دی۔ شرف الدولہ محمد ابراہیم علی خاں کو خلعت وزارت عطا ہوا۔ جرنیلی کا خلعت حسام الدولہ کو ملا۔ مگر کل وجود کے اختیارات ناصر الدولہ علی محمد خاں عرف ممو خاں کے ہاتھ میں تھے (باغی علما، ص ۳۸)۔

Marfat.com

سُنّی اکثریت پورا اعتماد کرتی تھی۔

مقابلہ، ناکامی اور وجوہاتِ ناکامی بے شک کا نقشہ قائم ہوگیا۔ عام ہندو مسلمانوں نے دلوں کی گہرائیوں سے وفاداری کا عہد بھی اس حکومت سے کرلیا مگر جو مرض دہلی میں تھے، وہی بیماریاں لکھنؤ کی فضا میں بھی موجود تھیں بلکہ اُن سے کسیقدر زیادہ۔

یہاں شیعہ سُنّی کا مسئلہ بھی موجود تھا۔ اربابِ اقتدار کی جنگی نااہلیت بھی اپنا رنگ جمائے ہوئے تھی، اور مرزا مغل کی طرح ممو خاں کی ریشہ دوانیاں بھی احمد اللہ شاہ جیسے بہادر اور دیانت دار جرنیل کے راستہ میں ہر قدم پر رکاوٹ کے لئے موجود تھیں۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ یعنی بہادرانہ معرکوں کے باوجود ناکامی۔ جس کی تفصیل کے لئے مستقل جلد کی ضرورت ہے۔

مولانا احمد اللہ شاہ صاحب لکھنؤ سے ہٹ کر شاہ جہان پور پہنچے۔ شاہزادہ فیروز، جنرل بخت خاں، تجمل حسین خاں رئیس فرخ آباد، جنرل اسمٰعیل خاں (فتح گڈھ)، نانا راؤ پیشوا، غرض تمام ہی سرغنہ جنہوں نے بار بار شکست اُٹھانے کے بعد بھی ہمّت نہیں ہاری تھی اور جو پورے عزم کے ساتھ طے کرچکے تھے ع

یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

یہ سب جمع ہوگئے۔ شاہ جہان پور میں جو معرکے ہوئے، اُن کا مختصر تذکرہ واقعات شاہ جہان پور کے سلسلہ میں پہلے گذر چکا ہے، اور جب یہاں بھی ناکامی ہو تو شاہ صاحب اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ قصبہ محمدی پہنچے اور یہاں از سرِ نو تنظیم کی۔ ایک عارضی حکومت بھی قائم کرلی۔ جس کی کابینہ کے ارکان یہ تھے:

جنرل بخت خاں	وزیر جنگ
مولانا سرفراز علی صاحب	قاضی القضاہ (چیف جسٹس)
نانا راؤ پیشوا	دیوان (وزیر مال)

مولانا لیاقت علی صاحب الہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اکبرآبادی مولانا

Marfat.com

فیض اللہ صاحب بدایونی، شاہزادہ فیروز شاہ ـــــ ارکانِ حکومت

سکّہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ

حامیِ دین محمّد احمد اللہ بادشاہ

پھر کیا ہوا؟ تاریخ شاہ جہان پور اور صحیفۂ زریں کے حوالے سے مفتی انتظام اللہ شہابی تحریر فرماتے ہیں:

ابھی شاہ صاحب پوری طرح جمنے نہ پائے تھے کہ سرکالن کیمبل نے قصبہ محمّدی پر حملہ کر دیا۔ خوب خوب مقابلہ رہا۔ شاہ صاحب کے ہٹتے ہی محمود[1] خاں معہ حضرت محل اور نانا راؤ، عظیم اللہ خاں اور بخت خاں وغیرہ

---

[1] ممو خاں، اصل نام علی محمد خاں، داروغہ دیوان خاص۔ برجیس قدر کو مسندِ حکومت تک پہنچانے میں ان کی کوشش کو خاص دخل تھا۔ حضرت محل کے خاص معتمد تھے۔ مگر اس عارضی شوکت و اقتدار کے دور میں بھی زیادہ ستانی اور خویش پروری کی شکایت رفع نہیں ہوئی، بلکہ زیادہ ہو گئی جس کی بناء پر حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کو بار بار مداخلت کرنی پڑی۔ جس کی وجہ سے ممو خاں حضرت شاہ صاحب سے بھی برگشتہ ہو گیا تھا۔ حضرت محل کے ساتھ لکھنؤ سے نکلا اور جب حضرت محل اور برجیس قدر نیپال روانہ ہوئے تو یہ بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ دونوں ماں بیٹوں کو نیپال کے افسروں نے اپنے یہاں رہنے کی اجازت دی۔ اُن کے لئے بطور مدد معاش ایک ہزار روپیہ ماہانہ جاری کر دیا۔ مگر ممو خاں کی آشفتہ مزاجی اور تند خوئی اس نازک موقع پر بھی ختم نہ ہوئی۔ اُس نے نیپالی افسروں سے ایسا انداز اختیار کیا کہ انہوں نے ممو خاں کو اجازت نہیں دی۔ دوسرے سپاہیوں کی طرح یہ بھی انگریزوں کی گرفت میں آگیا۔ گرفتار ہوا۔ مقدمہ چلا۔ ممو خاں نے انگریزوں کی وفاداری کے ثبوت میں بہت سی چٹھیاں بھی جو بالواسطہ یا بلا واسطہ ملی تھیں، پیش کیں۔ بڑے شد و مد سے دعویٰ کیا کہ میر واجد علی جس کو کمپنی نے دس لاکھ روپیہ عطا کیا ہے میرا نائب تھا۔ اُس نے جو کچھ انگریزوں کی وفاداری میں کارروائیاں کیں وہ سب میرے مشورہ سے کیں۔ بہرحال ان تمام صفائیوں کا نتیجہ اتنا ہی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

نیپال کی طرف چلتے ہوئے۔

لیکن شاہ صاحب نے پوائیں کا رُخ کیا جو بندیل کھنڈ اور اودھ کی سرحد پر شاہ جہان پور سے شمال مشرق تقریباً ۱۸ میل ہے۔ راجہ پوائیں اگر تعاون کے لئے آمادہ ہو جاتا تو شاہ صاحب کو پھر سانس لینے کا موقع مل سکتا تھا۔ مگر اُس نے غداری کی۔ اوّل وہ آپ سے گفتگو کے لئے آمادہ ہوا، اور جب شاہ صاحب گفتگو کے لئے پہنچے تو راجہ نے اپنی گڑھی کا پھاٹک بند کر لیا اور اُوپر سے گولیوں کی بوچھاڑ کر کے شاہ صاحب کو شہید کر دیا۔ اب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کا بیان ہے کہ:

> راجہ بلدیو سنگھ نے سر مبارک جسمِ اطہر سے اُتارا، اور صاحب کلکٹر بہادر شاہ جہان پور کے سامنے پیش کر دیا جو عرصہ تک کوتوالی پر لٹکا رہا۔ نعش کو آگ میں پھونک دیا۔ اس پر سرکار برطانیہ نے پچاس ہزار روپیہ نقد اور خلعتِ فاخرہ راجہ پوائیں کو عطا کیا۔ یہ واقعہ شہادت ۵ جون ۱۸۵۸ء مطابق ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ کو پیش آیا۔ دریا پار محلہ جہاں آباد متصل احمد پور مسجد کے پہلو میں سر دفن کر دیا گیا۔ مولوی سیّد طفیل احمد صاحب (علیگ مصنف روشن مستقبل و حکومت خود اختیاری) نے کتبۂ تاریخ نصب کرا دیا[1]۔

شاہ صاحب کے متعلق جو لکھا گیا، اس کی تصدیق کے لئے چند انگریز مؤرخین کے بیانات ملاحظہ فرمائیے۔ چارلس نال لکھتا ہے:

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) برآمد ہوا کہ پھانسی کی سزا منسوخ ہوئی۔ چند سال کی قید تجویز کی گئی۔ مگر آپ نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ کوشش ناکام رہی۔ دوبارہ گرفتار ہوئے اور انڈمان بھیج دیئے گئے۔ تقریباً پانچ سال جزیرہ انڈمان میں گذارے۔ پھر سراوک بھیج دیئے گئے۔ وہیں انتقال ہوا۔ (قیصر التواریخ جلد دوم ص۳۶۷ و ص۳۶۸ و تواریخ عجیب ص۴۳ و ص۴۴)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص۴۹۔

Marfat.com

ایک لمبا، لاغر مگر مضبوط آدمی، دُبلے جبڑے، بلمے پتلے ہونٹ اُونچا بانسہ، بڑی بڑی آنکھیں، تیغ نما ابرو، لمبی داڑھی، سخت کالے بالوں کی زُلفیں دونوں کانوں پر پڑی رہتی تھیں۔

چارلس نال حلیہ بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے:

اودھ کے باغیوں کی تجاویز اور سازش کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس مولوی کو انگریزی حکّام بحیثیت احمد شاہ فقیر اور صوفی عرصے سے جانتے تھے۔ شمال مغربی صوبجات میں ظاہراً مذہبی تبلیغ کی خاطر دورہ کر چکے تھے۔ لیکن فرنگیوں کے لئے یہ راز ہی رہا۔

اپنے سفر کے دوران وہ ایک عرصے تک آگرہ میں مقیم رہے۔ حیرت انگیز اثر شہر کے مسلم باشندوں پر تھا۔ شہر کے مجسٹریٹ ان کی جُملہ نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے۔ عرصہ بعد یقین ہو گیا، کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف ایک سازش کر رہے ہیں لیکن پھر بھی اُن کو کسی باغیانہ جُرم میں ملوّث نہ پایا گیا۔ وہ آزاد رہے۔ آخر کار جب بغاوت رونما ہوئی اور فیض آباد کے فوجیوں میں بھی یہ لوگ پہنچے تو یہ مولوی جو سابقاً غیر منظم طریقے پر اپنے مریدوں کو اُبھار رہا تھا، گارد کی نگرانی میں تھا۔ ہنگامہ کرنے والوں نے اُن چھُڑا کر اپنا سردار بنا لیا۔ اس طرح مولوی صاحب ایک طاقت ور فوج کے سپہ سالار بن گئے۔ اگرچہ کچھ عرصہ تک دوسرے باغی سرداروں کی طاقت چھپی رہی لیکن اس شخص کا اثر باغیوں پر بھرپور تھا لیکن یہ قابل آدمی تھا، اور ظلم کے دھبے سے پاک تھا جو نانا صاحب کے انتقامی جوش کی خصوصیت تھی، اس سے یہ بالکل پاک صاف تھا۔ اس لئے برطانیہ بھی ایک حد تک ان کو اچھا اور قابلِ نفرت نہیں سمجھتی تھی۔[1]

---

[1] انڈین میوٹنی۔ از جی، ڈبلیو فارسٹر اسکولر ص ۲۴ (باغی علما ص ۴۳)

Marfat.com

جنرل ٹامسن جو ایک بہادر انگریز تھا اور ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں شریک تھا، شاہ صاحب کی بابت لکھتا ہے :

مولوی احمد اللہ شاہ بڑی لیاقت و قابلیت رکھتا تھا۔ وہ ایسا شجاع تھا کہ خوف اُس کے نزدیک نہیں آتا تھا۔ یہ عزم کا پکّا۔ ارادہ کا مستقل تھا۔ باغیوں میں اس سے بہتر کوئی سپاہی نہیں تھا۔ یہ فخر کو اسی کو حاصل ہے کہ اُس نے دو مرتبہ سر کالن کیمبل کو میدانِ جنگ میں ناکام رکھا۔ وہ بہ نسبت اور باغیوں کے خطاب شاہ کا زیادہ مستحق تھا۔ اگر محبِ وطن ہونے کے یہ معنیٰ ہیں کہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے جو غلطی برپا ہو گئی ہو، سازشیں کی جائیں اور لڑائیاں لڑی جائیں، تو مولوی یقیناً اپنے مُلک کا محبِ صادق تھا۔ اُس نے کبھی تلوار کو مخفی اور سازشی قتل سے خون آلود نہیں کیا وہ بہادرانہ اور معجزانہ طور پر ان سے معرکہ آرا ہوا جنہوں نے اُس کا مُلک چھین لیا تھا۔ دنیا کی ساری قومیں اس کو تعظیم و ادب کے ساتھ جو شجاعت و صداقت کے لئے لازمی تھیں اور جن کا مستحق تھا، اس کو یاد کریں گی[1]

فارسٹر کا ایک اور نذرانۂ عقیدت ملاحظہ فرمائیے :

جن کو فیض آبادی مولوی کہا جاتا ہے، اُن کے متعلق یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ عالم باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھا۔ رُوحانی طاقت کی وجہ سے صوفی اور جنگی مہارت کی وجہ سے سپاہی اور سپہ سالار تھا۔ اسکی طبیعت ظلم سے پاک تھی۔ ہر انگریز اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے[2]۔

رفقاء مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی نے چند اسمار گرامی اس عنوان کے تحت نقل کئے ہیں۔ ان فداکارانِ حریت کے نام ہم بھی زیبِ صحیفہ کرتے ہیں :

---

[1] تاریخ شاہجہان پور بحوالہ باغی علما۔ ص ۴۹۔۵۰۔ [2] ہسٹری دی انڈین نیوٹی۔

Marfat.com

امیر احمد، شاہ آفاق، قطب شہید، رستم علی، اسمٰعیل خاں، غلام محمد خاں، کفایت اللہ تلہری، فرقان علی، محمد شاہ خاں شہید، سعد اللہ خاں شہید، نور احمد، احمد یار خاں تحصیل دار، نواب غلام قادر خاں (بٹول) عبدالرؤف خاں۔

اکثر انڈمان بھیجے گئے۔ کچھ کو دار نصیب ہوئی۔ کچھ گوشہ گیر ہوئے۔

نہ شیشہ، نہ مے، نہ ساقی رہا
فقط شکوۂ بخت باقی رہا

مولانا مفتی عنایت احمدؒ صاحب کاکوروی

خاندان مفتی عنایت احمد بن منشی محمد بخش بن منشی غلام محمد بن منشی لطف اللہ۔ قریشی النسل تھے۔ ان کے اجداد میں امیر حسام نامی ایک شخص بغداد سے آکر قصبہ دیوہ ضلع بارہ بنکی میں سکونت پذیر ہوئے اور اپنے صاحبزادے ضیاء الدین کی شادی وہیں کی۔ وہیں کے قاضی مقرر ہوئے۔ قصبہ دیوہ میں جس محلہ میں امیر حسام نے قیام کیا، وہ حجازی محلہ مشہور ہوا، جس کو بعد میں حجاجی کہا جانے لگا۔ اسی مناسبت سے امیر حسام کی اولاد بھی حجاجی کہلائی۔ باقی یہ خیال غلط ہے کہ امیر حسام حجاج بن یوسف ثقفی حاکم عراق کی اولاد سے ہیں۔ حجاج قریشی نہیں ثقفی تھا۔

سکونت کاکوری مفتی عنایت احمد صاحب کے دادا منشی غلام محمد کی سسرال کاکوری میں تھی۔ مفتی صاحب کے والد منشی محمد بخش اور چچا شیخ عبدالحسیب نے اسی

لہ یہ پورا مضمون جناب محمد ایوب صاحب کی کاوشِ علمی اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں قطع و برید مناسب نہیں معلوم ہوئی۔ قدر شناسی کا بھی یہی تقاضا تھا کہ پوری دستاویز جوں کی توں رکھی جائے۔

Marfat.com

ننہالی تعلق کی بنا پر کاکوری میں سکونت اختیار کر لی۔ پھر اُن کے تمام قریبی اعزّا بھی کاکوری آکر سکونت پذیر ہو گئے، اور کاکوروی کہلانے لگے۔ اب بھی وہاں ان کا بڑا خاندان سکونت پذیر ہے۔

پیدائش: مفتی عنایت احمد صاحب ۹ شوال ۱۲۲۸ھ کو بمقام دیوہ پیدا ہوئے۔

تحصیلِ علم ابتدائی تعلیم کاکوری میں حاصل کی۔ جب ۱۳ سال کی عمر ہو گئی تو تحصیلِ علم کی غرض سے رام پور گئے۔ وہاں مولوی سیّد محمّد صاحب بریلوی سے صرف و نحو، مولوی حیدر علی صاحب ٹونکی اور مولوی نورالاسلام صاحب سے دوسری درسی کتابیں پڑھیں۔ رام پور میں درسی کتابیں ختم کر کے دہلی پہنچے۔ وہاں شاہ محمد اسحاق صاحب محدّث دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ) سے کتب حدیث سبقاً سبقاً پڑھیں اور سند حاصل کی۔ دہلی سے علی گڈھ آئے، جہاں مولانا بزرگ علی مارہروی (شاگرد شاہ عبدالعزیز صاحبؒ دہلوی و شاہ رفیع الدین صاحبؒ دہلوی) جامع مسجد کے مدرسہ میں دینی خدمات انجام دے رہے تھے۔ یہ مدرسہ عہدِ محمد شاہی میں بانی مسجد نواب ثابت خاں نے قائم کیا تھا۔ علی گڈھ میں مفتی عنایت احمد صاحب نے تمام منقولی اور معقولی کتابیں مولانا بزرگ علی سے پڑھیں اور فارغ التحصیل ہوئے۔ بعد فراغ اسی مدرسہ میں مدرّس مقرر ہو گئے۔ کیونکہ ۱۲۶۲ھ میں مولانا بزرگ علی صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔

ملازمت ایک سال تک مدرسہ میں مدرس رہے۔ اس کے بعد منصفی و منصف کے عہدہ پر علی گڈھ میں ہی تقرر ہو گیا۔ اسی زمانہ میں مولوی لطف اللہ صاحب علی گڈھی (المتوفی ۱۳۲۴ھ) کے تلمذ کا سلسلہ شروع ہوا جو کہ مفتی صاحب کے نامور شاگرد گذرے ہیں۔ مولوی سیّد حسین شاہ صاحب بخاری نے بھی اسی زمانہ میں پڑھا ہے۔

اجلاس میں سبق مولوی سیّد حسین شاہ بخاری فرمایا کرتے تھے کہ مفتی صاحب مجھ کو ہدایہ اجلاس میں پڑھایا کرتے۔ جیسے ہی کسی مقدمہ سے فرصت ہوتی، اشارہ ہوتا، میں پڑھنا شروع کر دیتا۔ پھر کوئی سرکاری کام آجاتا تو اس میں مصروف ہو جاتے

Marfat.com

اس دوگونہ مشغولیت کے باوجود مسائل اس طرح ذہن نشین کرا دیتے کہ کبھی فراموش نہ ہوتے۔ آپ طلباء سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ مولوی لطف اللہ صاحب کی تعلیم کے زمانہ میں ہی مفتی صاحب کا تبادلہ علی گڈھ سے بریلی ہوگیا تھا۔ مولوی لطف اللہ صاحب بریلی ساتھ گئے۔ وہاں جملہ کتب درسیہ ختم کیں۔ صبح کی نماز کے بعد مفتی عنایت احمد صاحب تلاوت فرماتے تھے۔ مولوی لطف اللہ صاحب خدمت میں حاضر رہتے۔ دوران تلاوت میں اگر کوئی مشکل صیغہ آتا تو مفتی صاحب ان کی طرف دیکھتے، یہ حل کرتے۔ حل نہ کرسکتے تو بعد تلاوت خود حل کرکے بتاتے۔ مفتی عنایت صاحب نے بعد فراغ مولوی لطف اللہ صاحب کو اپنے ہی اجلاس کا سررشتہ دار مقرر کرلیا۔

قیام بریلی بریلی کے قیام میں مفتی عنایت احمد صاحب صدر امین ہوئے۔ درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ بریلی کے تلامذہ میں قاضی عبدالجمیل صاحب قاضی شہر مولوی فدا حسین منصف اور نواب عبدالعزیز خاں مشہور لوگ گذرے۔ آخر الذکر حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں کے پوتے تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

اسی زمانہ میں بریلی میں مفتی عنایت احمد صاحب کے ہم وطن مولوی رضی الدین ابن علیم الدین (المتوفی ۱۲۷۴ھ) صدر الصدور تھے۔ ۱۲۷۳ھ میں آگرہ کے صدر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ ابھی بریلی سے روانگی عمل میں نہیں آئی تھی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ شروع ہوئی۔ مفتی صاحب آگرہ نہ جاسکے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء نواب خان بہادر خاں نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خان نے روہیل کھنڈ میں علم جہاد بلند کیا تو مفتی عنایت احمد صاحب بھی اس میں شریک ہوئے بریلی اور رام پور آپ کی سرگرمیوں کے آماج گاہ رہے۔ جب تحریک آزادی ناکام ہوئی اور انگریزوں کا ملک پر دوبارہ تسلط ہوگیا تو مفتی عنایت احمد صاحب گرفتار ہوئے مقدمہ چلا اور عبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی۔

Marfat.com

قیامِ انڈمان مفتی عنایت احمد صاحب نے جزیرہ انڈمان میں بھی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا۔ جزیرہ انڈمان میں اُن کے پاس کسی علم کی کوئی کتاب نہ تھی۔ محض اپنی قوّتِ حافظہ پر مختلف فنون میں رسالے تصنیف کر دیئے اور وطن واپس آکر کتابیں دیکھیں تو تمام مسائل حرف بحرف صحیح تھے۔

ایک انگریز کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کیا جو دو برس میں ختم ہوا، اور وہی رہائی کا سبب بنا۔ ۱۲۷۷ھ میں رہائی پاکر کاکوری آئے۔ مولوی لطف اللہ صاحب علی گڈھی نے تاریخ رہائی لکھی اور خود کاکوری حاضر ہو کر پیش کی۔

چوں بفضلِ خالقِ ارض و سما — اوستادم شد ز قیدِ غم رہا
بہرِ تاریخ خلاص آں جناب — برنوشتم انّ استاذی نجا

قیامِ کان پور انڈمان سے واپس آکر مفتی صاحب نے ۱۲۷۷ھ مستقل قیام کانپور میں رکھا مدرسہ فیضِ عام قائم کیا جو کہ کان پور کی مشہور دینی درس گاہ ہے۔ کان پور کے مسلمان تاجر مدرسہ کے مصارف برداشت کرتے تھے۔ ان میں حافظ برخوردار خاص طور سے مشہور تھے۔ مفتی صاحب اپنے مصارف کے لئے صرف پچیس تیس روپیہ ماہانہ تنخواہ لیتے تھے بقول مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اسی مدرسہ کا فیض بالآخر ندوۃ العلماء کی شکل میں ظاہر ہوا۔

سفرِ حج دو سال کے بعد حج کا ارادہ کیا۔ مدرسہ فیض عام کان پور میں مولوی سید حسین شاہ صاحب بخاری کو مدرّسِ اوّل اور مولوی لطف اللہ صاحب کو مدرس ثانی مقرر کر کے حج کو روانہ ہو گئے۔ مفتی صاحب ہی امیر الحجاج تھے۔ اس زمانہ میں جہاز ہوا کی مدد سے چلتے تھے۔

شہادت جدّہ کے قریب جہاز پہاڑ سے ٹکرا کر ڈوب گیا۔ مفتی صاحب بحالتِ نماز احرام باندھے ہوئے غریق و شہید ہوئے۔ یہ واقعہ ۷ شوال ۱۲۷۹ھ کا ہے۔ ۵۲ برس کی عمر پائی۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔ اس سفینۂ علم کے ساتھ ایک نادِ تصنیف کا

Marfat.com

مسودہ بھی غرقاب ہوا جس کی تلافی ناممکن ہے۔ مفتی عنایت احمد صاحب نے چالیس فن کے ایک ایک مسئلہ کا انتخاب کیا تھا، اور ہر ایک مسئلہ پر چالیس ورق لکھنے کا التزام اس صفت کے ساتھ تھا کہ مسئلہ بھی بے نقطہ ہو اور اس پر پوری بحث بھی شگفتہ عبارت میں اسی التزام کے ساتھ کی جائے۔ تفسیر میں وعلم آدم الاسماء کلھا کی آیت اور حدیث میں کل مسکر حرام (رواہ مسلم) منتخب فرمائی تھی۔ بڑا حصہ مکمل ہو چکا تھا۔

تلامذہ منفتی صاحب کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے اکثر نامور مدرّس ہوئے۔ چند نام یہ ہیں:

مولوی سیّد حسین شاہ صاحب بخاری۔ مولوی امیر الدین احمد صاحب بخاری۔ مولوی لطف اللہ صاحب علی گڈھی۔ مولوی حافظ عزیز الدین صاحب عباسی۔ مولوی حافظ نواب عبد العزیز خاں صاحب بریلوی منشی مقصود احمد صاحب برادر زادہ مولوی حکیم حبیب علی صاحب کاکوروی

تصانیف مفتی عنایت احمد صاحب کی تصانیف بھی بہت ہیں جو آپ کے علم و فضل پر دال ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ آج تک کسی نے مفتی صاحب کی کتابوں پر اعتراض نہیں کیا، اور مفتی صاحب نے اردو میں جو رسالے لکھے ہیں، اُن کی زبان نہایت صاف اور بامحاورہ ہے۔ مضامین اخلاقی اور اسلامی ہیں۔ ایک مختصر سا فنڈ جمع کر لیا تھا۔ اس کی مدد سے مفتی صاحب کی یہ تصانیف طبع ہو کر تقسیم و شائع ہوتی تھیں۔

شرح ہدایۃ الحکمۃ صدر شیرازی۔ تصدیقات حمد اللہ اور شرح پر بھی حواشی لکھے ہیں۔ اب آپ کی جملہ تصانیف کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا جاتا ہے۔

علم الفرائض: نام سے مضمون ظاہر ہے۔ ۱۲۶۲ھ میں لکھی گئی۔ نام تاریخی ہے[1]۔

ملخصات الحساب: فنِ ریاضی پر مفید رسالہ ہے۔ ریاضی کے ابتدائی

---

[1] اگر کتابوں کے نام تاریخی ہیں تو یہ سنہ جو لکھے ہیں صحیح نہیں ہیں۔ سنہ وہی مانے جائیں جو ناموں سے تخریج ہوں۔

Marfat.com

اصول آسان پیرایہ میں تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی ۱۲۶۲ھ میں لکھی گئی۔ نام تاریخی ہے۔

تصدیق المسیح ردع کلمۃ القبیح : نام سے مضمون ظاہر ہے۔ ۱۲۶۸ھ میں کتاب لکھی گئی۔ نام تاریخی ہے۔

الکلام المبین فی آیات رحمۃ للعالمین : یہ ضخیم تصنیف ہے ۱۲۷۰ھ میں یہ کتاب لکھی گئی۔ نام تاریخی ہے۔ معجزات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان نہایت شرح و بسط سے کیا ہے۔

ضمان الفردوس : ۱۲۷۲ھ میں یہ رسالہ لکھا۔ نام تاریخی ہے۔ بخاری کی حدیث من یضمن لی ما بین لحییہ و ما بین رجلیہ اضمن لہ الجنۃ کی شرح لکھی ہے۔ کتاب دو باب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں معاصی متعلقہ زبان کا بیان ہے، اور دوسرا باب عضوِ خاص کے گناہوں پر مشتمل ہے۔

بیان قدر شب برآۃ : یہ ایک مختصر رسالہ ہے۔ شب برآۃ کے فضائل میں ۱۲۷۲ھ میں لکھا گیا۔ نام تاریخی ہے۔

رسالہ در مذمّتِ میلہ ہا : یہ رسالہ ۱۲۷۲ھ میں لکھا گیا۔ نام تاریخی ہے مسلمان ہندوؤں کے میلوں میں شرکت کرتے ہیں، اس کے رد میں لکھا گیا۔

فضائل علم و علماء دین : نام سے مضمونِ کتاب ظاہر ہے۔ ۱۲۷۲ھ میں لکھی گئی۔ نام تاریخی ہے۔

محاسن العمل الافضل معہ التتمات : یہ کتاب بھی ۱۲۷۲ھ میں لکھی گئی۔ نام اس کا بھی تاریخی ہے، کتاب طبع ہو چکی ہے۔

فضائل درود و سلام : درود و سلام کے فضائل میں یہ کتاب ۱۲۷۲ھ میں لکھی۔

ہدایات الاضاحی : نام سے کتاب کا مضمون ظاہر ہے۔ تاریخی نام ہے۔ ۱۲۷۲ھ میں لکھی گئی۔

Marfat.com

الدر الفرید فی مسائل الصیام والقیام والعید : نام سے مضمونِ کتاب ظاہر ہے۔ ۱۲۷۲ھ میں مرتب ہوئی۔ نام تاریخی ہے۔

وظیفہ کریمہ : اُردو وظائف پر مشتمل ہے۔ ۱۲۷۶ھ میں انڈمان میں لکھی گئی۔ کتاب طبع ہو چکی ہے۔

خجستہ بہار : گلستاں کے طرز پر نثر میں یہ کتاب لکھی ہے۔ ۱۲۷۶ھ میں انڈمان میں تالیف ہوئی۔

علم الصیغہ : عربی صرف کا نہایت جامع رسالہ، آج تک درس میں شامل ہے۔ کوئی حافظ سید وزیر علی صاحب تھے، ان کی تحریک پر لکھا گیا۔ اس کا دوسرا نام قوانینِ جزیلہ حافظیہ بھی ہے۔ یہ رسالہ بھی ۱۲۷۶ھ میں انڈمان میں لکھا گیا۔ نام تاریخی ہے۔ ایک مقدمہ، چار باب اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔

احادیث الحبیب المتبرکہ : ۱۲۷۵ھ میں قیامِ انڈمان کے زمانہ میں چالیس حدیثوں کا یہ مجموعہ مرتب کیا۔ رسالہ طبع ہو چکا ہے۔

تواریخ حبیب الہ : انڈمان میں ۱۲۷۵ھ میں سرکاری ڈاکٹر محمد امیر خاں کی فرمائش پر لکھی، جن کا ذکر مفتی صاحب نے دیباچہ میں کیا ہے۔ واقعات نہایت تفصیل سے بقید تاریخ لکھے ہیں۔ سیرت میں بہت خوب کتاب ہے۔

ترجمہ تقویم البلدان : جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، ایک انگریز کی فرمائش پر انڈمان میں عربی سے ترجمہ کیا اور یہی رہائی کا سبب بنا۔

نقشہ مواقع النجوم : یہ کتاب ہیئت جدید (فیثاغورسی) پر لکھا ہے بعض انگریزوں نے اس کو پسند کیا اور مؤلف تذکرہ مشاہیر کاکوری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مسٹر طاسن لفٹننٹ گورنر مغربی شمالی نے جو علم ہیئت کے عالم تھے، اس کو خاص طور سے پسند کیا اور اسی کتاب کی وجہ سے مفتی صاحب کو "خان بہادری" کا خطاب ملا۔ مؤلف تذکرہ مشاہیر کاکوری کے بیان کا آخری جملہ غلط ہے مفتی صاحب

Marfat.com

کو خان بہادری کا خطاب نہیں ملا۔

لوامع العلوم و اسرار العلوم : اس کتاب کے متعلق اُوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس میں چالیس علوم کا خلاصہ لکھنا پیش نظر تھا۔ ہر علم کا نام بھی بے نقط تھا۔ مثلاً علم التفسیر کا نام علم کلام اللہ، علم حدیث کا نام علم کلام الرسول، فقہ کا نام علم الاحکام وغیرہ یہ کتاب مفتی صاحب کے ساتھ غرق ہو گئی۔

حواشی کو چھوڑ کر مفتی صاحب کی جملہ تصانیف کی تعداد بیس ہے، جو معلوم ہو سکی ہیں۔ ان میں سے چھ کتابیں وظیفہ کریمہ، خجستہ بہار، علم الصیغہ، احادیث الحبیب المتبرکہ، تواریخ حبیب الہ اور ترجمہ تقویم البلدان تو انڈمان میں لکھی گئیں، اور انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ضمان الفردوس، بیان قدر شب براۃ، رسالہ در مذمت میلہا، فضائل علم و علماء دین، محاسن العمل الافضل معہ التتمات، فضائل درود و سلام اور ہدایات الاضاحی بریلی کے قیام میں لکھی گئیں۔ یہ ساتوں کتابیں ۱۲۷۲ھ میں تحریر میں آئیں، اور اس وقت مفتی صاحب کا قیام بریلی میں تھا۔

تبحر علمی | مفتی عنایت احمد صاحب کا علم و فضل مسلّم ہے۔ آپ کی تصنیفات اس پر دال ہیں۔ منقول و معقول ہر دو علم میں تبحر حاصل تھا۔ تمام علوم پوری قوت سے پڑھاتے تھے۔ ریاضی میں خاص امتیاز حاصل تھا۔ ادب کا ذوق تھا۔ جب مفتی صاحب کانپور میں مقیم تھے، تو روزانہ شام کو میدان میں ہوا خوری کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ مولوی سید حسین شاہ بخاری سے اکثر علمی و ادبی ذکر ہو جاتے تھے۔ مفتی صاحب کو اردو اساتذہ کا اکثر کلام یاد تھا۔

مفتی صاحب کی تحریرات | مفتی عنایت احمد صاحب نے اپنے استاذ مولوی بزرگ علی صاحب مارہروی کی بعض کتب پر مقدمہ و دیگر تحریرات اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ وہ کتابیں مولانا نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح مفتی عنایت احمد صاحب کی دستخطی تحریر بھی موجود ہے۔

Marfat.com

ماخذ مضمون بالا مندرجہ ذیل کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے۔

۱: تذکرہ مشاہیر کاکوری مؤلفہ مولوی محمد علی حیدر مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۷ء ۲: استاذ العلماء (حالات مولانا لطف اللہ علی گڈھی) مؤلفہ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ ۳: تواریخ حبیب الہ۔ ۴: علم الصیغہ۔ ۵: ضمان فردوس۔ ۶: بیان قدر شب براۃ۔ ۷: حیاتِ حافظ رحمت خاں۔ ۸: باغی ہندوستان۔ ۹: مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد دوم۔

علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

ایک فاضل و کامل جو درس و تدریس میں یکتائے روزگار ہے تو شعر و سخن کا اُستاذ فن کار۔ محاضرہ اور مذاکرہ کے وقت میرِ مجلس ہے تو بساطِ شطرنج پر رونقِ محفل۔ اور کبھی ایک ہی وقت میں مدرّس و معلم بھی ہے اور اُستاذِ شطرنج بھی۔ تذکرہ علماء ہند کے مصنّف رحمان علی خاں صاحب ۱۲۶۴ھ میں (جبکہ علامہ موصوف لکھنؤ میں قیام فرما تھے) ملاقات کے لئے حاضر خدمت ہوئے تو حیران رہ گئے کہ

> در عین حقہ کشی و شطرنج بازی تلمیذے را سبق "الافق المبین" مے داد و مطالبِ کتب را باحسن بیانی دلنشین مے نمود۔

شانِ جامعیت کی یہ ندرت کس قدر حیرت انگیز ہے کہ اگر ایک وقت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ سے مدّ مقابل تھے تو دوسرے وقت اُسی راہ پر گامزن۔ ایک وقت اگر انگریز کے وفادار اور انگریزی محکمہ کے سررشتہ دار تھے تو دوسرے وقت جہادِ حریت کے علمبردار، اور کٹہرۂ عدالت میں ایک سیاسی ملزم کی حیثیت سے حاضر۔ ایک طرف زندگی کا ہر ایک دَور ناز و نعم، عزّت و عظمت سے ہم کنار ہے تو اسی زندگی کا ایک دَور پابندِ سلاسل اور دیارِ غربت میں وحشت بداماں۔

Marfat.com

ہندوستان کے وہ قصبے جو مردم خیزی میں مشہور ہیں، اُن میں ضلع سیتاپور کا قصبہ خیرآباد بھی ہے۔ اب چودھویں صدی کے ربع آخر میں اس کی حالت کچھ بھی ہو مگر حلقۂ درس و تدریس سے تعلق رکھنے والے جانتے ہیں کہ گذشتہ صدی کے آخر تک خیرآباد کو خیر البلاد لکھا جاتا تھا۔

اسی خیرآباد کے مشہور فاضل مولانا فضل امام صاحب تھے۔ سیّدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی کے معاصر، درس و تدریس میں شہرۂ آفاق۔ انہیں مولانا فضل امام صاحب کے نُورِ چشم و لختِ جگر یہ مولانا فضل حق صاحب ہیں جن کی جامعیت کا مختصر تذکرہ سطور بالا میں گذرا ہے۔

سلسلۂ نسب کے لحاظ سے آپ فاروقی ہیں۔ چودہ واسطوں کے بعد آپ کا سلسلۂ نسب سیّدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے شجرۂ نسب سے مل جاتا ہے[1]

ولادت اور تعلیم و تربیت | مولانا فضل حق صاحب ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں اپنے آبائی وطن خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد مولانا فضل امام صاحب دہلی میں صدر الصدور تھے۔ مولانا فضل حق کی تعلیم و تربیت آپ کے ہی زیر سایہ دہلی میں ہوئی۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہما کے بارگاہِ فیض پناہ سے علمِ حدیث کی خوشہ چینی کی۔ تیرہ سال کی عمر میں تمام عقلی و نقلی علوم کی تکمیل کرلی۔ چار ماہ اور چند روز میں قرآن مجید حفظ کیا[2]

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے اجداد میں ایک بزرگ شیر الملک ہیں (ملاحظہ ہو شاندار ماضی جلد دوم) شیر الملک تک علامہ خیرآبادی کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

علامہ فضل حق ابن علامہ فضل امام[1] ابن شیخ محمد ارشد[2] بن حافظ محمد صالح[3] بن مُلّا عبدالواجد[4] بن عبدالماجد[5] بن قاضی صدرالدین[6] بن قاضی اسمٰعیل[7] ہرگامی بن قاضی عماد[8] بدایونی بن شیخ ارزانی[9] بدایونی بن شیخ منوّر[10] بن شیخ خطیر الملک[11] بن شیخ سالار[12] شاہم بن شیخ وجیہ الملک[13] بن شیخ بہاء الدین[14] بن شیر الملک[15]۔ باغی ہندوستان ص۱۲

[2] سیر العلماء۔

Marfat.com

ملازمت | والد ماجد کے انتقال کے وقت علامہ کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ خاندانی ذمہ داریوں کا بار پڑا۔ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ دہلی میں ریزیڈنٹ رہا کرتا تھا۔ اس کے محکمہ کے سررشتہ دار ہو گئے۔

ہر دلعزیز بزرگی اور اہلِ فن سے تعلّقات | سلطنتِ مغلیہ کا چراغِ سحری اگرچہ بے نور ہوتا جا رہا تھا مگر علم و فن کے کتنے گوہر شب تاب تھے جن کے دم سے اس زمانہ کی دلّی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ خاندانِ ولی اللہ کے جانشین مولانا شاہ اسحاق صاحب، شاہ عبدالغنی صاحب، حضرت شاہ ابوسعید صاحب مجددی، حضرت شاہ غلام علی صاحب، اور ان اربابِ فضل و کمال کے علاوہ بڑے بڑے کہنہ مشق اساتذۂ شعر و سخن مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبداللہ خاں علوی، حکیم مومن خاں مومن، مفتی صدرالدین خاں آزردہ، مرزا اسداللہ خاں غالب، نواب ضیاءالدین خاں منیر، شاہ نصیرالدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا خاں عیش، حافظ عبدالرحمن خاں احسان، میر حسن تسکین اور خدا جانے کتنے سخنورانِ باکمال کا جمگھٹا اسی دہلی میں تھا۔ مولانا فضل حق صاحب جیسا باکمال، ان سب کا قدردان تھا۔ اور یہ سب علامہ کے قدرشناس ع

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

اسی زمانہ کا ولی عہد "ابوظفر بہادر شاہ" خود بھی شعر و سخن کا شاہ تھا اور اہلِ علم کی قدردانی میں بھی شاہانہ شان رکھتا تھا۔ علامہ سے اُس کو یہاں تک تعلّق خاطر تھا کہ جب علامہ دہلی کی ملازمت ترک کر کے جھجر جانے لگے اور وداعی ملاقات کیلئے ولی عہد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بہادر شاہ نے اپنا خاص دوشالہ آپ کو اُوڑھایا اور آب دیدہ ہو کر کہا:

ہر گاہ شما مے گوئند کہ من رخصت مے شوم۔ مرا جز ایں کہ بپذیرم

لہ باغی ہندوستان صفحہ ۳۹

Marfat.com

گریز نیست اما ایزد دانا داند کہ لفظِ وداع از دل بزباں نمے رسد
الا بصد جرِ ثقیل[1]

(ترجمہ) آپ فرما رہے ہیں کہ میں رخصت ہوتا ہوں۔ میں بھی مجبور ہوں، قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ مگر خدائے علیم خوب جانتا ہے کہ سینکڑوں جرِ ثقیل کام میں لائے جائیں، تب کہیں لفظ وداع دل سے زبان تک آسکتا ہے۔

دہلی سے جھجر وغیرہ | بیشک ارباب فقر اور اصحابِ توکل علماء اور مشائخ کی ایک جماعت تھی جنہوں نے کمپنی کی ملازمت تو کیا مسلمان بادشاہوں کی بھی ملازمت پسند نہیں کی۔ علامہ فضل حق کا مسلک دوسرا تھا۔ آپ نے ملازمت کی مگر اس طرح کہ آپ کی نازک مزاجی نے عزتِ نفس، خودداری اور وقارِ علم کے دامن کو کبھی میلا نہیں ہونے دیا۔ بظاہر یہی سبب تھا کہ کہیں آپ کا قیام مستقل نہیں رہا۔

ریزیڈنٹ دہلی کے یہاں جب تک سررشتہ دار رہے۔ عزت کے ساتھ رہے اور جب آبگینۂ عزت میں بال آنے لگا تو نہ صرف ملازمت ترک کی بلکہ دہلی کی بود و باش بھی ترک کر دی۔

علامہ کی قابلیت مشہور تھی۔ قدر دانوں سے دنیا خالی نہیں تھی۔ نواب فیض محمد خاں والیِ جھجر نے موقع غنیمت جانا اور فوراً مبلغ پانچ سو روپیہ ماہانہ کی پیش کش کر دی۔ علامہ نے اس کو منظور کیا اور جھجر تشریف لے گئے۔ ایک عرصہ تک جھجر رہے۔ پھر مہاراجہ الور نے بلا لیا۔ الور سے آپ سہارن پور گئے۔ بعد ازاں آٹھ برس رامپور میں رہے۔ پھر لکھنؤ میں پہلے صدر الصدور بنائے گئے۔ جب ایک نئی کچہری "حضور تحصیل" کے نام سے بنی تو اس کے مہتمم قرار پائے۔

ہنومان گڑھی کا فساد اور مولانا امیر علی کی شہادت | مولانا لکھنؤ میں قیام فرما

[1] یادگارِ غالب و کلیاتِ نثر غالب، فارسی۔

Marfat.com

تھے کہ ہنومان گڑھی کے فساد، شاہ غلام حسین صاحب اور اُن کے ۲۶۹ رفقاء کی شہادت پھر مولانا امیر علی صاحب کی دعوتِ جہاد اور چھ سو مجاہدین کے ساتھ توپ دم کئے جانے کا خوں چکاں اور دل فگار حادثہ پیش آیا۔ مولانا اس عرصہ میں حکومت کے ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اور بقول مولانا عبدالشاہد خاں صاحب شروانی مصنف "باغی ہندوستان" :

جب مولانا امیر علی شاہ صاحب کو سمجھانے کے لئے علماء اور امراء کو بھیجا گیا تو علامہ نے بھی عہدے کی ذمہ داری اور بسہولت مطلب براری کی بنا پر گفتگو میں حصہ لیا۔[1]

یہ گفتگو ناکام ہوئی۔ مولانا امیر علی شاہ نے اپنے عزم میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ بالآخر اپنے رفقاء کے ساتھ بڑے مزے سے جامِ شہادت نوش کیا۔ لیکن تعجب نہ کرنا چاہیئے اگر اس عجیب و غریب حادثہ سے مولانا جیسے ذکی اور ذہین و فہیم نے یہ اثر لیا کہ آپ انگریزوں کی ڈپلومیسی سے متنفر ہو کر انقلاب کی تمنا کرنے لگے کیونکہ اگر بالفرض یہ صحیح نہ ہو کہ اس پورے ہنگامۂ قتل و خون اور شعبدۂ جور و جفا کے آلات و ذرائع کو پس پردہ حرکت دینے والا انگریز تھا تو اس بات کے تسلیم کرنے میں تو تامل نہ ہونا چاہیئے کہ ان واقعات اور حوادث سے انگریز نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔

پس منظر تقریباً پوری ایک صدی ہو چکی تھی جب سے انگریزوں کی خفیہ تدبیریں

---

[1] باغی ہندوستان ص۱۲۵ حکیم نجم الغنی صاحب مصنف تاریخ اودھ اور مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی مصنف ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء نے بھی یہ ذکر کیا ہے کہ مولانا امیر علی شاہ صاحب کے خلاف جو فتوے مرتب کیا گیا تھا، اس میں مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی نے بھی دستخط کئے تھے۔ لیکن اسی واقعہ کے متعلق سوال اور شیعہ سُنّی علماء کے فتاویٰ قیصر التواریخ جلد دوم میں موجود ہیں اور حکیم صاحب نے بھی اپنی تاریخ میں نقل کئے ہیں۔ اُن میں مولانا خیرآبادی کا نام نہ بحیثیت مجیب ہے، نہ تائید و تصویب کرنے والوں میں آپ کا نام ہے۔

Marfat.com

شاہانِ اودھ کو کمزور سے کمزور تر کرنے میں مصروف تھیں اور اب ایک آخری فیصلہ کی تیاری ہو رہی تھی کہ واجد علی شاہ کو معزول اور پورے اودھ پر بلا شرکت غیرے مکمل قبضہ کر لیا جائے۔ باشندگان اودھ کے لئے اس جرعہ تلخ کو خوش گوار اسی صورت سے بنایا جا سکتا تھا کہ ہندو اور مسلمان تمام ہی باشندے واجد علی شاہ اور اس کی حکومت سے متنفر اور برافروختہ ہو جائیں۔ اس موقعہ پر انگریز کا یہ مقصد بہت آسانی سے پورا ہو رہا تھا۔ کیونکہ پردۂ سیمیں پر واجد علی شاہ کی مورت تھی۔ چنانچہ ہندو اور مسلمانوں نے اسی کو ملعون اور مردود قرار دیا۔ مگر بات کی تہ کو پہنچنے والے تو اس وقت بھی اس تماشہ کو حیرت سے دیکھ کر اس کے مضمرات کا مطالعہ کر رہے ہوں گے کہ:

> ہنومان گڈھی کے حادثہ کے وقت انگریز افسر موجود تھے۔ مگر ایسے بے بس و لاچار یا ایسے بھولے کہ بیراگیوں نے مسجد میں گھس کر ۲۶۹ مسلمانوں کو ذبح کر ڈالا اور ان بے چاروں کو خبر بھی نہ ہوئی۔ یہ ایک درخت کے نیچے کھڑے ہوئے باتیں ہی کرتے رہے۔

قیصر التواریخ کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے جو انہوں نے اپنے ایک خاص دوست کے چشم دید بیان (جو اس وقت وہاں موجود تھا) لکھے ہیں:

> اس عرصہ میں بارانِ رحمت نازل ہوئی۔ ایک ساعت تک جدال و قتال موقوف رہی۔ اسی وقت ایک کبڑا ہمراہی غلام حسین کے واسطے جو دو دن سے بے آب و دانہ تھے، کھانا لایا۔ کپتان آر صاحب اور جان ہرسی نے اپنے سپاہیوں کو بھیج کر کہلا بھیجا کہ تم کمریں کھول کر بہت اطمینان سے جامع مسجد میں بیٹھو۔ باہر نہ نکلو۔ کوئی تم سے فساد نہ کر سکے گا وہ کمریں کھول کر کھانا کھانے لگے۔ اب زبانی مرزا علی اعلیٰ کے ہے (جو مولف

لہ مرزا علی اعلیٰ منصرم مجسٹریٹ (ملا قیصر التواریخ) اسی طرح مرزا نثار حسین بھی پولیس کے کوئی افسر ہیں۔ مگر فوج انگریز افسران کے ماتحت ہے اور اصولاً نظم و نسق کے جملہ اختیارات فوج کے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

کتاب سے وقت روانگی کربلا کہ اُس شب خاص کربلا میں میرے پاس رہے تھے) بیان کرتے تھے کہ دونوں انگریز اور میں خود اور مرزا نثار حسین مع اپنی سپاہ اور توپ وہاں سے ہٹ کر بڑی دُور درخت کھرنی کے نیچے جا کھڑے ہوئے[1] ایک ساعت نہ گذری تھی کہ بیراگی ہزاروں گولر لئے نعرہ مارتے آکر مسجد کو گھیر لیا اور رجب علی شاہ فقیر کے کوٹھے سے چڑھ کر غلام حسین کے ہمراہیوں پر گولیاں برسانا شروع کر دیا اور مسجد میں آکر ۲۶۹ آدمیوں کو ذبح کیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا الخ[2]

لیکن اسی انگریز ذات کا افسر کپتان بارلو، مولانا امیر علی شاہ کے مقابلہ میں اتنا چاق و چوبند ہے کہ نماز ظہر ختم ہونے کا بھی انتظار گوارا نہیں کیا۔ خاص نماز کے وقت گولوں کی زد پر رکھ کر ان کمزور نہتوں کے پرخچے اُڑا دیئے اور جو باقی بچے، اُن کو بعد میں گولیوں کا نشانہ بنا ڈالا۔ اور لُطف یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ واجد علی شاہ کی حکومت کے نام پر، جو ابھی تک مولانا امیر علی کے معاملہ میں علماء سے فتوے ہی لکھوا رہا تھا۔ کیا انگریز افسروں کے اس تغافل اور اس چُستی کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہندو مسلمانوں میں منافرت پیدا ہو۔ واجد علی شاہ بدنام ہو اور انگریز کا بول بالا ہو۔

چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ جس روز مولانا امیر علی شاہ صاحب اودھ میں شہید کئے گئے، اُسی روز حکومتِ اودھ سے واجد علی شاہ کی معزولی کا فیصلہ لندن کی پارلیمنٹ

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) انہیں انگریز افسران کو حاصل ہیں۔ اپنے فعل کو دوسرے کے سر تھوپنے کے لئے ان مسلمان افسران کو ساتھ رکھ رکھا ہے جیسا کہ مولانا امیر علی شاہ کے حادثہ کے وقت بھی کپتان بارلو کے ساتھ حاجی مرزا حسین علی کمیدان بٹالین گلابی، کپتان بارلو کے ساتھ شریک حملہ تھے۔ اور مولانا امیر علی شاہ کو عین نماز ظہر کے وقت توپ دم کر رہے تھے (ص ۱۲۳ قیصر التواریخ)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] کیوں کیا وجہ تھی؟ ان کو کیا خوف تھا؟ [2] قیصر التواریخ ص ۱۱۱ و ص ۱۱۲

Marfat.com

میں صادر کیا گیا۔[1]

بہرحال یہ واقعہ بھی ایک زیرک اور فہیم کے لئے سبق آموز تھا۔ چنانچہ مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب نے اس سے یہی سبق لیا تھا کہ باعثِ فتنہ نہ ہندو ہے نہ مسلمان اور نہ مجبور و مقہور واجد علی شاہ، بلکہ اس فتنہ و فساد کے بیج کار پردازان کمپنی نے بوئے ہیں۔ وقت کا سب سے ضروری مطالبہ یہ ہے کہ ان بیج بونے والوں کو وطن سے نکالا جائے۔

اس حادثہ کے بعد ہی مولانا سیّد احمد اللہ شاہ صاحب آگرہ سے لکھنؤ پہنچے۔ مولانا فضل حق صاحب سے ملاقات کی۔

اس کے مولانا فضل حق وہ نہیں تھے جو ہمیشہ سے تھے۔ وہ اب داعیٔ انقلاب تھے۔ لکھنؤ کو خیرباد کہا اور الور پہنچ کر نئی بساط بچھائی۔[2]

ہنگامۂ ۱۸۵۷ء اور مولانا خیرآبادی ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو مولانا الور میں تھے۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ وہ علماء مجاہدین جو ایک عرصہ پہلے سے اپنا نصب العین استخلاصِ وطن بنا چکے تھے، ابتداء میں وہ بھی متامل رہے کیونکہ یہ ہنگامہ اُن کے کسی پروگرام کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس کی ابتداء فوجوں کی بددلی سے ہوئی تھی اور پھر اگرچہ دہلی پر انقلابی فوجوں نے قبضہ کر کے بہادر شاہ کو بادشاہ بنا دیا تھا مگر ان کارروائیوں میں کوئی ایسا ضبط و نظم نہیں تھا جو نظرِ شریعت میں قابلِ اعتماد ہو۔

جب ۲ر جولائی کو جنرل بخت خاں نے ایک لشکرِ جرّار کے ساتھ دہلی پہنچ کر نظم و

---

[1] باغی ہندوستان ص۱۴۸۔ [2] خود مولانا فضل حق صاحب نے بھی "الثورۃ الہندیہ" میں اپنے اس فکری تبدیلی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس کے اسباب میں اگرچہ اس واقعہ کا نام نہیں لیا لیکن جو سبب بیان کئے ہیں اُن کے دلائل و شواہد اسی قسم کے واقعات ہو سکتے ہیں۔ مثلاً سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نصاریٰ کی کوشش ہے کہ تمام مذہب بدل کر صرف ایک مذہب نصرانیت و عیسائیت باقی رکھا جائے۔ دوسرا سبب یہ کہ جملہ ذرائع پیداوار پر قبضہ کر کے وہ ہندوستانیوں کے خورد و نوش کو بھی اپنے قبضہ میں کرنا چاہتے ہیں۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں سے اُن کے مذہبی مراسم مثلاً ختنہ وغیرہ ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

Marfat.com

ضبط قائم کر دیا تو ان اصحاب الرائے علماء کو بھی اطمینان ہوا۔ اب ایک فتوے بھی مرتب کیا گیا اور بقول منشی ذکاء اللہ خاں صاحب مساجد کے ممبروں پر بھی تذکرۂ جہاد ہونے لگا۔

غالباً اسی شش و پنج کے سبب سے مولانا فضل حقؒ بھی اگست سے پہلے دہلی نہیں پہنچ سکے۔ جب فتویٰ کی اشاعت ہوئی، تب مولانا نے بھی دہلی کا قصد فرمایا۔ خود مولانا اپنی خود نوشت سوانح "قید و بند"، الثورۃ الہندیہ" میں تحریر فرماتے ہیں:

هذا وقد انتهض من	(دہلی میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا)
بعض القرى والبلاد جمع	کہ کچھ دیہات و قصبات اور شہروں
من المسلمين الجلاد	سے بہادر مسلمانوں کی جماعت جدال
للجدال والجلاد والغزو	و قتال اور غزوہ و جہاد کے لئے
والجهاد۔ بعد الاستفتاء	اٹھی۔ اس سے پہلے وہ خدا ترس
والاستشهاد من العلماء	تارکِ دنیا علماء سے ائمہ اجتہاد
الزهاد وافتاءهم بوجوب	کے فتاوے کی روشنی میں وجوبِ
الجهاد بفتاوىٰ ائمة	جہاد کا فتوے حاصل کر چکی تھی۔
الاجتهاد۔ (الثورۃ الہندیہ)	

دہلی میں مولانا کی مشغولیت | منشی جیون لال نے اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے:

۱۶ر اگست ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق شریکِ دربار ہوئے۔ انہوں نے اشرفی نذر پیش کی اور صورتِ حال کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔

۱۸ر اگست: مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ انگریزی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ شہر پر قبضہ ہو جانے کے بعد باشندوں کا قتلِ عام کیا جائے گا۔ شہر کو مسمار کر دیا جائے گا، اور بادشاہ کے گھرانے میں ایک بھی آدمی ایسا نہ چھوڑا جائے گا جو بادشاہ کا نام لے یا اُسے پانی کا ایک قطرہ بھی دے سکے۔ اس کے بعد مولوی نے کہا۔ حضور کو مناسب ہے کہ سپاہیوں کو ترغیب دے کر انگریزوں کے مقابلہ سے روک دیا جائے

Marfat.com

کیونکہ وہ کسی نوع انگریزوں پر فتح نہیں پا سکتے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ اپنی افواج کو لڑانے کے لئے لے جاؤ اور انگریزوں کے خلاف لڑاؤ۔ مولوی نے جواباً کہا۔ افسوس تو اسی بات کا ہے کہ سپاہی اُن کا کہنا نہیں مانتے جو اُن کی تنخواہ دینے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ اچھا تو اپنی افواج کو محاصل جمع کرنے کے کام پر لگا دو۔

۲ ستمبر ۱۸۵۷ء : بادشاہ دربارِ عام میں تشریف فرما ہوئے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی فضل حق، میر سعید علی خاں اور حکیم عبدالحق[1] آداب بجا لائے۔

۶ ستمبر ۱۸۵۷ء : مولوی فضل حق نے اطلاع کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے۔

۷ ستمبر ۱۸۵۷ء : بادشاہ دربارِ خاص میں رہے۔ حکیم عبدالحق، میر سعید علی خاں، مولوی فضل حق، بدرالدین خاں اور دیگر اُمراء و رؤساء شریکِ دربار رہے۔

منشی ذکاء اللہ خاں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ مولانا نے ایک دستورِ اساسی کا مسوّدہ بھی مرتب کیا تھا۔

دہلی میں حضرت مولانا فضل حقؒ کی مصروفیتوں کے متعلق معلومات کا ذخیرہ صرف یہی ہے۔ اس کے ماسوا قیاس ہے جس کا دامن بہت وسیع ہے۔ یہاں اسکی نہ ضرورت ہے نہ موقع۔

دہلی سے روانگی | ۱۹ ستمبر کو دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہوا۔ مولانا اور اُن کے اہل و عیال پانچ روز تک کسی مکان میں بھوکے پیاسے بند رہے۔ پھر رات کی تاریکی میں اہل و کو ساتھ لے کر نکلے اور پا پیادہ سفر کی مصیبتیں جھیلتے ہوئے بھیکن پور ضلع علی گڈھ پہنچے۔ یہاں اٹھارہ روز چھپے رہے۔ پھر نواب صدر یار جنگ بہادر (مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی) کے عم محترم نواب عبدالشکور خاں رئیس بھیکن پور نے سانکرہ کے گھاٹ سے جو

---

[1] حکیم عبدالحق بن محمد حسن بخش دہلی کے رہنے والے مدت تک راجہ ناہر سنگھ والیِ بلب گڈھ کے ایجنٹ رہے۔ پھر مستعفی ہو کر دہلی آگئے۔ پھانسی کی سزا سے شہید کئے گئے۔

Marfat.com

بھیکن پور سے آٹھ میل پر ہے، دریا کے پار اُتار دیا۔ پھر کچھ مدت چھپے رہے[1]

گرفتاری جب ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے عفوِ عام کا اعلان ہو گیا تو مولانا بھی اس پر بھروسہ کر کے اپنے وطن خیر آباد پہنچ گئے۔ فرماتے ہیں:

مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر بھروسہ اور بے دین کی قسم پر اعتماد کسی بھی حالت میں درست نہیں ہے خصوصاً جبکہ وہ بے دین جزا و سزائے آخرت کا بھی قائل نہ ہو[2]۔

چند روز اطمینان سے گھر پر رہے۔ پھر دو آدمیوں نے آپ کی مخبری کر دی۔ گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا۔ عبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی اور تمام مال و اسباب حتیٰ کہ کتابیں بھی ضبط کر لی گئیں۔ حسبِ ضابطہ کچھ عرصہ ہندوستان کے جیل خانہ میں رہے۔ جہاں خود مولانا کے ارشاد کے مطابق:

ہر ممکن اذیت پہنچائی گئی اور قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایمان و اسلام پر مضبوطی سے قائم رہے اور اُن کا شمار علماء اعلام میں ہوتا تھا[3]۔

جیل کی اذیتوں کا خاکہ مولانا نے اپنی تصنیف "الثورۃ الہندیہ" میں ہندوستان کے جیل خانوں، انڈمان اور وہاں کے مصائب و تکالیف کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ چند اقتباسات کا ترجمہ درجِ ذیل ہے:

مکر و تلبیس سے جب نصاریٰ نے مجھے قید کر لیا تو ایک قید خانہ سے دوسرے قید خانہ، اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کیا۔ مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہنچایا۔ میرا جوتا اور لباس تک اُتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیئے۔ نرم بستر چھین کر خراب، سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کر دیا۔ گویا کانٹے بچھا دیئے گئے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئی تھیں۔ میرے پاس لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن تک

---

[1] باغی ہندوستان ص۱۵۸۔ [2] الثورۃ الہندیہ ص۴۱۶۔ [3] ایضاً ص۴۱۷۔

Marfat.com

نہیں چھوڑا۔ بخل سے ماش کی دال کھلائی اور گرم پانی پلایا۔ کوئی گرمجوش دوست تو کیا ملتا، گرم جوش پانی دیا گیا۔ اس ضعیفی اور پیرانہ سالی میں ہر وقت اور ہر آن ذلت و توہین سے کام لیا گیا۔

جزیرہ انڈمان پھر مجھے دریائے شور کے کنارے ایک ایسے پہاڑ پر پہنچا دیا گیا۔ جس کی آب و ہوا ناموافق، جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا ہے۔ اس کی گھاٹیاں دشوار گذار، پیچ در پیچ جنہیں دریائے شور کی موجیں ڈھانپ لیتی ہیں۔ اس کی نسیمِ صبح بھی سموم سے زیادہ گرم، غذا حنظل سے زیادہ کڑوی اور زہرِ ہلاہل سے زیادہ مضر، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے زیادہ ضرر رساں۔ ہر کوٹھری پر چھپر تھا جس میں رنج و مرض بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں کی طرح اُن کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں اور اُن سے بدبُو مہکتی رہتی تھی۔ امراض کی کثرت، بیماری عام، دوا ناپید اور مشکل۔ خارش اور قوبا[1] کا رواج عام۔ بیمار کے علاج، تندرست کے بقا، صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہیں۔ دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جا سکتی۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے۔ بخار موت کا پیغام، مرض سرسام اور برسام[2]۔ ہلاکت کی علت تام ہے، اور کتنی ہی بیماریاں ایسی ہیں کہ طب کی کتابوں میں ان کا نام و نشان نہیں۔ ڈاکٹروں کی یہ حالت کہ مرض کچھ دوا کچھ۔ مرنے والوں کے ساتھ یہ سلوک کہ مُردہ خاکروب کے حوالہ کر دیا جاتا ہے جو اُس کے کپڑے اُتار کر ٹانگ پکڑ کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے۔ نہ غسل نہ کفن نہ دفن نہ نماز جنازہ۔ اگر میّت کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا تو یہاں کی مصیبتوں کے مقابلہ میں مرجانا سب سے بڑی آرزو ہوتی، اور اگر مذہباً خودکشی ممنوع نہ ہوتی تو قید و بند کی ان مصیبتوں

---

[1] قوبا مرض کا نام ہے جس میں بدن کی کھال چھلنے اور پھٹنے لگتی ہے۔ [2] دماغ کے پردوں کا ورم۔

Marfat.com

سے نجات پالینا بہت آسان تھا۔

مَیں نہیں جانتا کہ ان مصیبتوں سے کس طرح چھٹکارا ہو سکے گا۔ خارش اور قوبا میں مبتلا ہو جانا مصیبت بالائے مصیبت ہے۔ صبح شام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے۔ رُوح کو تحلیل کر دینے والے درد اور تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔[1]

کسی قدر سہولت مولانا کو پہلے صفائی کے کام پر لگایا گیا تھا۔ برہنہ پا، صرف ایک لُنگی اور کمبل کا کرتہ۔ کوڑا کرکٹ صاف کرتے اور ٹوکرے میں اکٹھا کر کے پھینک آتے۔ مگر کچھ دنوں بعد آپ کو محرری کے کام پر لگا دیا گیا اور اس تبدیلی کا سبب آپ کا علمی تبحر ہوا۔ صورت یہ ہوئی کہ سپرنٹنڈنٹ کے پاس علمِ ہیئت کی ایک قلمی کتاب تھی۔ سپرنٹنڈنٹ کے یہاں ایک مولوی صاحب کام کرتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے مولوی صاحب کو دی کہ اس کی غلطیاں درست کر دیں۔ مولوی صاحب یہ کتاب مولانا کے پاس لے آئے۔ مولانا نے نہ صرف عبارتیں درست کیں بلکہ جگہ جگہ مضمون کی بھی تصحیح اور توضیح کر دی، اور کتابوں کے حوالے بھی درج کر دیئے۔ سپرنٹنڈنٹ کو جب مولانا کے علم و فضل کا احساس ہوا تو اُس نے صفائی کی خدمت سے ہٹا کر محرری پر لگا دیا، اور حکومت سے رہائی سفارش بھی کر دی۔

پروانۂ رہائی اور وفات علامہ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بیخبر میر منشی لفٹننٹ گورنر کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ ادھر انڈمان کے سپرنٹنڈنٹ جیل نے بھی سفارش کی تھی۔ نتیجہ میں کامیابی ہوئی یعنی رہائی کا حکم ہو گیا۔ لیکن عجیب و غریب اور نہایت تکلیف دہ اور دل خراش صورت یہ پیدا ہوئی کہ مولانا شمس الحق صاحب پروانۂ رہائی حاصل کر کے انڈمان پہنچے۔ جہاز سے اُتر کر شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا۔

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص۴۲۱ تا ص۴۲۴

Marfat.com

اُس کے ساتھ بڑا اژدھام تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۲۰ اگست ۱۸۶۱ء کو علامہ فضل حق خیرآبادی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب سپردِ خاک کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت و یاس شریکِ دفن ہوئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

جنرل بخت خاں

یہ تعجب خیز تو نہیں، حسرت انگیز ضرور ہے کہ بخت خاں جو دہلی کے محاذ پر شہاب ثاقب بن کر چمکا، اور ایسا چمکا کہ اس داستانِ سرفروشی میں دلچسپ و دل گیر ہے تو صرف اُسی کی کارگذاری اور معرکہ آرائی۔

اس کی زندگی کا آغاز اور انجام دونوں ایسے پردہ میں ہیں کہ اب تک کوئی بھی تحقیق و تفتیش اس کو بے نقاب نہ کر سکی۔ خود بخت خاں نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے اپنے متعلق بتایا تھا:

میں بھی آپ ہی کے خانوادہ سے ہوں[1]۔ میں سلطان پور علاقہ لکھنؤ کا باشندہ ہوں اور اودھ کے شاہی خاندان سے میری رشتہ داری ہے[2]۔

---

[1] منشی جیون لال کے روزنامچہ میں ۲ جولائی کی روئیداد میں درج ہے:

بادشاہ نے جنرل کو بخت میں باریابی دی۔ جنرل نے کہا۔ میں بھی آپ کے خانوادہ سے ہوں اطمینان کی غرض سے آپ تحقیقات فرما سکتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا۔ تحقیقات کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس وقت جنرل سے اور کوئی بڑا بہادر موجود نہیں ہے۔ جنرل نے جواب میں عرض کیا۔ میں بہادر کے خطاب کا مستحق ہو جاؤں گا اگر میں دہلی اور میرٹھ سے انگریزوں کو نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

[2] منشی جیون لال نے ۱۱ جولائی ۱۸۵۷ء کے روزنامچہ میں لکھا ہے۔ بخت خاں نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں سلطان پور علاقہ لکھنؤ کا باشندہ ہوں اور اودھ کے شاہی خاندان سے (بقیہ صفحہ آئندہ)

Marfat.com

اس مختصر سے جملہ میں نہ ولدیت اور خاندان کا تذکرہ ہے، نہ رشتہ داری کی تفصیل۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی نے اس اجمال کی کسی قدر تفصیل کی۔ آپ حیات علامہ فضل حق خیرآبادی میں تحریر فرماتے ہیں:

> اس سلسلہ میں سب سے بڑی اہم شہادت نواب دوندے خاں کی پڑپوتی چندا بیگم کی ہے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ غلام قادر روہیلہ شہید سے اُن کی قرابتِ قریبہ تھی، اور خاندان روہیلہ سے تھے۔ اُن کے والد کا نام عبداللہ خاں تھا۔ والیِ روہیل کھنڈ حافظ الملک رحمت خاں کا خاندان جب انگریزوں اور شجاع الدولہ کے مظالم کا شکار ہو کر برباد ہوا، تو غلام قادر خاں کا خاندان بھی اس سے محفوظ نہیں رہا۔ اس انتشار میں جس کا جدھر منہ اُٹھا، چلا گیا۔ چنانچہ بخت خاں کے والد مع اہلِ خاندان اودھ کے موضع سلطان پور میں بس گئے۔ نواب عبداللہ خاں روہیلہ جو خوبصورتی اور بہادری میں منفرد زمانہ تھے، شجاع الدولہ کے خاندان کی ایک شہزادی کی توجہ کا مرکز بن گئے اور اس معتوب روہیلہ سردار کی نوابانِ اودھ سے قرابت داری ہو گئی[1]

اس بیان سے کچھ تفصیل معلوم ہوئی لیکن بخت خاں کی تاریخِ ولادت، شہزادی کا شاہانِ اودھ سے اور عبداللہ خاں کا غلام قادر خاں سے کیا رشتہ تھا۔ یہ سوالات پھر بھی تشنۂ تفتیش رہ گئے۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) میری رشتہ داری ہے۔ میری درخواست ہے کہ اس بیان کی تصدیق فرمائی جائے بادشاہ نے فرمایا کہ تصدیق کی ضرورت نہیں۔ آپ یقیناً شریف و نجیب خاندان سے ہیں۔ جنرل نے پھر عرض کیا۔ میں تصدیق پر اس وجہ سے زور دے رہا ہوں کہ جب انگریزوں کو دہلی، آگرہ اور میرٹھ سے نکال دیا جائے گا تو اعزاز کے امتیازی نشان کے لئے استدعا کروں گا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] بحوالہ ۱۸۵۷ء کے ہیرو، مصنفہ سید انیس فاطمہ بریلوی ص ۶۵ و ۶۶۔

Marfat.com

تعلیم و تربیت کے بارے میں ہماری واقفیت کا کُل اثاثہ یہ قیاس ہے کہ جس کا عمل اس درجہ بلند تھا، اُس کا علم بھی لامحالہ بلند ہوگا، اور دستور بھی یہی تھا کہ اُونچے گھرانوں کے سرپرست اپنی اولاد کی تعلیم اور اُس زمانہ کی فوجی تربیت کا پورا اہتمام کیا کرتے تھے۔

ملازمت تعلیم و تربیت کے دَور سے گذر کر خود تکفلی کا زمانہ آیا تو بخت خاں انگریزی فوج میں بھرتی ہوگئے۔ ایک سپاہی کی حیثیت سے جنگِ افغانستان میں شریک ہوئے اور اس جنگ مسٹر سیل کے ماتحت بمقام جلال آباد وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے، کہ "توپ خانہ باتری" کے سب سے بڑے ہندوستانی افسر ہوگئے۔ اس باتری نے اپنی کارگذاریوں میں یہاں تک شہرت حاصل کی کہ اس کو ایک اعزازی نشان دیا گیا۔ یہ پھولوں کا محراب نما تاج تھا جو اس کی توپوں پر بنایا جاتا تھا۔[1]

بخت خاں افغانستان سے واپس ہوئے تو نیمچ چھاؤنی بھیج دیئے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں رہ کر غالباً دست بردار ہوگئے۔ پھر مولانا سرفراز علی صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے، اور جس طرح مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے مرشدِ طریقت نے بیعت کے وقت انگریزوں سے جہاد کرنے کا عہد لیا تھا، یہ مولانا سرفراز بھی بیعتِ جہاد ہی لیا کرتے تھے۔

اس بیعتِ جہاد کی آزمائش کا وقت بھی جلد ہی آگیا۔ چنانچہ جیسے ہی بریلی میں نواب بہادر خاں نے علمِ آزادی بلند کیا تو بخت خاں اس کے دست و بازو تھے۔

بریلی میں خان بہادر خاں کی حکومت قائم ہوگئی، اور وہ امن و امان میسّر آیا، جس کی عرصہ سے تمنائیں کی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ بقول سیّدہ انیس فاطمہ بریلوی اس زمانہ میں کثرت سے شادیاں اور دوسری تقریبات ہوئیں۔ ہر چیز کی ارزانی اور بہتات تھی۔ گرانی کا کہیں ذکر نہیں تھا۔[2]

---

[1] غدر کی صبح و شام ص۱۵۲۔ [2] ۱۸۵۷ء کے ہیرو۔

Marfat.com

مگر دہلی کا مرکز ہر طرح امداد کا محتاج تھا۔ لہٰذا بخت خاں ایک جرار فوج لے کر دہلی کے لئے روانہ ہو گئے۔

دہلی میں ورود منشی جیون لال کے روزنامچہ میں یکم جولائی ۱۸۵۷ء کی روئیداد میں درج ہے:

یکم جولائی ۱۸۵۷ء: محل (لال قلعہ) میں خبر آئی کہ بریلی کی فوج جمنا کے کنارے آ پہنچی ہے۔ چونکہ پُل خراب ہو چکا تھا اور اُس پر سے گذرنے کی صورت نہ تھی، لہٰذا بادشاہ نے چار سو قلیوں اور سفر مینا کی دو کمپنیوں کو میر فتح علی خاں کی سرکردگی میں پُل کی درستی کے لئے بھیج دیا۔ پھر معلوم ہوا کہ صبح تک فوج پُل پر سے گذر سکے گی۔ بادشاہ نے احمد قلی خاں (زینت محل کے باپ) کو اس فوج کے استقبال کا حکم دیا۔

بادشاہ سے ملاقات ۲ر جولائی کو احمد قلی خاں استقبال کے لئے گئے۔ حکیم احسن اللہ خاں، جرنیل صمد[1] خاں، ابراہیم علی خاں، غلام علی خاں اور دوسرے اصحاب بھی ساتھ تھے۔ احمد علی خاں اور بخت خاں نے بارگاہِ شاہی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ جہاں ارشاد ہو فوج متعین کر دی جائے۔ بادشاہ نے پہلے سے حکم جاری کر رکھا تھا کہ شہر کے باشندوں کو ہرگز نہ لُوٹا جائے۔ اس موقع پر فرمایا۔ میرے احکام حاصل کرنے سے کیا ہوگا۔ ان احکام کی تعمیل تو ہوتی نہیں اور نہ یہاں کوئی ایسا آدمی ہے جو انہیں نافذ کر سکے۔ میرا فرمان یہ ہے کہ انگریزوں کے لئے یہاں رہنے کی گنجائش نہ چھوڑی جائے۔

بخت خاں نے عرض کیا کہ سپہ سالار کی حیثیت میں میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں تاکہ عام ڈسپلن بحال ہو جائے۔ بادشاہ نے بطور اظہار محبت و اعتماد بخت خاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

بخت خاں اپنی فوج میں پہنچا تو صوبیداروں کو آگاہ کیا کہ بادشاہ نے میری خدمات

---

[1] عبدالصمد خاں نواب عبدالرحمٰن خاں والیِ جھجر کے خسر تھے۔ اڑھائی سو اُن کے ماتحت تھے۔ ہمت اور مردانگی سے جنگی کارروائیوں میں حصہ لیتے رہے۔ ان سے جنگی مشورے بھی لئے جاتے تھے۔ ناکامی کے بعد دہلی سے نکلے۔ عرصہ تک جگہ جگہ مقابلہ کرتے رہے پھر لاپتہ ہو گئے۔ ۱۲

Marfat.com

قبول فرمالی ہیں۔ اب مَیں پوچھتا ہوں کہ آپ میں سے کون کون میرا حکم مانے گا۔ سب صوبیداروں نے بخت خاں کے ہاتھ پر اطاعت کے حلف اُٹھائے۔

قیام گاہ پھر اُس نے دوبارہ بادشاہ سے ملاقات کی۔ عبدالرحمٰن خاں والیِ جھجھر کو حکم ہوا کہ کالا محل (کلاں محل) بخت خاں کی فوج کے لئے خالی کر دیا جائے۔ اس کی تعمیل ہوئی۔ پھر بخت خاں نے شاہزادہ مرزا مغل سے ملاقات کی[1]

خطابات، منصب اور مُہر محمد بخت خاں کو ایک ڈھال اور ایک تلوار کے علاوہ "جنرل" کا خطاب دیا گیا اور اُسے تمام افواج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا۔ منادی کرا دی گئی کہ تمام رجمنٹوں کے افسر محمد بخت خاں سے ہدایات حاصل کریں۔ مرزا مغل کو ایڈجوٹنٹ جنرل بنا دیا گیا۔

محمد بخت خاں نے عرض کیا کہ اگر شاہزادوں نے لُوٹ مار کی کوشش کی، تو مَیں اُن کے کان اور ناک کاٹ دوں گا۔ فرمایا۔ تمہیں پورا اختیار ہے، جس کام میں بہتری نظر آئے وہی کرو۔ اس فرمان کے مطابق شہر کوتوال کو اطلاع دے دی گئی کہ اب اگر لُوٹ مار ہوئی تو لُوٹنے والوں کو پھانسی دے دی جائے گی[2]

۴ جولائی ۱۸۵۷ء : جنرل بخت خاں کو فرزند کا خطاب عطا ہوا[3]

بدرالدین خاں دہلی میں بہت اچھی مُہریں بناتا تھا۔ ۷ اگست کو اُس کے نام بادشاہ کا فرمان جاری ہوا :

"ایک بہترین وضع کی مُہر تیار کر کے پیش کرو۔ اس پر بخت خاں کے تمام خطابات کندہ ہوں یعنی

معزالدولہ، مابدولت کا بندۂ خاص، محمد بخت خاں، لارڈ گورنر بہادر، ناظم جملہ اُمور فوجی و دیوانی"۔

---

[1] روزنامچہ منشی جیون لال۔ [2] روزنامچہ منشی جیون لال، ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کی روئیداد۔

[3] غدر کی صبح شام ص ۱۵۶۔

Marfat.com

"اور دستور کے مطابق اس پر سنہ جلوس اکیس ۲۱ درج ہو۔"[1]

اس کے بعد بخت خاں کی کارگذاریوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی تفصیل پوری کتاب میں گذر چکی ہے۔ دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

دہلی سے روانگی اور زندگی کا آخری دَور دہلی میں ناکامی کے بعد جنرل بخت خاں ۱۹ ستمبر کو دہلی سے نکلا تو مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کی روایت یہ ہے:

> جنرل صاحب نے مع اپنی فوج کے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ جہاں پہنچتے پہنچتے اُن کی ہمراہ صرف پانچ ہزار فوج، ۳۳ عورتیں نیز دلّی فرخ آباد کے کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے۔

اس کے بعد جب لکھنؤ پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہوا تو بخت خاں، مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے ہمراہ شاہ جہان پور چلے گئے۔ مولانا احمد اللہ شاہ صاحب نے شاہ جہان پور سے ہٹ کر "محمدی" میں محاذ قائم کیا تو یہاں پر بھی شاہ صاحب کے رفقاءِ خاص میں بخت خاں کا تذکرہ آتا ہے۔ اس کے بعد جنرل موصوف کے حالات نامعلوم ہیں۔ غالب یہی ہے کہ حضرت محل وغیرہ کی طرح یہ بھی نیپال چلے گئے اور وہیں زندگی کے باقی دن پورے کر دیئے۔ رحمہ اللہ۔

اے مُرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ جاں شد و آواز نیامد

بخت خاں ایک مردِ مجاہد بخت خاں ایک روہیلہ نوجوان، بمبر برطانوی فوج کا ایک افسر۔ پھر جنگِ آزادی کا ہیرو اور کارزارِ حق و صداقت کا مردِ مجاہد۔

لیکن وہ برطانوی افسر سے مجاہدِ حریّت کیسے بنا؟

مفتی انتظام اللہ شہابی کا بیان یہ ہے:

"سیّد احمد بریلویؒ کے مریدین میں سے رئیس المجاہدین مولوی سرفراز علی

---

[1] بہادر شاہ کا مقدمہ (انگریزی) ص۳۱ و ص۶۸ بحوالہ مُہر

Marfat.com

گورکھ پور کے اضلاع میں انگریزوں کے خلاف ایک عرصہ سے خفیہ طور پر بیعتِ جہاد لے رہے تھے۔ وہ دورہ خود بھی کرتے اور اپنے خلفاء کو بھی دیہاتوں میں بھیجتے تھے۔ چنانچہ جب سلطانپور پہنچے، ایک صوبہ دار بخت خاں، نواب دوندے خاں کے خاندان سے تھا جس کے والد نے نواب شجاع الدولہ (لکھنؤ) کے خاندان میں شادی کر لی تھی، وہ مولوی سرفراز علی کا مرید ہوا، اور اُس نے بیعتِ جہاد کی۔[1]

بہرحال تبدیلی کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن ایک منصفانہ تبصرہ کے وقت یہ بات نظر انداز نہ ہونی چاہیئے کہ یہ تبدیلی بہت بڑی قربانی تھی۔

بخت خاں کو توپ خانہ کا وہ منصب حاصل تھا جو اس زمانہ میں شاید ہی کسی اور ہندوستانی کو حاصل ہو، اور بشرطِ استواری اس میں اضافہ کی توقع تھی۔ جنرل بخت خاں نے یہ منصب اور یہ اعزاز ہی قربان نہیں کیا بلکہ زندگی کے تکلّفات اور راحت و آسائش کے تمام اسباب و سامان بھی قربان کر دیئے تھے اور غالباً شوقِ مساوات میں وہ وضع اختیار کر لی تھی جو سب سے کم درجہ کے فوجیوں کی ہوتی تھی۔

سیّد ظہیر دہلوی نے بریلی والے جنرل کا نام بہت کچھ سُنا تھا۔ جب سامنے سے دیکھا تو وہ پہچان بھی نہ سکے۔

"سر پر انگوچھا لپٹا ہوا، کرچ گلے میں پڑی ہوئی، پیچھے چال کُھلا۔ بریلی والا جرنیل وہی تھا۔ ظاہر تو اس کا لباس گھس کھدوں کا تھا۔ میں تو سمجھا جیسے اور پُوربی سپاہی ہیں یہ بھی سپاہی ہوگا۔"[2]

نو بہار است جنوں چاکِ گریباں مددے
آتش افتاد بجاں جنبشِ داماں مددے
رحمہ اللہ وطاب ثراہ

---

[1] ابوظفر بہادر شاہ ص۴۱۔ [2] داستانِ غدر

Marfat.com

شاہزادہ فیروز شاہ

حمیّتِ تیموری کا آخری نشان

خانوادۂ بابر کے وہ سینکڑوں نوجوان جو قلعۂ معلّٰے اور اُس کے قرب و جو میں رینگ رہے تھے، جو نکبت و افلاس کے باوجود سلاطین کے نام سے خوش ہوتے تھے، ان سب میں جس نے بابر کی یاد تازہ کی، یہ جواں ہمّت فیروز شاہ تھا۔

فیروز شاہ، صاحبِ عالم مرزا ناظم بخت خلف شاہ عالم ثانی کا لختِ جگر تھا اپنے والد بزرگوار کی زیرِ نگرانی علومِ مروّجہ اور فوجی تربیت مکمّل کر چکا تھا۔ قدرت نے اس کی فطرت کو مذہبی رجحانات سے نوازا تھا۔ چنانچہ حج بیت اللہ شریف کا شوق پیدا ہوا، اور غالباً شاہانِ مغلیہ اور موجودہ "سلاطین"[1] (شاہزادوں) میں صرف یہی سلطان تھا جو حج بیت اللہ اور زیارتِ روضۂ اقدس سیّد الکونین صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوا۔ ادائے فریضہ کے بعد جب ہندوستان واپس پہنچا تو یہاں جنگِ آزادی کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ شاہزادہ بظاہر بندرگاہ سورت سے جہاز پر سوار ہوا تھا، اور اسی بندرگاہ پر جہاز سے اُترا۔ جس سے کچھ فاصلہ پر مالوہ کا وہ علاقہ تھا جہاں جہادِ حریّت نے شاہزادہ کی تگ و دو کے لئے میدان تیار کر رکھا تھا۔

مفتی انتظام اللہ شہابی تحریر فرماتے ہیں:

حکومت کو ان کی آمد کا پتہ لگا تو ان کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔"

ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے:

"وسط اگست میں مالوہ کے اندر سرکشی نے خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کی سالاری کا منصب "فیروز شاہ" نام ایک مذہب دوست

---

[1] شاہی خاندان کے افراد کو سلاطین کہا جاتا تھا۔ یہی محاورہ تھا۔

Marfat.com

اور مجاہد شاہزادے نے سنبھال لیا۔ "مندلیسور"[1] کے مسلمانوں نے دوسرے فرقوں کو ملا کر گوالیار کی حکومت ختم کر دی اور شاہزادہ کی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ وہاں بہت سے مواتی، مکرانی اور افغانی موجود تھے۔ وہ ساتھ ہو گئے۔ مندلیسور کا حاکم اور کوتوال زخمی ہوا۔ ایک افسر مارا گیا۔ پھر حاکم کے محل پر حملہ ہوا۔ خزانہ لوٹ لیا گیا۔ دفاتر جلا دیئے گئے۔ یہاں کے قدیمی اُمراء میں ایک شخص "مرزا جی" تھا۔ اس کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔

ایسا بہتر نظم و نسق قائم کیا گیا کہ جنوب سے تمام روابط منقطع کر دیئے گئے۔ سرکاری ڈاک کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ انگریزوں نے قاصدوں کے ذریعہ خبریں بھیجنے کی کوشش کی تو انہیں پکڑ کر موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔[2]

"دہلی چلو" کا نعرہ[3] اس وقت بھی بلند ہوا ہو گا۔ چنانچہ شاہزادہ گوالیار سے دہلی کی طرف بڑھا۔ اوّل دھول پور پہنچا۔ یہاں کے تحصیلدار سے ایک لاکھ روپیہ وصول کیا۔ افغانی ملازم رکھے۔ ابھی آگے نہیں بڑھا

---

[1] مندلیسور۔ ریاست گوالیار کا مشہور مقام ہے جو اُجین سے تقریباً اسّی میل شمال میں واقع ہے۔ یہاں جولائی ۱۸۵۷ء میں ریاست گوالیار کی بعض سرکش افواج قابض ہو چکی تھیں۔ آہستہ آہستہ ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ پورے مغربی مالوہ میں انگریزوں کے خلاف آگ بھڑک اُٹھی۔ اس مقام پر ادھر اُدھر سے بہت سی فوج جمع ہو گئی تھی جس نے شاہزادہ فیروز شاہ کو اپنا قائد و سپہ سالار بنا لیا تھا۔ مندلیسور کے آس پاس متعدد مقامات تھے جہاں ساز باز کے رشتے قائم ہو چکے تھے۔ ریاست دھار کا نوجوان راجہ اور اس کا وزیر رامچندر بابوجی، نیز راجہ کی والدہ اور چچا انگریزوں کے خلاف بڑی سرگرمی دکھا رہے تھے۔ نیمچ بھی اسی علاقہ میں ہے جہاں بغاوت کی آگ سلگ رہی تھی۔ مہرہ ۱۲۲۔ [2] عذر ہند کا ایک بھولا ہوا باب از شاورز Shawarz (۱۸۵۷ء کے مجاہدین ص ۱۲۲)۔ [3] جیسا کہ ۱۹۴۲ء میں نیتاجی سوبھاس چندر بوس کی زیر قیادت آزاد ہند فوج کا یہ ایک طے گردہ نعرہ تھا۔

Marfat.com

تھا کہ شکستِ دہلی کی خبر اُس کے کانوں میں پڑی۔ لہٰذا دہلی کے بجائے آگرہ کا رُخ کیا۔ انگریزی فوج نے کالی ندی پر آکر مقابلہ کیا اور شکست پاکر قلعہ بند ہو جانے پر مجبور ہو گئی۔ خدا جانے کیا مصلحت تھی کہ شہزادہ یہاں سے موات[1] کی طرف چلا گیا۔ شیخ فضل علی رسالدار، جنرل عبدالصمد اور اس علاقہ کے میواتیوں نے ہمنوائی کی[2]۔ دہلی کے بقیۃ السیف مجاہد بھی آکر مل گئے۔ اب یہ خاصی جمعیت ۲۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو متھرا پہنچی۔ وہاں اس کے ساتھ ایک اور فوج مل گئی۔ جس میں زیادہ تر ۷۰ دیسی پیادہ فوج کے آدمی تھے اور ہیرا سنگھ اس کا صوبیدار تھا۔ اسی طرح وسط ہند (ناگپور) وغیرہ کے لوگ بھی اس فوج میں آکر شامل ہو گئے[3]۔

یہ شاہزادہ اس جمعیت کے ساتھ فرخ آباد "شاہ جہان پور" ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچا۔ یہاں ان کا بہت احترام کیا گیا۔ پہلے سلطان بہو صاحبہ کے مکان میں بسبب قرابتِ قریبہ اُترے[4]۔

سلطان بہو صاحبہ نے حضرت محل سے کہلا بھیجا کہ میں محتاج ہوں مجھ سے ان کی خدمت کیا ہو سکے گی؟ سرکار سے دوسرا مکان اُن کے رہنے کو ملے تو اچھا ہے۔ اس جہت سے ایک اور مکان علیحدہ اُن کے قریب تجویز ہوا۔ مبلغ پانچ ہزار روپے دعوت کے آئے[5]۔

جب تک لکھنؤ میں مقابلہ جاری رہا۔ شاہزادہ فیروز شاہ اسی جگہ رہا۔ جب لکھنؤ خالی ہوا تو اپریل ۱۸۵۸ء میں مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے پاس شاہ جہان پور پہنچا اور شاہ صاحب کے ساتھ جنگ میں شریک رہا۔

مراد آباد کے تذکرہ میں گذر چکا ہے کہ شاہزادہ فیروز شاہ اپنی فوج کے ساتھ مراد آباد

---

[1] غالباً بھرت پور کا علاقہ مراد ہے۔ یہاں سے موات علاقہ شروع ہوتا ہے۔ [2] قیصر التواریخ جلد دوم ص۴۶۵۔ [3] میلی سن۔ [4] قیصر التواریخ ص۴۶۵۔ [5] ایضاً ص۳۱۳ و ص۳۱۴۔

Marfat.com

بھی پہنچا تھا۔ وہاں خان بہادر خاں کا چچا ناظم تھا۔ اُس نے کہلا بھیجا کہ شاہزادہ کے لئے چلا جانا ہی بہتر ہے۔ شاہزادہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ہم تھکے ہوئے ہیں اور روزے سے ہیں۔ آج ٹھہرنے اور روزہ افطار کرنے کی اجازت دیجئے، کل نجیب آباد چلے جائیں گے ناظم نے منظور نہ کیا بلکہ فوج اور توپیں بھیج دیں۔ شاہزادہ نے مقابلہ کیا۔ ناظم کی فوج کو بھگا دیا اور اس کا سارا سامان ضبط کر لیا۔

نواب رام پور انگریزوں کے سخت حامی تھے۔ نواب صاحب نے فیروز شاہ کے مقابلہ کے لئے اپنے بھائی کاظم علی خاں کو ایک فوج دے کر بھیجا۔ شاہزادہ نے اس کو بھی شکست دی۔ چھٹے دن نجیب آباد اور رام پور سے سات ہزار انگریزی فوج بھاری توپ خانہ اور پورے ساز و سامان کے ساتھ پہنچی۔ شاہزادہ اُس کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا تھا، لہٰذا محصور ہونے سے پہلے مع فوج صحیح سالم نکل کر بریلی پہنچ گیا۔ جہاں نواب خان بہادر خاں نے شاندار استقبال کیا۔ شاہزادہ کو اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھا کر جلوس کے ساتھ شہر کا گشت کیا۔[1]

شکست بریلی کے بعد شاہزادہ، مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے پاس شاہجہانپور پہنچا۔ محمدی میں شاہ صاحب نے اپنی طاقت کو دوبارہ منظم کر کے حکومت قائم کی، تو شاہزادہ اُن کے ساتھ ہی تھا۔ محمدی کی شکست کے بعد شاہزادہ نے نیپال کے بجائے دوبارہ اودھ کا رُخ کیا۔ سندیلہ، بانگرمئو، صفی پور، خیرآباد، باڑی وغیرہ میں قسمت آزمائی کی۔ پھر بلھور کے گھاٹ سے دریائے گنگا کو عبور کیا اور ملاحوں کو دو سو روپے انعام دیئے۔ بعد ازاں مکن پور، درگاہ مدار، حوالی، اٹاوہ وغیرہ سے ہوتے ہوئے شیر پور کے گھاٹ پر جمنا سے پار اُترا۔ جگہ جگہ مقابلہ ہوا۔ بے جگری سے لڑا اور صحیح سالم نکلتا چلا گیا۔ جنوری ۱۸۵۹ء کو وہ اندر گڑھ میں تانتیا ٹوپے سے جا ملا۔ ۲۱ جنوری ۱۸۵۹ء کو اُس سے الگ ہوا۔ اپریل ۱۸۵۹ء میں وہ سرونج کے جنگلوں میں تھا۔[2]

---

[1] قیصر التواریخ وغیرہ۔ [2] میلی سن جلد پنجم بحوالہ مہر۔

Marfat.com

اس کے بعد یہ تو تسلیم ہے کہ ہندوستان سے صحیح سالم بچ کر نکل گیا۔ اس میں اختلاف ہے کہ ہندوستان سے نکل کر کہاں پہنچا۔

کمال الدین حیدر (مصنّف قیصر التواریخ) لکھتے ہیں :

آخر کار اٹک دریا اُتر کر کابل سے ہو کر داخل مُلک ایران ہُوا۔ وہاں سے رہبری پا کر داخل ملک روس ہُوا۔ کہتے ہیں، وہاں اپنی جماعت قلیل سے بخوبی بسر کرتے ہیں۔ وہاں کی سلطنت سے بجہت ناموسی کچھ کفالت ہوتی ہے۔

مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی تحریر فرماتے ہیں :

روس ہو کر حجاز چلے گئے۔ مکّہ معظمہ میں اقامت اختیار کی ۱۸۹۵ء میں انتقال ہُوا۔ رحمۃ اللہ رضی عنہ۔

خاتمۂ کلام اور معذرت

کئی سو صفحات سیاہ ہو گئے۔ مگر داستان ۱۸۵۷ء اب بھی ناتمام رہی۔ صرف دہلی اور روہیل کھنڈ کے جستہ جستہ واقعات اور اس علاقہ کے چند علماء اور زعماءِ تحریک کا تذکرہ آسکا، اُن کا شمار تو ممکن ہی نہیں جو لائن میں کھڑے کر کے گولیوں سے اُڑا دیئے گئے یا توپ دم کر دیئے گئے یا کسی درخت پر لٹکا کر پھانسی دے دیئے گئے۔ وہ جرنیل اور مجاہد جن کے کچھ تذکرے منتشر طور پر کتابوں میں ملتے ہیں، ان کی تعداد بھی بہت ہے، اور اُن کو یکجا کرنے کے لئے ایک اور ضخیم جلد کی ضرورت ہے۔ مگر یہ ضرورت کس طرح پُوری ہو؟ اس کا جواب توفیقِ ایزدی پر موقوف ہے۔

دہلی کی طرح لکھنؤ اور کان پور کے محاذ بھی تفصیل طلب ہیں۔ مالوہ کا علاقہ بھی آماجگاہ رہا ہے۔ لکشمی بائی (مہارانی جھانسی) کنور سنگھ (جگدیش پور، ضلع آرہ، شاہ آباد

Marfat.com

بہار اسٹیٹ) ریاست دھاکے نوجوان راجہ اور راجہ بلب گڈھ جیسے فداکارانِ حریت نے جو کام کئے، یہ سب تاریخِ حبِ وطن کے زرّیں باب ہیں۔

عظیم اللہ خاں، نانا راؤ پیشوا، تانتیا ٹوپے، مولانا پیر علی، نواب تفضّل حسین فرخ آباد، سیّد اکبر زماں کے حالات جناب غلام رسول صاحب مہر اپنی تازہ تصنیف "۱۸۵۷ء کے مجاہدین" میں اس تفصیل سے پیش کر چکے ہیں کہ سر دست اس پر اضافہ مشکل ہے۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کی تصانیف میں بہت سے مشاہیر کا ذکر آ چکا ہے۔ یہاں اُن کو نقل کر کے کتاب کو گراں بار بنانا نہ ہمیں پسند ہے، نہ ناظرینِ کرام اس تکلّف کو پسند کریں گے۔ لہٰذا سلسلۂ تحریر یہیں ختم کیا جاتا ہے۔ البتہ ہمی گریں کا دلچسپ تذکرہ یہاں اس لئے پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے فداکارانِ حریت کی قابلیتوں اور غیر معمولی صلاحیتوں پر ہلکی سی روشنی پڑے گی۔

یہ پورا تذکرہ "العلم" کراچی کے جنگِ آزادی نمبر (اپریل تا جون ۱۹۵۷ء) سے ماخوذ ہے۔ اس کے بعد شاندار ماضی جلد چہارم کے سب سے پہلے ایڈیشن[1] کے چند صفحات بطور یادگار نقل کئے جائیں گے۔ یہ اُن مظالم کی قلمی تصاویر ہیں جو ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں کمزور اور نہتے ہندوستانیوں پر بجرم سرّیت طلبی، مہذب اور سائستہ انگریز کی طرف سے روا رکھے گئے تھے۔

---

[1] یہ وہی ایڈیشن ہے جو ۱۹۳۹ء میں ضبط کیا گیا تھا۔

Marfat.com

سرگذشت محمد علی خاں بریلوی
عرف جیمی گرین

۱۸۵۷ء کے چشم دید واقعات اور پُر اثر روایتیں اکثر انگریزوں نے یادداشتوں اور سرگذشتوں کے نام سے چھاپی ہیں۔ چنانچہ ایک انگریز فوجی افسر فوربس میچل نے بھی جو کان پور اور لکھنؤ دونوں جگہ کے معرکوں میں شریک تھا اپنے روزنامچہ سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی۔ یہ کتاب میسرز میکمیلن اینڈ کو کے یہاں چھپی تھی۔ اور اس کے ایک حصہ کا اُردو ترجمہ جو محمد علی خاں، عرف جیمی گرین کے حالات پر مشتمل ہے، منشی محمد شفیع الدین خاں مرادآبادی نے جولائی ۱۸۹۶ء میں شائع کیا تھا۔ اصل انگریزی کتاب اور یہ ترجمہ اب قریب قریب ناپید ہے۔ ایک نسخہ مفتی محمد انتظام اللہ صاحب شہابی، اکبرآبادی کے پاس موجود ہے۔ اس کو اس مضمون کا ماخذ سمجھنا چاہیئے۔

گوروں کی رجمنٹ ۹۳ء (ترکوں اور روسیوں کی کریمیا کی لڑائی کے بعد جس میں سلطان المعظم کو فتح نصیب ہوئی تھی) انگلستان سے مئی ۱۸۵۷ء میں لارڈ الگن موجودہ وائسرائے ہند کی ماتحتی میں روانہ ہوئی۔ افریقہ پہنچنے پر ہندوستان کا غدر فرو کرنے کے لئے یہاں بھیج دی گئی اور ۲۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ اور کان پور کے مرحلوں کے بعد نانا راؤ کا تعاقب اور بعض مفسدوں کی سرکوبی فتح گڈھ میں کر کے دوبارہ لکھنؤ جا رہی تھی۔ ۱۰ فروری کو اناؤ میں قیام تھا اور دس روز تک یہیں ٹھہرنا پڑا۔

میچل صاحب (جن کی کتاب سے ترجمہ کر کے یہ سرگذشت لکھی جاتی ہے)

Marfat.com

لکھتے ہیں کہ ایک روز میں خیمہ کے اندر لیٹا ہوا تھا کہ سامنے سے ایک شخص کو صدا لگاتے سُنا۔ پلم کیک، نہایت عمدہ پلم کیک۔ اوّل چکھو، بعد میں خریدو۔ چونکہ بسکٹ اور معمولی گوشت کھاتے کھاتے جی اُکتا گیا تھا۔ لہٰذا اس مٹھائی والے کا وہاں آنکلنا بہت ہی اچھا معلوم ہوا، اور اُسے فوراً اندر بُلا کر چکھوتیاں شروع کیں۔ یہ مٹھائی فروش بڑا ہی خوبصورت جوان تھا۔ اس کے کپڑے انتہا درجہ کے سفید تھے۔ داڑھی اور مونچھیں خوب چڑھی ہوئی تھیں۔ ماتھا چوڑا اور ناک ذرا خم دار تھی۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی، اور باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شکری نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ جو مزدور تھا، بڑا ہی شریر معلوم ہوتا تھا۔

مَیں نے (یعنی میجل نے) اس سے پوچھا، تمہارے پاس، پاس ہے؟

مٹھائی فروش : جی ہاں! کیوں نہیں لیجئے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ بریگیڈیر میجر صاحب نے نہیں۔ خود بریگیڈیر صاحب نے دیا ہے۔ مَیں جیمی گرین کے نام سے مشہور ہوں۔ اور دوسرے رجمنٹ کے خانساماں کا لڑکا ہوں۔ شیر صاحب مجسٹریٹ کانپور کی سفارشی چٹھی جنرل ہوپ صاحب کے نام لایا ہوں۔

مَیں نے چٹھی دیکھی تو واقعی شیر صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی اور جنرل ہوپ صاحب کے نام تھی۔ مٹھائی فروش کی ہیئت کے علاوہ جس بات پر مجھ کو سخت حیرت تھی وہ اس کی صاف ستھری انگریزی تھی جس کو وہ نہایت بے تکلفی سے بولتا تھا۔ مجھ سے انگریزی اخبار لے کر پڑھنے لگا۔ اور فوج کے متعلق ہر قسم کی بات چیت شروع کر دی۔ اُس نے پوچھنا شروع کیا۔ آج کل کتنے جوان ہیں؟ آپ نے لکھنؤ کے محاصرے کے لئے کیا کیا تیاریاں کی ہیں؟ آپ لوگ تو ولایت سے ابھی ابھی آ رہے ہیں، گرمی کیسے گذاریئے گا؟

مَیں نے اس ضمن میں اس کی شُستہ و شگفتہ انگریزی کا ذکر کیا تو کہنے لگا کہ میرا باپ مسکوٹ میں خانساماں ہے۔ اُس نے بچپن میں مجھے انگریزی سکھلائی۔ مَیں نے

Marfat.com

رجمنٹ سکول میں انگلش تعلیم پائی ہے۔ عرصہ تک مسکوٹ کا کلرک بھی رہا ہوں، وہاں سارا حساب وکتاب انگریزی میں لکھتا تھا۔ اس عرصہ میں اس شریر نوکر اور ایک گورے میں لڑائی ہونے لگی۔ میں نے اُس سے کہا۔ ارے میاں تمہارا یہ نوکر تو بڑا ہی لڑاکا ہے کہنے لگا۔ حضور آپ اس کا خیال نہ فرمائیے۔ یہ بڑا ہی شریر ہے۔ آئرلینڈ کا رہنے والا ہے۔ اس کی ماں آٹھویں آئرش رجمنٹ میں رہتی ہے اور اس کا سب پر زور ہے۔ یہ پنجاب سے ابھی ابھی آگرہ کی فوج کے ہمراہ آیا ہے۔ کان پور کے کمانیر نے اسے موقوف کر دیا ہے کیونکہ اس کی میم نوعمر تھی اور تیکھی چتون پر عاشق ہو گئی تھی۔

خیر مذاق تو ہو گیا مگر مٹھائی لے کر قیمت نہ دینا آپ ہی کا کام ہے۔ ان دل کش باتوں پر سب لوگ اس قدر ریجھ گئے کہ زبردستی اس گورے سے جس نے مٹھائی اس شریر نوکر سے چھین لی تھی، دام دلوا دیئے۔ اُسی روز شام کو میں نے سُنا، کہ جیمی گرین جو اپنے آپ کو مسکوٹ کے خانساماں کا بیٹا بتاتا تھا، لکھنؤ کا جاسوس نکلا۔ چونکہ شام ہو گئی تھی، اس لئے اُسے پھانسی نہ دی گئی۔ میری حراست میں بھیج دیا گیا، اور زائد سنتری پہرے کے لئے تعینات کر دیئے گئے۔ اس وقت مجھ کو بڑا صدمہ گذرا، کیونکہ میں اُس کی اوّل ہی ملاقات سے اُس کا دم بھرنے لگا تھا۔ اب میرا وہ تعجب بھی جاتا رہا کہ ایسا مہذّب اور تعلیم یافتہ شخص لشکری بنا ہوا ہے۔

اُس کا نوکر وہ جلّاد بوچر تھا جس نے جولائی ۱۸۵۷ء میں خون کی ندیاں بہائی تھیں اور فسچٹ صاحب نے اپنی کتاب میں جو اس کا حلیہ لکھا تھا وہ قطعی ٹھیک تھا۔ کیونکہ وہ طویل القامت، بدصورت، سیاہ فام، چیچک رو تھا۔

جب یہ دونوں میرے پہرے میں دیئے گئے تو بعض گوروں نے کہا کہ ان کو بازاری سور کا گوشت کھلانا چاہیئے لیکن میں نے صاف کہہ دیا کہ اگر کسی نے ایسی بات کا ارادہ بھی کیا تو میں فوراً حکم عدولی کے جُرم میں حوالات کر دوں گا۔ میں نے یہ الفاظ جو ڈانٹ کر کہے، سب ڈر گئے اور پھر کسی نے کچھ نہ کہا۔

Marfat.com

جیمی گرین کے چہرے سے سچے شکریہ کے آثار پائے جاتے تھے۔ کہنے لگا۔ خدائے کریم اور اُس کا رسول پاک آپ کو اس کا اجر دے گا، اور اس لڑائی میں بال تک آپ کا بیکا نہ ہوگا۔

مَیں نے یہ سُن کر کہا کہ مَیں حتی الوسع تمہیں آزادی دلانے کی کوشش کروں گا۔ اور اُسے نماز پڑھنے کی اجازت دے دی۔ لیکن وہ شریر نوکر کہنے لگا۔ مَیں ہرگز کافروں کا احسان نہیں لُوں گا۔ اس پر اُس کا مالک یعنی جیمی گرین بولا۔ ارے کمبخت! سارجنٹ صاحب (کیونکہ مَیں اس وقت سارجنٹ ہی تھا) کا ہم کو ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے ہمیں سؤر کی چربی سے بچا لیا۔

مَیں نے ارادہ کیا کہ آج تمام رات جاگوں۔ ورنہ یہ لوگ کہیں بھاگ گئے تو مفت میں بدنام ہوں گا، اور یہ تو مَیں خوب جانتا تھا کہ رات ان کی زندگی کی آخری رات ہے۔ لہٰذا مَیں نے ایک مسلمان دوکاندار کو بلا کر کہا کہ یہ جو مانگیں، انہیں لا دو۔ اور قیمت مجھ سے لے جاؤ۔ وہ کہنے لگا۔ جب آپ عیسائی ہو کر اتنا سلوک کرتے ہیں تو تف ہے اُس مسلمان پر جو ایک پائی بھی لے۔ مَیں نے ایک کمبل جیمی گرین کو دیا اور اُسے اپنی سرگذشت سُنانے پر مجبور کیا۔

مَیں نے اس سے کہا سُنو جیمی گرین! یہ تم اور مَیں خوب جانتے ہیں کہ آج کی رات تمہاری زندگی اور ہے اور صبح کو ضرور پھانسی لٹکو گے۔ لہٰذا اگر تم مجھے اپنی پوری اور سچی سرگذشت سُناؤ تو مَیں بہت شکرگذار ہوں گا۔ اُس نے کہا۔ صاحب آپ نے ہم پر اتنی بڑی عنایت کی ہے جس کی کچھ حد نہیں۔ میری سرگذشت آپ کان لگا کر سنئے۔

مَیں بیگم کی فوج کا ایک افسر ہوں اور لکھنؤ سے محض اس غرض سے آیا تھا کہ اس فوج کی جو ہمارے مقابلہ کو جا رہی ہے، حالت دیکھوں۔ میرا عہدہ فوج میں چیف انجینئر کا ہے اور خفیہ حالات دریافت کرنے نکلا ہوں۔ لیکن خدا کی مرضی میں کس کو دخل لکھنؤ میں میرا انتظار ہوگا اور یہاں مَیں موت کے منہ میں جانا چاہتا ہوں۔ اگر نصیب یاور

Marfat.com

ہوتا، تو آج رات ہی جا پہنچتا۔ کیونکہ ضروری بات دریافت کر چکا تھا مگر اناؤ راہ میں پڑھ جانے سبب اس لالچ میں آگیا کہ دیکھوں محاصرہ کرنے والی فوج چل دی کہ نہیں۔ اس ولدالزّنا قصاب نے مجھ کو جاسوس کہہ کر گرفتار کرا دیا۔ یہ مردود وہ ہے جس نے اوّل انگریزوں کو پھانسی دلوائی اور خود قتل کیا، اور اب خود اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں پہ ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔ مَیں نے ٹوک کر کہا۔ تمہارا اصلی نام کیا ہے؟ مَیں تمہارے حالات لکھ کر اپنے دوستوں کو اسکاٹ لینڈ اور لندن میں بھیجنے والا ہوں۔ اُس نے کہا۔ آپ مجھ سے میرا نام دریافت کرنا چاہتے ہیں اور اپنے اسکاچ دوستوں کو میرا حال لکھنا چاہتے ہیں۔ خیر مجھے اس سے کوئی تعرض نہیں۔ انگلستان اور سکاٹ لینڈ کے لوگ منصف مزاج ہیں وہ میری سرگذشت پڑھ کر ضرور متاسف ہوں گے خود میرے بھی دوست لندن اور اڈنبرا میں موجود ہیں۔ مَیں وہاں دو دفعہ ہو آیا ہوں۔ میرا نام محمّد علی خاں ہے۔ مَیں روہیل کھنڈ کے ایک بڑے شریف خاندان سے ہوں میں نے بریلی کالج میں تعلیم پائی ہے اور انگریزی زبان میں خصوصاً بڑا نام پیدا کیا ہے۔ بریلی کالج سے انجینئرنگ کالج رڑکی گیا تاکہ سرکار کمپنی کی ملازمت اختیار کروں۔ رڑکی کالج کے امتحان میں اوّل آیا اور تمام انگریزوں سے مَیں نے بہت زیادہ نمبر پائے۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کے انجنیئروں میں صرف جمعدار مقرر ہوا، اور اس سارجنٹ کی ماتحتی میں دیا گیا جو سوائے جہالت اور وحشی پن کے مجھ سے ہر بات میں کم تھا۔ اگر ولایت میں ہوتا تو صرف بڑھئی ہوتا۔ ہم دونوں پہاڑ پر تعینات ہوئے۔ جیسے اکثر خر دماغ ہوا کرتے ہیں وہ بھی یورپین عیبوں کی مجسّم تصویر تھا یعنی مغرور، خود رائے اور خود غرض۔ انہیں باتوں سے ہم لوگ سخت نفرت کرتے ہیں۔ جب تک آپ ہم لوگوں کی زبان نہ سیکھیں اور شرفاء سے میل جول پیدا نہ کریں، اُس وقت نہ آپ جان سکتے ہیں، اور نہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے کندہ ناتراش سے آپ کی قومی عظمت اور ناموری پر کتنا بڑا دھبہ لگتا ہے۔ ایسی ہی مثالیں آپ کے وہ دشمن اپنے دعووں کی تصدیق میں

Marfat.com

پیش کیا کرتے ہیں جو اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کو آپ کی قوم کی رعونت اور خودغرضی کا ذکر کرکے آپ کے فیاضانہ خیالات اور ہمدردی کو محض دھوکے کی ٹٹی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کمپنی کی ملازمت روپیہ کے خیال سے نہیں بلکہ معزز عہدہ حاصل کرنے کی اُمید پر کی تھی، مگر بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ اس لئے کہ میں جس کی صورت سے متنفر تھا، اُسی کی ماتحتی میں دیا گیا۔ میں نے تھوڑے دنوں کے بعد اپنے والد کو لکھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں استعفےٰ دے دوں۔ وہ راضی ہوگئے اور کہا کہ نسل ملوک سے ہو، ان صورتوں میں ہرگز نوکری مت کرو۔ میں فوراً ملازمت چھوڑ کر چلا آیا، اور ارادہ کیا کہ نصیر الدین حیدر شاہِ اودھ کی نوکری اختیار کروں۔ لکھنؤ میں پہنچتے ہی سُنا کہ مہاراجہ جنگ بہادر والیِ نیپال آج کل گورکھ پور میں لکھنؤ کے خلاف تیاری کر رہے ہیں اور انگلستان جانے کے لئے ایک لائق انگریزی داں سیکرٹری چاہتے ہیں۔ میں نے فوراً درخواست دی اور بڑی سفارشوں سے اس عہدہ پر مقرر ہوگیا اور مہاراجہ صاحب بہادر کے ہمراہ اوّل دفعہ انگلینڈ گیا۔ منجملہ دیگر مقامات کے ایڈنبرا بھی دیکھا جہاں آپ کی بھی رجمنٹ مہاراج کے استقبال کو آئی تھی۔ مجھے خود بخود خیال ہوا کہ یہ پلٹن کسی دن ضرور مجھے قید کرے گی۔ چنانچہ وہی ہوا۔ میں ہندوستان واپس آکر بعض رجواڑوں میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہا، اور ۱۸۵۴ء میں عظیم اللہ خاں نے جس کا نام آپ نے غدر کے سلسلے میں بہت کچھ سُنا ہوگا، مجھ سے انگلستان چلنے کو کہا۔ بعد وفات پیشوا، نانا راؤ نے عظیم اللہ خاں کو اپنا سربراہ مقرر کیا تھا۔ اس نے بھی میری طرح ماسٹر گنگا دین سے گورنمنٹ سکول کانپور میں انگریزی خوب تحصیل کی تھی اور اُسے قوی اُمید تھی کہ انگلستان پہنچ کر ضرور لارڈ ڈلہوزی کا حکم اپنے آقا پر سے منسوخ کرا لوں گا۔ جب میں اُن کے پاس پہنچا تو وہ ولایت جانے کو پا بر کاب تھے اُن کو بہت سا روپیہ اس غرض سے دیا گیا تھا کہ حسبِ دل خواہ وکیل کریں اور درصورت ضرورت حکام کی مٹھی بھی گرم کریں۔ میں اس سفارت کا حال آپ کو بتانا نہیں چاہتا۔

Marfat.com

آپ خوب واقف ہیں کہ ہم لوگوں کی آؤ بھگت تو خوب ہوئی مگر مطلب خاک بھی نہ نکلا اور ہم پانچ لاکھ روپیہ خراب کر کے وہاں سے چل دیئے، اور براہِ قسطنطنیہ ہندوستان کو ۱۸۵۵ء میں روانہ ہوئے قسطنطنیہ سے ہم کریمیا گئے اور یہیں پر ہم نے دیکھا کہ ۱۸ جون کو انگریزوں نے حملہ کیا مگر شکست کھائی۔ سباسٹپول کے سامنے دونوں فوجوں کی حالتِ زار دیکھ کر ہمارے دل پر بڑا اثر ہوا۔ میدانِ جنگ سے پھر قسطنطنیہ لوٹے۔ یہاں ہمیں کئی روسی افسر ملے۔ وہ سچے ہوں جھوٹے، یہ ہم نہیں جانتے مگر وہ ہم سے کہنے لگے کہ اگر تم لوگ ہندوستان میں غدر پھیلا دو تو ہم ہر طرح مدد کریں گے اور تمہارا بڑا فائدہ ہوگا۔ اب تو میں نے اور عظیم اللہ خاں نے ارادہ کر لیا کہ کسی طرح کمپنی کا راج سرزمینِ ہندوستان سے کھو دیں، اور خدا کا شکر ہے کہ ہم اس بارہ میں کامیاب بھی ہو گئے کیونکہ ان اخبارات سے جو آپ نے عنایت فرمائے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، اور اب ان کو لوٹ مار اور ضبطی کے لئے فرمان نہ ملے گا۔ اگرچہ ہم انگریزوں سے ملک نہ چھین سکے لیکن تب بھی ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے ملک کو کچھ فائدہ ضرور پہنچایا ہے اور ہماری جانیں بے فائدہ تلف نہ ہونگی کیونکہ میں یہ یقینی جانتا ہوں کہ پارلیمنٹ کی حکومت کمپنی کے راج سے زیادہ عادلانہ ہوگی۔ گو کہ میں اس زمانہ میں زندہ نہیں ہوں گا لیکن ہمارے مظلوم اور مصیبت زدہ ہم وطن کسی آئندہ وقت میں ضرور زیادہ امن و چین سے زندگی بسر کریں گے۔ صاحب! اس بات کو آپ خوب سمجھ لیں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ ہرگز نہ تو آپ کی خوشامد کے خیال سے ہے اور نہ اس اُمید پر کہ آپ مجھ پر زیادہ مہربانی کریں گے۔ اس لئے کہ یہ تو مجھے حاصل ہی ہے، اور میں خوب جانتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر آپ کر بھی نہیں سکتے اور اگر کرنی چاہیں تو آپ کو ادائے فرضِ منصبی کا خیال کبھی ہرگز نہیں کرنے دے گا۔ یہ تو صاف ظاہر ہی ہے کہ ہماری موت آ پہنچی ہے لیکن جو غیر مترقبہ احسان آپ نے میرے ساتھ کیا ہے اس کی وجہ سے میں دل کھول کر آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔

Marfat.com

اس ڈیرہ کی طرف آتے ہوئے تو ضرور میں دل میں گالیاں دیتا اور بُرا کہتا آتا تھا مگر آپ کی دوبارہ عنایتوں کو دیکھ کر دل میں بہت خفیف اور شرمندہ ہوں اور افسوس کرتا ہوں کہ ایّامِ غدر میں کیوں اس قدر کشت و خُون ہوا۔ اوّل موقع وہ تھا جب کرنیل نیپیر صاحب انجینئر کانپور گھاٹ پر حال ہی میں کچھ ہندوؤں کے مندر گرا رہے تھے کہ چند ہندو پجاری اُن کے پاس آئے اور ملتجی ہوئے کہ مندروں کو نہ تڑوائیے کرنیل صاحب نے جواب دیا۔ "سُنیئے صاحب! جب میمیں اور بچّے قتل ہوئے تو آپ سب یہیں تھے اور یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ہم بدلہ لینے کے خیال سے مندروں کو نہیں ڈھا رہے ہیں، بلکہ کشتیوں کے پُل اور فوجی حفاظت کے خیال سے ایسا کر رہے ہیں لیکن اگر ایک متنفّس بھی تم میں سے یہ بات ثابت کر دے کہ تم نے کسی ایک بھی انگریز، بچہ، میم کے ساتھ ذرا سا بھی سلوک کیا ہے، اور یہ بھی نہیں بلکہ اتنا بتلا سکو کہ ایک لفظ بھی کسی کی جان بچانے کو کہا ہے تو مَیں ذمّہ لیتا ہوں کہ جہاں ایسا شخص پوجا کیا کرتا ہے، مَیں اس مندر کو بجنسہٖ قائم رہنے دوں گا۔" مَیں اس مجمع میں کرنیل کے قریب ہی کھڑا تھا اور دل میں اُن کی باتوں پر کہہ رہا تھا۔ ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اس تقریر پر سب دم بخود ہو گئے اور سارے برہمن وہاں سے کھسک گئے کرنیل صاحب نے اشارہ کیا اور مندر ٹوٹنا شروع ہو گئے۔

مجھ پر اس تقریر کا ایسا اثر ہوا کہ میں بھی فوراً وہاں سے چل دیا۔ جس وقت کان پور میں غدر ہوا، مَیں اپنے وطن روہیل کھنڈ میں تھا۔ سوائے میدانِ جنگ کے میرے، ان ہاتھوں نے کبھی خون نہیں بہایا۔ میں سمجھتا تھا کہ طوفان اب آیا چاہتا ہے اور اسی سبب سے مَیں اپنے گاؤں میں بال بچّوں کی حفاظت کرنے گیا تھا۔ مَیں ابھی گاؤں میں ہی تھا کہ میرٹھ اور بریلی کے غدر کی خبر آئی۔ مَیں فوراً بریلی کی پلٹن میں جا مِلا، اور اس کے ہمراہ دہلی گیا۔ وہاں مَیں انجینئر اور اُس کے بعد چیف انجینئر مقرر

Marfat.com

ہو گیا اور سرکار کمپنی کے انجینئروں کی مدد سے جنہوں نے رڑکی سے میرٹھ جاتے ہوئے بغاوت کی تھی قلعوں وغیرہ کی مضبوطی کرنے لگا۔ بعدہٗ میں نے اس منتشر فوج کے آدمی جمع کر کے لکھنؤ کا راستہ لیا۔ ہم لوگ متھرا پہنچے تو وہاں مقام کرنا پڑا اور جب میں نے جمنا پر کشتیوں کا پُل بنا کر فوج کو پار اُتار دیا، تب ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ اس وقت بھی فیروز شاہ اور جنرل بخت خاں کے پاس تیس ۳۰ ہزار فوج تھی۔ جب میں لکھنؤ پہنچا، تو چیف انجینئر مقرر کیا گیا۔ نومبر کے مہینہ میں آپ کی رجمنٹ نے رزیڈنسی کو بچایا تو میں وہیں تھا۔

سکندر باغ کا قتل میں نے بچشم خود دیکھا تھا۔ اس جگہ کی مرمت پچھلی ہی رات کو میں نے کرائی تھی، اور جب آپ کا دھاوا ہوا تو میں شاہ نجف سے دیکھ رہا تھا۔ لکھنؤ کی فوج کے کچھ اُوپر تین ہزار چیدہ جوان میں نے سکندر باغ میں تعینات کر دیئے تھے مگر وہاں سے ایک متنفس بھی بچ کر نہ گیا۔ مجھے اس وقت غش آگیا اور جب میں نے دیکھا کہ ہرا جھنڈا جو میں نے رات کو نصب کیا تھا، اُتر گیا، اس کی جگہ گھاگھرا پلٹن کے جھنڈے لہرا رہے ہیں تو میرا جگر پارا پارا ہو گیا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو توپوں کے سر کرنے کا حکم دیا۔

اس کے بعد برابر لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار کے قلعوں وغیرہ کی مرمت کرتا رہا۔ آپ جا کر دیکھیں گے کہ سپاہی اور گولنداز اگر ان کے پیچھے قدم جمائے کھڑے رہیں تو انگریزوں کی بہت سی فوج کام آجائے گی، تب کہیں لکھنؤ جا کر ہاتھ آئے گا۔

اتنی کہانی کہہ کر محمد علی خاں بیٹھ گیا اور پانی پی کر تھوڑا سا کھانا کھایا۔

اس کے بعد میں نے دریافت کیا کہ یہ تمہارے ساتھ والا شخص جسے تم میکی کہہ کر پکارتے ہو، درحقیقت وہی ہے جس نے نانا راؤ کے حکم سے گذشتہ مئی میں میموں اور بچوں کو ذبح کیا تھا۔

Marfat.com

کہنے لگا۔ بیشک وہی ہے مگر جس وقت میں نے نوکر رکھا تھا یہ مجھے نہیں معلوم تھا، اور اگر یہ جانتا کہ اس نے میموں اور بچوں کو ذبح کیا ہے تو میں ہرگز اس کو ساتھ نہ لیتا۔ کیونکہ اسی کے سبب سے تو یہ مصیبت ہم پر نازل ہوئی تھی۔ کاجل کی کوٹھری میں جا کر آدمی بے داغ نہیں نکل سکتا ہے۔ اب مجھے بھی یقین ہے کہ سختیاں جھیلنا پڑیں گی۔ ایسے ہی مردودوں کے کرتوتوں نے تو یہ قہر خداوندی ہم پر نازل کر لیا ہے۔

تب میں نے کہا کہ تمہاری رائے میں یہ افواہ کہاں تک صحیح ہے کہ میمیں اوّل خراب کی گئیں اور پھر ماری گئیں۔ اس پر بولا۔ صاحب آپ اجنبی ہیں، ورنہ ایسا سوال نہ پوچھتے۔ جو شخص یہاں کے رسم و رواج اور ذات برادری کے سخت قاعدوں سے واقف ہے وہ خوب جانتا ہے کہ یہ سب محض جھوٹی کہانیاں ہیں اور طرفین کے بھڑکانے کو گڑھی گئی ہیں۔ حالانکہ اب کیا کم نفرت ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ عورتیں اور بچے نہایت بے رحمی سے مارے گئے مگر کسی کی آبرو ریزی نہیں کی گئی، اور یہ عبارتیں جو کانپور کے بنگلوں پر لکھی ہیں کہ "ہم وحشیوں کے ہاتھوں میں ہیں انہوں نے بوڑھی اور جوان سب عورتوں کو بے عزت کیا ہے اور اس قسم کی جو خبریں ہندوستان کے اخباروں میں شائع ہوئی ہیں اور ان سے لندن کے اخبارات نے نقل کی ہیں قطعی بناوٹ ہیں۔ اور جنرل سر ہنری ہیولاک اور جنرل سر جیمس اوٹرام کے کان پور فتح کرنے کے بعد لکھی گئی ہیں۔ گو میں وہاں نہیں تھا مگر میں نے ان سے یہ سب باتیں سُنی ہیں جو وہاں موجود تھے اور میں جانتا ہوں، یہ بالکل سچ ہے۔

پھر میں نے پوچھا کہ نانا راؤ نے کیوں اس قدر خون ریزی کی؟ کہنے لگا۔ ایشیا کے باشندے کمزور ہیں اور ان کے اقرار، بھروسے کے قابل نہیں ہوتے مگر اسکی وجہ ہمیشہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ ظلم کا ارادہ ہی کر لیتے ہیں بلکہ احسان کرنے میں بے پروائی سے کام لیتے ہیں۔ جب وہ پورا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو پورا بھی کرتے ہیں۔ جب

Marfat.com

اس کو پورا کرنے میں انہیں کسی قسم کی تکلیف ہوتی ہے تو وہ اُسے بھول جاتے ہیں۔

اور غالباً یہی حال نانا راؤ کا تھا۔ وہ عورتوں اور بچّوں کو بچانا چاہتا تھا مگر اُس کے حرم میں ایک عورت تھی جو غلامی سے آزاد کر کے زنانے میں داخل کر لی گئی تھی۔ وہ مجسّم شیطان اور میموں کی جانی دشمن تھی۔ اس کے علاوہ خود نانا راؤ، عظیم اللہ خاں وغیرہ ایسے لوگوں میں گھرا ہوا تھا، جو چاہتے تھے کہ وہ ایسا غدر میں گھر جائے جس سے رہائی ناممکن ہو۔

اس طرح اس عورت کو مدد ملی اور اُس نے میموں کو قتل کرنے کی زبردستی اجازت لے لی۔ مگر جب چھٹی کالی پلٹن اور نانا راؤ کے باڈی گارڈ نے انہیں قتل کرنے سے انکار کر دیا تو اس عورت نے ان بدذاتوں کو ڈھونڈ بلایا۔

یہ حالات مَیں نے جنرل تانتیا ٹوپے سے سُنے ہیں۔ اُس سے اور نانا سے اس بات میں جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔

مَیں سچ کہتا ہوں کہ کانپور کی عورتوں اور بچّوں کا قتل صرف اسی عورت کے سبب سے ہوا، اور عورت سے بڑھ کر کوئی شیطان بھی نہیں ہے۔ مگر نہ مَیں نے کبھی پوچھا، نہ مجھے معلوم ہے کہ وہ کیوں انگریزوں سے اس قدر جلتی تھی۔ اس چھوکری کا ذکر ہندوستان کے گواہوں نے کیا ہے جو قتل کان پور کے بارہ میں سُنے گئے ہیں۔

اس کے بعد مَیں نے پوچھا کہ ان افواہوں کی بھی کوئی اصل ہے کہ جنرل وہیلر کی بیٹی چار پانچ آدمیوں کو پستول سے ٹھنڈا کر کے کان پور کے مشہور کوئیں میں کود پڑی۔

اس کے جواب میں کہا کہ یہ گپیں ہیں اور بالکل بے اصل۔ جنرل وہیلر کی بیٹی اب تک زندہ ہے۔ وہ لکھنؤ میں ہے اور مسلمان ہو گئی ہے، از روئے شرع شریف جس نے اس کی جان بچائی ہے اس سے نکاح کر لیا ہے۔ مگر مَیں یہ نہیں کہتا کہ وہ پھر اپنے ہم قوموں میں آ ملے گی یا نہیں۔

اس قسم کی باتوں مَیں مَیں نے آنکھوں میں رات کاٹی اور صبح کو میں نے محمد علی خاں

Marfat.com

کو اجازت دے دی کہ وضو کر کے نماز فجر ادا کرلے۔ بعد فراغ نماز اُس نے دعا مانگی کہ یا خدا اس شخص کو ان احسانوں کا جو تیرے مظلوم بندوں پر اس نے کئے ہیں، جزائے خیر دے۔

یہ کہہ کر اُس کا دل بھر آیا۔ مَیں نے رونے کا سبب پوچھا۔ تو اُس نے اپنی بی بی اور بچوں کا ذکر کیا اور کہنے لگا کہ انہیں مجھ بدنصیب کا کیا حال معلوم ہوگا۔ مگر فوراً ہی دل مضبوط کر کے کہنے لگا۔ مَیں نے فرانس اور انگلستان کی تاریخیں پڑھی ہیں۔ اور ایسا تھڑدلا نہیں بننا چاہیئے۔ یہ کہہ کر ایک سونے کی انگوٹھی جو اس کے بالوں میں چھپی ہوئی تھی، نکالی اور مجھ سے کہا کہ اس کو آپ مری دلی احسان مندی کی نشانی سمجھ کر رکھئے۔ میری ساری چیزیں چھین لی گئیں جب مَیں گرفتار ہوا تھا، اور اب سوائے اس کے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ انگوٹھی ظاہراً دس بارہ کی معلوم ہوتی ہے مگر جب آپ اس کے خواص سُنیں گے تو لاکھ روپیہ سے زیادہ پائیں گے۔ یہ مجھے ایک بزرگ نے قسطنطنیہ میں حرز جان بنا کر دی تھی لیکن جب سے اس شریر نوکر قصائی کا ساتھ ہوا، اس کا اثر اُتر گیا ہے۔

مَیں نے اُسے قبول کر لیا، اور اُس نے دُعا دی کہ خدا تمہیں ہمیشہ امن و امان میں رکھے۔

محمد علی خاں نے یہ بھی مجھ سے کہا کہ جب آپ لکھنؤ کے قلعوں کے پاس پہنچیں تو اسے دیکھ کر مجھے یاد کر لیجئے گا، پھر آپ کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ وہ بات بھی پوری نہیں کرنے پایا تھا کہ گارڈ لینے کے لئے آ پہنچا اور مَیں نے بادل نخواستہ اُسے حوالہ کیا۔ ہماری فوج کو فوراً صبح کے وقت لکھنؤ کی طرف کُوچ کرنے کا حُکم ملا۔ مگر میری خاص کمپنی کو حُکم تھا کہ سب سے بعد کو جائے۔ جب ہم چلے تو دن خُوب چڑھ گیا تھا اور جو سڑک کان پور سے لکھنؤ جاتی تھی، اُس پر جاتے ہوئے ایک درخت کے نیچے سے گذرے۔ مَیں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو محمد علی خاں اور اُس کے نوکر بوچڑ کی

Marfat.com

لاشیں ننگی لٹکی ہوئی تھیں، اور کسی قدر اکڑ بھی گئی تھیں۔ میں کانپ گیا، اور میرے آنسو ٹپکنے لگے۔

۱۱ مارچ کو بیگم کی کوٹھی پر دھاوا کرتے وقت میں نے محمد علی خاں والی انگوٹھی دیکھی، اور اس کو یاد کیا۔ میں سچے دل سے کہتا ہوں کہ بعد کے معرکوں میں میرے رگڑ تک نہ لگی، زخم کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

جب کبھی مجھے ان احسانات کا خیال آتا ہے جو میں نے اُس نامراد محمد علی خاں کے ساتھ کئے تھے، تو کیسا ہی خطرہ ہوتا، میں ذرا بھی نہ جھجکتا۔ یہ انگوٹھی میرے پاس اب تک موجود ہے، اور غدر کی لُوٹ مار میں صرف یہی ایک چیز ہے جو مجھے ملی۔ جب میں مرتے وقت اپنے بچّوں کو دوں گا، تو اُنہیں محمد علی خاں کا بھی حال بتا دوں گا۔

مترجم

محمد شفیع مراد آبادی مرحوم

(مصنف علی گڈھ بابت مارچ ۱۹۴۳ء) ۲۷ / جولائی ۱۸۹۶ء

Marfat.com

تصویر کا دُوسرا رُخ

انتقامی جذبات کی درد انگیز داستان

انگریزی درندگی کے خونین نظارے

مذہبی، سیاسی، اقتصادی تباہی کا ایک سچا تقاضا تھا جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب انگیز ہنگامے کی شکل میں رونما ہوا۔ جس کے متعلق مسٹر لیکی کا یہ قول ہے:

"اگر دنیا میں کوئی بغاوت، حق بجانب کہی جا سکتی ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کی بغاوت ہے"

لارڈ رابرٹس نے مسٹر اینسن کے نام ایک خط بنام لارڈ کیننگ وائسرائے ہند کا ایک آخری جملہ نقل کیا ہے:

"میرے نزدیک ان کارتوسوں کے استعمال سے سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو ناقابلِ برداشت طریقہ سے ٹھکرا دیا گیا تھا۔[1]

مگر اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ تہذیب و اخلاق کے دعوے داروں نے اس حق بجانب بغاوت کا کیا علاج کیا، اور مذہبی مجنوں کی اصلاح کیلئے ان ہوشیار دانش مندوں کا طرزِ عمل کیا تھا، جو یورپ سے خدمتِ خلق کے لئے سات سمندر پار کر کے ہندوستان آئے تھے۔

کلیجہ تھام لوگے جب سُنوگے نہ سُنوائے خراشیوں کسی کا

ابتدار انتقام کارتوسوں کے انکار پر جو انسانیت سوز سزا دی گئی تھی، ایک

---

[1] انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ ص ۲۵

انگریز مورخ نے اس کا فوٹو مندرجہ ذیل الفاظ میں کھینچا ہے :

بندوقوں اور سنگینوں کے پہرہ میں ۸۵ جوانوں کو اُن کے اپنے فوجی لباس میں سپاہیوں کی حیثیت میں فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور سزا کو بلند آواز سے سُنایا گیا۔ جس کا مقصد سپاہیوں کو بدکار مجرموں کی فہرست میں داخل کرنا تھا۔ فوجی نشانات اُن سے چھین لئے گئے۔ وردیاں اُن کی پُشت کی طرف سے پھاڑ دی گئیں۔ پھر لوہار زنجیریں اور اوزار لے کر آگے بڑھے، اور آناً فاناً میں وہ پچاسی جوان اپنے ساتھیوں کے اس عظیم الشان مجمع کے سامنے انتہائی بے عزّتی کی، تمام روشن اور ظاہر علامات کے ساتھ، یعنی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے ہوئے نظر آئے۔

یہ نہایت ہی دردناک اور ذلّت آفریں نظارہ تھا۔ جس سے سپاہی بے حد متاثر ہوئے۔ بالخصوص جب انہوں نے اپنے بدقسمت ساتھیوں کی اس ناگفتہ بہ حالت اور مایوسانہ انداز کو دیکھا۔ حالانکہ بعض اُن میں سے اپنی پلٹن میں نہایت ہر دلعزیز تھے، اور متعدّد دفعہ اُنہوں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر برٹش حکومت کی ترقی اور وفاداری کا ثبوت بھی دیا تھا۔ قیدیوں نے ہاتھ اُٹھا کر بآوازِ بلند جرنیل سے گڑگڑا کر رحم کی التجا کی کہ ان کو اس شدید مصیبت اور ہلاکت سے بچایا جائے پھر یہ دیکھ کر کہ اس طریقہ سے کوئی فائدہ مرتّب نہیں ہو سکتا، وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجّہ ہوئے اور اس بے عزّتی کو خاموشی سے برداشت کرنے پر انہیں شرمندہ کیا اور غیرت دلائی۔ اس وقت ایک بھی سپاہی اس میدان میں ایسا موجود نہ تھا، جس نے اپنے سینہ میں اس واقعہ سے رنج اور نفرت کے جذبات اُٹھے ہوئے محسوس نہ کئے ہوں لیکن بھری ہوئی میدانی توپوں اور بندوقوں اور سواروں کے چمکتے ہوئے خنجروں کی موجودگی میں حملہ کرنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ قیدیوں کو اُن کی کوٹھریوں میں لے گئے جن پر پہرہ دینے کے لئے اُنہیں کے ساتھیوں کو متعیّن کیا گیا۔[1]

---

[1] ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ایک عرصہ تک تو ظالم نے اپنے ظلم کا اعتراف ہی نہ کیا (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

پھانسی یہ سزا انگریز کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ اُس نے بغاوت کی ہو۔ چنانچہ کوپر ڈپٹی کمشنر امرتسر لکھتا ہے:

مسٹر مونٹ گمری کے حکم سے پنجاب میں بھی جہاں عام طور پر لوگ ابھی تک وفادار ہیں، ایک سکھ پلٹن کے صوبیدار، سوار پولیس کے رسالدار اور ایک داروغہ جیل کو فرض کی کوتاہی کے الزام میں پھانسی پر لٹکانا ضروری سمجھا گیا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بخوبی ذہن نشین ہو جائے کہ پنجاب کے حکام ابتدا ہی میں بلا توقف متشددانہ کارروائی کرنے کی پالیسی سے لوگوں کے دلوں میں اپنا رُعب قائم کرنا چاہتے ہیں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے اس نیم وحشی مُلک میں وقار قائم رکھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف ایک سخت پالیسی کا مقصد یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ حکومت رعایا سے غیر مشروط اور غیر مبہم وفاداری چاہتی ہے نہ کہ رعایا کی بردباری کے بھروسہ پر، جو ایک حد تک گورنمنٹ کے استقلال کی شکست کے مرادف ہے۔[1]

کوپر ہمیں بتاتا ہے:

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اور مظلوم اتنا تباہ ہو چکا تھا کہ اس کو بھی چار و ناچار سکوت اور خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مگر دلوں کی دبی ہوئی چنگاریاں جن کو ظالم کے آئے دن کے نئے نئے ظلم ہوا دیتے ہیں آخر کب تک چھپی اور دبی ہوئی رہ سکتی ہیں۔ انہوں نے اہلِ ہند کے جگر اور دل کو اندر ہی اندر جلانا اور پکارنا شروع کیا۔ تب کچھ انگریزوں نے محسوس کیا کہ ان کو بھی ہندوستانیوں کا ہمنوا ہو کر ان چنگاریوں کو بجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دبی ہوئی چنگاریاں برطانیہ کے خرمنِ شہنشاہیت کے لئے برقِ سوزاں بن جائیں۔ اس نظریہ کے بموجب مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے ساٹھ سال گذرنے کے بعد اعترافِ ظلم کرتے ہوئے جدید ڈپلومیسی سے ان چنگاریوں کو بجھانا چاہا۔ چنانچہ ایک کتاب "اَور سامڈ آف دی مڈل" جس کا ترجمہ شیخ حسام الدین صاحب بی اے نے اُردو میں کیا، اور اس کا نام انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ" رکھا۔ یہ اسی کتاب کا اقتباس ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] تصویر کا دوسرا رُخ ص ۴۰۔

Marfat.com

قیدیوں کی دائمی نجات کا راستہ نہایت آسان تھا۔ یعنی باغیوں کو دیکھ کر فی الفور نکلسن کا نعرہ بلند کیا جاتا تھا "پھانسی پر لے چلو"۔[1]

ایک پادری کی بیوہ نہایت فاتحانہ انداز میں لکھتی ہے:

جب بہت سے باغی گرفتار کر لئے گئے تو انہیں حکم دیا گیا کہ وہ گرجے کے فرش کو صاف کریں۔ مگر باوجودیکہ یہ لوگ اپنے مذہبی معتقدات کی بنا پر اس قسم کا کام خلاف سمجھتے تھے پھر بھی سنگین کی نوک سے انہیں اس حقیر کام کے لئے مجبور کیا گیا۔ ان میں سے بعض نے نہایت پھرتی کے ساتھ اس کام کو سرانجام دیا، محض اس خیال سے کہ شاید پھانسی کی سزا سے بچ جائیں لیکن بے سود، کیونکہ وہ سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔[2]

مجینڈی لکھتا ہے:

"وہ رات ہم نے جامع مسجد پر پہرہ دیتے ہوئے بسر کی اور ہمارا زیادہ تر وقت ان قیدیوں کو گولی سے اُڑا دینے یا پھانسی پر لٹکا دینے میں گذرتا تھا جن کو ہم نے صبح کے وقت گرفتار کیا تھا۔ اُن میں سے بہت سے بیچارے تو اسی جگہ ختم ہو گئے لیکن آخر وقت تک اُن کے چہروں سے شجاعت اور ضبط کے آثار ہویدا تھے جو اس سے کسی بڑے مقصد کے شایان شان علامات تھیں۔[3]"

پلٹن نمبر ۲۶ کا قصور اور اس کی سزا پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار ٹائمز نے لکھا تھا:

"بغاوت کے اعلان سے ۴۸ گھنٹے کے اندر پانچ سو آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ سوال ہوتا ہے کہ جرم کیا تھا، درآنحالیکہ خود ذمہ دار

---

[1] تصویر کا دوسرا رُخ ص۴۵۔ [2] ایضاً ص۴۵۔ [3] ایضاً ص۴۶

Marfat.com

حکّام کی رپورٹ سے تصدیق ہو چکی ہے کہ باغی بالکل نہتے تھے اور طوفان سے ڈر کر بھاگ نکلے تھے۔ نیز محاصرے کے وقت بھوک اور مسافت کی تکلیف اور صدمے سے اُن کی حالت نیم مُردہ انسانوں کی تھی[1]

بہر حال ہندوستانیوں کو اس کثرت سے پھانسیاں دی گئیں جو بیان سے باہر ہے (الہ آباد سے کانپور آتے ہوئے) دو دن کے اندر بیالیس آدمیوں کو سڑک کے کنارے پھانسی دی گئی اور بارہ آدمیوں کو صرف اس جُرم میں پھانسی دی گئی، کہ جب فوج مارچ کرتی ہوئی اُن کے سامنے سے گذری تو اُن کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے[2]

جہاں جہاں فوج نے پڑاؤ ڈالے، وہاں پر قرب و جوار کے تمام دیہات جلے ہوئے تھے۔ یہ کہنا کہ یہ سب کان پور کے مظالم کے حادثہ کا جواب تھے، صحیح نہیں ہے کیونکہ کانپور کا شیطانی واقعہ ان خوفناک حوادث کے بہت بعد پیش آیا۔

آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے عورتوں، مردوں، بچّوں، بوڑھوں تک کو پھانسی کے تختوں پر لٹکایا گیا[3]

مَیں نے ایک گواہ سے کہا۔ مَیں تمہاری جان بخشی کر دیتا ہوں، بشرطیکہ تم اس کے عوض میں کوئی تین نام ایسے بتاؤ جن کو تمہارے عوض میں پھانسی دی جائے۔

(دہلی میں) خون ریزی کے عادی سپاہیوں نے جوش انتقام کو فرو کرنے کے لئے پھانسی دینے والے جلّادوں کو رشوت دے کر آمادہ کیا تھا کہ وہ پھانسی کے تختہ پر زیادہ دیر تک لٹکتے رہنے دیں تاکہ لاش کے تڑپنے کی دردناک کیفیت دیکھ کر جسے وہ ناچ کہتے تھے، اپنی خوں خوار طبائع کے لئے دلچسپی کا سامان بنا سکیں

---

[1] تصویر کا دوسرا رُخ ص۵۹۔ [2] ایضاً ص۶۰۔ [3] ایضاً ص۶۳۔ [4] ایضاً ص۶۴

Marfat.com

جھجر کے نواب صاحب[1] کو جان دینے میں بہت عرصہ لگا۔[2]

درختوں پر لٹکا کر پھانسی بنارس اور الہ آباد میں کان پور کے واقعہ سے پہلے ایک موقع پر چند نوجوان لڑکوں کو محض اس بنا پر پھانسی دی گئی کہ انہوں نے شوقیہ طور پر باغیوں کی جھنڈیاں اُٹھا کر بازاروں میں منادی کی تھی۔ سزائے موت دینے والی عدالت کے ایک افسر نے پُرنم آنکھوں سے کمانڈنگ افسر کے پاس جا کر درخواست کی کہ ان نابالغ مجرموں پر رحم کر کے پھانسی کی سزا کو تبدیل کر دیا جائے لیکن بے سود۔

اس تمام سلسلے میں بے شمار ایسے واقعات ملیں گے جن میں اس قسم کی نمائشی عدالتوں تک سے بھی گریز کیا گیا، اور بے گناہ انسانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ پھانسیاں دینے کے لئے رضاکارانہ ٹولیاں بنائی گئیں جنہوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے دیہات کا دورہ کیا اس حالت میں کہ ان کے پاس پھانسی دینے کا سامان بھی مکمل نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو پھانسی دینے کے طریقہ سے پُوری واقفیت تھی۔ چنانچہ اُن میں سے ایک شریف آدمی اپنی شاندار کامیابی پر اس طرح فخریہ اظہار کرتا تھا کہ ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی استعمال کرتے تھے۔ یعنی ملزم کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے تھے اور اُوپر سے رسّہ ڈال کر ہاتھی کو ہنکایا جاتا تھا یہاں تک کہ ملزم اس طرح تڑپنے اور جان کنی کی حالت میں اکثر اوقات انگریزی کے آٹھ (8) کے ہندسہ کی دلچسپ شکل بن کر رہ جاتا تھا۔[3]

لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا چنانچہ ہر ایسے ہندوستانی کو قطع نظر اس سے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی، بے دریغ تہ تیغ کیا گیا، یہاں تک کہ نہ کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا اور نہ اس قسم کا کوئی تکلف روا رکھا جاتا بلکہ محض سیاہ رنگ ہی اُس کے مجرم ہونے کے لئے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی، اور ہلاکت کے لئے ایک رسّہ اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا۔[4]

---

[1] عبدالرحمن خاں شہید۔ [2] تصویر کا دوسرا رُخ ص ۶۵۔ [3] ایضاً ص ۶۴۔ [4] ایضاً ص ۶۸۔

Marfat.com

سُولی دہلی وغیرہ میں شہر کے بلند مقام پر ایک چوگوشہ سولی نصب کی گئی تھی، جہاں پانچ اور چھ اشخاص کو روزمرہ پھانسی دی جاتی تھی جس کے قریب ہی انگریز افسران سگرٹوں کے کش پر کش اُڑاتے ہوئے لاشوں کے تڑپنے کے نظاروں میں محو دکھائی دیتے تھے۔[1]

جلتی ہوئی سلاخوں سے داغ کر مارنا یا جلا دینا مسٹر نکلسن مسٹر ایڈورڈز کو ایک خط میں لکھتا ہے:

دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کے خلاف ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیئے جس کی رو سے ہم ان کو زندہ بھی جلا سکیں یا زندہ ان کی کھال اُتار سکیں یا گرم سلاخوں سے اذیت دے کر اُن کو فنا کے گھاٹ اُتار سکیں۔ ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کئے دیتا ہے۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ کاش میں دنیا کے کسی ایسے گمنام گوشے میں چلا جاؤں، جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں سنگین انتقام لے کر دل کی بھڑاس نکال سکوں۔[2]

نکلسن کو اپنی آرزو کے پورا ہونے میں کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ مسٹر موبری تھامسن نے اپنے بعض قیدیوں کی دردناک سرگذشت سر ہنری کاٹن کو ذیل کے الفاظ میں سُنائی۔

شام کے وقت ایک سکھ اردلی میرے خیمہ میں آیا اور سلام کر کے پُوچھنے لگا۔ آپ غالباً یہ دیکھنا پسند کریں گے کہ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا میں فوراً لپک کے قیدیوں کے کیمپ میں گیا۔ جہاں ان بدبخت مسلمانوں کو عالمِ نزع میں بے حال دیکھا۔ یعنی مشکیں اُن کی بندی ہوئی تھیں اور وہ برہنہ زمین پر پڑے ہوئے تھے اور سر سے لے کر پاؤں تک تمام جسم کو گرم تانبے سے داغ دیا تھا۔ اس رُوح فرسا نظارہ کو دیکھ کر میں نے اپنے پستول سے اُن کا خاتمہ کر دینا ہی اُن کے حق میں مناسب سمجھا۔[3]

---

[1] تصویر کا دوسرا رُخ ص۶۶۔ [2] ایضاً ص۳۸۔ [3] ایضاً ص۴۰

Marfat.com

ایک عینی شاہد کا بیان ہے :

بدنصیب قیدی کے جلتے ہوئے گوشت سے مکروہ بدبو نکل کر آس پاس کی فضا کو مسموم بنا رہی تھی۔

انیسویں صدی میں جب کہ تہذیب اور شائستگی پر ناز کیا جاتا تھا۔ ایک ایسا دردناک نظارہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک انسان وحشیانہ طریق سے زندہ آگ میں جلایا جا رہا ہے اور سکھ اور یورپین نہایت اطمینان اور متانت سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر اردگرد کھڑے دیکھ رہے ہیں، گویا کہ وہ ایک تفریح کا سامان تھا۔[1]

ٹائمز آف انڈیا اخبار کے فوجی نامہ نگار مسٹر رسل نے بھی اس واقعہ کی تصدیق کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :

چند دنوں بعد میں نے اس شخص کی جلی ہوئی ہڈیوں کو اسی میدان میں پڑا ہوا پایا۔[2]

ایڈورڈ ٹامسن لکھتا ہے :

دماغ پر سزا کا ایسا مہلک اثر پڑتا ہے کہ بعض دفعہ تو انسان نواب معین الدین حسن کے بیانات کو جن میں اس دردناک سزا کا ذکر ہے، پڑھنے یا سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا۔ لیکن گورنمنٹ بنگال کے سرکاری کاغذات میں اب بھی ایسی دستاویزات محفوظ ہیں جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انگریز نہایت کثرت سے اس ہولناک سزا کا استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ ایک انگریز افسر کی چٹھی ابھی تک محفوظ ہے جس میں اٹھارھویں صدی کے آخری دور کے حالات پر بحث کرتے ہوئے اس دردناک طریقِ سزا کی ذیل کے الفاظ میں مذمت کی ہے۔

آخر کب تک ہی بنی نوعِ انسان کو اس دل خراش طریق سے

---

[1] تصویر کا دوسرا رُخ ص۴۱ ۔ [2] ایضاً ص۴۲

گرم سلاخوں پر سکڑتے اور بھنتے دیکھنے کی اذیت برداشت کرتے رہیں گے۔[1]

سور کی کھال میں سیکر جلانا ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر ڈی لین نے لکھا تھا:

زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے اُن کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں، ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات کی دنیا کی کوئی تہذیب بھی کبھی اجازت نہیں دیتی۔ ہماری گردنیں شرم و ندامت سے جھک جاتی ہیں اور یقیناً ایسی حرکات عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہیں جن کا کفارہ ہمیں بھی ایک دن ادا کرنا پڑیگا۔

توپ سے باندھ کر اُڑا دینا لارڈ رابرٹس اپنی والدہ کو ایک چٹھی میں لکھتا ہے:

ہم پشاور سے جہلم تک پا پیادہ سفر کرتے ہوئے پہنچے اور راستہ میں کچھ کام بھی کرتے آئے یعنی باغیوں سے اسلحہ چھیننا اور اُن کو پھانسیوں پر لٹکانا۔ چنانچہ توپ سے باندھ کر اُڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے اکثر استعمال کیا ہے، اس کا لوگوں پر خاص اثر ہوا۔ یعنی ہماری ہیبت لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گئی۔ اگرچہ یہ طریقۂ سزا نہایت دل خراش ہے۔[2]

لڑائی کے اختتام پر بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا، اور یہ معلوم ہونے پر کہ اس قسم کی موت کی وہ کوئی خاص پرواہ نہیں کرتے تو اُن میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھ کر اُڑا دیا گیا۔ چنانچہ ایک روز ایک توپ کے بہت بڑے دھماکہ کی آواز سے ہم چونک پڑے۔ جس کے ساتھ ہی ایک ناقابلِ بیان دھیمی، مگر وحشت ناک چیخ بھی سُنائی دی۔ دریافت کرنے پر ہمیں ایک افسر نے بتایا کہ یہ نہایت ہی کرب انگیز نظارہ تھا۔ یعنی ایک توپ میں اتفاق سے

---

[1] تصویر کا دوسرا رُخ ص۳۷۔ [2] ایضاً ص۳۴۔

Marfat.com

بارود زیادہ بھرا ہوا تھا جس کے چلائے جانے سے بدقسمت ملزم کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضائے آسمانی میں اُڑا اور تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے اور اس کا سر ایک راہرو پر اس زور سے گرا کہ اس کو بھی چوٹ آگئی۔[1]

بھوکا رکھ کر یا دم گھونٹ کر مارنا مسٹر کوپر لکھتا ہے:

پہلی اگست کو بقر عید کا دن تھا۔ اس لئے مسلمان سواروں کو وہاں سے علیحدہ کرنے کے لئے ایک مفید عذر تھا۔ چنانچہ اُن کو تیوہار منانے کے لئے امرتسر بھیج دیا گیا۔ اور صرف ایک عیسائی افسر وفادار سکھوں کی امداد سے ایک مختلف قسم کی قربانی کے لئے وہاں پر اکیلا رہ گیا جو نہایت اطمینان سے اپنا کام کرتا رہا۔ اب مشکل یہ پیش آئی، کہ لاشوں کو کس طرح دبایا جائے تاکہ اُن کا تعفّن نہ پھیلے۔ لیکن اتّفاق سے قریب ہی ایک ویران کنواں مل گیا۔

جب دس دس کی ٹولی کو یکے بعد دیگرے گولی سے اُڑاتے ہوئے ڈیڑھ سو سپاہی مارے جا چکے تو قتل کرنے والوں میں سے ایک شخص غش کھا کر گر پڑا، جو ہلاک کرنے والوں میں سب سے بوڑھا سپاہی تھا۔ اس لئے آرام کرنے کے لئے تھوڑا سا وقفہ دیا۔ اس کے بعد پھر قتل کی کارروائی شروع کر دی گئی۔ جب تعداد دو سو سینتیس تک پہنچ چکی تو ایک افسر نے اطلاع دی کہ باقی باغی بُرج سے باہر آنے سے انکار کرتے ہیں، جہاں وہ چند گھنٹے پیشتر عارضی طور پر بند کر دیئے گئے تھے۔ اس بُرج کے دروازے کھولے گئے تو معاً ایک دردناک نظارہ دیکھنے میں آیا جس سے ہول ولس بلیک ہال کی یاد تازہ ہو گئی۔ یعنی پینتالیس آدمیوں کی مُردہ لاشیں لائی گئیں جو خوف، گرمی، سفر کی صعوبت اور دم گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہو گئے تھے۔

ان مُردہ اور نیم مُردہ لاشوں کو گاؤں کے بھنگیوں کے ہاتھوں قریب کے ویران

---

[1] تصویر کا دوسرا رُخ صفحہ ۳۶

Marfat.com

کنویں میں پھینکوا دیا گیا۔[1]

لطف یہ ہے کہ جنرل لارنس اور رابرٹ منٹگمری وغیرہ نے اس فعل کی داد دیتے ہوئے کوپر کو مبارکباد کے خط لکھے۔ ملاحظہ ہو ص ۵۷ انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ۔

نہ صرف سولی پر اکتفا کیا گیا بلکہ دیہات میں اُن کو اپنے مکانوں میں بند کر کے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔[2]

قتلِ عام اور بستیوں کو جلا دینا ۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء کو گورنر جنرل یا اجلاس کونسل کی طرف سے ہندوستان میں مفصل ہدایات جاری کی گئیں کہ غیر معیّن طریق سے دیہات کو آگ لگانا فی الفور بند کر دیا جائے اور مجسٹریٹوں کو حکم دیا گیا کہ وہ غیر مسلح آدمیوں کو فوج کے بھاگے ہوئے سپاہی سمجھ کر ہرگز کوئی سزا نہ دیں۔

بہت سی ایسی سول عدالتوں سے موت اور عمر قید کے اختیارات واپس لے لئے گئے کیونکہ اُن کا استعمال نہایت بے دردی سے کیا جا رہا تھا۔

۲۸ اگست کو مسٹر جان گرانٹ کو وسط ہند کا گورنر اس لئے مقرر کیا گیا تاکہ الہ آباد اور دوسرے مقامات پر بے تحاشا پھانسیوں کے سلسلہ کو بند کر دیں۔ باوجود اس امر کے ایک کثیر طبقہ کی طرف سے وائسرائے اور مسٹر گرانٹ کی شدید مخالفت کی گئی یہاں تک کہ تعریض کے طور پر پھانسیوں کو روکنے والا گرانٹ اور رحم دل کیننگ وغیرہ نام دے کر اُن کی ہنسی بھی اُڑائی گئی۔ پھر بھی اس مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کی گئی۔ جب اگست میں انگریزی فوج ہندوستانی دیہات جلانے کی مہم سے واپس آ رہی تھی تو راستہ میں اُنہوں نے وفادار سپاہیوں کی ایک جماعت کو بلاوجہ گولیوں اور سنگینوں کا نشانہ بنا دیا۔ چنانچہ انتقام کے اس خوفناک مظاہرے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ٹائمز آف انڈیا نے اس واقعہ کو جنگی یا وحشی انصاف سے تعبیر کیا۔ لیکن جنرل آوٹریم کی رائے میں یہ واقعہ معصوم انسانوں کا سنگدلانہ قتل تھا۔[3]

---

[1] تصویر کا دوسرا رُخ ص ۵۵۔ [2] ایضاً ص ۶۳۔ [3] ایضاً ص ۴۴

Marfat.com

میجر ریناڈ کو جنرل نیل کی طرف سے ہدایت موصول ہوئی جب کہ وہ کان پور کے محصورین کی امداد کے لئے آ رہا تھا "بعض دیہات کو اُن کی مُجرمانہ حرکات کی بنا پر عام تباہی کے لئے منتخب کر دیا گیا ہے جہاں کی تمام مرد آبادی کو قتل کر دینا ہوگا۔ باغی رجمنٹوں کے تمام ایسے سپاہی فی الفور پھانسی پر لٹکا دیئے جائیں جو اپنے چال چلن کے متعلق اطمینان بخش ثبوت بہم نہ پہنچا سکیں۔ قصبہ فتح پور کی تمام آبادی کو محاصرہ میں لے کر تہ تیغ کر دیا جائے۔ باغیوں کے تمام سرغنوں کو فی الفور پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ اگر وہاں کا ڈپٹی کلکٹر قابو میں آجائے تو اس کو وہیں پھانسی دے دی جائے اور اُس کا سر کاٹ کر سب سے بڑی عمارت پر لٹکا دیا جائے"۔[1]

مسٹر رسل اپنی ایک طویل تحریر میں لکھتا ہے :

لیکن یہ تو انسانیت اور انصاف کے خلاف ہے کہ تمام اضلاع کو ہی تاخت و تاراج کیا جائے، محض اس جُرم پر کہ باغیوں نے ان علاقوں میں پڑاؤ کیا تھا۔[2]

کچھ افسروں کی جانب سے احتجاج کیا گیا کہ اگر اسی طرح دیہات کو جلایا جاتا رہیگا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ فوج کو راستہ میں رسد اور چارہ بالکل دستیاب نہ ہو سکے گا۔[3]

شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور پنجاب میں اندھا دھند پھانسیاں دی گئیں جن میں مرد، عورت اور بچّوں کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ نیز بے شمار دیہات جلانے کی وجہ سے آبادی کے اس حصّہ میں بھی نفرت اور وحشت پھیل گئی جو گورنمنٹ کے خلاف نہ تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فصلیں تباہ ہو گئیں۔ اس قسم کے وجوہات کی بناء پر یہ افواہ نہایت ترقی پکڑ گئی کہ گورنمنٹ کا منشاء تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو بے دریغ قتل کر دینے کا ہے۔

(رپورٹ گورنر جنرل باجلاس کونسل بحوالہ تصویر کا دوسرا رُخ ص۶۷)

انگریزوں نے راستہ میں سینکڑوں میل تک سڑک کے دونوں طرف دیہاتیوں کو بیدریغ

---

[1] تصویر کا دوسرا رُخ ص۴۶ ۔ [2] ایضاً ص۵۱ ۔ [3] ایضاً ص۶۰ ۔

Marfat.com

قتل و غارت و برباد کرکے ملک کو صحرا کی طرح ویران اور سنسان کر دیا۔ دہلی سے باغیوں کے فرار ہو جانے کے بعد انگریز فاتحین نے باشندوں کا قتلِ عام کیا اور بے ضابطہ انگریزی عدالتوں کے حکم سے ہزاروں شہری پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیئے گئے۔ حالانکہ اُن کو بغاوت سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا (تصویر کا دوسرا رُخ ص۷۵ و ص۷۶) مختصر یہ کہ بیشمار دیہات کو ایسے وقت میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا جب کہ عورتیں، بوڑھے اور بچے گھروں کے اندر موجود تھے۔ (تصویر کا دوسرا رُخ ص۷۸)۔

دہلی میں باشندوں کے قتلِ عام کی منادی کی گئی حالانکہ اُن میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کے متعلق ہمیں علم تھا کہ وہ ہماری فتح کے خواہش مند تھے۔ ہمارے اکثر جوان تو محض خون گرانے کی خواہش پورا کرنے کے لئے اپنی ہی فوج کے ہندوستانی اردلیوں اور پوربی گھسیاروں وغیرہ کو گولی سے اُڑا دینے کی تمنّا کا علانیہ طور پر اظہار کرتے تھے[1]

کان پور کے حادثہ سے بہت عرصہ پیشتر ایک طرف تو فوجی قانون کے نفاذ کا اعلان کیا گیا اور دوسری طرف مجلس وضع قانون نے مئی اور جون میں نہایت خوفناک قوانین پاس کئے جن پر پوری سرگرمی سے عمل کیا گیا اور فوجیوں اور سول افسروں نے خونی عدالتیں قائم کرکے ہندوستانیوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اُتارنا شروع کر دیا بلکہ بعض حالات میں تو بغیر کسی نام نہاد عدالت کے حکم کے پھانسیاں دی گئیں۔ جن میں مرد عورت کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ بایں ہمہ خون ریزی کی آگ دن بدن اور بھڑکتی گئی۔ چنانچہ آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو بھی پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا۔ نہ صرف سولی پر ہی اکتفا کیا گیا بلکہ دیہات میں اُن کو اپنے مکانوں میں بند کرکے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا، اور شاذ و نادر ہی کسی ایک کو گولی سے مارنے کی تکلیف گوارا کی گئی ہو۔ انگریزوں نے

---

[1] تصویر کا دوسرا رُخ ص۶۱

فخریہ لکھا ہے کہ ہم نے حتی الامکان کسی ذی رُوح کی آبادی کو زندہ نہیں رہنے دیا۔[1]

لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا چنانچہ ہر ایسے ہندوستانی کو قطع نظر اس سے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی، بے دریغ تہ تیغ کیا گیا۔ یہانتک کہ نہ تو کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا اور نہ ہی اس قسم کا تکلّف روا رکھا جاتا تھا بلکہ محض سیاہ رنگت ہی اُس کے مُجرم ہونے کے لئے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی اور ہلاکت کے لئے ایک رسّہ اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یا اگر یہ اشیاء مہیا نہ ہوں تو بندوق کی ایک گولی بے گناہ انسان کے دماغ کو چیرتی ہوئی نکل جاتی تھی اور وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا تھا۔[2]

دہلی میں ہماری فوج کے شہر میں داخل ہونے پر تمام ایسے لوگ جو چلتے پھرتے نظر آئے وہ سنگینوں سے وہیں ختم کر دیئے گئے۔ ایسے بدقسمت انسانوں کی تعداد بہت کافی تھی۔ آپ اس ایک واقعہ سے کافی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک گھر میں چالیس یا پچاس ایسے اشخاص ہمارے خوف سے پناہ گزیں ہو گئے جو اگرچہ باغی نہ تھے بلکہ غریب شہری تھے اور ہمارے عفو و کرم پر تکیہ لگائے ہوئے تھے جن کے متعلق میں خوشی سے ظاہر کرتا ہوں کہ وہ سخت مایوس ہوئے کیونکہ ہم نے اُسی جگہ اُن کو اپنی سنگینوں سے ڈھیر کر دیا۔[3]

بے گناہ شہریوں کو درانحالیکہ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم کی درخواست کر رہے تھے، گولی کا نشانہ بنا دیا گیا، بلکہ عمر رسیدہ لوگوں کو حالانکہ اُن کے جسم رعشہ سے کانپ رہے تھے، کاٹ کر رکھ دیا گیا۔[4]

ٹائمز کے نامہ نگار نے لکھا تھا۔

میں نے دہلی کے بازاروں میں سیر کرنا مطلقاً چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ کل ایسا دردناک واقعہ دیکھنے میں آیا جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یعنی جب ایک افسر بیس سپاہی لے کر شہر کی گشت کو جانے لگا تو میں بھی اُن کے ہمراہ ہو لیا اور راستہ میں ہم نے چودہ عورتوں کی لاشوں کو شالوں میں لپٹے ہوئے بازار میں پڑا پایا جن کے سر

---

[1] تصویر کا دوسرا رُخ ص۶۴۔ [2] ایضاً ص۶۸۔ [3] ایضاً ص۶۸۔ [4] ایضاً ص۶۸

Marfat.com

دھڑوں سے اُن کے خاوندوں نے خود جُدا کر دیئے تھے۔ چنانچہ عینی شاہد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اُن کے خاوندوں کو شُبہ تھا کہ اگر انگریز سپاہیوں کے قابو میں آگئیں تو وہ عصمت دری کریں گے۔ لہٰذا تحفّظِ ناموس کا یہی طریقہ مناسب خیال کیا گیا جس کے بعد خاوندوں نے بھی خودکشی کر لی۔ چنانچہ ان کی لاشوں کو خود ہم نے دیکھا۔[1]

ایڈورڈ ٹامسن لکھتا ہے :

فوجی شرابوں کی دکانوں کو لُوٹتے اور شراب پی کر بازاروں میں گشت کرتے۔ بے دریغ قتل و غارت کرتے۔ کبھی کبھی کوئی منچلا ان میں سے کسی کو ختم کر دیتا۔ لُطف یہ ہے کہ اس قاتل کو مذہبی دیوانہ کہا جاتا ہے یعنی عقل کا تقاضا یہ تھا کہ نہایت خاموشی سے ان شرابیوں کے سامنے ذبح کے لئے گردن کیوں نہیں جُھکا دی۔[2]

باغیوں کے جُرم کے مقابلہ میں ہزار گُنا زیادہ سنگین پاداش دہلی کے باشندوں کو برداشت کرنی پڑی۔ ہزارہا مرد و عورت اور بچّوں کو بے گناہ خانماں برباد ہو کر جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھاننی پڑی اور جتنا مال و اسباب وہ پیچھے چھوڑ گئے اُن سے ہمیشہ کے لئے ان کو ہاتھ دھونے پڑے کیونکہ سپاہیوں نے گھروں کے کونے کونے کھود کر تمام قیمتی اشیاء کو قبضہ میں کر لیا اور باقی سامان توڑ پھوڑ کر خراب کر دیا۔ جس کو وہ اُٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے۔[3]

اسنپر وال پول لکھتا ہے :

وحشی نادر شاہ نے بھی وہ لُوٹ نہیں مچائی تھی جو فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج نے جائز رکھی۔ شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے اور پانچ یا چھ چھ آدمیوں کو روزانہ سزائے موت دی جاتی تھی۔ وال پول کا بیان ہے کہ تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ جن میں سے اُنتیس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤلف قیصر التواریخ لکھتا ہے

---

[1] تصویر کا دوسرا رُخ ص۶۸۔ [2] ایضاً ص۷۰۔ [3] ایضاً ص۷۱

Marfat.com

کہ ستائیس ہزار مسلمان قتل کئے گئے اور سات دن تک برابر قتل عام برابر جاری رہا۔[1]

صفر ۱۲۷۴ھ کی پہلی یا دوسری تاریخ کو بادشاہ کے سمدھی الٰہی بخش کی جاسوسی سے مسٹر ہڈسن نے تین شہزادوں مرزا مغل، مرزا حضرت سلطان اور مرزا ابوبکر وغیرہ کو ہمایوں کے مقبرہ سے گرفتار کیا۔ اور تینوں کا سر قلم کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے ہنس کر فرمایا۔ تیموری خاندان کے بہادر فرزند اسی طرح سُرخرو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتے ہیں۔ (پنڈت سندر لال)۔

آخر کی چند سطور کے علاوہ آپ نے جو کچھ واقعات پڑھے، وُہ انقلاب "۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ" یعنی مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کی کتاب "دی اَورسائڈ آف دی مڈل" سے نقل کئے گئے ہیں جن کے متعلق مصنّف (ایڈورڈ ٹامسن) کا دعویٰ ہے کہ جتنے واقعات یہاں قلمبند کئے گئے ہیں، ان میں سے ایک بھی کسی ہندوستانی قلم یا زبان سے نکلا ہوا نہیں ہے، اور مَیں نے شاذ و نادر ہی کوئی ایک فقرا اینگلو انڈین اخبارات یا اس سے کم درجہ پر اپنے مُلک کے اخبارات سے نقل کیا ہوگا نیز یہ کہ ان بہت سے واقعات کو چھوڑ دیا جن سے اس سے زیادہ سنگ دلی اور درندگی کا اظہار ہوتا ہے۔[2]

نیز اس موقعہ پر آپ کو یہ فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ لارڈ رابرٹس کے نزدیک اس قسم کی تمام درندگی کا مقصد یہ تھا کہ:

> ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔[3]

اس دہشت انگیزی، بربریت اور درندگی کا نتیجہ انگریز کے حق میں نہایت مبارک تھا۔ مسلمان اس قدر خائف ہو گئے کہ کانگریسی وزارتوں کے قیام سے پیشتر

---

[1] افسانۂ غم ص۲۸ و ص۲۹۔ [2] تصویر کا دوسرا رُخ ص۷۸ و ص۷۹۔ [3] ایضاً ص۳۴

Marfat.com

تک قومی اداروں کے دستور اساسی میں بسم اللہ کے بعد پہلا جملہ یہ ہوتا تھا کہ "اس ادارہ کا تعلق سیاست سے قطعاً نہ ہوگا"۔

هذا و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين

ایک بجے شب، ۴ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ
محمد میاں عفی عنہ۔ ۲۵ اپریل ۱۹۳۹ء

ختم شد اقتباس شاندار ماضی طبع قدیم حصہ چہارم
نیز ختم شد شاندار ماضی جلد چہارم طبع جدید
والله هو الباقی وهو الکافی
محمد میاں
۲ فروری ۱۹۵۹ء ۲۳ رجب ۱۳۷۸ھ
یوم دوشنبہ، ۱۱ ½ بجے شب

Marfat.com

ضمیمہ ع۱

قصبہ تھانہ بھون کے باقیماندہ حالات
اور
مجاہد جلیل قاضی عنایت علی صاحب کے کارنامے

اس کتاب میں آپ نے بہت سے عجیب وغریب واقعات ملاحظہ فرمائے ہیں۔ آخر میں خود اس کتاب کی ترتیب وتالیف کے متعلق ایک عجیب اتفاق ملاحظہ فرمائیے ضمیمہ کے چند صفحات میں جناب رفعت صاحب تھانوی کا مضمون پیش کیا جارہا ہے۔ یہ ۱۳ر اکتوبر پھر ۱۵ر ۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۷ء کو روزنامہ الجمعیۃ میں شائع ہوا تھا مضمون نہایت عمدہ ہے۔ تھانہ بھون کے متعلق معلومات کا ذخیرہ ہے اور سب سے زیادہ خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جناب قاضی عنایت علی صاحب کے حالات جو آج تک سینہ بسینہ تھے اور کسی کتاب یا رسالہ میں شائع نہیں ہوئے تھے، بہت ہی بہتر ترتیب سے جمع کئے گئے ہیں۔

احقر نے روزنامہ الجمعیۃ کے ان اوراق کو نہایت حفاظت سے ایسی جگہ رکھ لیا تھا کہ بظاہر نظر انداز ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا مگر اس ظلوم وجہول انسان کی بے چارگی ملاحظہ ہو کہ یہ سارا اہتمام وانتظام بے کار گیا۔ سامنے رکھے ہوئے صفحات نظر انداز ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ترتیب پھر کتابت اور تصحیح وغیرہ کے تمام مراحل طے ہو چکنے کے بعد وہ وقت آگیا کہ کاپیاں پریس میں جانے والی ہیں، ایک اور یادداشت کی تلاش میں یہ صفحات دفعۃً سامنے آگئے تو اب جس طرح ان کو نظر انداز کرنا مشکل تھا ایسے ہی ترتیب میں لانا بھی دشوار تھا۔ لہٰذا یہی مناسب معلوم ہوا کہ غیر ضروری اجزاء حذف کرکے مضمون کو کتاب کا ضمیمہ بنا دیا جائے۔

Marfat.com

۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون

اُس وقت قصبہ کی آبادی ۳۵۰۰۰ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ اس آبادی میں سے تقریباً سات ہزار اشخاص انگریزی افواج میں ملازم تھے۔ یہاں ۳۲ تو صرف سالدار تھے۔ دفعدار، جمعدار، حوالدار، نائک اور سپاہیوں کی علیحدہ علیحدہ تعداد کا تعین دشوار ہے۔ محکمہ فوج سے ایک لاکھ چوراسی ہزار روپے تنخواہوں اور پنشنوں کی صورت میں اہالیانِ قصبہ وصول کرتے تھے۔ قرب و جوار میں مشہور تھا کہ تھانہ بھون والوں کی کمائی خون کی کمائی ہے۔

مئی ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی کے آغاز پر جب فوجیں بگڑیں تو ساکنانِ تھانہ بھی اپنی اپنی ڈیوٹیاں چھوڑ کر وطن آگئے۔ یہاں انگریزی حکومت کی طرف سے پولیس اسٹیشن موجود تھا۔ پولیس ایسے فوجیوں کی متلاشی رہتی تھی جو جنگِ آزادی میں دلچسپی لے رہے تھے۔ یہ فدایانِ وطن شروع میں روپوش رہے۔ اور عام باشندگانِ قصبہ کو جنگِ آزادی میں حصہ لینے کے لئے آمادہ کرتے رہے۔ اسی دوران میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ قاضی عنایت علی خاں کے بھائی قاضی رعایت علی خاں معروف قاضی عبدالرحیم بغرض خریداری فیل سہارن پور تشریف لے گئے۔ ہاتھی اس زمانہ میں نشان امارت و ریاست تھا اور صرف اسی ضرورت سے اس کی خریداری مقصود تھی لیکن قاضی صاحب کے مخالفین نے ایس پکھی کلکٹر سہارن پور کو یہ غلط اطلاع پہنچائی کہ قاضی صاحب معہ فوج آپ پر چڑھائی کے لئے آئے ہیں اور حربی ضرورتوں کے پیش نظر ہاتھی خرید رہے ہیں۔ سہارن پور اس وقت فوجی نقطۂ نگاہ سے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ شمالی ہند کی جنگِ آزادی کو دبانے کے لئے پنجاب سے فوجیں لائی جا رہی تھیں۔ اُن کے لئے سہارن پور ہی سب سے اہم ناکہ تھا۔ ایس پکھی روزمرہ کے نئے حملوں کی خبروں سے بے حد پریشان اور حواس باختہ تھا۔ اس عالم میں اس کے رہے سہے ہوش گم ہو گئے

Marfat.com

تھے۔ چنانچہ اُس نے یہ خبر ملتے ہی قاضی عبدالرحیم کی تلاشی کرائی، اور گرفتار کرا کر بغیر تفتیشِ حال اُن کو مع اُن کے چند ساتھیوں کے گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ یہ خبر شب بھر میں تھانہ بھون پہنچی تو قاضی عنایت علی خاں کے یہاں صف ماتم بچھ گئی۔ شیدائیانِ حریت کے لئے یہ واقعہ "سمندِ ناز پہ اک تازیانہ اور ہوا" کے مصداق ہوگیا۔ قاضی عنایت علی خاں جو اب تک مذبذب تھے، ہمنوا بن گئے۔

جہادِ آزادی کی تنظیم تھانہ بھون اس وقت علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ بڑے بڑے یکتائے روزگار یہاں موجود تھے۔ ان علماء میں مرشدنا و ہادینا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قبلہ مہاجر مکیؒ اس وقت خاص طور پر سے مرجعِ خلائق تھے۔ قرب و جوار سے علماء کا اجتماع اس صورتِ حال پر غور کرنے کے لئے تھانہ بھون میں ہوا اور بڑی بحث و تمحیص کے بعد کثرتِ رائے سے علمِ جہاد بلند کرنے کی تجویز پاس ہوئی۔

پولیس اسٹیشن تھانہ بھون یہاں کے حالات کی مسلسل اطلاعات کلکٹر ضلع کو دے رہا تھا۔ ایس پنکھی کلکٹر سہارن پور کو اپنی غلطی کا علم ہوا تو وہ اپنی بدحواسی اور جلد بازی پر پچھتایا اور وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اُس نے قاضی عنایت علی خاں کو اپنے نمائندہ کے ذریعہ پیش کش کی کہ ہم پورا پرگنہ (جس میں اس وقت چوراسی گاؤں تھے) تمہاری حکومت میں دے کر تمہیں مستقل نواب تسلیم کئے لیتے ہیں، تم تحریکِ آزادی سے علیحدہ رہو۔ قاضی عنایت علی خاں نے ایس پنکھی کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور جہادِ آزادی کا سپاہی بننا منظور کیا۔

مجاہدین کا پہلا حملہ اعلانِ جہاد کے بعد انگریزوں کا انتظامیہ عملہ متعینہ پولیس اسٹیشن وغیرہ تھانہ بھون سے رخصت ہوگیا، ان میں جو لوگ جہادِ آزادی سے دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے اپنی خدمات باشندگانِ قصبہ کے لئے وقف کر دیں۔ ایس پنکھی کلکٹر سہارنپور، کلکٹری کے علاوہ اس وقت فوجی کمانڈر کے فرائض بھی سرانجام دے رہا تھا۔ تھانہ بھون کی صورتِ حال سے متاثر ہو کر اُس نے قرب و جوار کے انگریزی اداروں کی حفاظت

Marfat.com

کے لئے فوجی امداد بھیجی اور اُن کو وقتاً فوقتاً آلاتِ حرب اور میگزین بھیجتا رہتا تھا۔ مجاہدین تھانہ بھون نے سب سے پہلا حملہ ایسی ہی ایک پارٹی پر کیا جو سہارن پور سے شاملی میگزین لے جا رہی تھی، باغ شیر علی پر جس کو اس زمانہ میں خان والا باغ اور آج کل ماتا والا باغ کہا جاتا ہے، میگزین کی حفاظتی پارٹی پر حملہ کیا گیا۔ پوری پارٹی اُسی جگہ کام آگئی۔ صرف ایک سوار سمت مشرقی جنگل کی طرف بھاگا مگر تھوڑے فاصلہ پر گھوڑے سے گر کر مر گیا، اور میگزین مجاہدین کے ہاتھ آیا۔

مجاہدین کا دوسرا حملہ پہلے حملہ کے بعد اطلاع ملی کہ ایس سنگھی کلکٹر تحصیل کے حفاظتی انتظام کا معائنہ کرنے کے لئے شاملی آیا ہوا ہے۔ مجاہدین، تحریکِ آزادی کے اس دشمن اور قاضی عبدالرحیم اور اُن کے بے گناہ ساتھیوں کے قاتل کی فکر میں تھے۔ مجاہدین کا ایک لشکر شاملی پر چڑھ دوڑا۔ اس لشکر کی قیادت حافظ ضامن علی صاحبؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، اور حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتویؒ فرما رہے تھے۔ ایک دستہ قاضی عنایت علی صاحب کی کمان میں بھی تھا۔ شاملی پہنچ کر انگریزی فوج اور مسلح پولیس سے سخت مقابلہ ہوا۔ مجاہدین کے جوشِ جہاد کا مقابلہ انگریزی فوج کو دشوار ہوا تو وہ پسپا ہو کر قلعہ بند ہو گئی۔ تحصیل کی عمارت جو ایک مستحکم گڑھی کی صورت میں تھی، اب جنگی قلعہ کا کام دے رہی تھی۔ صدر دروازہ جو بہت مضبوط تھا، بند کر لیا گیا اور فوج و پولیس نے چہار دیواری کی آڑ لے کر گولیاں چلائیں مجاہدین کے پاس بندوقیں بہت کم تھیں۔ پھر وہ کھلے میدان میں تھے۔ اس لئے دو یوم کی جنگ میں مجاہدین کا اتلافِ جان زیادہ ہوا۔ تیسرے دن حافظ ضامن علی صاحبؒ نے تحصیل کا دروازہ توڑ ڈالا اور انگریزی فوج کی گولیوں سے شہید ہو گئے۔ تحصیل کو لوٹ لیا مدافعین میں سے بعض قتل ہوئے، بعض نے معافی مانگ لی۔ نہ لڑنے والے اشخاص میں سے مجاہدین نے کسی کو انگلی بھی نہ لگائی۔ تحصیل فتح ہونے کے بعد پتہ چلا کہ ایس سنگھی کی آمد کی اطلاع غلط تھی۔

Marfat.com

انگریزی فوج کا تھانہ بھون پر پہلا حملہ | تحصیل شاملی کے لُٹ جانے کی اطلاع جب سہارن پور پہنچی تو ایس پنکھی نے ایک فوج جس کے ساتھ مشہور ہے کہ تین توپیں بھی تھیں، ایک انگریز کمانڈر کے تحت تھانہ بھون پر تاخت کے لئے بھیجی۔ کمانڈر کے علاوہ اس فوج میں کئی انگریز افسر کام کر رہے تھے۔ توپ خانہ کا افسر مسلمان تھا اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ قبلہ کا مرید تھا۔ اس فوج نے تھانہ بھون کا محاصرہ کر کے ریتی دروازہ کے باہر پڑاوے پر اپنا توپ خانہ قائم کیا اور شب بھر قصبہ پر گولہ باری ہوتی رہی۔ افسر توپ خانہ کو حضرت حاجی صاحبؒ کی قصبہ میں جلوہ افروزی کا علم تھا۔ اُس نے دانستہ تمام توپوں کے منہ اُوپر کو کرا دیئے۔ تمام شب کی گولہ باری میں ایک گولہ بھی قصبہ کی آبادی میں نہ گرا۔ سب باہر جنگل میں گرتے رہے۔ کمانڈر نے صبح کو حالات معلوم کئے اور قصبہ کو صحیح و سالم حالت میں سُن کر آگ بگولہ ہو گیا اور اُس نے فوراً تفتیش کر کے افسر توپ خانہ کو حراست میں لے لیا جس کو کورٹ مارشل کے بعد گولی سے اُڑا دیا گیا۔ اس کی جگہ ایک انگریز افسر کو انچارج بنایا جس نے آبادی کا نشانہ لے کر گولہ باری شروع کرائی۔ قصبہ والوں کے پاس کوئی توپ نہ تھی۔ دو معمولی رہکلے تھے۔ ان سے شہر کے دروازہ کی حفاظت کا کام لیا جا رہا تھا۔ ابھی دو تین گولے ہی آبادی میں گرے تھے کہ مجاہدین میں سے ایک توپچی نے اسی معمولی رہکلے سے ایک گولہ پھینکا، جو انگریزی توپ کے دہانہ پر لگا اور وہ بے کار ہو گئی۔ دوسرا گولہ دوسری توپ کے پہیے کو ناکارہ بنا گیا۔ مجاہدین کے پاس آلاتِ حرب کی بے حد کمی تھی۔ ہزاروں مجاہدین میں سے چند سو کے پاس معمولی بندوقیں تھیں۔ تلوار، تیر، کمان، نیزہ اور دوسرے معمولی ہتھیاروں اور آتش بازی سے مسلح تھے۔ اس خیال سے کہ انگریزی فوج کو کمک نہ پہنچ جائے، دوسرے روز مجاہدین نے شہر سے نکل کر محاصرین پر حملہ کر دیا۔ سات گھنٹہ کی دست بدست جنگ کے بعد انگریزی فوج شکست کھا گئی مگر وہ بڑی باقاعدگی سے پسپا ہوئی، اور جاتے ہوئے اپنی توپیں اور سامانِ جنگ بھی ساتھ لیتی گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس

Marfat.com

جنگ میں طرفین کے تقریباً پانچ سو آدمی کام آئے۔

انگریزی فوج کا دوسرا حملہ اس شکست کے بعد سکھ آرمی کی مدد سے انگریزوں نے پہلے حملہ سے زیادہ بڑی فوج اور پہلے سے زیادہ توپوں کے ساتھ تھانہ بھون پر دوسرا حملہ کیا۔ قصبہ پورا خالی ہوگیا تھا کچھ معذور اور کچھ فدائی یہاں رہ گئے تھے۔ فوج نے قصبہ کا محاصرہ کرکے پہلے توپوں سے گولہ باری کی صدر دروازہ کو تباہ کردیا۔ جب آبادی کی طرف سے کوئی مدافعت نہ ہوئی تو حملہ آور فوج قصبہ میں داخل ہوگئی۔ لوٹ مار کا آغاز ہوا۔ قصبہ چھوڑنے والوں میں سے بہت کم لوگ اپنا اثاث البیت اس روداری میں ساتھ لے جاسکے تھے۔ اکثر تو اپنا زیور اور نقدی بھی چھوڑ بھاگے تھے۔ حملہ آوروں نے خوب ہاتھ رنگے۔ نہ صرف مکانوں کو لوٹا بلکہ بعض پرشوکت مکانات میں آگ بھی لگا جو متنفس نظر آیا اس کو یا تو گرفتار کرلیا یا گولیوں سے اڑا دیا۔ مولوی عبدالرحیم صاحب جو قاضی عنایت علی خاں صاحب کے پرسنل اسسٹنٹ تھے، ایسے ہی شہداء میں ہیں۔ ان کی سوتیلی ماں ان کے ساتھ ان ہی کے مکان میں شہید کردی گئی۔ قصبہ سے گرفتار ہونے والوں کی تعداد ایک سو تیس بتائی جاتی ہے جن کو مہاجنوں والی باغیچی میں پھانسی دے دی گئی تھی۔

شکست کے بعد مجاہدین کے کارنامے علماء کرام کے ساتھ انگریزوں کے خوف سے پھر کوئی نئی جمعیت نہ بن سکی۔ حکومت نے ان کی گرفتاری کے لئے ایڑی چوٹی کے زور لگائے۔ عوام کو بڑے بڑے لالچ دیئے اور حکام بعض اوقات ان تک پہنچ بھی گئے مگر ہر مرتبہ محیر العقول طریقوں سے بچتے رہے اور گرفتار نہ ہوسکے۔

مرشدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دو سال تک ہندوستان کے مختلف مقامات میں فروکش رہ کر مکہ معظمہ ہجرت فرما گئے۔ صرف حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی گرفتار ہوسکے اور چھ ماہ تک جیل میں قید و بند کی سختیاں برداشت کرتے رہے۔ اس کے بعد عام معافی کے تحت رہا ہوئے۔ بقیہ حضرات بھی

Marfat.com

عام معافی کے بعد ارکانِ حکومت نے کوئی تعرض نہ کیا۔ قاضی عنایت علی خاں شکست خوردہ انگریزوں کی تلاش میں تحصیل جانسٹھ سے گذر کر ضلع بجنور پہنچ گئے۔ دورانِ سفر میں اُن کو بہت سے محبّانِ وطن ملے اور ان کی جمعیت میں شامل ہوتے گئے۔ بعض اہلِ دول نے اُن کی مالی امداد بھی کی۔ انگریزی فوج ان کی تلاش میں تھی۔ چنانچہ ضلع بجنور میں کئی مرتبہ انگریزی فوج سے مڈبھیڑ ہوئی، اور ان میں کئی لڑائیوں میں قاضی صاحب کو کامیابی ہوئی ان کی طاقت روز بروز بڑھنے سے انگریز خائف تھے اور زیادہ سے زیادہ فوج اُن کی گرفتاری کے لئے مامور کر رہے تھے آخر نجیب آباد کے قریب (قصبہ کے نام میں اختلاف ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی دوسرا قصبہ ہو) انگریزوں کی ایک بڑی فوج سے جس کے پاس کافی توپیں تھیں، مقابلہ ہوا۔ قاضی صاحب کی جمعیت تہائی کے قریب تھی اور توپیں تو سب سے ہی کم تھیں۔ دس گھنٹے کے سخت مقابلہ میں انگریزی فوج کے قدم اُکھڑنے لگے۔ قاضی صاحب فنونِ حرب میں یکتائے روزگار تھے اور میدانِ جنگ میں دو دستہ تلوار چلاتے تھے۔ اُن کے داہنے بازو پر اُن کا بچپن کا ساتھی اور فدائی دوست چودہری ہمنچل سنگھ راجپوت اور بائیں بازو پر اُن کا جاں نثار غلام کلو لڑتا تھا۔ چودہری ہمنچل سنگھ کو بیک وقت نو گولیاں لگیں اور وہ "قاضی جی خدا حافظ" کہتے ہوئے گھوڑے سے نیچے آرہے۔ قاضی صاحب فوراً اپنے گھوڑے سے کُودے اور چودہری ہمنچل سنگھ کو گود میں اُٹھا کر اپنے خیمہ میں لے آئے۔ ذمہ دارانِ فوج نے قاضی صاحب کو توجّہ دلائی، کہ یہ وقت میدان سے علیحدہ رہنے کا نہیں ہے مگر اُن کو اپنے اس فدائی کا اس قدر غم ہوا کہ وہ تادیر خود پر قابو نہ پاسکے اور متوقع فتح شکست سے بدل گئی۔ قاضی صاحب معہ اپنے چند جاں نثار رفقاء کے لڑتے بھڑتے نکل بھاگے۔ ساتھی تتر بتر ہو گئے۔ سامانِ حرب پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔

قاضی عنایت علی خاں قاضی صاحب تھانہ بھون کے با اختیار قاضی تھے۔ ان کا خاندان عہدِ شاہجہانی سے اسی عہدہ پر فائز تھا اور اُن کو بائیس گاؤں جاگیر میں ملے ہوئے

Marfat.com

تھے۔ متبع شریعت اور بڑے صادق القول تھے۔ فنونِ حرب اور شہسواری میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ وجیہ و شکیل تھے۔ اُس وقت عمر کا اندازہ تیس بتیس سال بتایا جاتا ہے۔ ضلع بجنور سے نکل کر وہ میرٹھ ہوتے ہوئے بندیل کھنڈ کے علاقہ میں پہنچے اور وہاں کے محبانِ وطن کو ساتھ لے کر انگریزی فوجوں پر حملے کرتے رہے۔ یہ زمانہ اُن کا ع

دن کہیں رات کہیں، صبح کہیں شام کہیں

کا مصداق گذرا ہے۔ ۱۸۵۹ء تک انگریز فوجوں نے بہت سے محبانِ وطن کو گرفتار کر لیا یا شہید کر دیا۔

جب ان کو اپنے ہمنوا اور ہم خیال لوگ نہ مل سکے تو بالآخر اُنہوں نے جنگ سے دست کشی اختیار کر لی۔ جو چند جاں نثار رہ گئے تھے، اُن کو رخصت کر کے خود اپنے اعزہ کے پاس بھوپال پہنچ گئے۔ وہاں بالکل خاموش زندگی گذار رہے تھے کہ ایک دن شاہراہ پر ہز ہائی نس قدسیہ بیگم فرمانروائے بھوپال کی سواری آتی نظر پڑی۔ یہ بھی اپنے گھوڑے پر سوار تھے۔ مردم شناس بیگم نے ایک ہی نظر میں جوہر قابل کو پہچان لیا۔ مصاحب بھیج کر بلوایا۔ استفسار پر اُنہوں نے خود کو مسافر اور متلاشیِ روزگار ظاہر کیا۔ سواری اُن کی شہسواری کو ظاہر کر رہی تھی۔ چند سوالات کے بعد بیگم صاحبہ نے معقول مشاہرے پر سواروں اور گھوڑوں کی تربیت و اصلاح کے لئے اُن کو ملازم رکھ لیا اور ہفتہ میں دو دن ان کی ڈیوٹی مقرر کی۔ پُرانے ملازمین کو اُن کی اس قدر افزائی پر رشک و حسد ہوا، اور وہ گاہ بگاہ بیگم صاحبہ سے اُن کے خلاف شکایت کرنے لگے۔ بیگم صاحبہ نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ ریاست کی کسی سالانہ تقریب پر ملازمینِ ریاست میں سے ایک شہسوار کچھ خاص کرتب دکھاتا تھا اور اُس کا آخری کرتب ایک باؤلی کے اُوپر سے گھوڑا گذارنا تھا جس پر صرف ایک بالشت چوڑا تختہ بچھا ہوا تھا۔ قاضی صاحب کے علم میں اس کا یہ کرتب آ چکا تھا۔ جب وہ یہ آخری کرتب دکھانے کے لئے باؤلی کے ایک طرف سے روانہ ہوا تو قاضی صاحب نے مخالف سمت سے اُس تختہ پر اپنا گھوڑا بڑھایا۔ ریاستی

Marfat.com

شہسوار چلّایا۔ یہ کیا کرتے ہو، دونوں باؤلی میں ڈوب مریں گے"۔ قاضی صاحب نے جواب دیا۔" ڈوب مرنے کی ضرورت نہیں۔ اُستادی کا دعویٰ ہے تو گھوڑا موڑ کر واپس ہو جاؤ۔ ورنہ شاگردی کا اقرار کر کے ہنٹر پیش کرو"۔

اس شہسوار نے عاجزی کا اظہار کر کے شاگردی کا اقرار کیا۔ قاضی صاحب نے اپنے گھوڑے کو چمکار کر اس کی گردن پر تھپکی دی۔ باگ کے اشارے کے ساتھ ہی گھوڑا اپنی پچھلی ٹانگوں پر الف ہو کر مُڑا اور پُورا گھوم کر واپس ہو گیا۔ تماشائی عش عش کر اُٹھے۔ ریاستی شہسوار پار ہو کر گھوڑے سے کُودا، رکاب بوس ہوا، اور ہنٹر پیش کر کے شاگردی کا باضابطہ اعلان کیا۔ اُن کی یہ شہرت اور مقبولیت ہی اُن کے احوال کے تجسس کا ذریعہ بنی، اور کچھ عرصہ کے بعد اُن کو احساس ہوا کہ لوگ میرے متعلق مشکوک ہیں، تو وہ وہ بھوپال چھوڑ کر جودھپور چلے گئے۔ وہاں بھی ان کی شہسواری اور سپہ گری نے اُن کو پوشیدہ نہ رہنے دیا، اور بعض عمائدین اُن پر شک کرنے لگے تو وہ ریاست الور میں قصبہ تجارہ کے قریب ایک موضع میں اپنے ایک شمشیر ساز دوست کے یہاں تشریف لے آئے اور دمِ واپسیں تک خاموشی سے وہیں مقیم رہے۔ غالباً ۱۹۱۰ء میں تراسی یا پچاسی سال کی عمر میں اس شیر بیشۂ جرأت نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور اسی گاؤں میں مدفون ہوئے۔ انتقال کے بعد اُن کے شمشیر ساز دوست کو پتہ چلا کہ مرحوم تھانہ بھون کے مشہور مجاہد قاضی عنایت علی خاں تھے۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

قاضی صاحب کی اولاد میں سے دو لڑکے عرصہ تک میرٹھ میں مقیم رہے۔ اب نہ اُن کے پہچاننے والوں میں سے کوئی صاحب رہے اور نہ اُن کا کسی کو پتہ ہے۔

غدر کے بعد تھانہ بھون کی حالت انگریزی فوج کے آخری حملہ سے قصبہ بالکل ویران ہو گیا تھا۔ باشندگانِ قصبہ بعض قرب و جوار میں اور بعض دُور دراز مقامات پر پناہ گزیں ہوئے۔ اس وقت کے گئے کچھ خاندان اب بھی حیدر آباد دکن، بھوپال، جودھپور

Marfat.com

اور اور دوسری ریاستوں میں موجود ہیں جن کی اولاد تھانہ بھون سے بالکل بیگانہ ہے جن انگریزی ملازمین نے تحریکِ آزادی میں حصّہ نہ لیا تھا، اُن کے گھر بھی حملہ آور فوج کی دست بُرد سے نہ بچ سکے۔ مجاہدین میں سے جن ملازمین کو معافی دی گئی اُن کی ترقیاں محدود کر دی گئیں۔ فوجی ملازمین کو بالادست جنگی خدمات سے ہٹا کر فوج کے دوسرے شعبوں میں لگا دیا گیا۔ ان میں سے اور مجاہدینِ قصبہ میں سے اکثر پر بغاوت کے الزام میں مقدمات چلے اور بیشتر کو سزائے موت دی گئی۔ قاضی صاحب کے ملازمین اور متوسّلین میں سے تو کوئی بھی نہ چھوڑا گیا۔ دیوان رُوپ سنگھ جو کایستھ خاندان کے فرد تھے اور قاضی صاحب کے مختارِ عام تھے، پھانسی دے دیئے گئے اور ان کی جائداد ضبط کر لی گئی اور مجاہدینِ قصبہ کی بارہ ہزار بیگھہ زمین ضبط کر کے محال باغیان بنا دیا گیا۔ قاضی صاحب کے بائیس گاؤں جو اُن کی مستقل اور نسلاً بعد نسلٍ جاگیر میں تھے، ضبط کر لئے گئے۔ بڑے بڑے عالی شان مکانات اور کھیت کوڑیوں کے مول نیلام کر دیئے گئے۔ قصبہ دو سال تک بالکل غیر آباد رہا۔ فوج کی تاخت سے جو مکانات بچ رہے تھے وہ مناسب مرمّت نہ ہونے کی وجہ سے منہدم ہو گئے۔ بعض مکانات کے کڑی تختے قرب و جوار کے بدمعاش اُتار کر لے گئے۔ ملکہ وکٹوریہ کے اعلانِ معافیِ عام کے بعد جب دوبارہ قصبہ آباد ہوا تو اس وقت تک ۱۳۲ شہدا کی نعشیں درختوں پر ٹنگی ہوئی تھیں جن کو مہاجنوں والی باغیچی میں انگریزوں نے پھانسیاں دی تھیں۔ یہ دیکھ کر لوگ غرقِ حیرت ہو گئے کہ ان نعشوں کو نہ گدھوں نے کھایا تھا، نہ اور کسی جانور نے چھوا تھا۔ گوشت و پوست سوکھ کر رہ گئے تھے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ایسا کوئی ریکارڈ دستیاب نہ ہو سکا جس سے تھانہ بھون کے شہدائے جنگِ آزادی کی صحیح تعداد معلوم ہو سکتی۔ بزرگوں کے بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً

Marfat.com

ایک ہزار افراد نے اس جنگ میں شہادت پائی۔ وہ لوگ اس تعداد کے علاوہ ہیں جو نقلِ مکانی کی بدولت حادثات کا شکار ہوئے۔

تھانہ بھون سے انگریزوں کا عناد انگریزوں پر باشندگانِ تھانہ بھون کی حریت پسندی کی ہیبت مدت تک طاری رہی۔ تھانہ بھون برٹش حکومت کی بلیک لسٹ" میں مدتوں تک رہا۔ عرصہ تک یہاں کے باشندوں کو سرکاری ملازمت نہ دی گئی۔ پولیس میں غدر کے برسوں بعد تک یہاں کا کوئی آدمی نہ لیا گیا اور فوج میں تو پہلی جنگِ عظیم تک یہاں کا کوئی باشندہ نہ لیا جاتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں تھانہ بھون سے ایک پلٹن گذر رہی تھی۔ اس کے انگریز کمانڈر کے دریافت کرنے پر لوگوں نے قصبہ کا نام بتایا تو وہ حیرت زدہ سا ہو کر بولا۔ "اوہ تھانہ بھون ابھی تک آباد ہے"؟

۱۹۱۷ء میں مسٹر سی مور کلکٹر مظفر نگر بسلسلہ دورہ تھانہ بھون آئے، تو انہوں نے قاضی احسان الحق صاحب سے دریافت کیا کہ "آپ کے اور قاضی عنایت علی خاں کے کیا تعلقات تھے؟" موصوف نے واسطہ داری بتائی تو سی مور بولے۔ "وہ اب تک زندہ ہیں اور سنا ہے، کبھی کبھی یہاں آتے ہیں"۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ سنا ہے کہ سی مور نے تھانہ بھون دیکھنے کے بعد بایں الفاظ اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ "تھانہ بھون سے اب بھی بوئے بغاوت آتی ہے"۔

حکومت کی اس معاندانہ ذہنیت کا اثر قصبہ کی معاشیات پر بے حد برا پڑا۔ دوبارہ آبادی پندرہ ہزار نفوس مشتمل تھی جو اقتصادی حالات کی ابتری سے روز بروز کم ہوتی گئی اور گھٹتے گھٹتے ایک وقت تو صرف ساڑھے چھ ہزار رہ گئی تھی اس حریت پسندی کی بدولت برٹش دورِ حکومت میں اہالیانِ تھانہ بھون کے حقوق جس قدر پامال کئے گئے اس کی مثال دوسری جگہ ملنی مشکل ہے۔ اتنا بڑا قصبہ ہونے کے باوجود حکومت نے یہاں مڈل سکول تک قائم نہ کیا۔ نہ کوئی شفاخانہ کھولا اور نہ کوئی دوسرا پبلک ادارہ۔ اس سے کم تر آبادی کے قصبات میں حالانکہ ایسے ادارے موجود ہیں۔

Marfat.com

آخری تبرّک ضمیمہ ۲

حضرت حافظ صاحب شہیدؒ کا ذکرِ خیر

اے مُرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ جاں شد و آواز نیامد

جنگِ اُحد میں ناموسِ مِلّت پر قربان ہونے والا وہ فدائے اعظم جس کو لسانِ رسالت (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسّلام) نے سیّد الشّہداء کا خطاب دیا تھا۔ یعنی سیّدنا حمزہ رضی اللہ عنہ ان کو اگرچہ شہدائے اُحد کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ مگر سردارِ دوجہاں محبوبِ ربّ العالمین صلّے اللہ علیہ وسلّم کا جذبہ یہی تھا کہ جسدِ مبارک یونہی "میدانِ اُحد" میں پڑا رہتا۔ نہ جنازہ اُٹھتا نہ مزار بنتا۔ آپ نے فرمایا۔ پھوپھی صفیہ (حضرت حمزہؓ کی حقیقی بہن رضی اللہ عنہا) کا خیال آتا ہے کہ اُن کو رنج ہوگا اور یہ بھی کہ لوگ اسی کو سُنّت قرار دے لیں گے۔ اگر یہ باتیں نہ ہوتیں تو حمزہ کی اس مظلوم نعش کو جس کے کان کاٹ لئے گئے ہیں۔ پیٹ چاک کر کے جگر نکال کیا گیا ہے اور اس کو دانتوں سے چبایا گیا ہے۔ میں یونہی رہنے دیتا، تاکہ میدانِ حشر میں احکم الحاکمین کے سامنے جسدِ حمزہ کے ٹکڑے وحشی درندوں اور پرندوں کے پیٹ سے برآمد ہوتے اور داستانِ مظلومیت سُناتے[1]۔

یعنی مظلومیت کی انتہا اور فدائیت و فنائیت کی معراج یہ ہے کہ اس دُنیائے ہست و بود میں "نشانِ ہست" بھی نہ رہے۔

تھانہ بھون کے محاذ پر میدانِ شاملی میں قربان ہونے والے سیّدنا حضرت حافظ ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ اسی کی ایک مثال ہیں۔

سادر کرمیلی سن وغیرہ غیر مسلم مؤرخین کو تو اُن کا نام بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ شمس العلماء

---

[1] سیرۃ ابن ہشام جلد دوم ص۷۸ وطبقات ابن سعد قسم اوّل جزو ثالث ص۷

Marfat.com

ذکاء اللہ خاں صاحب جیسے مصنفین کو نام معلوم ہوگا۔ مگر داستانِ شہادت تو کیا لکھتے، اشارہ کنایہ بھی کہیں نہیں کیا۔ ضلع سہارن پور و مظفر نگر سے تعلق رکھنے والوں کا حلقہ نامِ نامی سے بھی واقف ہے اور آپ کی شہادت کا قصہ بھی اس کو ازبر ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس آخری سانحہ کے علاوہ باقی "سوانح حیات" سے ناواقف یہ ماجرا کیا ہے؟ کیا یہ اسی شہیدِ وفا کے جذبۂ محویت کا کرشمہ تو نہیں ہے؟

ترا خیال ہے، ترا جمال ہے، تو ہے
مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ ہوں کیا میں

اس شہیدِ عشق کی سوانح حیات کے دو قصے بزرگوں سے سُنے ہیں امیر الروایات اور ارواحِ ثلاثہ میں بھی انہیں کو قلم بند کر دیا گیا ہے۔ ان دونوں سے بھی اگر کچھ معلوم ہوتا ہے تو یہی ذوقِ فنا جو درجۂ جذب تک بڑھا ہوا ہے۔ ایک واقعہ یہ ہے۔

آپ اپنے شیخ طریقت حضرت میاں جی نُور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ اُن کی جوتیاں[1] بغل میں لے کر اور توبرہ گردن میں ڈال کر جھنجھانے جاتے۔ آپ کے صاحبزادے کی سسرال وہیں تھی۔ لوگوں نے کہا۔ اس حالت میں جانا مناسب نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے سمدھیانے کے لوگ حقیر سمجھ کر رشتہ توڑ دیں۔ حافظ صاحب نے فرمایا:

رشتے کی پرواہ نہیں لیکن میں جس طرح جھنجھانے جاتا ہوں، اُسے اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔ اپنی سعادت ہرگز نہ چھوڑوں گا۔

عشقِ اوّل، عشقِ آخر، عشقِ کُل عشقِ شاخ و عشقِ نخل و عشقِ گُل

یہ بارگاہِ شیخ میں اپنی شخصیت کو مٹا دینے کی ایک مثال ہے جس کی اصطلاحی تعبیر "فنا فی الشیخ" ہوتی ہے۔

اب دوسرا قصہ ملاحظہ فرمائیے، وہ تکمیلِ فنا کی ایک نادر مثال ہے یعنی جہاں تک

---

[1] دیہات و قصبات میں پیدل مسافت طے کرنے والے جوتیاں نکال لیتے ہیں اور برہنہ پا چلتے ہیں کہ اس طرح قدم ہلکا ہو کر تیزی سے اُٹھتا ہے۔

Marfat.com

انانیت کا تعلق ہے، اس کا گرد بھی آئینہ قلب پر باقی نہ رہے، اور جادہ پیمائے طریقت اپنے آپ کو ہیچ در ہیچ سے بھی کمتر سمجھنے لگے۔ دوسرا قصہ یہ ہے:

آپ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے آستانہ پر چارپائی بچھائے بیٹھے رہتے۔ حقہ آپ کے سامنے رہتا۔ جب کوئی شخص آپ کے پاس آتا تو فرماتے۔ اگر مسئلہ پوچھنا ہے تو مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھو۔ مرید ہونا ہے تو وہ بیٹھے ہیں حاجی صاحب، ان کے پاس جاؤ۔ حقہ پینا ہے تو یاروں کے پاس بیٹھو۔

آج کی انانیت پرست تہذیب "نمودِ شخصیت" کو ذاتی ترقی کی بنیاد قرار دیتی ہے جس کا نتیجہ ہوتا ہے خود پرستی، اغراض پرستی، جاہ پرستی، پھر رشک وحسد، بخل وطمع پھر باہمی رقابت، سیاسی کش مکش، جنگ وجدال، فتنہ وفساد۔

لیکن اسلام کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ نمود ختم کرو، للّٰہیت پیدا کرو۔ انانیت کا نام ونشان نہ رہے، جو کچھ رہے للّٰہیت رہے۔ اپنی چاہ، اپنی پسند، اپنی خواہش سب کچھ فنا۔ صرف ایک چیز باقی یعنی رضائے مولیٰ۔ پھر رضائے مولیٰ کی بقا بھی اس شان سے ہو کہ نمود اس کی بھی نہ ہو ؎

از دروں شو آشنا و از بروں بیگانہ وش
این چنیں زیبا روش کمتر بود اندر جہاں

حضرت حافظ صاحب انہیں کمتر اور نایاب بزرگوں میں سے تھے جن کا باطن سوزاں و بریاں اور ظاہر شاداں وخنداں ؎

بلبل نیم کہ نعرہ زنم و دردِ سر کنم — قمری نیم کہ طوق بگردن در آوردم
پروانہ نیستم کہ بسوزم بگردِ شمع — شمعم کہ جاں گدازم و دم بر نیاوردم

شاندار ماضی کی سابق جلدوں میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ جہاد جو نظرِ شریعت میں محمود اور مطلوب ہے، وہی جہاد ہے جو نتیجہ ہو فنائیت کا۔

مطلب یہ ہے کہ کائناتِ عالم کے خلّاق و پروردگار پر جس کا یقین واذعان

Marfat.com

اس درجہ پختہ ہوگیا ہو، اور ذوقِ خدا پرستی یہاں تک بڑھ گیا ہو کہ نماز اُس کیلئے دل کا سکون اور آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائے اور رضائے مولےٰ کو پورا کرنے کی راہ میں جو بھی مصیبت آئے اُس کو ہنسی خوشی برداشت کرنا (جس کو قرآن حکیم نے صبر سے تعبیر کیا ہے) فطری جوہر اور ایک لازوال قوّت بن جائے، تو قرآن حکیم اُن کو زندہ جاوید قرار دیتے ہوئے ہدایت کرتا ہے کہ اُن کو مُردہ کہنا بھی بے ادبی ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا	اے ایمان والو! مدد حاصل کرو
اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ	صبر وصلوٰۃ سے۔ بے شک اللہ
وَالصَّلٰوةِ ط اِنَّ اللّٰهَ	تعالےٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ
مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ○ وَلَا	ہے۔ اور مت کہو اُن کو جو راہِ
تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ	خدا میں قتل کر دیئے جائیں "مُردہ"۔
سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ط	بلکہ وہ زندہ ہیں، مگر تمہیں
بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا	اُن کی زندگی کا احساس نہیں
تَشْعُرُوْنَ ○ (سورۂ بقرہ)	ہوتا۔

واللہ اعلم بالصواب

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

علمائے ہند کا شاندار ماضی

جلد چہارم

۱۸۵۷ء اور جانبازانِ وطن

از

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دہلوی

محدث، فقیہ، مؤرخ، مجاہد فی سبیل اللہ، مؤلف کثیر کتب

از

مکتبہ مسعودیہ ٹیکہ - لاہور

Marfat.com